شاہ حسین حقیقت

اور

اُن کا خاندان

مشرف احمد

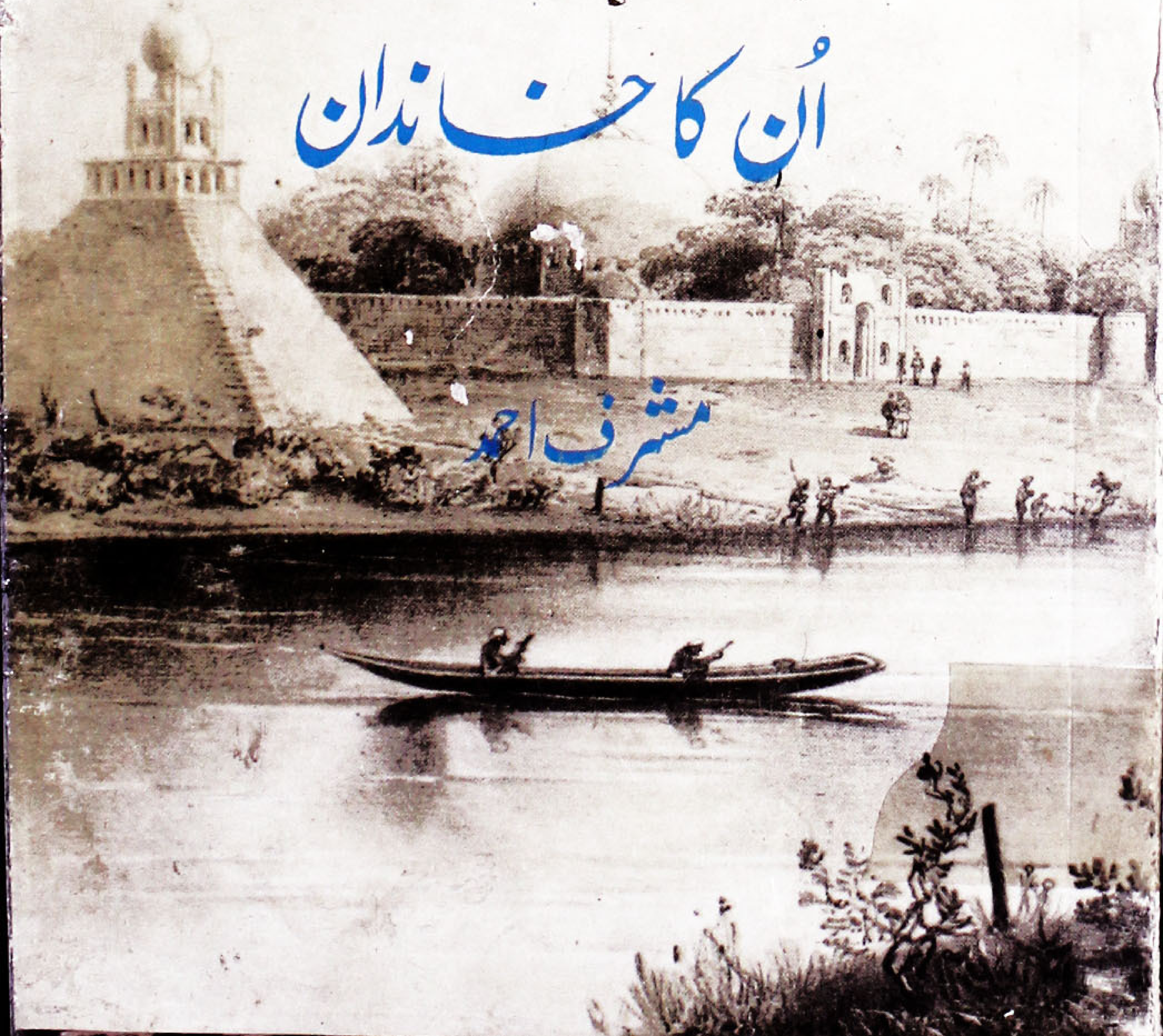

Collection of Prof. Muhammad Iqbal Mujaddidi
Preserved in Punjab University Library.

پروفیسر محمد اقبال مجددی کا مجموعہ
پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ شدہ

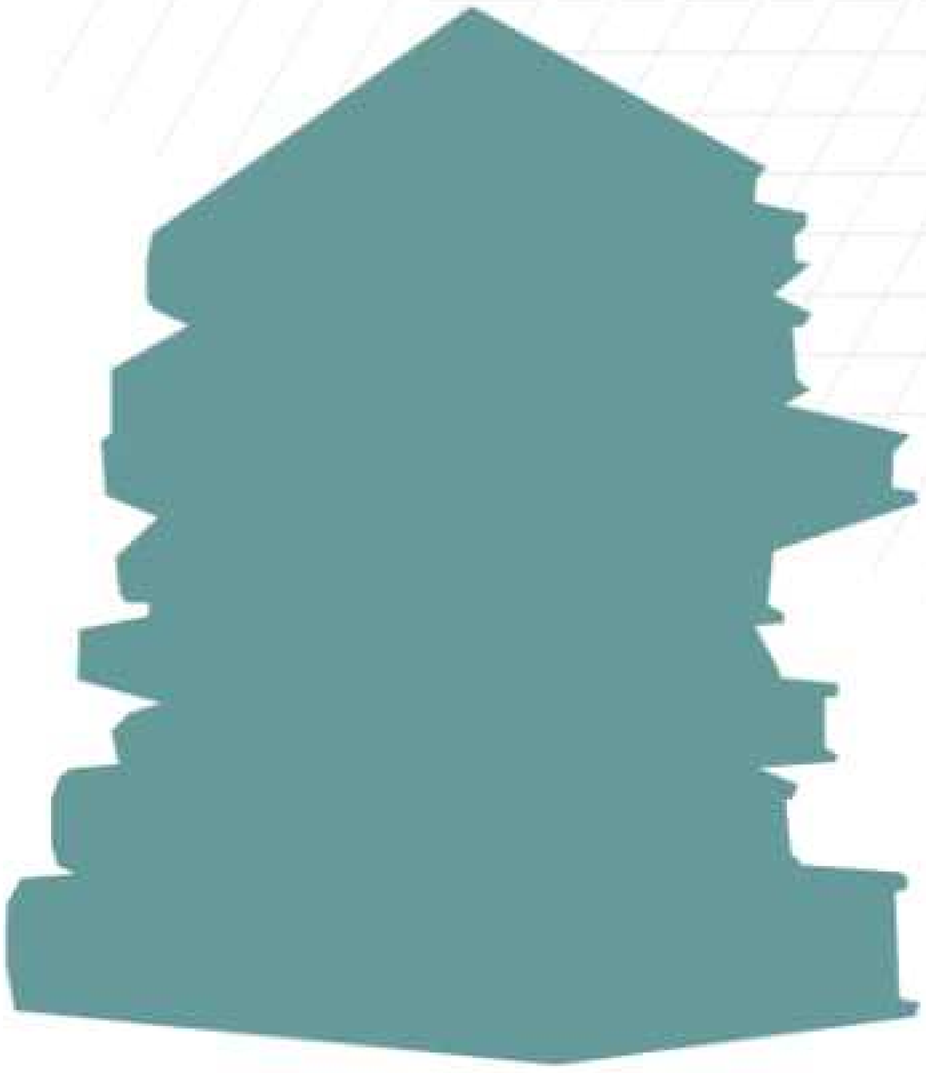

Marfat.com

شاہ حسین حقیقت

اور

ان کا خاندان

مشرف احمد

To Mohammad Iqbal
Musaddiq
With best wishes
Shahid Hamid

ادارۂ ادبیات پاکستان، کراچی

پوسٹ بکس نمبر ۳۴۲۶ - کراچی - ۵

10 July 89

Marfat.com

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

129018

سلسلہ مطبوعات ادارہ ادبیات پاکستان (۱)

بار اوّل ۱۹۷۷ء

تعداد ..... ایک ہزار

ناشر ..... سیّد انیس احمد

ادارہ ادبیات پاکستان کراچی

باشتراک امیر کلال اکیڈمی

پوسٹ بکس ۱۳۹ - راولپنڈی

مطبع ..... ابن حسن آفسٹ پریس، کراچی

قیمت ..... بائیس روپے

PRICE Rs. 25/

ملنے کا پتہ

ادارہ ادبیات پاکستان، کراچی

پوسٹ بکس نمبر ۳۴۲۶ کراچی - ۵

Marfat.com

فہرست

انتساب	۵
عرض مصنف	۷
تعارف	۱۱
حضرت امیر کلالؒ	۱۷
ارشادات امیر کلالؒ	۵۳
شاہ حسین حقیقت	۵۷
حقیقت کے فنی کارنامے	۸۰
جذب عشق	۹۱
ہشت گلزار	۱۲۴
ہیرامن طوطا	۱۶۷
خزینۃ الامثال	۲۰۱
صنم کدہ چین	۲۱۳
تحفۃ العجم	۲۱۸
دیوان حقیقت	۲۲۰
تذکرۂ احبا	۲۳۲
شاہ حسن ضبط	۲۳۳
نشتر	۲۳۷

ذخیرہ محمد اقبال مجددی لاہور

Marfat.com

میر محسن لکھنوی	۲۷۹
تذکرۂ سراپا سخن	۲۸۶
مخزن نکات اور اس کا ترجمہ	۲۹۴
محسن کی شاعری	
خان بہادر سید جعفر حسین	۳۴۸
خان بہادر سید حامد حسین	۳۸۳
سید رفیق حسین	۴۲۲
سید رفیق حسین کی افسانہ نگاری	۴۲۹
ظفر عمر بی۔ اے	۴۳۹
نیلی چھتری	۴۴۲
لال کھنڈور	۴۴۹
مستقبل اسلام	۴۵۶
میجر جنرل (ریٹائرڈ) سید شاہد حامد	۴۵۹
خاندان حقیقت کی چند دوسری شخصیات	۴۷۷
مولوی محمد حسین لندنی	۴۷۷
محمد فضل امین	۴۷۸
مولوی آفتاب عمر	۴۸۱
الطاف فاطمہ	۴۸۲
فضل قدیر	۴۸۳

Marfat.com

میں ان اوراق کو خاندانِ شاہ حسین حقیقت
کے نامور فرزند میجر جنرل (ریٹائرڈ)
سیّد شاہد حامد صاحب
کے نام سے معنون
کرتا ہوں

مشرف احمد

Marfat.com

Marfat.com

میجر جنرل (ریٹائرڈ) سیّد شاہد حامد

Marfat.com

Marfat.com

عرضِ مصنّف

شاہ حسین حقیقت کے علمی و ادبی کارناموں کے بارے میں تحقیقی و تنقیدی نوعیت کا مقالہ لکھنے کا خیال مجھے میرے محترم دوست مشفق خواجہ صاحب نے دلایا تھا۔

جب اس سلسلے میں کام کا آغاز کیا گیا اور حقیقت کے حالاتِ زندگی کی فراہمی کے سلسلے میں مختلف تذکروں اور ان پر لکھے جانے والے ایک آدھ مضمون کا مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ اس خاندان کے اکثر و بیشتر لوگ ممتاز و مشہور مصنف ہو گزرے ہیں چنانچہ میں نے شاہ حقیقت کے علاوہ شاہ حسن ضبط، محسن لکھنوی اور بعض دوسرے ادیبوں کے لیے بھی اس کتاب کا ایک حصّہ وقف کر دیا۔

شاہ حسین حقیقت کی بعض تصانیف کے بارے میں اکثر محققین و ناقدین نے اپنی تحریروں میں یہ تاثر دیا ہے کہ وہ کبھی شائع ہی نہیں ہوئی تھیں لیکن مجھے کام کے دوران معلوم ہوا کہ بعض وہ کتابیں جن کے بارے میں عام خیال تھا کہ شائع نہیں ہوئیں۔ آج سے تقریباً ایک صدی قبل شائع ہو چکی تھیں۔ اسی طرح یہ بھی معلوم ہوا کہ قصّہ "ہیرا من طوطا" جسے اکثر محققین نے اپنے مضامین میں ایک علیحدہ تصنیف قرار دیا ہے، حقیقت کی طویل مثنوی "ہشت گلزار" ہی کا ایک حصّہ ہے جس کو حقیقت نے علیحدہ صورت میں بھی شائع کرایا تھا۔

Marfat.com

شاہ حسن ضبط کے ناول قصۂ حسن رنگین کے مشہور اردو ترجمے "نشتر" پر کئی پہلوؤں سے بحث کی گئی ہے۔ اس ناول کے اردو ناقدین نے اسے ایک فرضی قصہ اور اس کے مصنف کا نام اس کے مترجم کی ذہنی اختراع قرار دیا ہے۔ راقم السطور نے اس ناول کے تاریخی پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے۔ اور اسے اردو کا اوّلین ناول قرار دیا جانے کے حق میں دلائل دیئے ہیں۔ اس ضمن میں شاہ حسن ضبط کو بھی ایک حقیقی فرد ثابت کیا ہے۔

راقم کا خیال ہے کہ نشتر کی ہیروئن خانم جان، مرزا رسوا کے ناول امراؤ جان ادا کا پیشرو کردار ہے۔ نیز خانم جان اور امراؤ جان ادا میں بعض حیرت ناک مشابہتیں پائی جاتی ہیں۔

محسن کاکوروی کے بارے میں کچھ زیادہ تحقیقی مواد نہیں ملتا۔ محسن کی شاعری اور تذکرہ سراپا سخن کے تنقیدی جائزے کے علاوہ مخزن نکات (از قائم چاند پوری) کے ترجمے کا بھی پہلی بار تفصیل سے جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔

سیّد رفیق حسین اردو کے منفرد افسانہ نگار ہیں۔ ان کی افسانہ نگاری کے بارے میں چند ایک مطبوعہ مضامین ملتے ہیں۔ اس کتاب میں ان کے فن کا اختصار کے ساتھ جائزہ لیا گیا ہے۔ تاہم میرا خیال ہے کہ سیّد رفیق حسین کے فن و شخصیت پر تفصیل سے لکھنے کی ضرورت ہے۔ اگر اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن شائع ہونے کی نوبت آئی تو میں اس کمی کو ضرور پورا کروں گا۔

ظفر عمر بی۔ اے مصنف نیلی چھتری، بہرام کی گرفتاری وغیرہ اردو کے اوّلین جاسوسی ناول نگار ہیں۔ ان کی موت کو آج تیس برس کا عرصہ ہونے کو آیا لیکن ان کے تخلیقی کارناموں کے بارے میں آج تک کوئی مضمون شائع نہیں

Marfat.com

ہوا۔ ادھر جوں جوں وقت گزر رہا ہے ان کی تصانیف کی فراہمی بھی دشوار ہوتی جا رہی ہے۔ تلاش بسیار کے بعد ادارہ یادگار غالب کی لائبریری میں ان کی تصنیف کردہ دو کتابیں لال کٹھور اور نیلی چھتری۔ حاصل ہو سکیں۔ لہٰذا صرف انہی دو کتابوں کا تنقیدی جائزہ کتاب میں شامل ہے۔

اس خاندان میں بعض ایسے اشخاص بھی موجود ہیں جن کی وجہ شہرت ادب و شعر نہیں ہے۔ ان میں سے ایک خواجہ بہاء الدینؒ نقشبندی کے مرشد حضرت سید امیر کلالؒ روحانی شخصیت ہیں۔

اس کے علاوہ سرسید احمد خان کے مشیر تعمیرات سید جعفر حسین، اور ان کے بیٹے سید حامد حسین اور پوتے میجر جنرل شاہد حامد کے حالات زندگی بھی قاری کی دلچسپی کا باعث ہوں گے۔ لہٰذا ان اصحاب کے حالات زندگی بھی شامل کتاب کر دیئے گئے ہیں۔

میجر جنرل شاہد حامد صاحب نے مواد کی فراہمی کے سلسلے میں جس شفقت اور کشادہ دلی سے تعاون کیا ہے۔ اس کا شکریہ لفظوں میں ادا کرنا ممکن نہیں۔ سید صاحب سے اوّلین ملاقات کے بعد سے روز بروز ان کی محبت و شرافت کا نقش اوّلین دل میں گہرا ہوتا چلا گیا۔ وہ اپنے خاندان کی شاندار روایات کے پاسدار اور مشرقی وضع داری کا نمونہ ہیں۔

جناب مشفق خواجہ اسم بامسمّٰی ہیں۔ ان کی ذات گرامی بہت سے لوگوں کے لیے علمی و ادبی کاوشوں کا محرک بنتی ہے۔ خوش قسمتی سے مجھ جیسے بے مایہ اور کم علم آدمی پر بھی ان کی نظر التفات رہتی ہے۔ اور مختلف نوعیت کے علمی

Marfat.com

و ادبی کاموں کی انجام دہی کے سلسلے میں میری ہمت بندھاتے رہتے ہیں۔ اگر خواجہ صاحب کی رہنمائی اور زیر یہ تذکرہ مصنفین کی نگارشات، حوالہ جاتی کتب اور مخطوطات کی فراہمی کے سلسلے میں ان کی مدد شامل حال نہ ہوتی تو اس کتاب کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا نہایت دشوار ہو جاتا۔

آخر میں اپنے چھوٹے بھائی سید سعید احمد استاد فارسی، گورنمنٹ کالج بہاول پور کا تذکرہ ضروری سمجھتا ہوں جن کا تعاون اس کتاب کی ترتیب و تیاری میں شامل رہا ہے۔

مشرف احمد

۵ رجولائی ۱۹۷۷ء

Marfat.com

تعارف

موجودہ صدی میں اردو کے ادبی تحقیق کے سرمائے ہیں جو قابل قدر اضافے ہوئے ہیں، ان کی اہمیت وافادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہماری ادبی تحقیق کا دائرہ بہت محدود رہا ہے گنتی کے چند شاعر ہیں جو ہمارے اہل تحقیق کی توجہ کا مرکز رہے ہیں۔ ہر محقق انہیں چند شاعروں پر زور تحقیق صرف کرتا ہے نتیجہ یہ ہے کہ ان چند شعرا کے بارے میں تو ہمیں ایسی معمولی معمولی باتیں بھی معلوم ہیں جن کے نہ جاننے سے کوئی فرق نہ پڑتا لیکن بہت سے قدیم شعرا کے بارے میں ہمیں بنیادی معلومات بھی حاصل نہیں ہیں۔

اس بے اعتدالی کی کئی وجوہ ہیں پہلی وجہ تو ہمارے اہل تحقیق کی تن آسانی ہے۔ وہ ہمیشہ ایسا موضوع انتخاب کرتے ہیں جس پر پہلے بہت کچھ لکھا جا چکا ہو یا لکھنے کے لیے بہت سا مواد موجود ہو۔ وہ کسی نئے موضوع کو ہاتھ لگاتے ہوئے ڈرتے ہیں کیونکہ ہر نیا موضوع اپنے ساتھ بہت سے تقاضے بھی لے کر آتا ہے جنھیں پورا کرنا خاصا مشکل کام ہے۔

تن آسانی کے اس رویے کو ہماری یونیورسٹیوں نے خاصی تقویت پہنچائی ہے جہاں تحقیق کا مقصد صرف سند لینا اور سند دینا ہے حقائق کی دریافت یا بازیافت نہیں ہے۔ اگر کوئی برا نہ مانے تو میں یہاں تک کہوں گا کہ یونیورسٹیوں سے باہر جو تحقیقی کام ہوئے ہیں، ان کا معیار یونیورسٹیوں

Marfat.com

میں ہونے والے تحقیقی کاموں سے کہیں بہتر ہے۔ قاضی عبدالودود، امتیاز علی عرشی، مالک رام اردو تحقیق کے معتبر نام ہیں۔ اور ان میں سے کسی کا تعلق یونیورسٹیوں سے نہیں رہا۔

اردو ادب اور زبان کے عہد بہ عہد ارتقا سے صحیح طور پر آگاہ ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اردو کے شاعروں اور نثر نگاروں کی تمام تحریروں کا متن ہمارے سامنے ہو۔ ان ادیبوں کے حالات زندگی بھی منظر عام پر آنے چاہئیں تاکہ ان کے زمانے کا صحیح تعین کیا جا سکے۔ یہاں صورت حال یہ ہے کہ اردو کے قدیم ادبی سرمائے کا بڑا حصہ شائع ہی نہیں ہوا۔ یہ سرمایہ مختلف کتب خانوں میں مخطوطات کی صورت میں اپنے محققوں اور پبلشرز کے توسط سے قارئین کے انتظار میں ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہمارے محقق اپنے محدود دائرے سے باہر نکل کر ان شاعروں اور نثر نگاروں پر کام کریں جن پر کچھ نہیں لکھا گیا یا جن کا کلام منظر عام پر نہیں آیا۔

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ چھوٹے اور کم رتبہ شاعروں پر کام کرنا محض تضییع اوقات ہے۔ یہ بات اس وقت درست ہو سکتی تھی جب تمام شاعروں کا کلام ہمارے سامنے ہوتا۔ جب ہم نے کسی شاعر کا کلام ہی نہ دیکھا ہو تو ہمیں اسے چھوٹا یا کم رتبہ کس طرح قرار دیا جا سکتا ہے۔ ہماری ادبی تاریخوں میں بیشتر شعرا کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اس کی حیثیت سماعی یا قیاسی ہے۔ ہمارے ادبی مورخوں میں سے بیشتر کو ادب کے براہ راست مطالعہ کرنے کی توفیق ہی نہیں ہوئی۔ ایسی صورت میں اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ہماری ادبی تاریخیں کہاں تک اپنے موضوع سے انصاف کرتی ہیں۔

اس ساری تمہید کا مقصد یہ ہے کہ اگر ہمیں اپنی ادبی روایات سے واقف ہونا ہے اور اپنے ادبی سرمائے کی قدر و قیمت سے آگاہی حاصل کرنا ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ ہمارا ادبی سرمایہ ہمارے سامنے ہو۔ ہمیں اپنے تمام قدیم شاعروں کو پڑھ کر ان کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنی چاہیے۔

Marfat.com

یہی وجہ ہے کہ جب کسی قدیم شاعر پر پہلی مرتبہ کوئی تحقیق کام سامنے آتا ہے تو میں اسے ادبی ماضی کی بازیافت ہی نہیں، ادب کے ماضی و حال میں ایک گہرا تعلق پیدا کرنے کی کوشش بھی سمجھتا ہوں۔ زیرِ نظر کتاب بھی اسی قسم کی ایک کوشش ہے۔ اس کے ذریعے ایک ادیب، اور اس کی ادبی کاوشوں ہی کا سراغ نہیں لگایا گیا بلکہ ادیبوں کے ایک پورے خاندان کی ادبی سرگرمیوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔

شاہ حسین حقیقت، جرأت کے خاص الخاص شاگردوں میں سے تھے۔ غزل گو اور مثنوی نگار کی حیثیت سے اپنے عہد کے ممتاز شعرا میں شمار ہوتے تھے لیکن شاعری ہی ان کے لیے ذریعہ عزت نہیں تھی۔ وہ فارسی اور اردو کے نثر نگار بھی تھے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ایک بڑے عالم بھی تھے جس کا اندازہ ان کی متنوع تصانیف سے ہوتا ہے۔ وہ شعرائے اُردو کے تذکرے تذکرۂ احبا کے مولف تھے۔ یہ تذکرہ اگرچہ اب ناپید ہے لیکن اس سے استفادہ کر کے جو تذکرے لکھے گئے ہیں، ان کے اعلیٰ معیار کے پیشِ نظر کہا جا سکتا ہے کہ اگر یہ ضائع نہ ہوتا تو اردو تذکرہ نگاری میں ایک اہم اضافہ ہوتا۔ شاہ حسین حقیقت کا سب سے بڑا علمی کارنامہ "تحفۃ العجم" ہے جو فارسی زبان کی صرف و نحو سے متعلق ہے۔ یہ کتاب ایک زمانے میں برصغیر اور ایران کے علمی حلقوں میں بہت مقبول تھی۔ "جذبِ عشق" اردو نثر میں ایک قصہ ہے جو اٹھارویں صدی کے آخری چند برسوں میں لکھا گیا تھا۔ یہ اُردو کے نثری اسلوب کے ارتقا کی اہم کڑی ہے جو "نوطرزِ مرصع" اور "باغ و بہار" کی تخلیق کے درمیانی زمانے کی تصنیف ہے جس نے تحسین کے اسلوب میں سادگی کا عنصر شامل کر کے میر امن کے اسلوب کے لیے راہ ہموار کی۔

مشرف احمد صاحب نے زیرِ نظر کتاب میں شاہ حسین حقیقت کی ادبی و علمی کاوشوں پر تفصیل سے لکھا ہے جس سے اندازہ ہو گا کہ حقیقت کی ادبی تخلیقات نے اردو ادب کے ارتقائی سفر میں اہم تاریخی کردار ادا کیا ہے۔

Marfat.com

شاد حسین حقیقت کے خاندان کے متعدد افراد نے ادبی دنیا میں نام پیدا کیا۔ حقیقت کے بڑے بھائی شاہ حسن ضبط کا نام اردو کے مشہور ناول "نشتر" کی وجہ سے زندہ رہے گا۔ "نشتر" شاہ حسن ضبط کے "قصہ حسن و عشق" کا ترجمہ ہے۔ حقیقت کے بیٹے میر محسن لکھنوی، خواجہ وزیر (شاگرد ناسخ) کے شاگرد تھے اور اپنے عہد کے مشہور شاعر تھے، لیکن ادبی تاریخ میں وہ شاعر سے زیادہ "سراپا سخن" کے مولف کی حیثیت سے یاد رکھے جائیں گے۔ اردو زبان میں یہ اپنی نوعیت کا منفرد تذکرۂ شعرا ہے۔ جس میں موضوعات کے اعتبار سے شعرا کا کلام جمع کیا گیا ہے۔ "سراپا سخن" کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ متعدد شعرائے لکھنؤ کے سلسلے میں یہی اب تک واحد ماخذ ہے۔ محسن کے بڑے بیٹے سید جعفر حسین، بہت بڑے ماہر تعمیرات تھے وہ خود تو کوئی ادبی شخصیت نہیں تھے لیکن ادب میں ان کی یہ اہمیت کچھ کم نہیں ہے کہ وہ مرزا رسوا کے ناول "شریف زادہ" کے مرکزی کردار ہیں۔ محسن کے دوسرے بیٹے محمد حسین تھے، جن کے نام کا جزو آخر "لندنی" تھا۔ کیونکہ وہ ایک عرصے تک لندن میں رہے تھے۔ وہ شاعر تھے لیکن ان کی شہرت اس وجہ سے تھی کہ انہوں نے زراعت کے موضوع پر اردو میں سب سے پہلے متعدد کتابیں لکھیں۔

زمانہ حال کے کئی مشہور ادیب ظفر عمر (نیلی چھتری) سید رفیق حسین (گوری ہوگوری) اور الطاف فاطمہ (دستک نہ دو) بھی اسی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ مشرف احمد صاحب نے ان سب کے حالات بھی، بعض دوسرے افراد خاندان کے حالات کے ساتھ لکھے ہیں۔

مشرف احمد صاحب ادبی دنیا میں افسانہ نگار کی حیثیت سے معروف ہیں۔ ان کا شمار ہمارے ان جدید تر ین افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنی تخلیقی کاوشوں کے گہرے نقوش

Marfat.com

ثبت کیے ہیں۔ پیشے کے اعتبار سے وہ ایک کالج میں استاد ہیں، اس لیے اردو ادب کی تاریخ ان کی دل چسپی کا خاص موضوع ہے۔ شاید ۱۹۷۲ء کی بات ہے کہ ایک روز مشرف احمد صاحب سے اردو کے قدیم شعرا پر گفتگو ہو رہی تھی۔ دوران گفتگو شاد حسین حقیقت اور ان کے بیٹے محسن کا بھی ذکر آیا اور میں نے مشرف صاحب سے گزارش کی کہ وہ ان باپ بیٹوں پہ کام کریں تو بہت اچھا ہو۔ مشرف صاحب نے ہامی بھر لی۔ اور کام شروع کر دیا۔

خوش قسمتی سے اسی زمانے میں میجر جنرل سید شاہد حامد صاحب سے میری ملاقات ہوئی۔ موصوف سید جعفر حسین (ابن میر محسن لکھنوی) کے پوتے ہیں، وہ اپنے خاندان کے مصنفین کی کتابیں جمع کر رہے تھے۔ اور اسی سلسلے میں مجھ سے ملے تھے۔ میں نے انھیں بتایا کہ میرے ایک دوست حقیقت و محسن کے بارے میں کتاب لکھنے کا ارادہ کر رہے ہیں تو انھوں نے بڑی خوشی کا اظہار کیا، اور ہر ممکن مدد کا وعدہ کیا۔

مشرف احمد صاحب نے تقریباً چار برس کی ان تھک محنت کے بعد اس کام کو مکمل کیا ہے۔ انھوں نے جس طرح مواد کی فراہمی اور متعلقہ کتابوں کے حصول کے لیے دوڑ دھوپ کی ہے، وہ کچھ انھیں کے بس کا کام تھا۔ خاندانی حالات کے سلسلے میں میجر جنرل سید شاہد حامد کے خاندانی ذخیرۂ دستاویزات سے بہت سا مواد ملا ہے لیکن مصنفین کے ادبی کارناموں کے سلسلے میں مشرف احمد صاحب کو خود ہی ساری تگ و دو کرنی پڑی۔ انھوں نے بہت سی نایاب کتابوں کا سراغ لگایا، ناپید کتابوں کے بارے میں معلومات حاصل کیں، اور بعض ایسی کتابوں کے مطبوعہ نسخوں کی نشان دہی کی جن کے بارے میں اب تک سمجھا جاتا تھا کہ وہ شائع نہیں ہوئیں۔ اس سلسلے میں ایک مثال دوں گا۔ حقیقت کی تصنیف "جذب عشق" کے بارے میں اب تک عام خیال یہی تھا

Marfat.com

کہ یہ کبھی شائع نہیں ہوئی۔ اہلِ تحقیق کی نظر میں اس کتاب کا صرف وہ قلمی نسخہ تھا۔ جو پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب کے کتب خانے میں تھا۔ سب نے اسی قلمی نسخے کے حوالے دیئے ہیں۔ مشرف احمد صاحب نے اس کا مطبوعہ نسخہ بھی ڈھونڈ نکالا ہے۔ اور یہ ایک بہت اہم دریافت ہے۔

مشرف احمد صاحب نے اس کتاب میں جہاں متعدد سوانحی و تاریخی مباحث پر مدلّل بحث کر کے عمدہ تحقیقی معیار پیش کیا ہے۔ وہیں یہ کتاب تنقیدی بصیرت سے بھی خالی نہیں ہے۔ حقیقت کی مثنویوں اور دیگر تصانیف نیز ضبط کے ناول کے ترجمے "نشتر" کے تنقیدی تجزیے سے ان تخلیقات کی قدر و قیمت متعین کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ اس کتاب میں تحقیق و تنقید کا جو خوش گوار توازن ملتا ہے وہ اس قسم کی کتابوں میں عام طور پر نظر نہیں آتا۔ ہمارے اہلِ تحقیق عموماً تنقیدی بصیرت سے اور اہلِ تنقید تحقیقی بصارت سے کم کام لیتے ہیں۔ مشرف احمد صاحب نے اس روشِ عام کی پیروی نہ کر کے تنقیدی اور تحقیقی دونوں سطحوں پر اپنے موضوع کے ساتھ انصاف کیا ہے۔

مشفق خواجہ

Marfat.com

امیر کلال

حضرت سید امیر کلال رحمۃ اللہ علیہ ترکستان کے قصبہ سوخار میں پیدا ہوئے، جو رامتین سے ایک میل اور بخارا سے نو میل کے فاصلے پر واقع ہے۔

القاب آپ کے القاب سلطان الطریقت، برہان الحقیقت، سید السادات، قطب زماں، وحید دوراں اور فرید دہر ہیں۔

جواہر علویہ میں آپ کا اسم مبارک امیر بیان کیا گیا ہے[۱]۔

امیر کلال کی وجہ تسمیہ امیر کلال کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی گئی ہے کہ چونکہ آپ کا پیشہ کوزہ گری تھا اور بخارا میں اس فن سے متعلق شخص کو کلال کہا جاتا ہے لہذا آپ اس نام سے معروف ہوئے۔ حضرات القدس جلد اول میں مرقوم ہے "آپ کوزہ گری کا شغل رکھتے تھے، بخارا کی زبان میں کوزہ گری کا پیشہ کرنے والے کو کلال کہتے ہیں[۲]"۔ جواہر علویہ میں لفظ کلال کی تعبیر میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ چنانچہ مولوی رؤف احمد نقشبندی، جواہر علویہ میں اس لفظ کی وضاحت کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں "کلال حاس گر کو کہتے ہیں۔ آپ زراعت کیا کرتے تھے[۳]"۔

غیاث اللغات اور فیروز اللغات[۴] میں لفظ کلال کے معنی مٹی کے برتن بنانے والے کے بیان کئے گئے ہیں۔ (آپ کا اصل نام خواجہ شمس الدین ذاتوری ہے لیکن اصل نام کی بجائے آپ امیر کلال کے عرف سے معروف ہیں[۵])۔

۱: صفحات ۶۳-۶۲ (۲) ۱۲۱ اردو ترجمہ ۳: حضرات القدس [illegible]
۴- فیروز اللغات [illegible] لغات سندھی ۵: اکثر تذکروں میں [illegible] کے سبب سے تک
قاخوای بھی لکھا گیا ہے۔ اس لفظ کے معنی میں فارسی لغتوں میں [illegible]

آباؤ اجداد

آپ کا سلسلہ نسب، فخر موجودات، سرور کائنات، رسول رحمت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جاملتا ہے جس کی تفصیل یوں ہے۔

(۱) حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم (۲) امیرالمومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ، حضرت فاطمہ الزہرہ (۳) حضرت امام حسین (۴) حضرت امام زین العابدین (۵) حضرت امام محمد باقر (۶) حضرت امام جعفر صادق (۷) حضرت امام موسیٰ کاظم (۸) حضرت سید ابراہیم رضا (۹) حضرت سید محمد جعفر موسوی (۱۰) حضرت سید محمد عزیز موسوی (۱۱) حضرت سید احمد موسوی (۱۲) حضرت سید محمد شہید موسوی (۱۳) حضرت سید عبداللہ الملقب بہ مظلوم (۱۴) حضرت سید امیر موسوی (۱۵) حضرت سید امیر حسین (۱۶) حضرت سید ابوالقاسم (۱۷) حضرت سید امیر عزیز (۱۸) حضرت سید امیر حمزہ (۱۹) حضرت سید امیر کلال[1]

حضرت امیر کلال کے اجداد میں سے ہر بزرگ کی شخصیت اور ان کی صفات و کرامات کے بارے میں علیحدہ کتابیں لکھی جاسکتی ہیں۔ ان کی شخصیات، تاریخ میں مینارہ نور کی حیثیت رکھتی ہیں لہٰذا یہاں اصل موضوع سے گریز کرتے ہوئے علیحدہ علیحدہ ان کے بارے میں لکھنا تحصیل لاحاصل ہوگا۔ بس اس قدر کافی ہے کہ ان تمام بزرگوں نے اپنے اپنے عہد میں رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری رکھا اور بندگان خدا کی رہنمائی کرتے رہے۔

امیر کلال کے بزرگوں کا ترک وطن اور ترکستان میں آمد

حضرت امیر کلال کے بزرگوں نے عرب کو کب خیرباد کیا؟ اور ترک وطن کرکے ترکستان میں تشریف لائے؟

اس سلسلہ میں کافی تلاش و تحقیق اور جستجو کے بعد بھی ایسے شواہد دستیاب نہیں ہوسکے کہ جن کی بناء پر کسی حتمی رائے کا اظہار کیا جاسکے۔ البتہ بعض تاریخی روایات اور مختلف سلسلوں کی کڑیاں جوڑنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ خلفائے بنی عباس کے عہد حکومت میں حضرت سید ابراہیم رضا

---

[1] ا۔ ا۔ آگاہی امیر کلال بزبانِ فارسی ص ۲

Marfat.com

کے صاحبزادے حضرت سید عبداللہ الملقب بہ مظلوم بعض روایات کے بموجب جنوبی یمن میں مخفی طور پر سکونت پذیر تھے جہاں سے انھوں نے جور و ستم کے سبب، اپنے تبرکات خاندانی کو حرز جان بنائے ہوئے ترکستان کی جانب ہجرت کی اور بلخ یا بخارا میں سکونت اختیار کی. آپ کے ہمراہ آپ کے قرابت دار، اعزہ، عقیدت مند اور مخلص دوست بھی ترک وطن کرکے ترکستان میں آگئے۔ چنانچہ ایک اور روایت میں بیان ہوا ہے کہ "حضرت سید محمد شہید موسوی کی شہادت کے بعد حضرت سید عبداللہ الملقب بہ مظلوم اپنے اعزہ اور مخلص دوستوں کے ہمراہ حدود ترکستان میں قیام پذیر ہوئے"۔ آل رسول ہونے کے سبب سے، حضرت امیر کلال کا خاندان ترکستان میں مرجع خلائق رہا ہوگا۔

حضرت امیر کلال کی بزرگی کے آثار ان کی پیدائش سے قبل ہی ظاہر ہونا شروع ہو گئے تھے چنانچہ جب وہ شکم مادر میں تھے تو ان کی والدہ کو یہ احساس ہو گیا تھا کہ ان کی کوکھ میں پرورش پانے والا بچہ غیر معمولی بچہ ہے۔ چنانچہ آگاہی امیر کلال میں لکھا ہے" ابھی حضرت شکم مادر میں تھے اگر وہ (امیر کلال کی والدہ) کوئی ایسی چیز کھا لیتی تھیں کہ جس کے پاک ہونے یا حلال ہونے میں کسی قسم کا شک و شبہ ہوتا تو فوراً پیٹ میں درد شروع ہو جاتا اور بعض اوقات درد کی یہ شدت اور زیادہ ہو جاتی، کچھ عرصہ کے بعد انھوں نے محسوس کیا کہ شاید اس کا سبب شکم میں موجود نازائیدہ بچہ ہے، لہذا اس دن کے بعد سے انھوں نے کھانے پینے میں احتیاط کو اپنی عادت بنالیا۔

آگاہی امیر کلال کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ بچپن ہی سے اہل اللہ اور صاحبان نظر امیر کلال کی جانب متوجہ ہو گئے تھے، اور انھوں نے امیر موصوف میں بزرگی کے آثار کو

Marfat.com

پہچان لیا تھا۔ آگاہی امیر کلال میں بیان ہوا ہے کہ امیر کلال کے والد ماجد قریہ افشنہ میں مدینہ منورہ سے آنے کے بعد سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ اس زمانے میں ایک اور بزرگ سید آتا نامی تھے جن کے امیر موصوف کے والد سے قریبی و مخلصانہ تعلقات تھے۔ چنانچہ بزرگ موصوف جب بھی قریہ افشنہ اور بخارا میں تشریف لاتے تو امیر کلال کے والد سے ملاقات کرتے تھے ایک بار جب سید آتا امیر کلال کے والد سے ملاقات کے لئے تشریف لائے تو ان سے کہا "اے بھائی اللہ تعالےٰ تمہیں ایک فرزند عطا کرے گا کہ جو تمام جہان کو اپنی خدمت میں لے گا اس کا نام امیر کلال رکھنا۔"

ایک دوسری روایت یہ ہے "ایک بار حضرت سید آتا کا گزر قریہ افشنہ سے ہوا۔ انھوں نے امیر کلال کے والد سے کہا "اے برادر فرزند کو ہمارے روبرو لاؤ"۔ جب امیر کلال کو ان کے سامنے لایا گیا تو انھوں نے کمال شفقت کا اظہار کرتے ہوئے امیر موصوف کو اپنے پہلو میں بٹھایا۔

ایک اور روایت میں ہے کہ امیر کلال بچوں میں کھڑے تھے، لیکن ان کے ساتھ کھیل نہیں رہے تھے۔ جب انھوں نے حضرت سید آتا کو دیکھا تو وہاں سے بھاگے اور ان کے پاس آئے۔ حضرت سید آتا انھیں اپنے گھر لے آئے اپنے پہلو میں بٹھایا اور اپنے عمامے کو دو حصے کرکے تہائی حصہ خود باندھ لیا اور بقیہ امیر کلال کے سر پر باندھ دیا۔ اس کے بعد انھوں نے حاضرین سے مخاطب ہو کر فرمایا: "مشائخ طیبّہ کی ارواح وارد ہو رہی ہیں۔ اس کو تمام ولایتیں بخش دی گئی ہیں۔ ہم نے اس کے عالی مرتبہ ہونے کا مشاہدہ کرلیا ہے اور

Marfat.com

اس کا مرتبہ ہم سے زیادہ ہوگا"

حضرت امیر کلالؒ کے والد حضرت امیر کلال کے والد کے حالاتِ زندگی زیادہ تفصیل سے دستیاب نہیں ہیں۔ ان کے اجداد کے عرب سے ترکِ وطن کرکے ترکستان میں آباد ہونے کا ذکر ہم گزشتہ صفحات میں کر آئے ہیں۔ البتہ آگاہی امیر کلال سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امیر کے والد مدینہ جاتے رہتے تھے۔ اور جو واقعہ ہم حضرت سید آتا کے سلسلے میں آگاہی امیر کلال سے پچھلے صفحات میں رقم کر آئے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ امیر کلال کے والد، ان کی پیدائش سے قبل مدینہ منورہ کے سفر سے واپس آئے تھے

امیر کلالؒ کے مرشد حضرت امیر کلال کے مرشد اس وقت کے ایک معروف روحانی اور دینی شخصیت خواجہ بابا سماسی تھے۔ خواجہ بابا سماسی صاحب باطن بزرگ تھے اور ترکستان کے قصبہ سماس کے رہنے والے تھے چنانچہ اس نسبت سے سماسی مشہور ہوئے۔ سماس رامتین کا ایک گاؤں ہے جو بخارا سے تین میل کے فاصلے پر تھا۔ بابا سماسی کا مزار مبارک بھی وہیں ہے۔ خواجہ بابا سماسی، حضرت عزیزاں علیہ الرحمتہ کے افضل واکمل اصحاب میں سے تھے۔ قصبہ سماس کے محل وقوع میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے چنانچہ اخبار الاخیار میں لکھا ہے کہ سماس، طوس میں ایک قصبہ ہے جو اب مشہد کے نام سے مشہور ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ بخارا میں ایک قصبہ ہے۔

جب حضرت عزیزاں علی رامتینی کی وصال کی گھڑی نزدیک آئی تو آپ نے اپنے تمام مریدوں اور اصحاب سے حضرت خواجہ محمد بابا سماسی کو منتخب کیا اور اپنی خلافت اور

Marfat.com

نیابت برج حق شناسی کے اس روشن آفتاب کو سونپی اور سارے مریدوں کو ان کی تابعداری کا حکم دیا۔ آپ پر اکثر جذبات عشق اور وارداتِ الٰہی کا غلبہ طاری رہتا۔ اور اکثر از خود رفتہ اور عالم فراموشی میں رہتے۔ آپ کا ایک باغ تھا، جب اس سے انگور توڑتے تو حال اور کیفیت کے غلبے کی وجہ سے انگور آپ کے دستِ مبارک سے گر پڑتے، اور مدت تک آپ اسی غلبے کے عالم میں رہتے۔"

مرشد کی نگاہِ جوہر شناس

حضرت امیر کلال اور خواجہ محمد بابا سماسی کی ملاقات کے بارے میں یہ روایت بیان کی جاتی ہے کہ "جن دنوں میں امیر کلال کشتی کھیلنے میں مصروف تھے ایک شخص نے خواجہ محمد بابا سماسی سے کہا کہ اس شخص کو دیکھو کیسی بدعت میں مشغول ہے، انھوں نے جواب دیا" یہ اس میدان کا ایسا مرد ہے اور اس دام گاہ کا ایسا صید ہے کہ تمام کامل اس کی صحبت سے بہرہ مند ہو جائیں گے اور ہم اس مرد کے منتظر ہیں کہ حق تعالےٰ اس مرد کو ہمارے دام میں پھنسا دے ہم نے اس کے مقامات بلند کا مشاہدہ کرلیا ہے۔ ابھی وہ یہ بات ہی کر رہے تھے کہ امیر کی نگاہ خواجہ بابا پر پڑی اور ان کے دل کا صید کمند خواجہ میں گرفتار ہو گیا، اور عنانِ اختیار ان کے ہاتھ میں چلا گیا، اور اسی روز فرزندی قبول کرلی[۱]۔"

حضرت امیر کلال اور حضرت خواجہ محمد بابا سماسی کے درمیان ہونے والی اولین ملاقات کے سلسلے میں جواہر علویہ میں جو روایت بیان کی گئی ہے وہ مذکورہ بالا روایت سے کچھ مختلف ہے: "ایک روز محمد بابا سماسی رحمتہ اللہ علیہ اس اکھاڑے کے پاس سے گزر رہے تھے تو وہاں کھڑے

۱:۔ تذکرۃ الکرام۔ تاریخ خلفائے عرب و اسلام

129018

Marfat.com

ہو کر دیر تک دیکھتے رہے، بعض اصحاب نے جو ہمراہ تھے خیال کیا کہ کیا سبب ہے کہ خواجہ صاحب ان کی طرف متوجہ ہیں۔ خواجہ صاحب نے کشف کر کے معلوم فرمایا کہ اس اکھاڑے میں ایک ایسا مرد ہے کہ بہت سے مرد اس کی صحبت میں کمال کے درجے پر پہنچیں گے ہماری نگاہ اس پر ہے اور ہم اس کو شکار کرنا چاہتے ہیں اس اثنا میں امیر کلال کی نظر خواجہ صاحب پر پڑی تو کشش ہوئی چنانچہ جب خواجہ صاحب اپنے مکان پر چلے آئے تو امیر صاحب بھی اکھاڑہ چھوڑ حواس باختہ ہو کر خواجہ صاحب کے پیچھے روانہ ہوئے اور ان سے طریقہ اخذ کیا اور خواجہ صاحب نے آپ کو فرزندی میں قبول فرمایا۔

مرشد کامل سے تعلق خاطر پیدا ہو جانے کے بعد پھر امیر کلال کو کسی نے بازار یا اکھاڑے میں نہیں دیکھا۔ آپ بیس سال تک حضرت خواجہ محمد بابا سماسی کی خدمت میں حاضری دیتے رہے اور پابندی کے ساتھ ہفتے میں دو دن، سوموار اور جمعرات کو سوخار سے سماس حاضر ہوا کرتے تھے ان قصبوں کے درمیان پندرہ میل کا فاصلہ ہے۔

اسی مرشد کامل کی صحبت میں امیر کلال نے سلوک وطریقت کی منازل طے کیں، اور صاحب خوارق، کرامات ظاہری وباطنی سے آراستہ وپیراستہ اور کشوف حالات میں روشن نگاہ ہوئے۔"

حضرت امیر کلال کو ابتدائے عمری میں کشتی وغیرہ سے خاص شغف تھا۔ چنانچہ یہاں ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے جو اکثر تذکروں میں مرقوم ہے۔ پندرہ سال کی عمر میں وہ ایک جگہ کھڑے ہوئے کشتی دیکھ رہے تھے اور بعض روایتوں میں ہے کہ خود بھی اس کھیل میں شریک تھے۔ تماشائیوں میں سے ایک شخص نے انھیں دیکھکر اپنے دل میں سوچا کہ یہ ایک شریف اور نجیب الطرفین سیدزادہ ہے اور

۷:۔ آگاہی امیر کلال بزبان فارسی

Marfat.com

اور ایسی بدعت میں مصروف ہے۔ اتفاق سے اس کھیل کو دیکھتے دیکھتے اس شخص کی آنکھ لگ گئی اور اس نے دیکھا کہ وہ دوزخ میں جا رہا ہے اور حضرت امیر اسے ہاتھ سے پکڑ کر واپس لائے ہیں بعدازاں اس سے کہتے ہیں کہ کسی کے ظاہر پرست جاؤ وہ اعتراض کنندہ اس خواب سے چونک اٹھا اور بعد میں معذرت خواہ ہوا۔

جواہر علویہ میں لکھا ہے کہ "جب آپ جوان ہوئے تو کشتی لڑنا سیکھنے لگے آپ کے گرداگرد لوگوں کا ہجوم جمع ہو جایا کرتا تھا۔ ایک روز جب کہ آپ اکھاڑے میں کشتی لڑ رہے تھے تو ایک شخص نے خیال کیا کہ اس کے کیا معنی ہیں کہ ایک شریف سید زادہ کشتی لڑے اور زور آزمائی کرے اور اہل بدعت کا طریقہ اختیار کرے۔ اس اثنا میں اس شخص کو نیند آگئی تو خواب میں کیا دیکھتا ہے کہ قیامت کا دن ہے اور وہ کیچڑ میں سینے تک دھنس گیا ہے اور عاجز ہو گیا ہے اتنے میں امیر رحمۃ اللہ علیہ آئے اور اس کے دونوں پکڑ کر آسانی سے اس کو کیچڑ میں سے نکال لائے جب وہ شخص جاگا تو امیر صاحبؒ نے اس کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ ہم ایسے ہی دن کے لئے زور آزمائی کرتے ہیں۔

خواجہ نقشبندی کی تربیت کا حکم

حضرت خواجہ بہاؤالدین نقشبندی کی ذات، اہل علم اور اہل تصوف کے لئے کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ آپ سلسلۂ نقشبندی کے بانی ہیں اور آپ کا شمار اولیائے کبار میں ہوتا ہے اسی سلسلۂ نقشبندیہ میں دنیائے تصوف کے روشن آفتاب و ماہتاب شامل ہیں جن میں حضرت خواجہ باقی باللہ، حضرت مجدد الف ثانی، حضرت مرزا مظہر جان جاناں اور شاہ غلام علی جیسے جید بزرگان دین شامل ہیں۔

---

۸ :۔ جواہر علویہ، از مولوی رؤف احمد۔ ص ۶۲-۶۱

Marfat.com

حضرت خواجہ بہاؤالدین نقشبندی کے اولین مرشد حضرت سید امیر کلال ہی تھے۔ بعد ازاں خود اپنے مرشد کے ارشاد پر بہاؤالدین نقشبندی، حضرت عجدوانی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس تشریف لے گئے اور ان کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا۔ جس کی تفصیل آئندہ سطور میں آئے گی۔

مختلف تذکروں میں مرقوم ہے کہ حضرت خواجہ محمد بابا سماسی، جب قصر ہندواں سے گزرتے تو فرمایا کرتے تھے کہ جلد ہی اس خاک سے ایک مرد پیدا ہوگا اور یہ قصر ہندواں، قصر عارفاں ہو جائے گا۔ اس سفر میں حضرت امیر کلال بھی ان کے ہمراہ ہوا کرتے تھے، ایک دفعہ جب قصر عارفاں سے بابا سماسی گزرے تو فرمایا کہ "اب وہ خوشبو زیادہ ہو گئی ہے، شاید وہ مرد پیدا ہو گیا ہے۔ چنانچہ جب آپ اتر کر قصر ہندواں پہنچے تو آپ کو بتایا گیا کہ قصر عارفاں میں آج ایک لڑکا پیدا ہوا ہے۔

چنانچہ حضرت خواجہ بہاؤالدین نقشبندی کے دادا، نومولود کو لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ بابا سماسی نے فرمایا "یہ ہمارا فرزند ہے ہم نے اسے قبول کیا۔ بعد ازاں اپنے احباب کی طرف، جن میں حضرت امیر کلال بھی موجود تھے۔ متوجہ ہو کر کہا "یہی مرد ہے جس کی خوشبو ہمیں آیا کرتی تھی، یہ شخص جلد مقتدائے زمانہ میں سے ہوگا۔ اس کے بعد امیر کلال سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ "ہمارے فرزند بہاؤالدین کے حق میں تربیت و شفقت کا فرق نہ کرنا۔ اگر تم نے اس میں قصور کیا تو میں معاف نہیں کروں گا۔" امیر نے فرمایا کہ "میں مرد نہ ہوں گا اگر آپ کی وصیت میں قصور کروں گا۔"

جب حضرت بہاؤالدین نقشبندی سن شعور کو پہنچے اور تربیت کے قابل ہوئے تو

Marfat.com

حضرت خواجہ محمد بابا سماسی کا انتقال ہو چکا تھا. چنانچہ حضرت امیر کلال کے طلب کرنے پر یا از خود خواجہ مذکور کے اقارب، بابا محمد سماسی کی وصیت کے مطابق، انھیں حضرت امیر کلال کی خدمت میں لے کر حاضر ہو گئے۔ تذکرۃ الکرام تاریخ خلفائے عرب واسلام میں مذکور ہے کہ "خواب میں حضرت خواجہ بابا سماسی نے آکر خواجہ بہاؤالدین نقشبندی سے فرمایا تم امیر کلال کے پاس حاضر ہو کہ وہ ابدال سے ہیں۔ حضرت خواجہ بہاؤالدین نقشبندی، بابا سماسی حکم کے مطابق اگلے روز امیر کلال کی خدمت میں پہنچے آپ نے اپنے مرشد کے روحانی فرزند کی بڑی خاطرداری کی اور ذکر اثبات کا یعنی لا الٰہ اللہ محمد رسول اللہ کا تعلیم کیا۔

حضرت خواجہ نقشبندی کا بیان ہے کہ" چنانچہ اس سے پہلے مجھ کو ذکر خفی کی تعلیم ہوتی تھی اس لئے میں نے ذکر جہر سے احتراز کیا۔ جب اہل طریقت نے اس طریقے میں سماع اور ذکر جہر اور خلوت یعنی چلہ کشی نہیں دیکھا ان لوگوں نے کہا کہ تمھارے اس طریقے میں اور طریقوں سے اختلاف ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ہمارے یہاں خلوت در انجمن ہے اور ہمارا قول ہے۔

آشنا شوں از دروں دو زبرونی بیگانہ باش
کین چنیں زیبا روش کم مے بود اندر جہاں [۱]

چنانچہ امیر کلال سے بیعت ہو کر، خواجہ بہاؤالدین نقشبندی، سلوک و طریقت کی منازل طے کرنے لگے۔ جب امیر موصوف کی خدمت میں حاضری دیتے ہوئے خواجہ صاحب موصوف کو کافی عرصہ گزر گیا تو ایک دن امیر کلال نے خواجہ نقشبندی کو یاد فرمایا۔ جب آپ مرشد کی خدمت میں حاضر ہوئے تو اس وقت امیر موصوف کے ارد گرد عقیدت مندوں اور مریدوں

۱:۔ تذکرۃ الکرام تاریخ خلفائے عرب واسلام ص ۸۵ھ

Marfat.com

کا ہجوم تھا۔ آپ نے خواجہ نقشبندی کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا۔" اے فرزند بہاد الدین، حضرت خواجہ محمد بابا سماسی کے نقش برقدم ہو کر میں تمہارے حق کو پورا بجا لاؤں گا کیونکہ آپ نے فرمایا تھا کہ جیسے ہم نے تمہاری تربیت کا حق پورا کیا ہے ایسا ہی تم میرے فرزند بہاد الدین کے حق میں بجا لانا۔ اور فرق نہ کرنا۔ میں نے ایسا ہی کیا ہے۔ پھر اپنے سینے کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا کہ میں نے اپنے پستان کو تمہارے لئے خشک کر ڈالا تاکہ تمہاری روحانیت کا مرغ بشریت کے انڈے سے باہر نکل آئے، لیکن تمہاری ہمت کا مرغ بلند پرواز ہوا ہے اب تم کو اجازت ہے جہاں کی تمہارے دماغ میں خوشبو پہنچے خواہ ترک ہو خواہ تاجیک ہو بخوشی طلب کرو اور اپنی ہمت کے مطابق خدا کی طلب میں کوتاہی نہ کرو۔

حضرت خواجہ بہاد الدین نقشبندی نے اپنے مرشد کے ان احکامات کا کیا اثر قبول کیا اور وہ امیر موصوف کو کس درجے پر فائز سمجھتے تھے اس کے بارے میں خواجہ بہاد الدین کے اپنے خیالات لکھے جاتے ہیں۔ جب امیر سے یہ نقش ظاہر ہوا وہی آزمائش کا سبب ہو گیا اگر کسی صورت پر ہم حضرت امیر کی متابعت کرتے تو ابتلا سے بہت دور رہتے سلامتی کے زیادہ نزدیک ہوتے۔"

امیر برہان خواجہ نقشبندی کی فرزندی میں

ایک دن حضرت امیر کلال نے خواجہ نقشبندی سے فرمایا کہ جب استاد اپنے کسی شاگرد کی تربیت کرتا ہے تو اس کے بعد یہی چاہتا ہے کہ اس شاگرد میں اپنی تربیت کا اثر دیکھے تاکہ اس کو اعتبار آ جائے اور اگر تربیت میں کسی صورت سے کوئی کمی دیکھے تو اس کی اصلاح کر دے اس کے بعد فرمایا۔" میرا فرزند امیر برہان حاضر ہے کسی نے اس پر قبضہ کا ہاتھ نہیں رکھا اور معنوی تربیت نہیں کی، میرے خیال میں اس کی تربیت میں تم مشغول ہو جاؤ تاکہ اس کا اثر

Marfat.com

ہم دیکھیں اور مجھ کو تمہاری صفت پر بھروسہ ہو جائے "

حضرت خواجہ بہاؤالدین اس وقت مراقبے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اور امیر کلال کی جانب متوجہ تھے۔ آپ نے مرشد کی موجودگی اور ادب و تعظیم کا خیال کرتے ہوئے اس حکم کے ماننے میں تامل کیا حضرت امیر نے ان کے اس پس و پیش کو دیکھا تو فرمایا کہ اس میں توقف نہ کرنا چاہیئے۔ چنانچہ حضرت خواجہ مرشد کے حکم کو بجالانے پر آمادہ ہوئے اور " امیر برہان کے باطن کی طرف متوجہ ہوئے اور ان کے باطن کے تصرف میں مشغول ہوئے۔ اس وقت اس تصرف کی علامات امیر برہان کے ظاہر و باطن میں شروع ہو گئیں، اور بزرگ حال ان میں ظاہر ہوگا اور سکر حقیقی کا اثر بھی ظاہر ہونے لگا۔

بعد ازاں اپنے مرشد کے حکم کے مطابق حضرت خواجہ بہاؤالدین نقشبندی، حضرت فتح شیخ، خلیل آقا اور عبدالخالق غجدوانی علیہ رحمتہ کی جانب کسب فیض کے لئے بڑھے۔ آپ نے اس سلسلہ میں بھی پس و پیش کیا تھا اور حضرت امیر کلال کے در فیوض بخش سے ہی وابستہ رہنا چاہتے تھے لیکن حضرت امیر نے فرمایا "میں نے اپنے پیر بزرگوار کی وصیت کے مطابق تمہاری تربیت کی ہے۔ لیکن تمہاری استعداد اس سے بھی بہت اعلیٰ واقع ہوئی ہے اس واسطے جن سے تمہیں باطنی فیض حاصل ہو سکے کرلو۔" حضرت خواجہ یہ سن کر توقف میں پڑ گئے پھر حضرت سید امیر کلال نے فرمایا " کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی اسی طرح ہے۔

ایک واقعہ حضرت خواجہ بہاؤالدین کے درجۂ کمال پر پہنچنے کے بارے میں ایک روایت بیان کی جاتی ہے "ایک دن حضرت امیر کلال نے خواجہ بہاؤالدین سے کہا چونکہ تم مجھے نہیں چاہتے لہذا یہاں سے چلے جاؤ۔ خواجہ پر یہ بات ناگوار گزری اور وہاں سے چل دیئے۔ راستے میں سوچا کہ حضرت کے ایک بار کہنے سے میں کیوں چلا جاؤں۔

Marfat.com

چنانچہ واپس آگئے۔ حضرت امیر نے دیکھا تو فرمایا۔ "یہاں تیرا کوئی کام نہیں جا کوئی دوسرا دروازہ تلاش کر" خواجہ نے کہا میں جاتا ہوں۔ اور اب کبھی پھر نہ پلٹوں گا۔" چنانچہ وہ وہاں سے رخصت ہو کر شہر بخارا میں آگئے خواجہ کا گزر راستے میں ایک قمار خانے سے ہوا جہاں دو قمار باز کھیل رہے تھے ان میں سے ایک قمار باز سب کچھ ہار چکا تھا۔ پھر بھی دوسرے سے قرض مانگ کر کھیل جاری رکھنے پر اصرار کر رہا تھا۔ دوسرے قمار باز نے جواب دیا "تمہارے پاس کھیلنے کے لئے کیا رہ گیا ہے؟" ہارنے والے نے جواب دیا۔ "اب جان کی بازی لگاؤں گا۔" خواجہ بہاؤالدین اس قمار باز کا یہ جواب سن کر بے قرار ہو گئے اور ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگے اور پھر اپنے آپ سے مخاطب ہو کر کہنے لگے "بہاؤالدین تو قمار باز سے بھی گیا گزرا ہے کہ اتنی جلدی میدان چھوڑ گیا۔ تجھے فوراً حضرت امیر کے آستانے پر لوٹ جانا چاہیئے۔

تا جان دارم در غمت آویزم! تا اشک بود بر سر کویت ایزم
چو صبح قیامت بدمد با عشقت از خاک درت نعرہ زناں برخیزم

خواجہ بہاؤالدین کا معمول تھا کہ حضرت امیر کے وضو کے لئے پانی کا اہتمام کرتے تھے چنانچہ معمول کے مطابق پانی کا آفتابہ بغل میں لئے ہوئے رات گئے آستان مرشد پر پہنچے رات بے حد سرد تھی اور برف گر رہی تھی۔ آپ پانی لئے دروازے میں کھڑے رہے حتیٰ کہ خواجہ بہاؤالدین کا سارا جسم برف میں دب گیا جب امیر کلال صبح کو جب باہر آئے تو آپ کا پاؤں خواجہ بہاؤالدین کے سر پر پڑا۔ فرمایا "بیٹے بہاؤالدین اٹھ جا جس طرح ہمارا قدم تمہارے سر پر پڑا۔ تمہارا قدم لوگوں کی کثیر تعداد کے سر پر پڑے گا۔ حضرت امیر کی توجہ سے اسی رات خواجہ بہاؤالدین درجہ تکمیل کو پہنچ گئے۔

Marfat.com

امیر کلال اور تیمور گورگاں

صاحب قراں امیر تیمور گورگاں، حضرت امیر کلال کا خاص عقیدت مند تھا۔ اور ان کی ذات کو اپنے دینوی و دینی معاملات میں ممد و معاون سمجھتا تھا۔" تیمور بار بار کہا کرتا تھا کہ مجھ کو جو کچھ سلطنت اور فتوحات حاصل ہوئیں وہ شیخ شمس الدین کی دعا کی تاثیر اور شیخ زین الدین خوانی کی صحبت کا اثر تھا اور جس قدر برکت ہے سید برکہ کا طفیل ہے۔

تیمور اور آل تیمور کی اہل اللہ اور مقدس لوگوں اور صاحبان علم و دانش سے عقیدت و مودت تاریخ کے لازوال نقوش ہیں اس خاندان میں بزرگوں سے ربط و ضبط اور ان کے رو برو اظہار عقیدت و احترام کی رسم قدیم تھی جس پر ان کے خاندان کا ہر فرد عامل تھا۔ یہ شاہان کج کلاہ، بزرگوں اور اہل اللہ کی نظر التفات کو اپنے لئے دنیا میں کامیابی و کامرانی اور ان کی دعاؤں کو نجات اخروی کا باعث جانتے تھے۔ اس بات میں تو کوئی اختلاف رائے نہیں ہے کہ امیر تیمور، اپنی زندگی کے اوائل ہی سے حضرت امیر کلال کا عقیدت مند تھا البتہ اس بارے میں روایات میں اختلاف پایا جاتا ہے کہ تیمور کی اولین ملاقات حضرت امیر کلال سے کب اور کس طرح ہوئی" شہر کس میں حضرت شمس الدین فاخوری شیخ وقت اور معتقد بلاد تھے۔ ہر اک کا یہ گمان تھا کہ دین اور دنیاوی امورات میں ان کی دعا مقبول اور حضرت کا فرمودہ قابل اعتماد ہے۔ تیمور کی یہ حالت تھی کہ فقیر عاجز اپنے خیالات اور زعم میں عزت مند اور بہ اعتبار حالت موجودہ ذلیل و خوار، تیمور کے پاس سوا ایک کھادی کی چادر کے اور کچھ نہ تھا۔ تیمور نے اس کو بیچ کر ایک بکری کا بچہ خریدا اور شیخ کی خدمت میں اپنے مقصد دلی کی غرض سے حاضر ہوا۔ بایں طور کہ ایک رسی میں ایک جانب اپنی گردن اور ایک جانب بکری کی گردن باندھ دی، اور لکڑی کے سہارے سے شیخ کی خدمت میں اس

Marfat.com

وقت پہنچا کر شیخ اپنے مریدوں کو توجہ دے رہے تھے۔ اور سب مریدین ذکر اللہ میں مشغول تھے۔ تیمور بہ حالت گدائی شیخ کے فارغ ہونے تک سامنے کھڑا رہا جب شیخ کی نظر پڑی فوراً دوڑ کر شیخ کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور قدموں پر گر گیا۔ شیخ نے مراقب ہو کر تیمور کے مافی الضمیر کو اوّل دریافت کیا۔ پھر سر اٹھا کر اپنے مریدوں سے فرمایا کہ اس شخص نے اپنی آبرو اور اپنی موجودہ دنیا ایسی چیز کی تمنا میں خرچ کی کہ جو اللہ کے نزدیک مچھر کے برابر بھی نہیں، ہم کو لائق ہے۔ ہم اس کی امداد کریں اور اس کو نامراد نہ لوٹائیں چنانچہ سبھوں نے مل کر دعا کی۔

ممکن ہے ناقد ادانہ لگائیں اس بیان میں حد درجہ مبالغہ اور خوش اعتقادی کو تلاش کریں لیکن تیمور کی زندگی کے نشیب و فراز اور اس کی تزک سے اس بات کی گواہی ملتی ہے کہ وہ امیر موصوف کی خدمت میں دعا اور تائید کی درخواست لے کر حاضر ہوا تھا۔ اور اس وقت اس کا شاندار مستقبل، ابتدائی زندگی کی ناکامیوں کی دھند میں لپٹا ہوا تھا۔ دوسری طرف مندرجہ بالا بیان سے امیر کلال کی بے نیازی کا پتہ چلتا ہے اور یہ کہ وہ دنیاوی مال و دولت کے حصول کو کار زیاں سمجھتے اور بادشاہت کو پرکاہ سے زیادہ اہمیت نہ دیتے تھے۔

امیر کلال اور امیر تیمور کے مابین ملاقات کی ایک دوسری روایت بھی یہاں بیان کی جاتی ہے۔ اس روایت سے یہ تو طے نہیں کیا جا سکتا کہ ان دونوں کی یہ اولین ملاقات تھی یا اس سے قبل بھی تیمور، ان کی خدمت میں حاضر ہو چکا تھا۔ البتہ امیر موصوف اور امیر تیمور کے درمیان ربط و ضبط کا پتہ چلتا ہے اور اس امر پر روشنی پڑتی ہے کہ امیر تیمور اپنے دنیاوی کامیابیوں کے لئے حضرت امیر کی دعاؤں کا طالب ہوا تھا۔ اس حکایت کے راوی آگاہی امیر کلال کے خلف حضرت شہاب الدین ہیں جو خانوادہ امیر کلال کے ایک فرد اور خود بھی ایک

۱:۔ تذکرۃ الکرام تاریخ خلفائے عرب و اسلام ص ۴۸۸

Marfat.com

بلند مرتبہ بزرگ تھے۔

"حضرت امیر کلال بخارا میں نماز پڑھ کر اپنے گھر جا رہے تھے انہوں نے دیکھا کہ فتح آباد اور کلاآباد کے درمیان ایک سبزہ زار میں کچھ لوگ بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان کی صحبت شروع تھی مجلس میں اولیا اللہ کی کرامات بیان کی جا رہی تھیں۔ اس جماعت میں امیر تیمور بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرت امیر کلال اپنے حلقے کے ساتھ ادھر سے گزرے جب امیر تیمور نے ان لوگوں کو دیکھا تو پوچھا کہ یہ جماعت کن لوگوں کی ہے؟" ان میں سے ایک نے کہا کہ یہ امیر کلال ہیں امیر تیمور یہ سن کر نہایت تیزی سے اٹھا اور حضرت امیر کلال کے نزدیک آیا اور سر نیاز خم کیا اور کہا اے بزرگوار دین و رہ نمایندہ یقین! میں اپنے دل میں آپ کی طرف سے ایک امید لے کر آیا ہوں کہ آپ میرے لئے کوئی ایسا کام فرمائیے کہ جو درویشوں کے لئے تسکین خاطر کا باعث ہوتا ہے۔"[۱]

امیر کلال نے فرمایا کہ "سخنان درویش مخفی ہوتے ہیں ہمارا طریقہ یہ نہیں ہے کہ ہم خود کسی کو کچھ کہیں بلکہ جس وقت تک ہم خود کسی میں روحانیت نہیں دیکھتے تو خود کسی کو کچھ نہیں کہتے لیکن تم اس سے غافل نہ ہونا اور منتظر رہنا کہ تمہارے امور میں میں بہت ترقی دیکھ رہا ہوں اور تم اس تک پہنچو گے۔"

اس کے بعد حضرت امیر کلال واپس گھر پہنچے اور عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر دیر تک مشائخ کی روحانیت کے بارے میں اپنے مریدوں اور عقیدتمندوں سے گفتگو کرتے رہے۔

امیر تیمور کو فتح خوارزم کی بشارت امیر تیمور سے ملاقات کے بعد اسی رات حضرت امیر کلال نے اپنے جاننے والوں میں سے

۱۔ ص ۱۳

شیخ منصور ساکن قریان کو طلب کیا۔ اور اس سے کہا کہ جلدی جا اور امیر تیمور سے کہہ کر توقف کیے بغیر فوراً خوارزم کی طرف متوجہ ہو جائے، کوئی پس و پیش نہ کرے۔ اگر بیٹھا ہو تو فوراً کھڑا ہو جائے اور کھڑا ہو تو بیٹھ (غالباً گھوڑے کی پشت پر سوار ہونے کی طرف اشارہ ہے) جائے۔ مشائخ کرام کی ارواح طیبہ نے اشارہ کیا ہے کہ تمام مملکتوں کو انھوں نے تمھیں اور تمھارے فرزندوں کو عطا کیا۔ اور جب خوارزم تمھارے قبضے میں آجائے تو پھر سمرقند کی طرف متوجہ ہو جانا۔

شیخ منصور جب امیر کلال کا پیغام لے کر پہنچا تو اس وقت امیر تیمور حضرت شیخ کے جواب کا منتظر تھا۔ چنانچہ پیغام ملتے ہی وہ بلا توقف اپنے ہمراہیوں کے ہمراہ خوارزم کو روانہ اور وہاں سے ظفر مند و کامران لوٹا۔

امیر تیمور اپنی تزک میں لکھتا ہے۔ "آخر یہ سوچا کہ بدخشاں جاؤں اور وہاں کے حکمرانوں کو اپنی امداد پر آمادہ کروں، چنانچہ میں بدخشاں روانہ ہوا۔ امیر کلال کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس نے خوارزم جانے کی رائے دی۔ میں نے امیر کو ایک سال کی آمدنی نذر کرنے کا وعدہ کیا بشرطیکہ میں اُزبکوں پر غالب آجاؤں، اس نے دعائے فتح و ظفر دے کر مجھے رخصت کیا۔ امیر کلال سے رخصت ہوتے وقت میرے پاس بس ساٹھ سوار تھے۔

امیر تیمور کے بیان سے یہ اندازہ لگا لینا کوئی مشکل نہیں ہے کہ اس وقت تیمور کی ، دجہد کا آغاز تھا۔ اور ابھی اس کو وہ قوت و طاقت حاصل نہ تھی، جو بعد میں اس کا مقدر بنی علاوہ ازیں آگاہی امیر کلال کی جس روایت کا سطور بالا میں تذکرہ کیا جا چکا ہے اس کی تصدیق امیر تیمور کے اس بیان سے ہوتی ہے۔ ایک جماعت کی جانب جو اشارہ اس روایت

Marfat.com

میں ہے اس سے مراد تیمور کے اپنی قلیل تعداد (یعنی ساٹھ) سواروں کی تعداد کا پتہ چلتا ہے۔
دارا شکوہ امیر موصوف اور تیمور کے تعلق باہمی کے بارے میں لکھتا ہے "امیر تیمور گورگان کو اپنی فرزندگی کا لقب عطا کیا اور ان کو سات ملکوں کی سلطنت اور فتحیابی اور کامرانی کی بشارت دی۔ اور یہ کہ وہ اپنے دشمنوں پر غالب آئیں گے اور ان سے انتقام لیں گے[1]"

امیر کلال کی بے نیازی

سفینۃ الاولیا اور تاریخ الاولیا کے مصنف شہزادہ دارا شکوہ نے حضرت امیر کلال کے بارے میں لکھا ہے کہ بعد ازاں وہ بخارا میں رہنے لگے تھے لیکن ہر محاذ پر امیر تیمور کے ہمراہ رہتے تھے دارا شکوہ کے اس بیان کی تائید کسی دوسرے تذکرے سے نہیں ہوتی۔ ممکن ہے دارا شکوہ کا مقصد یہاں یہ ہو کہ امیر کلال اس کے جدامجد امیر تیمور کے ہمراہ روحانی طور پر شریک رہتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ امیر کلال کی درویشانہ بے نیازی اس بات کی روادار کیسے ہو سکتی تھی کہ وہ امیر تیمور کے دربار میں جاتے یا اس کے ساتھ مہمات میں شریک رہتے۔

امیر تیمور نے فتح خوارزم کے بعد سمرقند پہنچ کر حضرت امیر کلال کو سمرقند میں تشریف لانے کی درخواست کی تھی، لیکن امیر کلال نے تیمور کے پاس سمرقند جانا پسند نہ کیا اور اپنے صاحبزادے امیر عمر کو تیمور کے پاس اس پیغام کے ساتھ بھیجا "اگر تم چاہتے ہو کہ تمھیں اللہ تعالے کی راہ ملے تو تقویٰ اور عدل کو اپنا شعار بنانا اور دوسرے یہ کہ درویش مومنوں کے لئے ہر وقت دعاؤں میں مشغول ہیں اگر دنیا داری کریں تو ان کی دعا میں حجاب آتا ہے۔"

امیر تیمور اور امیر عمر کی گفتگو

حضرت امیر کے فرزند امیر عمر، اپنے والد کا پیغام لے کر امیر تیمور کے پاس پہنچے، اور چند دن

۱:- سفینۃ الاولیا۔ از دارا شکوہ

Marfat.com

قیام کے بعد رخصت کے طالب ہوئے۔ امیر تیمور نے بہت بے نیازمندی کے ساتھ کہا کہ "تمام ولایت بخارا آپ کے لئے ہے۔"

امیر عمر نے جواب دیا "اجازت نہیں ہے۔"

امیر تیمور نے پھر کہا "صرف شہر بخارا کو قبول فرمالیں۔"

امیر عمر نے جواب دیا "اس کی بھی اجازت نہیں ہے۔"

امیر تیمور نے پھر باصرار کہا "اچھا آپ جس قریے میں ساکن ہیں اس کو ہی قبول کر لیجئے۔"

امیر عمر نے اس کو بھی قبول کرنے سے معذوری کا اظہار کیا۔ اس کے بعد امیر تیمور نے پوچھا کہ "ہم کیا بھیجیں کہ جو حضرت کے لائق اور قربت کا باعث ہو۔"

یہ سن کر امیر عمر نے فرمایا کہ "ہمارے والد صاحب نے کہا ہے کہ اگر تم چاہتے ہو کہ اہل اللہ کے دل میں تمھاری جگہ ہو تو ان کا تقویٰ اور عدل شعار کرو کہ جو اللہ تعالیٰ جل شانہ کے قرب کا بھی باعث ہے۔"

آپ کی اولاد میں سے حضرت سید امیر برہان، جن کا لقب امیر بزرگ تھا امیر تیمور کی درخواست پر اس کے ہمراہ رہا کرتے تھے چنانچہ تذکروں میں مرقوم ہے کہ تیمور جس وقت ہندوستان آیا تھا تو امیر برہان اس کے ہمراہ تھے۔ آخر عمر میں امیر برہان، تیمور سے اجازت لے کر بدخشاں واپس آگئے تھے اور وہیں ان کا انتقال ہوا تھا۔ حضرت خواجہ امیر برہان، خواجہ بہاؤالدین نقشبندی کے مرید خاص تھے اور حضرت امیر کلال کے حکم پر ہی خواجہ بہاؤالدین نقشبندی نے انھیں اپنی تربیت میں لیا تھا۔

Marfat.com

امیر کلال کی اولاد

امیر کلال کے چار فرزند، امیر برہان، سید امیر شاہ، امیر حمزہ اور امیر عمر تھے۔ جن کے مختصر حالات پیش کئے جاتے ہیں۔

امیر برہان

یہ خواجہ بہاؤالدین نقشبندی کی زیر تربیت تھے اور امیر کلال کے سب سے بڑے فرزند تھے، لوگوں سے میل جول کو پسند نہ کرتے تھے اور نہ ہی کسی سے انس کا اظہار کرتے تھے۔ اکثر و بیشتر تنہا رہا کرتے تھے۔ حضرت امیر کلال اکثر و بیشتر ان کی تعریف و توصیف کیا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ "یہ فرزند میری برہان ہے۔"

سید امیر شاہ

امیر کلال کے فرزند دوم تھے۔ یہ شیخ یادگار کے زیر نظر تھے کسب حلال سے روزی کماتے اور اسے مخلوق خدا پر صرف کرتے تھے۔ کبھی کسی سے تحفہ یا نذرانہ بھی وصول نہ کرتے تھے فرمایا کرتے تھے، جو لیتا ہے اسے ویسا دینا پڑتا ہے۔

قناعت کن بنان خشکی خویش   چو کردی از برودت سفلہ پندیش

آپ کو درویشوں اور فقراء کی حاجت روائی کی بے حد فکر رہتی تھی۔ جب تک کسی سائل کی احتیاج پوری نہ فرماتے آپ کو چین نہ آتا۔ لوگ آپ کے گرویدہ ہو جاتے تھے اور خود غریبوں کی دعاؤں کے طالب رہتے تھے۔ نمک کی فروخت ان کا وسیلۂ معاش تھا۔

امیر حمزہ

امیر کلال کے فرزند سوم تھے۔ آپ مولانا عارف کے مرید تھے امیر کلال انھیں ان کے نام سے مخاطب کرنے کے بجائے امیر کلال کے نام سے ہی مخاطب کیا کرتے تھے۔ امیر حمزہ خود بھی بزرگ شخصیت تھے۔ حضرت امیر کلال کے ایک مرید مولانا شمس الدین خلیفہ کے مرید تھے۔ امیر حمزہ کے صاحب کمال ہونے کا ثبوت مانگنے پر

Marfat.com

مولانا شمس الدین خلیفہ نے تین بار یا حمزہ کہا۔ چنانچہ آپ اس آواز پر پہنچ گئے اور فرمایا: "مولانا خلیفہ تین بار پکارنے کی کیا ضرورت تھی صرف ایک ہی دفعہ نام لے لیا ہوتا۔

ایک اور روایت ہے کہ امیر حمزہ کے بعض مرید تجارت کی غرض سے ایک سفر پر روانہ ہوئے۔ راہ میں چوروں نے انھیں لوٹ لیا۔ مریدوں نے غائبانہ طور پر حضرت امیر سے استمداد کی، تھوڑی دیر کے بعد چور مال مسروقہ لوٹا گئے، اور ان لوگوں سے دریافت کیا تمہارا کوئی مرشد ہے انھوں نے اثبات میں جواب دیا پھر چوروں نے حلیہ بیان کیا جس کی تصدیق مریدوں نے کی، اس کے بعد چوروں کا یہ گروہ تائب ہو کر امیر موصوف کے حلقۂ ارادت مندان میں شامل ہو گیا تھا۔ واپسی پر امیر حمزہ نے ان مریدوں سے دریافت کیا کہ کیا تمھیں چوروں سے واسطہ پڑا تھا۔ مریدوں نے اقرار کیا۔ آپ نے فرمایا کہ اب وہ چور اس گھر کے ارادت مند بن گئے ہیں۔"

ایک دفعہ امیر حمزہ کے کچھ ارادت مند ایک کشتی میں جا رہے تھے۔ مخالف ہوا نے زور پکڑا اور کشتی ڈوبنے کے قریب ہو گئی ان مریدین نے حضرت امیر حمزہ سے استمداد کی اور ان کی خاطر ندرانہ دیا۔ کشتی صحیح سلامت کنارے پر پہنچ گئی۔ واپسی پر ان مریدوں نے امیر حمزہ سے ساری کیفیت بیان کی۔ امیر حمزہ نے انھیں اپنا کندھا دکھایا اور فرمایا: "عزیزو ہم مفت خورے نہیں دیکھو ابھی تک کندھے پر رسیوں کے نشانات موجود ہیں۔"

ایک دن امیر حمزہ قصبہ سماس میں تشریف فرما تھے اور بحر معرفت میں غوطہ زن۔ یکایک چونک کر آپ نے عصا اٹھایا اور بظاہر ایک ارادت مند پر غصہ ظاہر کیا۔ لوگوں کو تعجب ہوا۔ امیر حمزہ نے فرمایا: "دوستو سوغار میں ایک بھیڑیا، ایک دیوانے پر حملہ آور ہو رہا تھا۔ میں نے اسے روک دیا الحمد للہ بھیڑیئے کو ہلاک کر دیا ہے۔

Marfat.com

ایک بار تین دن تین رات تک مسلسل بارش ہوتی رہی۔ لوگ بارش تھم جانے کی خواہش لے کر امیر کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ نے جواب دیا "عزیزو بارش کو جب رکنا ہوگا تو خود بخود رک جائے گی۔ لوگوں نے پھر بارش کا ذکر کیا اور اصرار کیا۔ حضرت امیر حمزہ نے اپنے ایک خادم سے کہا باہر جا کر بارش سے کہو کہ اب رک جاؤ۔ خادم نے ایسا ہی کیا چنانچہ بارش رک گئی۔"

امیر سید عمر

امیر سید عمر بھی صاحب کمال بزرگ اور اپنے بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ آپ کا پیشہ کاشت کاری تھا۔ شہر نسف میں آپ کی کچھ مزروعہ زمین تھی۔ جہاں کے کاشت کار اپنے کھیتوں کو پانی دینے سے قبل آپ کے کھیت کو پانی دیا کرتے تھے ایک بار پانی کی قلت تھی جب لوگوں کو پانی فراہم ہوا تو انھوں نے حسب روایت حضرت امیر عمر کے کھیت کو پانی دینا چاہا ایک شخص نے منع کیا اور کہا کہ پانی کا بھروسہ نہیں پہلے اپنے کھیتوں کو پانی دے لو۔ لوگوں نے اسے سمجھایا پر وہ نہ مانا امیر عمر نے فرمایا کہ ان باتوں سے پریشان نہ ہوں۔ پانی میں آگ آ رہی ہے۔ اور جب پانی نہ رہے گا تو آگ اس کھیتی جلا ڈالے گی۔ وہ شخص تو اپنے گھر چلا گیا اور اس کی عدم موجودگی میں اس کے کھیت کو آگ لگ گئی۔ وہ آکر معافی کا خواستگار ہوا۔ آپ نے فرمایا کتنے اولیا اللہ ہیں جن کی کرامات ظاہر ہیں۔ مگر یہ ناچیز اپنی کرامات چھپاتا ہے کیونکہ یہی بات باصواب ہے۔

ایک بار آپ کو اطلاع ملی کہ شہر کبش میں شیخ اسماعیل کے ترک مرید غیر شرعی حرکات کے مرتکب ہو رہے ہیں آپ تشریف لے گئے اور انھیں سمجھایا ان کے سردار نے حضرت امیر عمر کا گریبان پکڑ لیا لیکن اسی وقت اس کا ہاتھ پشت سے چپک گیا اس نے اور اس کے ساتھیوں نے معافی مانگی اور تین دن بعد اس کا ہاتھ پشت سے جدا ہوا۔ آپ نے قصبہ آہین میں ۸۰۲ ہجری میں انتقال کیا اور آپ کی لاش کو ایک سال کے بعد لا کر امیر کلال کے پہلو میں دفنایا گیا۔

Marfat.com

امیر کلال کا انتقال

امیر موصوف کی تاریخ وفات کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ تذکرۃ الکرام تاریخ خلفائے عرب واسلام میں لکھا ہے کہ ان کا انتقال ۱۱ رجمادی الآخر ۷۷۲ ہجری کو سوخار میں ہوا۔ بعض روایات میں تاریخ وفات ۱۵ رجمادی الاخریان ہوئی ہے اور بعض جگہ پنج شنبہ ۸ رجمادی الاول ۷۷۲ ہجری لکھا گیا ہے۔ بہر حال ان کا سال وفات ۷۷۲ھ ہی ہے سے

کرد رحلت چوں امیر اولیا　　　ہر کسے سالش بہ سلک نظم سفت
ہاتف غیبی بتاریخ وصال　　　صاحب انوار عرفان بود گفت
۷۷۲

اس قطعے سے بھی مادہ تاریخ وفات ۷۷۲ ہجری ہی برآمد ہوتا ہے۔

امیر حمزہ کی جانشینی

وصال سے چند دن قبل آپ نے اپنے چاروں فرزندوں کو قریب بلایا اور فرمایا "میرے بیٹو! تم میں سے کون اللہ کے بندوں کی خدمت کا کام سنبھالے گا"۔ تمام بیٹوں نے جواب دیا کہ ہم میں اتنی استطاعت کہاں ہے مگر جسے آپ حکم دیں گے باقی دوسرے اس کا حکم مانیں گے۔"

خدمت بجان کنیم اگر باشدت قبول　　　اے دولت وسعادت ما گر قبول نست

یہ بات سن کر حضرت امیر نے مراقبہ کیا اور پھر حضرت امیر حمزہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا "مشائخ کی ارواح نے آپ ہی کا اشارہ کیا ہے۔"

امیر حمزہ نے اس بارگراں کو قبول کرنے سے معذرت کی اور عرض کیا کہ "میرے مخدوم مجھ میں اتنی طاقت کہاں اور اس قدر استعداد کیسے ہو سکتی ہے۔" آپ نے فرمایا بیٹا یہ کام تمھارا مقدر ہو چکا ہے مانو یا نہ مانو بار خلافت تمھیں سنبھالنا ہی پڑے گا۔

Marfat.com

ما بدست یار دادیم اختیار خویش را

اس کے بعد امیر کلال پیر حمزہ کو اشارہ کر کے خلوت میں لے گئے اور تین دن تین رات تک وہیں رہے۔

امیر کلال کا مدفن

حضرت امیر کلال کی آخری آرام گاہ کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے اکثر تذکروں میں مرقوم ہے کہ آپ کا مزار قریۂ سوخار میں ہے جو آپ کا مولد بھی ہے۔ تذکرۃ الکرام تاریخ خلفائے عرب و اسلام کے مؤلف امیر کلال کا مدفن سمرقند میں گور میر بتاتا ہے۔ جو اصل میں تیمور کا مدفن ہے اور ان دنوں روسی ترکستان میں شامل ہے۔

"۸۰۵ ہجری میں گرجستان پہنچ کر سب کو زیر و زبر کیا اور کلیساؤں کو توڑ کر مسجد بنایا پھر وہاں سے سمرقند کو واپس گیا اور ملک چین کو فتح کرنے کا ارادہ کیا۔ چنانچہ ۸۰۷ھ میں راہ میں ختن کو مسخر کیا۔ اور موضع انزار میں اقامت کی تھی۔ کہ امیر تیمور بیمار ہو کر شب چہار شنبہ ماہ شعبان کو ۸۰۷ھ میں مطابق ۱۸ فروری ۱۴۰۵ء کے انتقال کیا۔ امیر کی وصیت کے بموجب اس کی نعش سمرقند میں لائے اور حضرت خواجہ سید امیر کلال کے گنبد میں کہ امیر تیمور کو جن سے عقیدت تھی اور جو حضرت خواجہ بہاؤالدین نقشبند کے پیر ہیں دفن کیا۔

گور میر میں امیر تیمور کی قبر کے علاوہ ایک اور قبر بھی موجود ہے لیکن تذکرۃ الکرام کی رائے سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اکثر قدیم کتابوں اور تذکروں میں امیر کلال کا مدفن قریۂ سوخار بتایا گیا ہے خود امیر کلال کی درویشی ان کے زہد و اتقا اور بے نیازی سے بھی یہ بات بعید معلوم ہوتی ہے کہ انھوں نے شاہی مقبرے میں دفن ہونا پسند کیا ہو۔ اس سلسلے میں ایک مغربی مصنف کی رائے زیادہ قابل قدر اور وقیع ہے۔ تاریخ بخارا کا مصنف ایک طویل عرصے تک ترکستان میں قیام پذیر

۱۔ ص ۴۹۹ (۲) تاریخ بخارا از پروفیسر آرمینس ویمبرے اردو ترجمہ نفیس الدین ایم اے مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور

Marfat.com

رہا ہے۔ ترکوں اور منگولوں کی تاریخ کے بارے میں اس کی عالمانہ تحقیق و تلاش ایک عالم سے خراج تحسین وصول کر چکی ہیں۔ امیر تیمور کے مزار کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے: "شام کے وقت ۷ رشعبان ۸۰۷ھ (۱۷ فروری ۱۴۰۵ء کو انتقال کر گیا اس کا جسد خاکی سمرقند لایا گیا اور شاندار مقبرے میں دفن ہوا جو اس نے اپنے پیر سید برکہ کے لئے بنوایا تھا۔ یہ سید برکہ ہی تھا جس نے اس کی اوائل جوانی میں پیش گوئی کی تھی کہ مستقبل میں اسے بہت عظمت حاصل ہوگی۔ اب ایک ہی تہہ خانے میں دونوں پاس پاس دفن ہیں" بیشتر تذکروں میں اتفاق رائے پاتے ہوئے یہی کہا جاسکتا ہے کہ امیر کلال کا مدفن سوخار ہی ہے۔ جو بخارا سے ۵ میل کے فاصلے پر ہے۔

سلسلہ نقشبندیہ

حضرت امیر کلال کے کئی نامور خلفاء میں سے ایک، خواجہ بہاؤالدین نقشبندی ہیں جو شہرہ آفاق بزرگ ہیں۔ ان کے اور امیر کلال کے باہمی تعلق کے بارے میں گزشتہ صفحات میں تفصیل سے ذکر آچکا ہے۔ روحانی سلسلوں میں سلسلہ نقشبندیہ ایک ہمہ گیر اور عظیم سلسلہ ہے چونکہ خواجہ بہاؤالدین نقشبندی کے نام سے معروف تھے لہٰذا یہ خیال عام ہے کہ غالباً خواجہ صاحب تصوف کے اپنے کسی علیحدہ سلسلے کے بانی ہیں یا ان کا طریقہ اپنے مرشد حضرت خواجہ امیر کلال سے مختلف ہے۔ ہمارے خیال میں خواجہ نقشبند، طریقت و سلوک میں اپنے مرشد اور ان کے مرشد خواجہ بابا محمد سماسی کے مسلک کے ہی پیروکار تھے۔ اور اس سلسلے کے نقشبندی مشہور ہو جانے کی کئی وجوہ ہو سکتی ہیں۔ طریقہ نقشبندیہ کی شرائط بیان سے کرنے سے پہلے۔ ہم لفظ نقشبندیا نقشبندی کی وضاحت کرتے چلیں۔

خواجہ بہاؤالدین کے نقشبند مشہور ہونے کی ایک روایت تو یہ بیان کی جاتی ہے کہ آپ کے اجداد میں سے کوئی قالین بنا کرتا تھا اور اس میں نقش بنایا کرتا تھا۔

Marfat.com

دوسری روایت یہ ہے کہ جب خواجہ بابا محمد سماسی نے آپ کی تربیت سید امیر کلال کے سپرد کی تو فرمایا کہ بہاؤ الدین کا نقش باندھ، اس واسطے آپ نقشبند مشہور ہوئے۔ تیسری روایت کے مطابق جو شخص امیر کلال کی خدمت میں جاتا تھا اس کے دل پر فیضانِ الٰہی کا نقش بندھ جاتا تھا اس واسطے آپ کو نقشبند کہتے تھے۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ چونکہ طالب علموں کو آپ اسم اللہ کا تصور صنوبری دل پر تلقین فرماتے تھے اسی سبب سے نقشبند کے نام سے مشہور ہوئے۔

نقشبندی سلسلے میں آٹھ شرائط ہیں۔ جو ہشت شرائط خواجگان نقشبندیہ کہلاتی ہیں۔ یہ شرائط کب ضبط تحریر میں لائی گئیں، اس کے بارے میں کوئی بادثوق بات نہیں کہی جا سکتی۔ البتہ خیال یہ ہے کہ حضرت خواجہ بہاؤ الدین نے اپنی تعلیمات روحانی کا سلسلہ اپنے مریدوں میں جاری رکھا ہوگا کہ جس کی تعلیم انھیں حضرت امیر کلال سے اور حضرت امیر کلال کو حضرت خواجہ بابا محمد سماسی سے ملی تھی۔ یعنی یہ سلسلۂ تصوف مرشد در مرشد پھیلا ہوا ہے لیکن چونکہ حضرت خواجہ بہاؤ الدین نقشبند کے زمانے میں اس روحانی تعلیم کی شرائط کو ضبط تحریر میں لایا گیا لہذا یہ انہی کے نام سے موسوم ہو کر سلسلۂ نقشبندیہ کہلایا۔ ہم یہاں مختصراً ان شرائط کو بھی بیان کرتے ہیں جو ہشت شرائط خواجگان نقشبند کے نام سے مشہور ہیں۔

شرط اوّل

نقشبندی سلسلے کی شرط اوّل ہوش در دم ہے جس کے معنی دو بتائے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ جو دم اندر سے باہر آئے چاہیئے کہ حضور و آگاہی سے ہو۔ سالک کو چاہیئے کہ غفلت کو دخل نہ دے اور ہمیشہ ذکر میں مشغول رہے اور بار بار ذکر کرے تاکہ عذاب سے رہائی حاصل ہو۔

ہوش در دوم کے دوسرے خاص معنی ہر ایک دم میں غیر کی نفی اور حق کا اثبات ہے

Marfat.com

یا اپنی نفی کر بیٹھنے سے جیسا کہ لاموجود الا ہو (نہیں موجود مگر وہی یعنی خدا) اس شرط کے مطابق ازل سے ابد تک کے دقیقے کو ایک ساعت جاننا چاہیئے۔

شرط دوم نظر بر قدم نظر بر قدم کے بھی دو معنی ہیں۔ ایک خاص ایک عام۔ عام شرط یہ ہے کہ سالک رستہ چلتے وقت اوپر نیچے دائیں اور بائیں نہ دیکھے اور اپنے پاؤں کی طرف دیکھتا رہے یعنی غیر حق کو اپنے پاؤں کے نیچے لائے اور تواضع، حلم، نرمی اور عاجزی سے راستہ طے کرے۔

نظر بر قدم کے خاص معنی یہ ہیں کہ سالک جب معرفت کے راستے کو طے کرنا چاہے۔ تو معرفت گوناگوں میں قدم مارے کیونکہ معرفت کی کوئی انتہا نہیں اور ترقی حاصل کرے چنانچہ حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر روز ستر مرتبہ استغفار اور توبہ کیا کرتے تھے یعنی ہر روز ستر مقام طے کرتے اور قدم اٹھاتے تھے اور مقام گزشتہ سے توبہ کرتے۔ اسی طرح پیغمبر خدا کی تابعداری ہر فرد بشر پر فرض ہے، اور ایک مقام سے دوسرے مقام میں قدم رکھے اور مقام گزشتہ سے توبہ کرے اور چونکہ سلوک میں عجیب وغریب چیزیں دیکھی جاتی اور معلوم ہوتی ہیں ان کی طرف نگاہ تک نہ کرے اور اصل مقصود کو جو خداوند تعالےٰ جل جلالہٗ ہے اور جو حضرت رسالت پناہ کی صفت ہے اس کو اپنا پیشہ اختیار کرے اور آں جناب کے حالات کی متابعت کرے۔

شرط سوم سفر در وطن سفر در وطن کے بھی دو معنی ہیں۔ عام معنی یہ ہیں کہ سالک طبیعت بشری میں سفر کرے، یعنی چوپایوں کی خصلت سے انسانی خصلت میں، اور انسان سے فرشتوں کی خصلت میں اور بری خصلتوں سے نیک خصلتوں میں انتقال کرے۔ یعنی روح جو اس کا لطیفہ ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کا مظہر ہے اور خدا کا خلیفہ ہے کم

Marfat.com

(تحقیق میں زمین میں اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں)

اس کی ذات میں ہے۔ انسانی صفتوں سے روحانی صفتوں میں بدل جائے اور نفس عین روح بنائے اور روح کو عین مجرد کرے اور مجرد کو عین مفتوح کرے۔

اس شرط کے دوسرے خاص معنی یہ ہیں کہ سالک، ناسوت، ملکوت، جبروت اور لاہوت کا سفر کرے۔ یعنی ناسوت میں خلقت سے خدا کی طرف اور ملکوت میں خدا کی طرف سے خدا کے ساتھ اور جبروت میں خدا کے ساتھ خدا میں اور لاہوت میں خدا میں سے خدا کی طرف یعنی انسانیت سے ملکیت سے روحانیت میں اور روحانیت سے رحمانیت کی طرف انتقال کرے۔

شرط چہارم خلوت درانجمن خلوت درانجمن کے بھی دو معنی ہیں۔ عام معنی یہ ہیں کہ سالک اپنے ظاہر کو خلق سے اور باطن کو خدا سے لگائے رکھے اور اپنے ظاہر کو فرائض اور سُنن کے نور سے منور کرے اور اپنے باطن کو خداوند تعالیٰ کے مشاہدے سے روشن کرے اور ذرہ بر غفلت کو بھی اپنے اندر نہ گھسنے دے اور فراغت و جماعت میں خداوند تعالےٰ کے ساتھ رہے۔ سالک کو چاہیئے کہ اپنے ظاہر کو حدود اللہ کے ادا کرنے اور حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تابعداری میں رکھے اور اپنے باطن کو حضرت رسالت کے تابع بنائے۔ تاکہ اس کا ظاہر بدعت اور گمراہی میں مبتلا نہ ہو اور اس کا باطن گمراہی اور برے عقیدوں اور جھوٹے ارادوں کی طرف مائل نہ ہو اور ہر دم خداوند تعالےٰ کی محبت اور محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی تابعداری سے افعال و اقوال اور احوال میں پختہ ہو جائے اور ذرّہ بھر بھی اس کی متابعت کے خلاف نہ کرے۔

اس کے خاص معنی یہ ہیں کہ چونکہ روح خدا کا خلیفہ ہے اور اس کی صفات کا عرش ہے اس لئے اس میں طرح طرح کے جنگل اور عجیب وغریب مجلسیں ہیں۔ ان کی طرف ہرگز خیال نہ

Marfat.com

کرے۔ اور خداوند تعالےٰ کے مشاہدے سے باز نہ رہے۔ اور مشاہدہ کے عجائب وغرائب میں خوشحال رہے اور روح جو کہ حرم خدا ہے اور مظہر جمال اللہ ہے۔ حرم سے حریم کی طرف رستہ معلوم کرے۔ اور غیر کو حرم میں داخل نہ ہونے دے۔ چنانچہ حدیث نبوی ہے کہ مومن کا دل حرم خدا ہے اور یہ حرام ہے کہ خدا کے سوا کوئی اور اس میں آئے۔ اور مومن کا دل عرش خدا ہے اور مومن کا دل عرش و کرسی سے بھی بزرگ ہے اور خداوند تعالےٰ کی تمام مخلوقات سے افضل ہے اور حدیث نبوی ہے کہ مومن کا دل عرش سے بڑا ہے اور کرسی سے وسیع ہے اور جو کچھ اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے سب سے افضل ہے۔ نیز حدیث قدسی ہے کہ مجھے زمین و آسمان میں نہ ڈھونڈو بلکہ پرہیزگار اور شریف مومن کے دل میں ڈھونڈو۔ ایک اور حدیث قدسی ہے اے آدم کے فرزند میں نے جہاں کی چیزوں کو تو تیرے لئے پیدا کیا اور تجھ کو اپنے لئے، پس تجھے چاہیئے کہ دونوں جہاں کے عجائب و غرائب کی طرف تو مائل نہ ہو جائے۔ اور چشم ظاہری کو انجمن ظاہری سے کہ عالم صوری ہے بند کرے۔ اور چشم باطنی، انجمن باطنی سے جو کہ عالم معنوی ہے بند کرے۔

شرط پنجم یاد کرد یاد کرد سے مراد ذکر لسانی اور قلبی ہے۔ اس کے بھی دو معنی ہیں۔ عام معنی یہ ہیں کہ جو کچھ زبان سے کہا جائے اس کا اثر دل پر لے جائے اور اس کا حظ اٹھائے اور خاص معنی یہ ہیں کہ جو کچھ دل سے خدا کی یاد کرے زبان کو اس سے ناآشنا پائے اور اپنے اندر خیال کر کے صحرائے دل کی سیر کرے۔

شرط ششم باز گشت باز گشت سے مراد یہ ہے کہ ذکر سے مذکور کی جانب باز گشت ہو اس کے بھی دو معنی بیان کئے گئے ہیں۔ عام معنی یہ ہیں کہ اپنے پروردگار کے نام کو یاد کرے اور تمام مخلوقات سے پورے طور پر کنارہ کش ہو یعنی ہر حالت میں خدا کی طرف متوجہ

Marfat.com

ہو۔ اور خاص معنی یہ ہیں کہ اپنے پروردگار کو اس وقت یاد کر کہ تو اپنے آپ کو بھلا دے۔ کیونکہ ذاکر کا مذکور میں فنا ہونا دوسری حقیقت ہے یعنی نفی ذات سے وجود بشری فنا ہو جائے گا۔ اور واجب الوجود کے اثبات سے تو فنا حاصل کرے گا۔

شرط ہفتم نگہداشت نگہداشت یہ ہے کہ خطرات کی نفی کا مراقبہ کرے۔ اور خدا کے علاوہ تمام چیزوں سے دل کو نگاہ میں رکھے۔ اس شرط کے عام معنی یہ ہیں کہ مراقبہ اس طرح کرے کہ اپنا تمام ظاہر و باطن خداوند تعالے کی طرف لگائے۔ خاص معنی یہ ہیں کہ نہ ظاہر ہی رہے اور نہ ہی باطن اور نہ مراقبہ رہے اور نہ غیر۔

شرط ہشتم یادداشت یادداشت سے جو کہ تمام عبادتوں کا مقصود ہے از روئے ذوق کے آگاہی دوام ہے اس کے اول معنی یہ ہیں کہ ہمیشہ توحید اور معرفت میں مستغرق رہے اور ذوق دائمی حاصل کرے۔ اور بے عقل و بے ہوش نہ ہو جائے۔ اور اگر ہو جائے تو طریقت کا نقصان ہے اور آہ و بکا نہ کرے۔ اگر کرے گا تو گویا طریقت کا خون کرے گا

اس کے خاص معنی یہ ہیں کہ توحید اور معرفت کے استغراق میں جو اسرار الٰہی معلوم کرے انہی پر اکتفا نہ کر کے تازہ بتازہ اسرار حاصل کرے اور ان کو ظاہر نہ کرے اگر کرے گا تو دو وجہ سے گرفتار عتاب الٰہی ہوگا ایک تو اس وجہ سے کہ جو شخص بادشاہوں کے رازوں کو افشا کرے نزدیکی کے لائق نہیں ہوتا، اور دوسرے اس واسطے کہ دوسرے کے بھید کو ظاہر نہیں کیا کرتے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ خدا کے بھیدوں کو ظاہر کرنا کفر ہے۔

ان کے علاوہ تین اور باتوں وقوف زمانی، وقوف عددی اور وقوف قلبی کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔

وقوف زمانی سے مراد یہ ہے کہ اپنی حالت کی طرف نگاہ کرے۔ اور یہ دیکھے کہ حالات میں

Marfat.com

ترقی ہوئی ہے یا نہیں۔ اگر ہوئی ہے تو خداوند تعالےٰ کا شکور ہو۔ اور اگر نہیں تو اپنا ماتم کرے اور وقوف قلبی یہ ہے کہ نفس کو پاک کرنے اور دل کو صاف کرنے اور روح کو جلا دینے میں ہر روز زیادہ کوشش کرے۔

کرامات امیر کلال

حضرت امیر کلال کی کرامات بے شمار ہیں۔ یہاں ان میں سے چند پیش کی جا رہی ہیں۔

روایت ہے کہ ایک سال حضرت امیر کلال چند مریدوں کے ساتھ کسی دریا کے کنارے فروکش ہوئے۔ آپ تقریباً ہر سال دریا کے کنارے جایا کرتے تھے۔ وہاں آپ دوستوں سے کسی قدر آگے نکل گئے۔ اور پھر کچھ سوچتے ہوئے لوٹ آئے، اور ارادت مندوں کو خطاب فرمایا۔ دوستو علی صوفی ابھی آجائے گا لوگ خاموش رہے مگر انہیں تعجب ہو رہا تھا کہ علی صوفی جسے حضرت امیر دور دراز مقام بخارا میں چھوڑ آئے ہیں کیسے آئے گا؟ اتنے میں دیکھا کہ علی صوفی ہوا کی مانند پانی پر سے دوڑتا ہوا آرہا ہے اور جب دریا سے نکل کر باہر آیا تو اس کا ایک بال بھی تر نہ تھا۔ حضرت امیر کلال نے علی صوفی کو جھڑکا کہ تو گھر سے کب باہر آیا تھا۔ اس نے جواب دیا میرے مخدوم وہاں آپ کے جمال کا اشتیاق اس قدر غالب آگیا کہ مجھے کوئی خبر نہ رہی اور آنکھ کھلی تو اپنے آپ کو یہاں دیکھا اور اس سے قبل میں آپ کے جمال میں مستغرق رہا ہوں۔ حضرت امیر بولے۔ جیسے آیا ہے ویسے ہی لوٹ جا اور جب تک ہم نہ لوٹیں اپنی جگہ پر موجود رہو۔ علی صوفی نے حضرت امیر کے اشارے سے پانی پر قدم رکھا اور ہوا کی مانند چل پڑا اور فوراً منزل مقصود کو جا پہنچا۔

آگاہی امیر کلال کے مصنف نے ایک اور واقعہ لکھا ہے۔ "حضرت امیر کلال ایک بار محفل میں مناسک حج بیان فرماتے ہوئے بعض مناسک کے ذکر میں علمائے اسلام کے بیان کردہ دقیق مسائل پر گفتگو فرما رہے تھے۔ حاضرین محفل کو آپ کے ارشادات پر تعجب ہو رہا تھا۔ محفل میں ایک

Marfat.com

بے حقیقت وارادت شخص نے حضرت کی باتیں سن کر کہا کہ ایسی باتیں وہ کرے جس نے یہ سب کچھ دیکھا ہو۔
حضرت امیر کلال نے ایک گھڑی بعد اسے باہر بلا کر فرمایا کہ اپنے سر کے اوپر دیکھو۔ اس نے دیکھا کہ خانہ کعبہ امیر کلال کے سر پر گردش کر رہا ہے۔ یہ منظر دیکھکر وہ شخص قدموں پر گر پڑا اور معافی مانگی۔ حضرت امیر نے فرمایا کہ "اگر کسی کے پاس ایک درم بھی نہ ہو تو اسے یہ خیال تو نہیں کرنا چاہیئے کہ دنیا سے دولت ختم ہو گئی اور کسی دوسرے کے پاس بھی کچھ نہ ہو گا۔

ایک دن حضرت امیر کلال اپنے ارادت مندوں کے ساتھ حضرت جبرئیل آقا کے مزار کی زیارت کے لئے روانہ ہوئے، راہ میں ایک شیر نظر آیا۔ آپ کے ہمراہی شیر کو دیکھ کر گھبرا گئے لیکن آپ نے آگے بڑھکر شیر کو گردن سے پکڑ لیا اور اسے راستے سے ہٹا دیا۔ شیر نے سر جھکا لیا اور آپ کے قدموں میں گر پڑا۔
ارادت مندوں کے تعجب پر آپ نے فرمایا کہ "دوستو جو اللہ سے ڈرے گا ماسوا اللہ کے ہر چیز اس سے ڈرے گی۔" آپ نے اسی سلسلے میں مزید فرمایا۔ دنیا کی جملہ اشیا آدمی سے ڈرتی ہیں اللہ نے انھیں آدمی پر مسلط و غالب نہیں کیا۔ البتہ جب آدمی خدا سے نہ ڈرے تو اس کے دل میں ماسوا اللہ کا خوف داخل ہو جاتا ہے۔

ایک بار حضرت امیر کلال اپنے مرشد کے پاس قصبہ سماس میں تشریف فرما تھے۔ وہاں کے لوگوں میں آپس میں لڑائی ہوئی جس کے نتیجے میں ایک شخص کا دانت ٹوٹ گیا۔ وہ لوگ حاکم کے پاس اس کی شکایت لے کر جانا چاہتے تھے اور اس شخص سے دانت کی دیت مانگتے تھے۔ ایک شخص نے مشورہ دیا کہ پہلے حضرت خواجہ محمد بابا سماسی سے ملاقات کریں اور ان سے اجازت مانگ لیں۔ غرض وہ خواجہ بابا کے پاس پہنچے۔ خواجہ نے انھیں امیر کلال کے پاس تصفیے کے لئے بھیج دیا۔ حضرت امیر نے ان لوگوں کو باہم صلح و آشتی سے رہنے کی تلقین کی اور اس شخص کا ٹوٹا ہوا۔ دانت اسی جگہ رکھ دیا

Marfat.com

حاضرین یہ دیکھکر متعجب رہ گئے کہ دانت اس طرح بیٹھ گیا گویا کبھی ٹوٹا ہی نہ تھا۔

ایک دن حضرت امیر کلال "دروازہ کلاں" نامی ایک قصبے میں تشریف فرما تھے۔ اسی روز آپ کے ایک عقیدت مند کا انتقال ہو گیا اس کی وصیت تھی کہ حضرت امیر کلال ہی اس کا نماز جنازہ پڑھائیں۔ اس وقت وہاں کئی دوسرے مشائخین کرام جن میں حضرت امیر واشوی، مولانا شمس الدین انکتوی اور مولانا تاج الدین عجدوانی بھی موجود تھے۔ ان بزرگوں نے کہا کہ کسی شخص کو حضرت امیر کو بلانے کی خاطر بھیجنا چاہیئے۔ حضرت شیخ صوفی نے یہ سن کر کہا کہ قاصد کی ضرورت نہیں حضرت امیر خود آجائیں گے کیونکہ اللہ تعالےٰ نے انھیں صفائے باطن سے نوازا ہے حاضرین میں سے ایک شخص، دوسرے سے کہنے لگا کہ حضرت امیر سے اس معاملے میں دریافت کریں گے۔ کہ آیا مرشد نے انھیں اس تصرف کی اجازت دی ہے۔ ابھی وہ شخص یہ بات کہہ ہی رہا تھا کہ حضرت امیر آپہنچے۔ لوگوں نے آپ کے کمال کا مشاہدہ کیا اور استقبال کو حاضر ہوئے۔

جب حضرت امیر کلال کے اس عقیدت مند کی نماز جنازہ پڑھائی جا چکی اور تجہیز و تکفین سے فراغت پانے کے بعد حضرت امیر کلال مسجد میں تشریف لائے تو امیر واشوی اور مولانا شمس الدین نے متذکرہ بالا سوال دریافت کیا۔ حضرت امیر نے جواب دیا" مولانا شمس الدین اور امیر واشوی صادق القول اور عاقل ہیں۔ وہ دونوں آئینہ دل میں بے اجازت ایک دوسرے کو اور دیگر باتوں کو مشاہدہ کرتے ہیں آنحضرت کا ارشاد ہے کہ دل، دل کا آئینہ ہے اور یہ کہ مومن، مومن کا آئینہ ہے۔ آپؐ کا ایک دوسرا دوسرا ارشاد ہے کوزے سے وہی ٹپکے گا جو اس میں ہے۔ اس اشاراتی گفتگو کے نتیجے میں سب امیر کلال کے معترف ہو گئے۔

ایک روز خواجہ بہاوالدین آپ کی ملاقات کو حاضر ہوئے۔ اس وقت امیر موصوف قصبہ خواجہ

Marfat.com

مبارک میں تشریف فرما تھے۔ آپ کے سامنے آگ دہک رہی تھی۔ حضرت امیر خواجہ بہاؤالدین کو دیکھ کر خوش ہوئے اور آگ کے اندر لکڑی ڈالی۔ خواجہ بہاؤالدین پر اس وقت اضطراب کا عالم طاری تھا انھوں نے دہکتی ہوئی آگ میں اپنی پوستین اتار کر ڈال دی، اس پوستین کی جیبوں میں چند شکار کئے ہوئے پرندے تھے۔ حضرت امیر کلال نے اس بات پر خواجہ کو ملامت کی، اور حکم دیا کہ جا کر پوستین اٹھا لاؤ خواجہ بہاؤالدین نے عرض کیا حضرت پوستین جل کر خاک ہو چکی ہوگی۔ آپ نے فرمایا۔ بہاؤالدین جو چیز سالہا سال تک درویشوں کے زیر استعمال رہی ہو اسے آگ کس طرح جلائے گی اسے تو آتش عشق نے پہلے ہی جلا رکھا ہے خواجہ بہاؤالدین گئے اور اپنی پوستین کو وہاں سے صحیح و سالم باہر نکال لائے یہ کام آپ نے گہرے چولہے میں قدم رکھ کر انجام دیا اور آگ نے انھیں کوئی گزند نہ پہنچائی۔

آگاہی امیر کلال میں مرقوم ہے کہ "حضرت امیر کلال کی خدمت میں مردان غیب بھی حاضر ہوا کرتے تھے ان کی حاضری کا وقت بعد از نماز مغرب ہوتا تھا۔ ایک مرید رات کے وقت حضرت امیر کلال کا نیاز حاصل کرنے کے لئے ان کے پاس گیا دیکھا تو امیر ایک بہت بڑی جماعت کے ساتھ وہاں موجود ہیں۔ اس مرید کے وہاں داخل ہونے پر وہ لوگ غائب ہو گئے اور امیر تنہا رہ گئے حضرت امیر نے فرمایا "تم نے اپنا مقصد پا لیا مگر زنہار کسی اور کو خبر نہ ہو، یہ غیبی مرد تھے۔ پہلے حضرت خواجہ کلاں عبدالخالق غجدوانی کے پاس آتے تھے ان کے انتقال کے بعد اب میرے پاس آنے لگے ہیں۔

ایک دن حضرت امیر کلال اپنے مریدوں کی ایک جماعت کے ہمراہ خانقاہ میں تشریف فرما تھے۔ ایک خوبصورت نوجوان محفل میں آیا، اور بغیر سلام کئے بیٹھ گیا۔ اس نووارد اور حضرت امیر کے درمیان کوئی گفتگو نہ ہوئی تھوڑی دیر کے بعد امیر نے سر اٹھایا اور فرمایا "ختم ہوگیا" وہ نوجوان بولا "معمولی سا رہ گیا تھا وہ بھی ختم ہوگیا۔" اس کے بعد وہ نوجوان محفل میں تھوڑی دیر اور بیٹھا رہا اور پھر باہر آگیا۔

Marfat.com

جب وہ باہر نکلا تو لوگوں نے اس سے اس کے تعجب انگیز رویے کے بارے میں استفسار کیا۔

وہ نوجوان بولا میں روم سے آیا ہوں چند دن قبل حضرت امیر ہمارے ساتھ ایک مسجد کی تعمیر کے کام میں مصروف تھے۔ میں اب اس مسجد کی تکمیل کی اطلاع دینے حاضر ہوا تھا، لوگوں نے یہ جواب سن کر تعجب کیا اور بولے" حضرت امیر تو کبھی روم نہیں گئے ؟ اس نوجوان نے جواب دیا، حضرت امیر وہاں اکثر تشریف لایا کرتے تھے۔ ہم ان کی اقتدا میں نماز پڑھتے رہے ہیں۔ وہاں ان کے کئی مرید ہیں اور ہم سب ان کے ہاتھ پر بیعت ہیں۔ لوگوں نے پھر سوال کیا" جب آپ محفل میں آئے تو سلام کیوں نہ کیا۔ اس رومی نوجوان نے جواب دیا" میں دل سے سلام کہتا اور دل کے ذریعہ سنتا ہوں۔ ہمیں زبان کی احتیاج نہیں۔ ہمیں جب کوئی مشکل درپیش آتی ہے تو حضرت امیر تشریف لاتے ہیں۔ اور وہ اس مشکل کو حل کر دیتے ہیں۔ یہاں کے مقابلے میں وہ وہاں زیادہ معروف ہیں، اور روم کے لوگ ان کے قدر شناس ہیں ؎

ولی و والی ملک ولا است میر کلال! یقین کر وارثِ اولیا است میر کلال!

ولی است سالک مجذوب قطب این عالم مقرر ازلی بادشاہت میر کلال

اہل بخارا کا بیان روایت ہے کہ ترکستان سے صوفیاء کی ایک جماعت بخارا آئی۔ وہ وہاں کے لوگوں سے امیر کلال کے مراتب روحانی بیان کر رہے تھے بخارا کے لوگوں نے اس گروہ صوفیا سے استفسار کیا کہ حضرت موصوف تو کبھی خود ترکستان تشریف نہیں لے گئے۔ اس پر ان ترکستانیوں نے جواب دیا" امیر کلال ہمارے ہاں بے حد معروف ہیں۔ ہم سب ان کے مرید ہیں۔ اور ان کے ہاتھ پر بیعت ہیں۔ ہمیں کوئی مصیبت درپیش ہوتی ہے تو ان کے توسط سے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں اور وہ مصیبت ٹل جاتی ہے۔

Marfat.com

مولانا تاج الدین عجدوانی

حضرت امیر کلال کے مریدین بے شمار ہیں۔ جن میں خواجہ بہاء الدین نقشبندی کو بے پناہ شہرت ملی۔ علاوہ ازیں آپ کے بہت سے دوسرے مرید بھی نامور ہوئے۔ مولانا تاج الدین عجدوانی بھی ایسے ہی مریدین میں شامل ہیں۔ ایک بار انھوں نے حضرت امیر سے درخواست کی کہ یہ فقیر بھی اپنے ہاتھ کو آپ کے دامن سے وابستہ رکھنا چاہتا ہے۔ حضرت امیر نے جواب دیا "ہمارا کام خدمت لینا نہیں ارادت کیشوں میں داخل کرنا ہے۔ اور آپ کو بھی شامل کر لیا۔

مولانا کشی

حضرت مولانا جلال الدین کشی بھی ایک نامور بزرگ گزرے ہیں جو حضرت امیر کلال کے ارادت مندوں میں شامل تھے۔ چنانچہ جب آپ نے امیر موصوف کے زمرۂ مریدین میں شامل ہونے کی درخواست کی تو آپ نے اسے منظور فرمایا۔

Marfat.com

ارشادات امیر کلال

۱۔ عالم وہ ہے جس کی گفتار اس کے عمل سے بہتر ہو۔ اور عارف وہ ہے جس کا عمل اس کی گفتار سے احسن ہو۔ علم کا مقصد یہ ہے کہ عارف اپنی آگاہی کے مطابق عمل کرے۔

۲۔ یاد رکھئے سودمند علم وہ ہے جو آدمی کو ماسوا سے دور رکھے اور ہوا و ہوس کیلئے ڈھال ثابت ہو۔

۳۔ معرفت کی علامت یہ ہے کہ آدمی ظاہر و باطن میں خدا سے ڈرے کیونکہ خدا سے ڈرنا عرفان کی بنیاد ہے۔

۴۔ جب تک تو دل کا رخ دنیا اور اہل دنیا سے پورے طور پر نہ پھیرے مقصود حقیقی کا رخ تجھے نظر نہیں آئے گا۔

۵۔ اگر آپ رات کی عبادت میں کمان کی طرح خم ہو جائیں۔ اور پیٹ کمان کے چلّے کی مانند پتلا ہو مجھے رب جلیل کی عزت کی قسم آپ اس وقت تک مقصد نہیں پا سکتے جب تک آنحضرت کی پیروی نہ کریں اور اپنے حلال کے خرچے اور پاک روزی کا خیال نہ رکھو اصل چیز شریعت کی متابعت ہے۔

۶۔ حسن اخلاق ہر دوسرے کام سے بہتر ہے۔

۷۔ خبردار دوستو، درویشوں کی بددعا سے بچ کر رہو۔ یہ سینکڑوں سر کاٹ دیتے ہیں اور ان کا ہاتھ غائب رہتا ہے۔ البتہ ان کا ساتھ دو، ان لوگوں نے دنیا سے ہاتھ کھینچ رکھے ہیں اور

Marfat.com

آسودگی دنیا سے چہرہ پاک کر رکھا ہے۔

۸ــــ طلب دنیا سے دور رہو اور آنحضرتؐ کی سنت کی پیروی سے سرمو انحراف نہ کرو۔ کیونکہ جملہ سعادتیں اسی عمل سے حاصل ہوتی ہیں۔

۹ــــ عزیز یقین جانو کہ دنیا داروں کی دوستی اللہ تعالےٰ کے راستے کی بڑی رکاوٹ ہے ضروری ہے کہ خدا کو جانو، خدا کا ذکر کرو اور ہمیشہ اس کی یاد میں رہو تاکہ تمہارے دین و ایمان کا زیاں نہ ہو۔

۱۰ــــ خدا ترسی سے بڑھ کر کوئی عبادت نہیں ہے۔ جو شخص خدا سے نہ ڈرے اس سے مت ڈرو ہاں جو خدا سے ڈرتا ہو اس سے تم بھی ڈرو۔

۱۱ــــ جہاں تک ممکن ہو اللہ تعالےٰ کے ذکر پر زیادہ توجہ دو، ذکر ایسا کرو کہ اس سے نفی و اثبات نمایاں ہوتی ہوں۔ لا اللہ کہتے ہیں ماسوائے حق کی نفی کرو۔ اور اس کے بعد الا اللہ سے ذات واحد جو والدین، اولاد اور ہر قسم کی احتیاج و مدد سے پاک اور بے نیاز ہے کا اثبات کرو۔ اس وقت تم صحیح طور پر ذکر کرنے والے بنو گے۔

۱۲ــــ یاد رکھو کپڑے پانی سے پاک ہوتے ہیں۔ زبان ذکر الہٰی سے اور جسم ادائے نماز سے مال و دولت زکوٰۃ دے کر پاک ہوتے ہیں اور تمہارا پورا وجود نفی ماسوا اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی سے پاک ہوتا ہے۔

۱۳ــــ دل، زبان اور جسم کی پاکیزگی حلال کے لقمے سے حاصل ہوتی ہے۔ آدمی کے معدے کو پانی کا حوض جانیئے۔ حوض سے مختلف سمتوں میں پاک پانی اسی صورت میں نکل سکے گا جب کہ خود حوض پاک پانی کا مجموعہ ہو۔

۱۴ــــ سالک کو تائب رہنا چاہیئے کیونکہ توبہ سب طاعتوں کا سرچشمہ ہے۔

Marfat.com

۱۵۔۔۔ توبہ یہ ہے کہ پہلے اپنے کیے پر شرمندہ ہو۔ پھر ترکِ گناہ کی نیت کرے۔ اس کے بعد ان گناہوں کا ارتکاب نہ کرے، اور ہمیشہ اللہ تعالےٰ سے ڈرتا رہے اور گناہوں کی معافی مانگے۔

۱۶۔۔۔ دنیا کا غم دل سے نکال دو اور آخرت کے غم سے فکرمند رہو، عبادت کرتے رہو کیونکہ یہ بندہ ہونے کی علامت ہے۔

۱۷۔۔۔ ہر حالت میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرائض بجالاتے رہو۔ غیر شرعی باتوں اور بدعتوں سے بچتے رہو۔

۱۸۔۔۔ اپنے اعمال کی کسوٹی سنت رسول کو بناؤ جو کام اس کسوٹی پر پورا اترے وہ مقبول ہے ورنہ غلط اور گمراہی ہے۔

۱۹۔۔۔ اللہ تعالےٰ کے ساتھ اپنے حقوق کا خیال رکھو۔ اس کی بشارتوں سے خوش رہو اور وعیدوں سے ڈرو، کھاتے، پینے، اٹھنے، بیٹھنے اور ہر کام میں احکام خداوندی کا خیال رکھو۔

۲۰۔۔۔ احتیاج سے جو بچے بچانے میں ہرج نہیں ہے مگر بھروسہ اس ذخیرے پر نہ ہو خدا پر ہو۔

۲۱۔۔۔ اچھے اخلاق اور جوانمردی سے آدمی واقعی انسان بنتا ہے۔

۲۲۔۔۔ لوگ وصالِ حق سے اس لئے محروم رہتے ہیں۔ کہ انھوں نے دنیا نے دول کو اپنا مقصود بنا رکھا ہے۔

۲۳۔۔۔ علمائے دین کی خدمت کرنے میں پیش پیش رہو کیونکہ آنحضرتؐ نے انھیں "وارثانِ انبیاؑ" کہا ہے۔

۲۴۔۔۔ جس نے علم اور علما کو چاہا اس نے زندگی بے خطا گزاری۔

Marfat.com

۲۵ــــ بے وقوف کی صحبت آدمی کو خدا سے دور کردیتی ہے۔

۲۶ــــ سماع و رقص کرنے والوں کی محفل میں نہ جاؤ کیونکہ یہ لوگ دل کی صلاحیت کو خراب کردیتے ہیں۔

۲۷ــــ اجازت و رعایت سے استفادہ نہ کرو تاکہ صاحبِ عزم بنو، رعایات سے مستفید ہونا کمزوروں کا شیوہ ہے۔

۲۸ــــ اخلاص کی دولت کبھی رد نہیں ہوتی۔ یاد رکھو اخلاص کے ساتھ معمولی عمل اللہ تعالےٰ کی نظر میں بہت ہے اور بے اخلاص اعمال کا طومار کسی کام کا نہیں۔

۲۹ــــ اپنے عمل پر ناز نہ کر عالمِ آخرت میں اس عمل کے باوزن اور مقبول ہونے کی فکر کر تجھے سوچنا چاہئیے کہ عالمِ دنیا سے کہاں جائے گا۔ اور اس بات کی فکر کر کہ وہاں شرمندگی و حسرت نہ اٹھانی پڑے۔

Marfat.com

شاہ حسین حقیقت

نام حقیقت کے نام کے بارے میں ادبی تذکروں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ مصحفی نے تذکرہ ہندی[1] میں ان کا نام "میر شاہ حسین المتخلص بہ حقیقت لکھا ہے" دیگر تذکرہ نگاروں، قدرت اللہ قاسم[2]، عبدالغفور خاں نساخ[3]۔ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ[4]، سید حسن علیخاں[5]، نصراللہ خاں خویشگی[6]، اشپرنگر[7]، خوب چند ذکا[8]، قطب الدین باطن[9]، شاہ محمد کمال[10] اور اعظم الدولہ سرور اور سعادت خاں ناصر[12] نے ان کا نام شاہ حسین ہی تحریر کیا تھا۔

حقیقت کی تصانیف، مثنوی ہشت گلزار[13] (جو دراصل شاہ بہرام گور کا قصہ ہے اور امیر خسرو کی ہشت بہشت کا آزاد ترجمہ ہے) بیراں طوطا[14]، اور جذب عشق[15] میں بھی ان کا نام شاہ حسین ہی لکھا ہوا ہے البتہ حقیقت کی دوسری تصانیف صنم کدہ چین[16]، خزینۃ الامثال[17]، تحفۃ النجم[18] اور ان کے دیوان[19] میں ان کا نام سید حسین شاہ تحریر ہے، میر محسن لکھنوی نے جو حقیقت کے بیٹے ہیں اپنے تذکرے سراپا سخن[20] میں کہیں ان کا نام شاہ حسین اور کہیں حسین شاہ لکھا ہے۔

حقیقت کے بڑے بھائی سید حسن شاہ ضبط کے فارسی ناول "نشتر"[21] میں بھی ان کا نام شاہ حسین تحریر

۱۔ تذکرہ ہندی از مصحفی ص ۸۶ ۲۔ مجموعہ نغز فارسی ص ۲۱۹-۲۲ مرتبہ حافظ محمود شیرانی لکچرار پنجاب یونیورسٹی مطبوعہ ۱۹۲۲
۳۔ سخن شعرا اردو ص ۱۳۶ ۴۔ گلشن بے خار فارسی ص ۶۱ ۵۔ بزم سخن فارسی ص ۴۲ ۶۔ گلشن بہار (تذکرہ شعرائے اردو) ص ۱۱۸، ۱۱۹ مرتبہ ڈاکٹر اسلم فرخی مطبوعہ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی ۷۔ یادگار شعرا اردو ترجمہ از طفیل احمد مطبوعہ ہندوستان اکیڈمی صوبہ متحدہ الہ آباد ۱۹۴۳
۸۔ تذکرہ عیار الشعرا یہ تذکرہ فوٹو اسٹیٹ کی صورت میں انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی کی ملکیت ہے ۹۔ گلستان بے خزاں (تذکرہ باطن) ص ۲۳۰ ۱۰۔ مجمع الانتخاب ص ۲۸ تلخیص و مقدمہ خواجہ نثار احمد فاروقی ۱۱۔ عمدہ منتخبہ ص ۲۳۰ ۱۲۔ خوش معرکہ زیبا جلد اول مرتبہ مشفق خواجہ مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور ص ۱۷ ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹ ان تصانیف کے سرورق ۲۰۔ تذکرہ سراپا سخن ص ۲۴، ۲۵، ۲۰، ۱۳۶، ۲۶۷ ۲۱۔ نشتر مرتبہ سید حسن شاہ ضبط اردو ترجمہ منشی سجاد حسین انجم کسمنڈوی تعارف عشرت رحمانی مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور۔

Marfat.com

ہے۔مفتی ولی اللہ فرخ آبادی[۲۲] نے اپنی تاریخ میں ان کا نام حسین شاہ حقیقت ہی لکھا ہے۔

آصفیہ جلد اول[۲۳] اور ارباب سخن[۲۴] میں بھی ان کا نام میر شاہ حسین ہی تحریر ہے۔

حقیقت[۱] نے ایک جگہ رباعی میں اپنا نام میر حسین شاہ بتایا ہے۔

پھرتا ہے جو یوں تباہ کیا تجھکو ہوا　　ہے کس سے جدا تو آہ کیا تجھکو ہوا

جو دیکھے ہے تیری شکل رو دیتا ہے　　میر حسین شاہ کیا تجھکو ہوا!

پروفیسر لطیف حسین کا یہ کہنا درست ہے کہ

"اگر حقیقت کے اہل خاندان کے ناموں کی ترکیب کو دیکھا جائے تو اس نتیجے پر پہنچنے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی کہ ان کا نام سید حسین شاہ ہی تھا کیونکہ ان کے دادا کا نام میر کرک شاہ تھا۔ والد کا نام عرب شاہ، تایا و چچا کا نام سید محمد شاہ، سید اشرف شاہ، سید میر محمد شاہ، حقیقت کے بڑے بھائی کا نام سید حسن شاہ تھا، اور چھوٹے بھائی کا نام سید قاسم شاہ تھا۔ وہ خود منجھلے بھائی تھے[۲]۔"

حقیقت کے اجداد

سید حسن شاہ ضبط نے اپنے ناول نشتر کے دیباچے میں لکھا ہے کہ وہ حضرت سید عبداللہ ملقب بہ مظلوم کی اولاد میں سے ہیں جن کا سلسلۂ نسب گیارہ واسطوں سے حضرت سید الشہدا امام حسین علیہ السلام سبط رسول مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے[۱]۔ عبداللہ ملقب بہ مظلوم ہی کے خاندان میں آگے چل کر حضرت سید امیر کلال پیدا ہوئے جن کا تفصیلی تذکرہ ہم باب اول میں کر چکے ہیں۔ سید حسن شاہ نے لکھا ہے۔

"حضرت سید عبداللہ ملقب بہ مظلوم جن کا سلسلہ گیارہ واسطوں سے حضرت سید الشہدا حضرت امام حسین علیہ السلام سبط رسول مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے اپنے والد حضرت ابراہیم رضا کے

۲۲۔ تاریخ فرخ آباد مولفہ مفتی ولی اللہ مترجمہ حکیم شریف الزماں اکبر آبادی صفحہ ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹ (۲۳) مرتبہ نعیم الدین ہاشمی ص ۱۲۵

۲۴۔ حسرت موہانی طبع اول سنہ ۱۹۲۹ء صفحہ ۲۸۶ (۱) نشتر از سید شاہ ضبط اردو ترجمہ از منشی سجاد حسین ایم کسمنڈوی مرتبہ عشرت رحمانی ص ۱۲۔ تعارف دیوان حقیقت از افسر امروہوی مطبوعہ قومی زبان کراچی سال ۱۹۶۲ ص ۱۴ (۲) شاہ حسین حقیقت از پروفیسر لطیف حسین ادیب مطبوعہ معارف نمبر ۱ جلد ۱۰۲۔ جولائی ۱۹۶۸ ص ۵۱ (۳) نشتر ص ۶ (اردو ترجمہ) منشی سجاد حسین کسمنڈوی مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور

Marfat.com

کے سامنے خلفائے بنو عباس کے جور و جفا سے حدود بلخ میں مخفی سکونت پذیر تھے۔ شدت ظلم اعدا کی وجہ سے مع تبرکات شریفہ جو نسلاً بعد نسل چلے آتے تھے بعد شہادت ولد بزرگوار مع چند ہمراہیاں حدود ترکستان میں پہنچے۔ اور اقامت اختیار کی۔ ان کی اولاد سے جناب سید السادات قطب انام حضرت سید امیر کلال عرف امیر کلال رحمۃ اللہ علیہ کا شہرہ عام ہوا حتیٰ کہ صاحبقراں امیر تیمور گورگان کو آپ نے اپنا پسر خواندہ فرمایا اور بشارت سلطنت ہفت کشور کی دی۔[۱]"

مذکورہ بالا بیان میں سید حسن شاہ نے اپنے اجداد کو اول اول حدود بلخ میں مخفی طور پر سکونت پذیر بتایا ہے۔ اور بعد میں ان کا حدود ترکستان میں وارد ہونا بیان کیا ہے۔ لیکن بعض تاریخی روایتوں کے بموجب، حضرت امیر کلال کے خاندان کے بزرگ جو خلفائے بنو عباس کے ظلم و ستم سے محفوظ رہنے کے لئے حدود یمن میں سکونت پذیر ہوئے تھے۔ وہاں سے ترک وطن کرکے ترکستان چلے گئے۔[۲] بلخ ترکستان کا ہی ایک حصہ ہے۔

حقیقت کے اجداد کا وطن

حقیقت کے اجداد کے وطن کے بارے میں بھی مختلف تذکرہ نویسوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

تذکرہ مصحفی میں انہیں بلخی الاصل بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ مصحفی لکھتے ہیں۔

" وطن اجدادش بلخ و خوست است۔[۱] "

اس کے علاوہ عیار الشعراء (قلمی نسخہ[۲]) گلشن بے خار،[۳] گلشن ہمیشہ بہار،[۴]

۱:۔ نشتر۔ اردو ترجمہ از منشی سجاد حسین انجم کسمنڈوی مرتبہ عشرت رحمانی مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور ص۱۶۴ لا در مترجم) ۲:۔ تاریخ سیاسیات عرب (مسلمانوں کی سیاسی تاریخ) جلد دوم مصنفہ ڈاکٹر حسن ابراہیم ایم اے پی ایچ ڈی۔ اردو ترجمہ از علیم اللہ صدیقی مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور۔ (۳) تذکرہ ہندی از مصحفی ص۸۶ (۱) خوب چند ذکا زبان فارسی ص۱۴۷ مخطوط مخزونہ انڈیا آفس لندن فوٹو اسٹیٹ مملوکہ انجمن ترقی اردو۔ (۲) مصطفٰے خاں شیفتہ ص۶۱ (۳) نصر اللہ خاں خویشگی ص۱۱۷-۱۱۸ (۴) سید حسن علیخاں ص۲۴

Marfat.com

گلستان بے خزاں[5]، نسخہ دلکشا[6]، یادگار شعرا[7]، نزہۃ الخواطر[8]، عمدہ منتخبہ[9] میں بھی حقیقت کو بلخی الاصل بتایا گیا ہے۔

محسن لکھنوی نے اپنے تذکرے سراپا سخن میں لکھا ہے کہ ان کے اجداد نے عربستان سے آکر خوست میں توطن اختیار کیا۔ تاریخ فرخ آباد[10]، جلوۂ خضر[11]، ارباب سخن[12]، شمیم سخن[13] میں بھی حقیقت کا وطن خوست ہی لکھا گیا ہے۔

حقیقت کے والد نے حکیم میر محمد نواز کی لڑکی سے عقد کیا تھا۔ اور حکیم صاحب موصوف چونکہ حقیقت کے نانا تھے اور بلخی الاصل تھے۔ لہٰذا اکثر تذکرہ نویسوں نے بلا کسی تحقیق کے حقیقت کو بھی بلخی الاصل لکھ دیا۔

حقیقت کے اجداد کا ورود ہندوستان

حقیقت کے اجداد کے ورود ہندوستان کے بارے میں دو[2] بیانات ملتے ہیں۔ صنم کدۂ چیں میں حقیقت لکھتے ہیں کہ اول ان کے بزرگ عرب سے شاہ جہاں آباد آئے۔ معلوم نہیں حقیقت نے اپنے اجداد کو براہ راست عرب سے شاہ جہاں آباد میں وارد کیوں بتایا ہے اور ترکستان میں ان کے توطن کا تذکرہ کیوں نہیں کیا۔ بظاہر یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے کہ انھیں اپنے آبا و اجداد کے ان تاریخی حالات سے کماحقہٗ واقفیت نہ ہو۔ جبکہ ان کے بڑے بھائی سید حسن شاہ ضبط کی تصنیف میں اس کا تذکرہ بھی موجود ہے۔ ممکن ہے حقیقت نے شعوری طور پر ایسا کیا ہو اور اپنے خاندان کی نقل مکانی کی طول طویل داستان کو بیان کرنا مناسب نہ سمجھتے ہوئے اختصار سے کام لیا ہو۔

۵۔ قطب الدین باطن ص ۲۲ (۶) باب الغفار ص ۱۵ مطبوعہ نسخہ ص ۸۸ (۷) اشپرنگر ص ۷۶ (۸) قدرت اللہ قاسم ص ۲۱۹-۲۲۰ (۹) اعظم الدولہ سرور ص ۲۲۷ (۱۰) مفتی ولی اللہ فرخ آبادی ص ۲۷۷-۲۷۸-۲۷۹

۱۱۔ جلد پنجم ص ۱۳۶ (۱۲) حسرت موہانی طبع اول ۱۹۲۹ء ص ۲۸۷ (۱۳) ص ۲۰۲، ۲۰۵ (۱) صنم کدۂ چیں ص ۲۲ مصنفہ شاہ حسین حقیقت، مطبوعہ مطبع مجتبائی لکھنؤ (۲)

محسن لکھنوی کا بیان ہے:۔

" سید امیر کلال کی اولاد میں سے سید امیر برہان حسب الطلب فرخ سیر معہ تحائف خاندانی لاہور پہنچے، اور وہاں سے حقیقت کے دادا سید میرک شاہ بہ عہد۔ شاہ عالم دلی آئے۔"[1]

شاہ حسن ضبط کے بیان سے اس سلسلے میں کافی روشنی پڑتی ہے۔

" تا آنکہ نوبت سجادگی حضرت حاجی الحرمین سید میرک شاہ رحمۃ اللہ علیہ جد بزرگوار کاتب الحروف کو پہنچی، اور بموجب بشارت از ارواح طیبات بزرگان مع چند تبرکات شریفہ عازم ہندستان ہوئے ۱۱۲۵ھ میں بیس قرابت داران کے ساتھ داخل کابل ہوئے صوبہ دار کابل کی استدعا سے چند مہینے اقامت کر کے بقصد شاہجہان آباد وارد لاہور ہوئے اور بوجہ اصرار عقیدت منداں شاہ جہاں آباد کا قصد ملتوی فرمایا۔ صرف ایک شخص مسمی گدا شاہ اپنے ہمراہی کو فرخ سیر بادشاہ ہندوستان کے پاس روانہ کیا۔ مگر سادات بارہہ کے تسلط اور غلو سے ملاقات نہ ہو سکی۔ سید موصوف کی معاودت بادشاہ کا بعد ہلنے کے مطلع ہونا۔ عذر خواہی کے ساتھ نذر و نیاز کا اپنے خواص خاص کے ساتھ جناب حاجی صاحب کی خدمت میں بھیجنا اور متمنی تشریف آوری حضرت موصوف ہونا بموجب بشارت روح بزرگان جناب سید حقانی متوطن قصبہ بندگی متعلقہ چکلہ کوڑہ جہاں آباد کی صاحبزادی سے نکاح کیا۔ اور صرف ایک بار محمد شاہ بادشاہ کے عہد سلطنت میں شاہ جہاں آباد کو تشریف لے گئے ورنہ ہمیشہ اطراف لاہور اور سرہند میں بسر فرمائی، اور ایک عالم کو فیوض باطنی سے سرفراز فرمایا۔"[2]

سید حسن شاہ ضبط کے اس بیان سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ سید میرک شاہ نے ۱۱۲۵ھ

۱۔ محسن لکھنوی۔ دیباچہ تذکرہ سراپا سخن مطبوعہ مطبع مجتبائی لکھنؤ۔ (۲) تشریحات ۷ اردو ترجمہ منشی سجاد حسین انجم کسمنڈوی مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور۔

Marfat.com

بطابق ۱۴۲-۱۷۱۳ء کے اوائل میں ترکستان سے رخت سفر باندھا ہوگا۔ اور کابل پہنچے ہوں گے جہاں سے وہ لاہور وارد ہوئے۔ یہ زمانہ جیسا کہ ضبط نے لکھا ہے۔

فرخ سیر کا زمانہ تھا۔ فرخ سیر ۱۷۱۳ء سے ۱۷۱۹ء تک سریر آرائے سلطنت رہا۔ گویا اسی زمانے میں حقیقت کے دادا سید میرک شاہ لاہور پہنچ چکے تھے۔ سید میرک شاہ اپنے زمانے کے نامور بزرگ تھے۔ امرأ و وزرا کو بطور خاص صوفیا اور بزرگان دین سے عقیدت وارادت ہوتی ہے۔ حسن عقیدت کے علاوہ عین ممکن ہے کہ صوبیدار لاہور نے اس لئے بھی ان کے قیام لاہور پر اصرار کیا ہو کہ وہ امیر تیمور کے مرشد کے خاندان کے ایک فرد تھے۔ سادات بارہہ نے ان کی فرخ سیر سے ملاقات نہ ہونے دی۔ اس میں سادات بارہہ کی سیاسی مصلحتوں کو دخل ہوگا۔ اور سادات بارہہ نے دربار میں ان کے اثر و رسوخ کو اپنے لئے خطرناک سمجھتے ہوئے رکاوٹیں کھڑی کی ہوں گی۔

گویا حقیقت کے دادا جس وقت ہندوستان پہنچے تو مغلیہ سلطنت پر جانکنی کا عالم تھا اور آل تیمور کی بے سروسامانی، عبرت کا مرقع پیش کر رہی تھی۔ سید میرک شاہ کے لاہور کے قیام کے دوران ہی سادات بارہہ کے ہاتھوں فرخ سیر کا قتل ہوا جس کی صدائے بازگشت ہندوستان کے طول و عرض میں سنی گئی۔ بیدل کا ایک مصرعہ اسی جانب اشارہ کرتا ہے ؎

سادات بوئے نمک حرامی کردند

سادات بارہہ نے فرخ سیر کے قتل کے بعد شہزادہ رفیع الدولہ کو قید خانے سے نکال کر محمد شاہ کے لقب سے تخت سلطنت پر بٹھایا۔ اس کے دور میں اہل دہلی کو اور خاندان مغلیہ کو سادات بارہہ کے ظلم و ستم سے نجات ملی۔ سید میرک شاہ بھی محمد شاہ کے عہد حکومت میں ایک بار شاہجہاں آباد تشریف لے گئے۔ گو سید حسن شاہ ضبط، سید شاہ حسین حقیقت اور محسن لکھنوی کے بیانات میں اختلاف پایا جاتا ہے لیکن سید میرک شاہ کے سفر دہلی کے بارے میں یہ حسن شاہ ضبط کا بیان ہی

Marfat.com

صحیح معلوم ہوتا ہے۔

سید میرک شاہ ہمیشہ لاہور و سرہند اور اس کے اطراف و جوانب میں ہی قیام پذیر رہے البتہ ان کے انتقال کے بعد ان کی اولاد شمالی ہند کے اندرونی علاقوں میں پھیل گئی۔ اس سلسلے میں بھی شاہ حسین حقیقت، اور شاہ حسن ضبط کے بیانات میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ حقیقت نے صنم کدۂ چین میں لکھا ہے کہ ان کے اجداد ہندوستان پہنچ کر کٹھیر میں متوطن ہوئے جو موجودہ روہیل کھنڈ کی حدود میں شامل ہے اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ ان کے اجداد کا تعلق بلخ و خوست سے تھا اور وہ خود (حقیقت) بریلی میں پیدا ہوئے۔

حقیقت کے بزرگوں کی بریلی میں آمد کے بارے میں زیادہ تفصیلی اور بنیادی معلومات ہمیں شاہ حسن ضبط سے ہی ملتی ہیں۔ ضبط نے اپنے ناول نشتر میں لکھا ہے۔

"حاجی صاحب موصوف (یعنی سید میرک شاہ) کے چار بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں سید محمد شاہ، سید اشرف شاہ، سید عرب شاہ والد مصنف، سید محمد میر شاہ، مگر ان چاروں صاحبزادے نے مناصب شاہی اختیار کر لئے تھے اور نفع کثیر خلق اللہ کو پہنچایا بالجملہ بعد انتقال حاجی صاحب (یعنی سید میرک شاہ) اور دست برد نادر شاہ اصفہانی و احمد شاہ درانی اور تغیر سلطنت گورگانی، نواب نجیب خاں چچا صاحب کو اپنے ہمراہ شاہ جہاں آباد میں لایا۔ اور عموے موصوف نے بعد چندے نجیب آباد اور مدینہ و عام پور میں اقامت اختیار کی اور وہیں انتقال فرمایا میرے والد ماجد (یعنی سید عرب شاہ) سکھوں کی زبردستیوں سے تنگ آکر آخر کار بریلی میں تشریف لائے اور وہیں شادی بھی کی۔[۲]

ضبط کے اس بیان سے جن باتوں کی تصدیق ہوتی ہے۔ ان میں سے ایک تو یہ ہے کہ سید میرک شاہ ہمیشہ لاہور و سرہند کے اطراف میں مقیم رہے۔ دوم یہ کہ ان کے ایک لڑکے نے، جو حقیقت

(۱) تذکرہ ہندی ص ۸۲ مصحفی (۲) نشتر از حسن شاہ ضبط ص ۴ مترجمہ منشی سجاد حسین کسمنڈوی طبع مجلس ترقی ادب لاہور۔

Marfat.com

کے چچا بھی تھے۔ بادشاہی ملازمت اختیار کرلی تھی۔ اور یہ کہ وہ نادر شاہ و احمد شاہ کے حملوں کے وقت دربار شاہی سے وابستہ تھے۔ جہاں ان کے روابط نواب نجیب خاں سے ہوئے جس نے لال قلعے کو مرہٹوں کے قبضے سے پاک کیا تھا اور بادشاہ کو ان سے رہائی دلائی تھی۔ البتہ سید میر محمد شاہ کے بھائی یعنی حقیقت کے والد سید عرب شاہ کے بارے میں یہ پتہ نہیں چلتا کہ وہ خود کس سال لاہور و سرہند وغیرہ کی اقامت ترک کرکے نگینہ دھام پور، نجیب آباد وغیرہ میں پہنچ کر اقامت گزیں ہوئے تھے۔ بہرحال جب دہلی کی مرکزیت، انتشار کا شکار ہوگئی اور پنجاب میں سکھوں کی شورش نے سر اٹھایا تو مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ ہو جانے کے سبب، سید عرب شاہ بھی آنولہ بریلی پہنچے ہوں گے جہاں (روہیل کھنڈ) میں پٹھانوں نے چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم کرلی تھیں۔

سید عرب شاہ کے بارے میں یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ ان کی بریلی میں آمد کا زمانہ ۱۷۶۱ء کے بعد کا ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انھوں نے اطراف لاہور و سرہند کی جائے سکونت ترک کرنے کے بعد دہلی کا رخ کیوں نہ کیا جہاں تیمور کے روحانی پیشوا کے خاندان کا ایک فرد ہونے کے سبب ان کی زیادہ آؤ بھگت ہوتی۔ اور بہتر ذریعہ معاش پیدا ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہیں کہ چونکہ اس زمانے میں دہلی کی مرکزیت اور سیاسی قوت ختم ہو چکی تھی اور مرہٹوں نے تخت دہلی پر قبضہ کرکے بادشاہ کو بے یار و مددگار بنا دیا تھا اور نجیب الدولہ جس نے بادشاہ کو اس فتنے سے نجات دلائی تھی ایک نئی قوت بن کر ابھرا تھا۔ دوسرے اس زمانے میں ابدالی اور مرہٹوں کے درمیان جنگ ہو رہی تھی اور شمالی ہند کے لوگ دہلی کو امن و امان کی جگہ نہ پاتے ہوئے پورب کی جانب سفر کر رہے تھے چنانچہ اگر سید عرب شاہ بھی دہلی سے دور آنولہ بریلی روہیل کھنڈ میں پہنچے تو اس کی ایک وجہ تو مذکورہ بالا واقعات ہی تھے۔ دوسری اہم وجہ یہ رہی ہوگی کہ ان کے ایک بھائی نجیب الدولہ کی سرکار سے وابستہ ہو کر نگینہ دھام پور میں رہائش اختیار کر چکے تھے۔

Marfat.com

سید عرب شاہ کی شادی | حقیقت کے والد سید عرب شاہ نے آنولہ بریلی میں حکیم میر محمد نواز کی دختر سے شادی کی۔ حکیم میر محمد نواز نجیب الطرفین تھے ان کے اجداد بلخ کے رہنے والے تھے جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے اس سبب سے شاید حقیقت کو اکثر تذکرہ نگاروں نے بلخی الاصل لکھا ہے حکیم میر محمد نواز کے بارے میں سید حسن شاہ ضبط لکھتے ہیں۔[1]

"میرے نانا صاحب قبلہ حکیم میر محمد نواز حضرت سید عطا موسوی کی اولاد ہیں۔ اور علم و فضل خصوصاً طب و حکمت میں یگانۂ وقت و فرید دہر کہنا چاہیئے۔ آپ کے والد شاہ مینا محمد شاہ بادشاہ کے وقت میں بلخ سے شاہ جہاں آباد کو تشریف لائے اور منصب داران شاہی میں شامل ہوئے۔ وہیں شادی بھی کی ۱۱۸۴ھ میں جب کہ والد مرحوم کی شادی ہوئی اس وقت حکیم صاحب موصوف نواب عنایت اللہ خاں پسر حافظ الملک حافظ رحمت خاں کی سرکار میں ملازم با امتیاز تھے اور شہر بریلی میں اقامت گزیں۔"

حقیقت کی پیدائش | حقیقت کے بڑے بھائی حسن شاہ ضبط کی ولادت شادی کے ایک سال بعد ہوئی۔ چنانچہ ضبط لکھتے ہیں۔

"۱۱۸۴ھ میں میری ولادت ہوئی اور دو چھوٹے بھائی بھی اسی شہر میں پیدا ہوئے ۱۱۹۴ھ میں جناب والد مغفور نے انتقال فرمایا۔ اور دونوں چھوٹے بھائی سید حسین شاہ و سید قاسم شاہ سلمہا بجناب نانا صاحب قبلہ کے زیر تعلیم و تربیت اسی شہر میں رہے اور جو کچھ پڑھا لکھا ان ہی کی مزید شفقت کا نتیجہ ہے۔"[2]

۱:۔ نشتر ص۳ مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور۔

۲:۔ نشتر ص۳ " " " "

Marfat.com

حقیقت کانپور میں | تقریباً چودہ برس کی عمر میں شاہ حسین حقیقت، اپنے بھائی حسن شاہ ضبط اور حکیم سید میر محمد نواز کے پاس بریلی سے کانپور پہنچے

۲۳ اپریل ۱۷۷۴ء کو ایسٹ انڈیا کمپنی اور شاہ شجاع الدولہ کی مشترکہ افواج نے حافظ الملک نواب حافظ رحمت خاں کو شکست دے دی جس کے بعد روہیل کھنڈ میں روہیلوں کے اقتدار کا آفتاب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔ اس شکست کے نتیجے میں بریلی تباہ و برباد ہو گئی اور وہاں کے باشندوں نے اپنی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کی خاطر بریلی سے رخت سفر باندھا۔

ڈاکٹر لطیف حسین ادیب اس سلسلے میں لکھتے ہیں۔

" ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حکیم میر محمد نواز نے اپنے داماد سید عرب شاہ کی وفات ۸۱-۱۷۸۰ء ۱۱۹۰ھ کے چند سال بعد بریلی سے سفر کیا۔ وہ بریلی سے کانپور پہنچے اور منگ صاحب کی سرکار میں عہدہ منشی گری پر مامور ہو گئے[۱] "

حافظ رحمت خاں کو ۱۷۷۴ء میں شکست ہوئی تھی جس کے بعد بریلی تباہ و برباد ہوئی۔ لیکن ۱۷۸۰ء تک یعنی آئندہ چھ برس تک حکیم میر محمد نواز بریلی میں ہی سکونت پذیر رہے اور اس کے بعد کانپور پہنچے جہاں امن و امان کی فضا تھی۔ کانپور میں حکیم صاحب موصوف، منگ صاحب کی سرکار سے بعہدہ منشی گری وابستہ ہو گئے۔

ہر چند کہ حکیم صاحب موصوف انگریزوں کے جانی دشمن، حافظ رحمت خاں اور ان کے بیٹے کی ملازمت میں رہ چکے تھے لیکن ان کے علم و فضل کے سبب انگریزوں نے ان کی قدر و منزلت کی۔ منگ صاحب بقول حسن شاہ ضبط ایک شریف اور عالی نسب انگریز تھا اور جنرل کوٹ کا ہمشیرہ زادہ تھا۔ خود جنرل کوٹ بھی ایک عالی مرتبت انگریز تھا[۲]۔ شاہ حسن ضبط کے بیان سے معلوم

۱۔ میر شاہ حسین حقیقت از لطیف حسین ادیب ص ۵۶ مطبوعہ معارف نمبر ۱ جلد ۱۰۲ ماہ جولائی ۱۹۶۸ء

۲۔ نشتر عشق ۹ مترجمہ منشی سجاد حسین انجم کسمنڈوی مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور۔

Marfat.com

ہوتا ہے کہ مسٹر منگ نے حکیم میر محمد نواز کا تقرر اپنے خانگی منشی کی حیثیت سے کیا تھا اور ان سے پڑھتا بھی تھا۔ غالباً فارسی، عربی اور ہندوستانی (اردو) زبانیں پڑھتا ہوگا جس کی تحصیل کا شوق اس زمانے کے اکثر انگریزوں کو ہوا کرتا تھا۔ درس و تدریس کا یہ سلسلہ مسٹر منگ کے کانپور کے زمانہ قیام کے اولین دور میں جاری رہا[1]۔ منگ صاحب جب کلکتہ سے دوبارہ کانپور میں آئے اور کرنل ہملیڈی صاحب کمانڈنگ آفیسر سے زیادہ رسم و راہ اور محبت کا اتفاق ہوا اور پڑھنا چھوڑ دیا۔

سید حسن شاہ ضبط نے منگ صاحب کے ہاں اپنے سلسلۂ ملازمت کا ذکر کرتے ہوئے اپنی عمر پندرہ، سولہ سال بیان کی ہے اس حساب سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ۱۲۰۰ھ مطابق ۸۶-۱۷۸۵ء میں حکیم میر محمد نواز اور سید حسن شاہ ضبط کانپور میں رہائش اختیار کر چکے تھے۔ سید حسن شاہ منگ صاحب کے خانگی، روپے پیسے کے حساب و کتاب کی خدمت پر مامور ہوئے تھے۔ حکیم میر محمد نواز نے فکر معاش سے آزاد ہو کر اپنے متعلقین کو قصبہ جاج مئو (کانپور) میں بلوا لیا تھا گویا اس طرح ۱۷۸۵ء میں حقیقت، بریلی سے کانپور پہنچے۔ اس وقت حقیقت کی عمر تیرہ برس تھی۔ سید حسن شاہ ضبط مسٹر منگ سے ملازمانہ تعلق پیدا ہونے کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"صاحب نے نانا صاحب سے ذکر کیا کہ مجھے بوجہ عدیم الفرصتی اپنا خانگی کاروبار حساب و کتاب لکھنے کی مہلت نہیں ملتی اور اکثر میرا روپیہ مفت تلف ہوتا ہے اگر آپ اس کام کو بوجہ اس کے کہ کوئی دوسرا کام آپ کے ذمے نہیں ہے، دیکھ بھال کریں تو بہتر ہے نانا صاحب نے انکار کیا اور کہا اگر حسن شاہ اس کام کو قبول کرے گا تو آپ کی غایت پوری ہو سکتی ہے چنانچہ منگ صاحب نے مجھ کو بلا کے اصرار کیا اور میں نے بعد چند شروط کے اس کو قبول کر لیا[2]۔"

اپنے نانا کے ترک خدمت اور حقیقت کی کانپور میں رہائش کے بارے میں سید حسن شاہ ضبط

۱۔ نشتر ص ۹ مرتبہ منشی سجاد حسین انجم کسمنڈوی مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور۔
۲۔ نشتر ص ۱۲

Marfat.com

آگے لکھتے ہیں "میری عمر اس زمانے میں پندرہ سولہ برس کی تھی اور نانا صاحب نے بریلی سے متعلقین کو بلوا کر قصبہ جاج مئو میں جو کانپور سے دو کوس پورب کی طرف ہے سکونت کر لی تھی اور چونکہ کوئی تعلق خدمت باقی نہیں رہا تھا اکثر خانہ نشین رہتے تھے۔ میں اور میرا چھوٹا بھائی میر حسین شاہ اور چچازاد بھائی میر محمد یوسف مع بعض قرابت داروں کے کیمپ میں رہتے تھے[1]۔

حقیقت لکھنؤ میں

حقیقت قصبہ جاج مئو (کانپور) میں تھوڑا عرصہ قیام کرنے کے بعد لکھنؤ پہنچے۔ مختلف تذکروں میں ان کے کانپور سے آنے یا بریلی میں پیدا ہونے اور لکھنؤ میں آنے کے بارے میں تو ذکر ملتا ہے لیکن لکھنؤ میں ان کی آمد کے صحیح سنہ کے بارے میں کچھ پتہ نہیں چلتا۔ ہم مختلف تذکروں کے حوالے یہاں پیش کرتے ہیں۔

عیار الشعرا میں لکھا ہے۔

"وہ (حقیقت) بریلی میں پیدا ہوئے۔ اور لکھنؤ میں رہے۔[2]"

تذکرہ گلشن بے خار میں تحریر ہے:۔

"وہ (حقیقت) بریلی میں پیدا ہوئے لیکن نشو و نما لکھنؤ میں پائی[3]۔"

تذکرہ سراپا سخن میں لکھا ہے۔

"میر شاہ حسین اپنے نانا حکیم میر محمد نواز کے ہمراہ لکھنؤ آئے[4]۔"

مصحفی تذکرہ ہندی میں لکھتے ہیں۔ "لکھنؤ میں سن تمیز کو پہنچے[5]۔"

اس کے علاوہ حقیقت فرخ آباد بھی آتے جاتے رہتے تھے۔ چنانچہ مفتی اللہ فرخ آبادی لکھتے ہیں "شاہ جہاں آباد کے بزرگ زادے اور حکیم میر محمد نواز کے بھانجے ہیں۔ فرخ آباد میں آنے کے

---

(۱) نثر ص۵ مترجمہ منشی سجاد حسین انجم کسمنڈوی مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور (۲) عیار الشعرا ص۲۴۲ (۳) ص۱۶۱ (۴) ص۶ (۵) ص۸۴

موقع پر اکثر راقم کے پاس تشریف لاتے تھے۔[1]

حقیقت لکھنؤ میں کس سن میں پہنچے اس کا تعین کرتے ہوئے ڈاکٹر لطیف حسین ادیب اپنے مضمون[2] میں لکھتے ہیں۔

"حقیقت کانپور سے لکھنؤ پہنچے، مصحفی نے لکھا ہے۔ "دریں لکھنؤ بہ سن تمیز رسیدہ" (تذکرہ ہندی ص۸۶) حقیقت ۱۲۰۰ھ (مطابق ۸۶-۱۷۸۵ء) میں کانپور میں تھے۔ اس وقت ان کی عمر تیرہ سال تھی۔ مصحفی نے تذکرہ ہندی ۱۲۰۱ھ مطابق ۱۷۸۶ء عیسوی سے قبل لکھنا شروع کیا تھا۔ سردست اگر یہ مان لیا جائے کہ انھوں نے حقیقت کا حال ۱۲۰۱ھ یا اس کے ایک ڈیڑھ سال بعد قلم بند کیا تو حقیقت چودہ پندرہ سال کی عمر میں لکھنؤ پہنچے۔[3]

جرأت کی شاگردی

لکھنؤ میں شاہ حسین حقیقت نے اس عہد کے نامور شاعر جرأت کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ بعض ناقدین کی رائے یہ ہے کہ ان کے بڑے بھائی سید حسن شاہ ضبط بھی چونکہ جرات کے شاگرد تھے۔ لہٰذا انھوں نے بھی جرات کو اپنا استاد بنایا۔ ہمارے خیال میں جرات کی شہرت و ناموری کے سبب کسی نوجوان شاعر کا ان کی طرف رجوع ہونا عین فطری ہے۔

مصحفی اس سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ "اکثر بہ کتابت ہائے غزلیات استاد خویش کہ بہ سبب کوری از نوشتن معذور است مصروف می ماند۔[4]"

ہمارے خیال میں استاد شاگرد کے تعلق کے سبب حقیقت، جرأت کی غزلوں کی کتابت کر دیا کرتے ہوں گے۔

۱۔ عہد بنگش کی سیاسی علمی تاریخ۔ مصنفہ مفتی ولی اللہ فرخ آبادی ص۴۳ (۲) میر شاہ حسین حقیقت (مطبوعہ معارف نمبر۱ جلد ۱۰۲، ماہ جولائی ۱۹۶۸ء ص۵ (۳) میر شاہ حسین حقیقت از ڈاکٹر لطیف حسین ادیب مطبوعہ معارف اعظم گڑھ ص۵ (۴) تذکرہ ہندی ص۸۶۔

حقیقت کا سلسلۂ معاش

حقیقت لکھنؤ میں اس عمر کو پہنچے کہ جب فکر معاش دامنگیر ہوتی ہے۔ تذکرہ مصحفی میں لکھا ہے کہ پہلے وہ ترک سواروں میں ملازم ہوئے اس کا مطلب یہ ہے کہ اس زمانے کے شرفا کی روایت کے مطابق وہ فن سپہ گری میں بھی کامل تھے[1]۔ قدرت اللہ قاسم کا بیان ہے کہ حقیقت معلمی کر کے بسر اوقات کیا کرتے تھے۔ صاحب تاریخ فرخ آباد[2] کے بیان کے مطابق اول ترک سواروں میں ملازم ہوئے اور جب یہ رسالہ برخواست ہوا تو جرأت کی سفارش پر امام بخش خاں کشمیری کے بچوں کی تعلیم پر ملازم ہو گئے۔ اس سے قدرت اللہ قاسم کے اس بیان کی بھی تائید ہوتی ہے کہ وہ معلمی کر کے گزر بسر کیا کرتے تھے۔

حقیقت سبزی منڈی لکھنؤ میں بھی کسی خدمت پر مامور تھے۔ چنانچہ ان کی ایک رباعی سے اس پر روشنی پڑتی ہے۔

کس منہ سے ادائے شکر ہم حق کا کریں
بندہ پرور نہ کیوں کہ پھر اس کو کہیں
یعنی ہم تھے جو عاشق سبز رنگ
خدمت بھی ملی تو سبزی منڈی کی ہمیں[3]

مصحفی کا الزام

مصحفی کی روایت کے مطابق ترک سواروں کا رسالہ برہم ہو جانے کے بعد حقیقت کی ملازمت بھی ختم ہو گئی تھی۔ اتفاق سے اسی زمانے میں امام بخش خاں کشمیری کو جو کہ پڑھا لکھا نہیں تھا ایک تذکرۂ شعرا مرتب کرنے کا

۱۔ مجموعہ نغز ص ۲۱۹ مرتبہ حافظ محمود شیرانی لکچرار پنجاب یونیورسٹی لاہور مطبوعہ ۱۹۲۳ (۲) مفتی ولی اللہ فرخ آبادی مترجمہ حکیم شریف الزماں شریف اکبرآبادی مطبوعہ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی ص ۲۷ (۳) دیوان حقیقت از افسر امروہوی مطبوعہ قومی زبان کراچی ص ۱۵ فروری ۱۹۶۲ء

خیال آیا۔ اور اس کو کسی ایسے شخص کی تلاش ہوئی جو بچوں کو تعلیم دینے کے ساتھ ساتھ اس کا تذکرہ بھی لکھ دے۔ جرات کی سفارش پر حقیقت، جو اس وقت بے روزگار تھے۔ امام بخش کشمیری کے منشی مقرر ہو گئے۔ امام بخش کشمیری نے مصحفی سے، ان کا تذکرہ ہندی عارتیاً مانگا اور اس میں شعرائے دہلی کے حالات حقیقت سے نقل کرا لئے۔

جب مصحفی نے اپنے ایک ملنے والے کے ذریعے امام بخش کشمیری کے تذکرے کا جزو اول دیکھا اور اس میں آفتاب اور آصف تخلص پایا تو وہ جرات، امام بخش کشمیری اور شاہ حسین حقیقت پر برہم ہوئے۔ اس برہمی کے سبب ان کی ہجو لکھنا چاہتے تھے مگر جب تذکرے کو بہ نظر غور دیکھا اور اس کو غیر معیاری اور پست اشعار سے بھرا ہوا پایا تو ارادہ ترک کر دیا۔ اور نظامی کے ایک شعر اور اپنا ایک قطعہ لکھنے پر اکتفا کیا۔

چنانچہ مصحفی لکھتے ہیں[1]

"تخلص آفتاب و آصف بطور تذکرۂ من درو نوشتہ است۔ بسیار برہم شدم و تفحص احوال کردم، مشار الیہ حقیقت تذکرہ نویسانیدن امام بخش خاں بگوش من رسانیدند اگرچہ مراد بلوی السنظر از حرکت ایں اصحاب ثلاثہ آزردگی کمال بہم رسیدہ بود۔ قریب بود کہ ہجو از من سر زند اما چوں بعبارت پوچ و غلطی احوال و اشعار شعرا کہ در آں جریدہ سمت تحریر یافتہ نگاہ کردم آسودہ شدم و در گزشتم و بہ ہمیں قطع طبع زاد و یک بیت مولانا نظامی اکتفا کردم۔" قطعہ

جانتے ہیں سب کہ اک مدت سے یہاں — مصحفی کے تذکرے کا شور ہے
تذکرہ یہ جو حقیقت نے لکھا — بے حقیقت مصحفی کا چور ہے

---

[1]: تذکرہ ہندی از مصحفی ص ۸۶

Marfat.com

شعر:۔ اگر بہ فردزی چو مہ صد چراغ
زخورشید باشد برو نام داغ!

مصحفی امام بخش کشمیری کے ساتھ جرأت اور حقیقت کو مجرم سمجھتے ہیں یہ درست نہیں ہے جرات و حقیقت کو اس سلسلے میں موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ حقیقت کی حیثیت ایک منشی کی سی تھی اور چونکہ وہ منشی گری اور معلمی کی خدمت پر مامور تھے۔ لہذا، امام بخش خاں کشمیری نے جو مسودہ انھیں نقل کرنے کو دیا ہوگا۔ انھوں نے اس کی نقل کر دی ہوگی۔ ڈاکٹر لطیف حسین ادیب لکھتے ہیں "اصل میں مصحفی کا دل جرات کی طرف سے صاف نہیں تھا (چنانچہ اس سلسلہ میں وہ مصحفی کے تذکرے میں سے وہ فقرہ نقل کرتے ہیں جس سے مصحفی کے دلی عناد کا پتہ چلتا ہے!! کور حوصلی کہ بجسری من بیرو در باطن ہمیشہ تخم کینہ می کارد" (تذکرہ ہندی ص۸۶) امام بخش کاشمیری اور جرات کا تو مصحفی کچھ بگاڑ نہ سکتے تھے۔ حقیقت ایک تو ابھی نوجوان تھے۔ اور ادبی حلقوں میں ان کی حیثیت زیادہ مستحکم نہیں تھی۔ لہذا مصحفی نے استاد کا غصہ شاگرد پر نکالا۔" اس سرقے کے الزام کو رد کرتے ہوئے۔ ڈاکٹر ادیب مزید لکھتے ہیں"۔ حقیقت تعلیم و تربیت کی اعلیٰ روایات کے حامل تھے۔ان پر سرقے کا الزام بے بنیاد ہے۔ اس وقت ان کی عمر چودہ پندرہ برس کی تھی۔ یہ عمر کم سے کم تذکرہ شعرا مرتب کرنے کی نہیں ہوتی۔ ان کی سب سے پہلی کتاب صنم کدۂ چین ۱۲۰۹ھ بمطابق ۱۷۹۴ء میں ضبط تحریر میں آئی جب کہ ان کی عمر بائیس برس کی تھی۔ امام بخش خاں کشمیری سے بھی ایک تذکرہ شعرا مسمی تذکرہ امام بخش کشمیری منسوب ہے۔ جو ترامی تذکرہ ہو سکتا ہے اس لئے یہ رائے بھی کہ حقیقت کا "تذکرہ اخبا" مصحفی کے خام مسودہ سے تیار کیا گیا اور جس کی بنیاد پر مصحفی نے حقیقت کو چور کہا صحیح نہیں معلوم ہوتی۔[۲]

۱۔ میر شاہ حسین حقیقت مطبوعہ رسالہ معارف اعظم گڑھ جلد ۱۰۲ مطبوعہ ماہ جولائی ۱۹۶۸ء ص۵۹
۲۔ میر شاہ حسین حقیقت " " " "

Marfat.com

قیام کلکتہ و مدراس

لکھنؤ میں حقیقت کو اتنی آسودگی بھی میسر نہ آسکی کہ وہ سفید پوشی کا بھرم رکھ سکتے لہٰذا مالی دشواریوں کے سبب، انھیں لکھنؤ کی سکونت ترک کرنی پڑی تاکہ کسی دوسری جگہ جاکر قسمت آزمائی کرسکیں۔

حقیقت بقول خود[۱] لکھنؤ سے کلکتہ پہنچے اور ریذیڈنٹ کے دفتر میں بہ عہدۂ میر منشی ان کا تقرر ہوگیا۔ کلکتہ کے بعد وہ چیناپٹن (مدراس) میں بھی اس عہدے پر فائز رہے۔ چنانچہ تذکرہ خوش معرکہ زیبا کا مصنف لکھتا ہے "القصہ سید سابق الذکر (یعنی حقیقت) سرکار نواب چیناپٹن مندراس (مدراس) میں عہدہ منشی گری میں نوکر رہے اور وہیں وفات پائی[۲]۔"

محسن لکھنوی تذکرہ سراپا سخن میں اپنے والد میر شاہ حسین حقیقت کے بارے میں لکھتے ہیں "چیناپٹن مندراس (مدراس) میں ہمراہ کٹ صاحب بہادر کے میر منشی ہو کر گئے تھے[۳]۔ لیکن صحیح نام کٹ نہیں بلکہ کِڈ ہے اور وہ کرنل کے عہدے پر فائز تھا۔ پروفیسر اقتدا حسن کٹ اور کِڈ کی صراحت اپنے مضمون میں کرتے ہوئے لکھتے ہیں "میجر جنرل شاہد حامد صاحب کے پاس جو خاندانی دستاویزات ہیں ان میں آگرہ کالج کے پروفیسر ٹامسن کا ایک خط محررہ یکم ستمبر ۱۸۹۳ بھی ہے اس میں لکھا ہے کہ شاہ حسین کرنل کِڈ[۴] (COL KYDD) کے ہمراہ میر منشی کی حیثیت سے چیناپٹن (مدراس) گئے تھے۔ وہیں ان کا انتقال ہوا۔ محسن نے کِڈ کو کٹ سمجھا ہے"

راقم الحروف نے بھی میجر جنرل سید شاہد حامد صاحب کی خاندانی دستاویزات میں شامل یہ خط دیکھا ہے۔ اس میں لفظ کِڈ ہی تحریر ہے۔

لکھنؤ سے باہر نکل کر حقیقت نے کن کن شہروں میں کتنی مدت تک قیام کیا تھا اس سلسلے میں کافی الجھاؤ ہے۔ ڈاکٹر لطیف حسین ادیب لکھتے ہیں۔

۱۔ صنم کدہ چین ص۳۲ (۲) تذکرہ خوش معرکہ زیبا جلد اول مرتبہ مشفق خواجہ ص۲۷ مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور (۳) سراپا سخن ص۵۵ (۴) مطبوعہ صحیفہ بابت ماہ جنوری ۱۹۶۸

Marfat.com

"حقیقت ۱۲۲۰ھ مطابق ۱۸۱۰ء میں کرناٹک میں تھے۔ اس وقت تک وہ بہت پریشان تھے اور انھوں نے تلاش معاش کی خاطر متعدد سفر کئے تھے۔ انھوں نے اپنی پریشانیوں کا ذکر مثنوی ہشت گلزار میں کیا۔"[۱]

حقیقت مدارس سے بہ سلسلہ تلاش معاش کرناٹک گئے۔ یہاں تذکرہ نویسوں کے اس بیان میں تضاد ملتا ہے کیونکہ مذکورہ حوالہ جات میں یہ بیان ہوا ہے کہ حقیقت کا انتقال چیناپٹن میں ہوا جہاں وہ عہدہ منشی گری پر فائز تھے یعنی انتقال کے وقت تک وہ برسرکار تھے اور اسی خدمت پر مامور تھے۔ پھر انھوں نے کرناٹک کا سفر کیوں اختیار کیا تھا؟ یہ معاملات تحقیق طلب ہیں۔ لیکن اس سلسلے میں ضروری مواد نہیں ملتا۔ ان کی مثنوی ہشت گلزار سے ان کی مالی پریشانیوں کا پتہ چلتا ہے۔ نیز یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ نواب کرناٹک کی سرکار سے بھی وابستہ ہو گئے تھے۔ مثنوی ہشت گلزار کے آغاز میں حقیقت نے عبدالقادر خاں بہادر ثابت جنگ ابن نواب والاجاہ مرحوم (نواب کرناٹک) کی مدح میں اشعار لکھے ہیں۔ ان اشعار میں انھوں نے اپنی غربت، دربدری اور عسرت و تنگدستی کا گلہ کیا ہے ؂

یعنی میں مبتلائے درد و الم — چھوڑ اپنے وطن کو اے ہمدم
دہشت بیما ہوا اور کوہ نورد — دیکھی دنیا کی خوب گرم و سرد
پورب آیا کبھی گیا پچھم! — نہ گیا لیک دل کا درد و غم
گاہ اتر پھرا گہے دکھن!! — پر کرم کے گئے نہ بدلچھن!
دیکھا پھر آکے ملک کرناٹک — کہتے دکھن کا ہیں جسے پھاٹک
گرچہ سب کچھ وہاں مہیا ہے — سیم کا اور نہ زر کا توڑا ہے!

۱۔ میر شاہ حسین حقیقت مطبوعہ معارف اعظم گڑھ ماہ جولائی ۱۹۶۸ء ص ۶۰

ایک شب گفتگو یہ دل سے تھی | لائی قسمت مجھے کہاں میری
یاں کسی سے نہیں شناسائی | یاں نہیں کوئی غیر تنہائی
کیا کروں جاؤں کس طرف کو نکل | دل کو بہلاؤں میں کہاں بیکل
گھر سے جانا کہیں نہ آنا ہے | خانہ کیا ہے کہ قید خانہ ہے
کب تلک کوہ اور بن دیکھوں | جلد پھر جا کے میں وطن دیکھوں[1]

حقیقت نے مثنوی ہشت گلزار اپنے کرناٹک کے زمانۂ قیام میں لکھی تھی۔

حقیقت کے بیان کے مطابق انھوں نے امیر خسرو کی مثنوی ہشت بہشت کا آزاد منظوم اردو ترجمہ تین ماہ میں مکمل کر لیا تھا۔ مثنوی کی تاریخ اختتام ۱۱ ربیع الاول ۱۲۲۵ھ بمطابق ۱۸۱۰-۱۱ء ہے اس زمانے میں حقیقت کرناٹک میں تھے اور گردش روزگار نے انھیں فراغت اور آسودگی میسّر نہیں آنے دی تھی۔

ڈاکٹر لطیف حسین ادیب نے حقیقت کی زندگی کے ان دس برسوں (۱۸۰۱ء تا ۱۸۱۱ء) اوران میں سپرد قلم کی جانے والی تخلیقات کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے: "خزینۃ الامثال ۱۸۰۱ء اور مثنوی ہشت گلزار ۱۸۱۱ء کے درمیان حقیقت کی کوئی تصنیف نہیں ملتی۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ سفر دکن سے پہلے (۱۸۱۰ء) حقیقت کی تصنیفات نثر میں تھیں۔ اس لئے ۱۸۰۱ء اور ۱۸۱۰ء کے درمیانی زمانے میں انھوں نے ضرور کوئی کتاب لکھی ہوگی میری دانست میں وہ کتاب تذکرۂ احبا تھی[2]۔"

ممکن ہے تذکرۂ احبا بھی انہی دس برسوں کے درمیان لکھا گیا ہو۔ لیکن پروفیسر ٹامس کے مکتوب محررہ یکم ستمبر ۱۸۹۲ء سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ حقیقت نے امیر خسرو کی مثنوی

---

(۱) مثنوی ہشت گلزار ص۹ مطبوعہ مطبع مجتبائی لکھنؤ۔ (۲) میر شاہ حسین حقیقت رسالہ معارف اعظم گڑھ ماہ جولائی ۱۹۶۹ء ص ۱۴۳۔

Marfat.com

ہشت بہشت کو پہلے نثر میں ترجمہ کیا تھا۔ ڈاکٹر طاقتداحسن بھی پروفیسر ٹامسن کے محولہ بالا خط کے مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر ہیں۔ مکتوب محولہ بالا میں پروفیسر موصوف لکھتے ہیں: "حقیقت نے شارل پیرون (CHARLES PERRON) کی فرمائش پر اس مثنوی کو اردو نثر کا جامہ پہنایا تھا (پیرون سندھیا کی ملازمت میں تھا اور جنرل پیرون کے نام سے مشہور ہے) یہ ترجمہ ۱۸۰۰ء بمطابق ۱۲۱۱ھ میں کیا گیا تھا[۱]۔"

اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس عرصے میں حقیقت نے تذکرۂ احبا کے علاوہ امیر خسرو کی مثنوی ہشت بہشت کا فارسی نثر میں ترجمہ کیا تھا۔ یہ ترجمہ کہیں دستیاب نہیں ہے نہ ہی یہ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ طبع بھی ہوا تھا یا قلمی صورت میں رہا۔ حقیقت نے اس مثنوی کو کرناٹک میں ہی لکھا اور تین ماہ کی مختصر سی مدت میں لکھا۔ اس کا بھی امکان ہے کہ حقیقت تھوڑے عرصے کے لئے کرناٹک گئے ہوں اور ان کی ملازمت مدراس میں ہی باقی رہی ہو۔

حقیقت کی تاریخ پیدائش کے اعتبار سے ۱۸۱۰ء میں کرناٹک کے قیام کے دوران ان کی عمر چالیس برس کے لگ بھگ تھی۔ اس وقت بھی وہ کرنل کڈ سے متعلق تھے اور آخر عمر تک میر منشی کے عہدے پر مدراس میں ہی فائز رہے ممکن ہے انھوں نے شاعرانہ افتاد مزاج کے پیش نظر اپنی عسرت اور گوناگوں مصائب کا ذکر کیا ہو۔ کیونکہ شخصی حکومت میں شاعر اس بات کا بھی خیال رکھتا تھا کہ وہ اپنے ممدوح کا ذکر کرتے ہوئے یہ بتائے کہ ان کے در دولت سے وابستہ ہونے سے قبل شاعر عسرت اور پریشانی میں زندگی گزار رہا تھا۔ مثنوی ہشت گلزار کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانہ میں حقیقت کو جسمانی عوارض بھی لاحق تھے۔

۱۔ پروفیسر ٹامسن کے خط کا عکس کتاب میں دیا جا رہا ہے۔

Marfat.com

تھا پریشان اگرچہ دل میرا — لفظ و معنی کو کر جمع یک جا
اک تو تھا میں اسیر دام مرض — مجھکو انواع کے مرض تھے غرض
درد سر، سرفہ اور نفث الدم — نزلے سے ناک میں تھا پہنچا دم
تپ، ابواسیر اور درد ملق — ان کے ہاتھوں سے بھی تھا جینا شاق
دل دگلہ اور خارش و داد — کر رہے تھے جدے ہی یہ بیداد
اس سوا اور تھے بہت آلام! — لوں میں کس کس کا تیرے آگے نام
لاحق افکار دنیوی تس پر! — ان میں پھر فکر شعر کیوں کر ہو
تیرے روزگار کا عالم — تھا نہ کچھ اختیار کا خالم!
فرصت اس کے سبب نہ تھی دم بھر — دم بھی لے سکتا تھا نہ میں ضطر[1]

کرناٹک کے قیام کے دوران ہی بعض شعرا نے ان کی شاگردی اختیار کی ان کے تلامذہ میں سے نواب حشمت جنگ اور سید ابوالحسن حیرت نامور ہوئے۔

کرناٹک سے حقیقت واپس مدراس گئے۔ خزینۃ الامثال میں لکھا ہے۔ "ہمیشہ بہ عہدہ میر منشی ریاست مدراس سرفراز رہے اور ایسے کام ان سے نمایاں ظاہر ہوئے کہ آج تک اولاد ان کی سرکار سے تنخواہ پاتی ہے"[2]۔

محسن کے تذکرہ سراپا سخن یا کسی دوسرے تذکرے سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ مدراس و کرناٹک جانے کے بعد حقیقت دوبارہ لکھنؤ آئے تھے یا نہیں۔ لیکن ان کے کلام کی بعض داخلی شہادتیں ایسی ملتی ہیں کہ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مدراس سے دوبارہ لکھنؤ آئے تھے۔ لیکن

---

(۱) اقتباس از ہشت گلزار مصنفہ میر شاہ حسین حقیقت (۲) دیوان حقیقت افسر صدیقی قومی زبان ص۱۶ یکم فروری ۱۹۶۲
(۳) خزینۃ الامثال از میر شاہ حسین حقیقت ص۲۔

Marfat.com

لکھنؤ انھیں پسند نہ آیا۔ حقیقت کے زمانے میں لکھنؤ علم و فضل کا گہوارہ اور ادبا و شعرا کا مرکز اور تہذیبی شہر تھا۔ چنانچہ ایسے شہر کا پسند نہ آنا سمجھ میں نہیں آتا۔ غالباً اس کا بنیادی سبب یہ ہوگا کہ لکھنؤ میں انھیں وسائل معاش بہم نہ تھے۔

قصہ ہیرا من طوطا سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ مدراس سے لکھنؤ آئے تھے۔

دیکھا پھر آکے لکھنؤ جس آں   کہتے ہیں ہند کی جسے سب جاں

ڈاکٹر لطیف حسین ادیب لکھتے ہیں "مگر (حقیقت) مایوس ہو کر لوٹ گئے انھیں لکھنؤ کے حالات پسند نہیں آئے۔" ہمارے خیال میں ڈاکٹر صاحب موصوف کا اشارہ بھی لکھنؤ کے معاشی حالات کی جانب ہے۔

حقیقت کی بعض تصانیف اور ان کی خاندانی دستاویزات اور تذکروں کے مطابق (سراپا سخن بزم سخن صفحہ ۴۲۔ خوش معرکہ زیبا، مجموعہ نغز صفحہ ۲۱۹ تذکرہ ہندی صفحہ ۸۶) ان کا انتقال مدراس میں ہوا۔ اور وہیں کی خاک میں آسودہ ہوئے[۲]۔

سالِ وفات

حقیقت کے سالِ وفات کے بارے میں تذکرہ نویسوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ شفیقہ نے گلشن بے خار صفحہ ۶۱ میں لکھا ہے کہ حقیقت ۱۲۶۰ھ میں فوت ہوئے۔ صنم کدۂ چین کے دیباچہ نویس کے مطابق ان کا سالِ وفات ۱۲۴۹ھ ہے[۳]۔ ڈاکٹر لطیف حسین ادیب حقیقت کے سالِ وفات کا تعین کرتے ہوئے اپنے مضمون میں لکھتے ہیں "ہمارے خیال میں ان کی وفات ۱۲۴۹ھ مطابق ۱۸۲۳، ۱۸۲۴ میں ہوئی کیونکہ مالک مطبع محمدی (جس میں صنم کدۂ چین چھپی تھی) کا حقیقت سے بوجہ ہم وطن شفیقہ کے مقابلے میں زیادہ قریب کا تعلق ہے لہذا اس کی مطبوعہ کتاب کا بیان زیادہ معتبر ہے[۴]۔"

۱:- میر شاہ حسین حقیقت مطبوعہ رسالہ معارف اعظم گڑھ ماہ جولائی ۱۹۶۸ء صفحہ ۶۲ (۲) محسن لکھنوی سراپا سخن بزم سخن سید حسن علیخاں سعادت خاں ناصر لکھنوی، قدرت اللہ قاسم (۲) صفحہ ۳۲ (۴) میر شاہ حسین حقیقت رسالہ معارف اعظم گڑھ جولائی ۱۹۶۰ء صفحہ ۶۲

ہمارے خیال میں ڈاکٹر صاحب کی رائے قابلِ قبول ہے۔

سعادت خاں ناصر نے بھی اپنے تذکرۂ خوش معرکہ زیبا[1] میں بھی ان کا سال وفات ۱۲۴۹ھ (۱۸۳۳-۱۸۳۴) ہی لکھا ہے۔ یہ بھی ایک اہم عصری شہادت ہے۔

۱:۔ تذکرہ خوش معرکہ زیبا از سعادت خاں ناصر مرتبہ مشفق خواجہ مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور ص ۲۷۲

Marfat.com

حقیقت کے فنی کارنامے

جذب عشق

جذبِ عشق شاہ حسین حقیقت کی تصنیف ہے۔ یہ داستان شمالی ہند میں فورٹ ولیم کالج کے مصنفین کی نثری تصانیف سے قبل تحریر کی جانے والی نثر میں امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔

جذب عشق کا سال تصنیف ۱۲۱۲ھ ۹۸-۱۷۹۷ء ہے۔ اس کا مادۂ تاریخ " ہے یہ جذب عشق آہ " ہے۔ جس سے ۱۲۱۲ھ برآمد ہوتا ہے۔ پروفیسر لطیف حسین ادیب لکھتے ہیں۔" جذب عشق طباعت سے محروم رہی اس کا قلمی نسخہ سید مسعود حسن رضوی ادیب (دین دیال روڈ لکھنؤ) کے کتب خانے میں محفوظ ہے[1]۔"

اسی طرح ڈاکٹر گیان چند لکھتے ہیں۔" جرات کے شاگرد شاہ حسین حقیقت بریلوی نے ایک داستان جذبِ عشق لکھی اس کا مخلوط مسعود حسن رضوی صاحب کے کتب خانے میں ہے[2]۔"

ڈاکٹر نیر مسعود رضوی نے اپنی تالیف " رجب علی بیگ سرور " میں بھی اس مخطوطے کا ذکر کیا ہے۔ جو ان کے والد کے کتب خانے میں موجود ہے[3]۔

لیکن یہ کتاب شائع ہو چکی ہے۔ مطبوعہ نسخہ انجمن ترقی اردو کے کتب خانے میں موجود ہے۔ مطبوعہ

۱۔ میر شاہ حسین حقیقت مطبوعہ رسالہ معارف نمبر ۲ جلد ۱۰۲ ص ۱۳۵ اگست ۱۹۶۸ء (۲) اردو کی نثری داستانیں از ڈاکٹر گیان چند مطبوعہ انجمن ترقی اردو ص ۱۵۹ (۳) رجب علی بیگ سرور از ڈاکٹر نیر مسعود رضوی

Marfat.com

نسخے کے صفحۂ اول کے مطابق یہ ۱۲۶۹ھ میں ۲۵ رجب المرجب کو بروز پنج شنبہ مطبع محمدی میں شیخ فوازش علی کے اہتمام سے شائع ہوئی تھی۔

جذب عشق نثری داستان ہے جس کو کثرت اشعار سے مزین کیا گیا ہے۔ یہ اشعار خود حقیقت، ان کے استاد جرأت، میر حسن دہلوی اور بعض دوسرے شعرا کے ہیں۔ اس داستان کی بنیادی خوبی یہ ہے کہ اس کا پلاٹ روایتی داستانوں کے برعکس حقیقت پر مبنی ہے۔ اس زمانے میں حقیقت نگاری کی اس کوشش کو ہم روش عام سے ہٹنے کی ایک مستحسن کوشش اور ایک انقلابی رویے سے موسوم کرسکتے ہیں۔ حقیقت نے اپنے بڑے بھائی سید حسن شاہ ضبط کی فرمائش پر اس قصے کو فارسی سے اردو میں منتقل کیا تھا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

"۱۲۰۴ھ نبوی میں دریائے سمیری کے جو مضافات پرگنہ بندرابن سے متصل قصبہ چھاتا ہے واقع ہوا اور مفصلاً اخوی صاحب و قبلہ جامع المعقول والمنقول حاوی الفروع والاصول حقائق و معارف آگاہ سید محمد حسن شاہ دام ظلہ جو لمعہ طور افاضت اوس کی سے چراغ دانش و فرہنگ کا روشن ہے اور ثمرۂ سحاب افادت سے اوس کی باغ فضل و ہنر کا سرسبز اور مزین، اس قصے کی معشوقہ کو برسانہ پیرایۂ الفاظ رنگین فارسی کی برہنت کر کے مجلس ظہور میں جلوہ افروز ناز کا کیا۔"

اب اگر کچھ خوبی رنگینی عبارت اور درست نشینی فقرات اوس کتاب مستطاب سے لکھوں تو مقصد سے باز رہتا ہوں اور اوس پر بھی کما حقہ تعریف اور توصیف اوس کی کو کب پہنچتا ہوں الغرض یہ فقرۂ ناقص کہ جو طبع نارسا اس ہیچمدان سے سرزد ہوئے ہیں فقط فیض تعلیمات امن حضرت کا ہے وگرنہ مجھ بے لیاقت عاجز بیان میں یہ قدرت اور استعداد کہاں تھی جو ساتھ او علائے تالیف کتاب کے حضور سرفراز ہوں (   ) سخن کی گردن بلند کرتا ایک روز کمال سرفرازی اور مہر سے جو بزرگوں کو خوردوں کے حال پر ہمیشہ مبذول ہے اس کمترین عقیدت گزین کو زبان معجز بیان سے

Marfat.com

فرمایا کہ چہرہ معشوقہ زیبا نگار اس مضمون عبرت مشحون کو ساتھ حلیہ اور زیورِ عبارت نثر زبان اردو کی آراستہ کر کے تحفہ مجلس احباب کا کرے سو بنا بر فرمان واجب الاذعان اور عین التماس جتبرک ...... سے جناب کی مصرع

دُر فکر سے گوندھ لڑیاں کئی

ساتھ عبارت سلیس رنگین اور دلچسپ کے ترتیب دے کے سات جذب عشق کے موسوم کیا ہے (ص۳)[1]

پروفیسر لطیف حسین لکھتے ہیں۔

"حقیقت کے بڑے بھائی سید محمد حسن شاہ ضبط نے فارسی زبان میں ایک کہانی ۱۲۰۴ھ (۱۷۹۰ء) میں لکھی تھی۔ حقیقت نے محمد حسن شاہ کے ارشاد کے مطابق اس کہانی کو ۱۲۱۲ھ (۱۷۹۷ء) میں اردو میں منتقل کیا۔"[2]

حقیقت کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ حسن ضبط نے فارسی میں ایک قصہ لکھا تھا جس کو حقیقت نے اردو میں منتقل کیا۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ شاہ حسن ضبط کا وہ کونسا فارسی قصہ تھا جس کو حقیقت نے اردو میں منتقل کیا؟ شاہ حسن ضبط کا صرف ایک ناول نشتر موجود ہے یہ ناول بھی فارسی میں لکھا گیا تھا۔ لیکن جذب عشق اور اس ناول کے پلاٹ بالکل مختلف ہیں۔

شاہ حسن ضبط نے نشتر کے علاوہ اور بھی کچھ لکھا ہوگا یا کم از کم وہ داستان تو ضرور لکھی ہوگی جس کا اردو ترجمہ جذب عشق ہے لیکن ضبط کی دوسری کوئی تصنیف شائع نہ ہو سکی۔ ممکن ہے کہ ان کی کوئی تصنیف قلمی نسخے کی صورت میں کہیں موجود ہو۔ ضبط کے ناول نشتر کا موضوع جذب

---

(۱)۔ جذبِ عشق مطبوعہ مطبع محمدی کانپور ۲۵ ر رجب ۱۲۶۹ھ ص۲-۳ (۲) میر شاہ حسین حقیقت مطبوعہ رسالہ معارف اعظم گڑھ۔ قسط دوم اگست ۱۹۶۸ء ص۱۳۶۔

Marfat.com

عشق کی طرح عشقیہ ہے لیکن اس کے باوجود دونوں کے قصے مختلف ہیں۔

جذبِ عشق کی کہانی

مرہٹوں کے لشکر میں ایک جوان رعنا تھا۔ یہ اپنی خوبصورتی میں بے مثال، اور انگریزوں کا رفیق کار تھا۔ حسن کی دولت سے مالا مال ہونے کے باوجود یار و دیار کی جدائی کے سبب اور ناجنس لوگوں کی صحبت میں رہنے کی وجہ سے ہر دم رنجیدہ رہا کرتا تھا۔ اس نوجوان کا طریقہ یہ تھا کہ جس جگہ لشکر پڑاؤ کرتا وہ اپنے افسران سے رخصت لے کر اس علاقے کی سیر کیا کرتا۔ جب وہ اپنے لشکر کے ہمراہ بندرابن سے کوچ کر کے قصبہ جھانا کے قریب آیا۔ تو اسے ۲۹ رجمادی الثانی کو سیمری کے باغ میں ہونے والے بھوانی میلے کی خبر ملی۔ میلے کی خبر پاکر اس نے اپنے سرداروں سے دوپہر کی رخصت لی اور چند رفیقوں کو ہمراہ لے کر جو اس علاقے سے واقف تھے تیز رفتار گھوڑے پر سوار ہو کر منزلِ مقصود کو روانہ ہوا۔ سیمری گاؤں کے بیچ میں پہنچکر اس نے ایک قطعۂ رشک فردوس بریں دیکھا۔ گلی کوچوں کی سیر کرنے کے بعد وہ نوجوان بھوانی باغ میں پہنچا جو اپنی خوبصورتی میں لاجواب تھا۔ اس باغ میں سیر کرتا ہوا وہ تالاب کے کنارے پہنچا جہاں بھوانی کا ایک دیہرہ نصب تھا چار دیواری کے چاروں جانب عورتیں اور مرد خوبصورت لباسوں میں عبادات اور سیر و تفریح میں مصروف تھے اس باغ میں گھومتے ہوئے اس جوان نے ایک درخت کے نیچے چار عورتوں کو بیٹھا ہوا دیکھا۔ یوں تو ان چاروں میں سے ہر ایک بے حد حسین تھی۔ لیکن دو عورتیں تو خاص طور پر حسن میں بے مثال تھیں یہ دونوں غالباً خواہر حقیقی تھیں۔ یہ جوان رعنا ان میں سے ایک کی نگاہ کا گھائل ہوگیا اور ایک جگہ حیران و ششدر کھڑا ہو کر ان کو دیکھنے لگا۔ ادھر وہ رشک ماہ بھی اس کی خوبصورتی کو دیکھکر دل دے بیٹھی۔ دونوں کے درمیان ایک ایک دو دو باتیں کنایہ آمیز ہوئیں۔

اتنے میں ناگاہ ایک جوگی جو یادِ حق میں بردگی بنا ہوا تھا۔ سر پہ بھبھوت ملے، لٹیں چھوڑے

Marfat.com

اشارہ بتاتا ہوا اس طرف آنکلا جدھر وہ جوان رعنا کھڑا ہوا تھا اس جوگی کے اردگرد ایک ہجوم جمع ہوگیا اس جوان نے بھی کچھ رقم بطور نذر کے اس جوگی کو دی۔ یہاں سے جوگی ان چاروں عورتوں کے پاس پہنچا ان چاروں میں سے اس نازنین نے جو اپنا دل اس اجنبی جوان پر قربان کرچکی تھی اس جوگی کو کچھ زر نقد اور چار بتاشے دیئے اور اشارے سے ان بتاشوں کو اس جوان کو دینے کے لئے کہا۔ ان چار بتاشوں میں سے ایک ٹوٹا ہوا اور باقی تین ثابت تھے۔ اس جوگی نے اس نوجوان کو یہ بھی بتایا کہ بتاشے کس کی طرف سے بھیجے گئے ہیں اس نے ٹوٹا ہوا بتاشہ تو کھالیا اور باقی تین بتاشوں کو الگ باندھ لیا۔ اس اثنا میں ان چاروں کے عزیز آپہنچے اور انھیں گھر لے گئے وہ نازنین بھی چاروناچار گھر کو روانہ ہوئی ادھر یہ جوان اس کا سراغ لگانے کے لئے اس کے پیچھے پیچھے روانہ ہوا۔

اپنے رفیقوں اور پیغامبر کے سبب عاشق نے محبوبہ سے اس کے گھر جاتے ہوئے راہ میں ملاقات کی، دونوں کے درمیان شرم و حجاب مانع رہا۔ آخرش جب اس جوان نے واپس لشکر جانے کے ارادے کا اظہار کیا تو معشوقہ نے اپنی بے قراری اور حال دل سنایا۔ اس اثنا میں جب اس نازنین کا گھر نزدیک آیا تو اس نے راز و نیاز کرتے ہوئے، رخصت کیا اور رات کے وقت آنے کی دعوت دی تاکہ وہ اس کے کلبہ احزاں کو اپنے نور قدم سے شب ماہ میں روشن کرے۔

یہ نوجوان ہر چند کہ غم والم کے سبب قدم اٹھانے کی ہمت نہ رکھتا تھا لشکر کو واپس لوٹا ادھر وہ نازنین بام پر کھڑی ہو کر اپنے عاشق کو جاتا ہوا دیکھنے لگی جب وہ نظروں سے اوجھل ہوا تو یہ خاک پر بے ہوش ہو کر گری۔ اتنے میں ادھر سے ایک شخص کا گزر ہوا۔ اس شخص کے ہاتھوں اس نازنین کی تینوں سہیلیوں نے یہ پیغام بھجوایا کہ میلے میں ابھی تین دن ہیں لہذا کسی وقت وہاں آکر اپنے دیدار سے نظروں کو سکون بخشے، وہ اجنبی شخص اس عاشق کی تلاش میں نکلا اور چاہا کہ

Marfat.com

ایسی پری جمال نازنین کو یوں والہ و شیدا کرنے والے کو دیکھے چنانچہ اس نے لشکر میں جاکر پیغام پہنچایا اس جوان نے بھی قاصد کے ہاتھ پیغام کہلایا کہ بشرط زندگی ضرور آؤں گا۔ اگلے دن کے انتظار میں اس جوان رعنا نے وہ رات بے قراری میں کاٹی۔

ادھر وہ نازنین جب ہوش میں آئی تو دوبارہ پچھاڑ کھا کر گر پڑی۔ اس کی سہیلیوں نے گلاب چھڑکا اور جب وہ ہوش میں آئی تو اس پر لعنت ملامت کی۔ اور کہا کہ کوئی یوں یکبارگی عشق میں اپنی حالت ایسی بناتا ہے اگر تیرے عزیز و اقارب کو خبر لگ جائے تو کیا حال کریں لہٰذا بہتر ہے کہ اس خیال کو دل سے نکال دے۔ لیکن ان کی نصیحتوں کا اثر برعکس ہوتا تھا۔ اور اس کی آتش دل اور فزوں ہوتی تھی۔ اپنی سہیلیوں کے جواب میں اس نے کہا کیا خبر کہ اس یار وفادار کا بھی میرے عشق میں ایسا ہی حال ہو۔ غرض تمام رات اس کی بھی بے چینی میں کٹی اور صبح کو افشائے راز کے ڈر سے اس نے خود کو دوسرے کاموں میں مصروف کیا اور جب چار گھڑی دن چڑھا تو اپنی تینوں سہیلیوں کو لے کر باغ میں پہنچی اور مقام مقررہ پر پہنچ کر نرگس کی طرح چشم کھول کر عاشق کے دیدار کی آرزو میں بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر میں اسے اپنا محبوب آتا نظر آیا وہ آکر تھوڑے فاصلے پر بیٹھ گیا اور نظر دل سے جذبات کا تبادلہ ہونے لگا۔ اتنے میں وہی جوگی پھر ادھر آنکلا اس جوان نے دو تینوں تاشے جوگی کو دیئے کر جا کر اس نازنین کو دے دے اور با آواز بلند کہا کہ یہ تاشے ناپائیدار ہیں ان کو کب تک سنبھال کر رکھوں براہ کرم کوئی ایسی چیز عطا کریں کہ پائیدار ہو۔ وہ شیریں دہن یہ سن کر مسکرائی اور فقیر کو اپنے پاس بلا کر کہا کہ یہ تاشے اس ناچیز نے تحفتہً نہیں دیئے تھے بلکہ تین ثابت اور ایک شکستہ تاشے سے مراد تھی کہ جوانی کا میعاد چار دن رہتا ہے جس میں سے ایک دن تو ختم ہو گیا اور بقیہ تین دن تھے اور ان تین تاشوں سے تین دنوں کی ملاقات مقصود تھی۔

فقیر کو وہ تاشے دوبارہ دے کر وہ خود پیپل کے درخت کے پاس گئی۔ پیپل کے اس درخت

Marfat.com

کے پیچھے بت رکھے ہوئے تھے یہاں پہنچ کر بظاہر تو وہ پوجا کے لئے بیٹھی اور تھوڑا سا سپندا آگ پر ڈالا اور آم کے ایک پتے کو توڑ کر اس کو سیندور سے سرخ کیا اور اپنے سینے پر لگایا۔ گویا اس طرح اس نے اپنا حال دل ظاہر کیا ادھر اس نوجوان نے جواباً حجام سے ایک آئینہ اور شانہ لے کر اس پری چہرہ کی طرف کیا۔ بیڑہ چبا کر اس کی پیک زمین پر ڈالی اور آئینہ، اس آئینہ رو کو دکھا کر حجام کے حوالے کیا۔ واپسی میں وہ جوان اس نازنین کو گھر تک چھوڑنے آیا۔ راہ میں ایک بڑھیا ان کے رازِ عشق سے آگاہ ہو گئی بڑھیا کے بیان کے سبب اس نازنین کے اہل خانہ بھی اس راز سے آگاہ ہوئے اور انھوں نے بھوانی کے باغ میں اپنے جاسوس ان دونوں کی نگرانی کے لئے مقرر کر دیئے۔

تیسرے دن وہ جوان کسی وجہ سے باغ میں نہ آ سکا اور اس نے اپنے قاصد کے ہاتھوں اپنی معذوری کا اظہار کیا۔ جس کے سنتے ہی اس نازنین کا حال بُرا ہو گیا۔ سہیلیاں گھبرا کر آئیں کسی نے جنون، کسی نے مکر کسی نے جادو یا آسیب وغیرہ بتایا۔ کسی نے علاج کے طور پر اس کو باغ میں لے جانے کا مشورہ دیا جس کو سن کر اس کے اضطراب میں کچھ کمی واقع ہوئی۔ لیکن باغ میں لے جانے کے باوجود اس کے اضطراب میں کوئی کمی نہ آئی اور اہل خانہ اسے واپس گھر لے آئے غرض وہ سارا دن اور ساری رات اس کی روتے ہوئے کٹی۔

اگلی صبح بیدار ہو کر پوجا کے بہانے سے وہ دوبارہ بھوانی باغ کو روانہ ہوئی۔ اس دن بھی عاشق سے ملاقات نہ ہوئی۔ لیکن پوجا سے فارغ ہونے کے بعد جب وہ گھر کو لوٹی تو راستے میں عاشق سے ملاقات ہوئی اس شوخ نازنین نے نہ آنے کا شکوہ کیا غرض دونوں کے درمیان گلے شکوے ہوئے اور اس جوان نے بھی کہا کہ دو شب اور ایک دن کی جدائی میں میری حالت تباہ ہو گئی ہے۔

اس نازنین نے اپنے عاشق کو ایک تالاب پر ملنے کی دعوت دی ٹھیک دوپہر کو وہ جوان

Marfat.com

تالاب کے قریب پہنچ کر ایک درخت کے نیچے محبوب کا انتظار کرنے لگا۔ ادھر وہ نازنین بھی غسل کا بہانہ کرکے تالاب پر پہنچی۔ یہاں اگرچہ خلق کا ہجوم دیکھا لیکن اس ہجوم کی پرواہ نہ کرتے ہوئے دیوانہ اپنے محبوب کے پاس آئی اور اس کی بے وفائی کی شکایت کی۔ اور ملنے میں مطلق ننگ و نام کی پرواہ نہ کی کیونکہ عاشقوں کو بدنامی سے نام آوری ہے اس نازنین نے اپنے عاشق سے یوں کہا کہ تیری محبت کے سبب ایک زمانہ میرا مخالف ہوا ہے اور میرے وارث مجھ سے بدگمان ہو گئے ہیں۔ لہذا اے خدا ناترس اب جلد دولت وصل سے سرفراز کر اگر میں تیرے فراق میں مرگئی تو قیامت میں اس خون ناحق کا کیا جواب دے گا۔ غرض ایسی باتیں کی کہ پتھر کا دل بھی تڑپ اٹھتا۔ اس عاشق نامراد نے جواب دیا " اے نازنین! جو کچھ تو نے کہا درست ہے لیکن وصل میں اس قدر عجلت درست نہیں ہے اگر تقدیر سے تدبیر لڑ جائے تو تا ابد دولت ملاقات یکدیگر سے بہرہ مند ہوں گے" ابھی ان دونوں کے درمیان یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ اس نازنین کے وارث، جو پہلے ہی بدگمان تھے، اور جن کو بڑھیا تمام حال بتا چکی تھی، اس جوان کو قتل کرنے کے لئے تقریباً پچاس مسلح افراد کے ہمراہ آ پہنچے یہ حال دیکھکر اس جوان نے اپنی محبوبہ کو یہ کہہ کر رخصت کیا کہ اگر اس بلائے ناگہانی سے زندہ بچ گیا تو خیر ورنہ سمجھنا کہ تجھ پر سے صدقہ ہو گیا۔ ہر چند کہ اپنے محبوب کو اس حالت میں دیکھکر اس نازنین کے قدم نہ اٹھتے تھے لیکن مجبوراً وہ وہاں سے رخصت ہوئی۔ اس جوان نے ان مسلح حملہ آوروں کو آتے دیکھکر اپنی تلوار نیام سے نکالی اور گرج کر حملہ آور ہوا۔ وہ ہجوم اس کے حملے سے کائی کے مانند پھٹ گیا۔ اس جوان کی تلوار جس کے سر پر لگتی تھی۔ صابن سے گزرتے ہوئے تار کی مانند مخالف کو دو نیم کر دیتی تھی۔ اس کی بہادری اور شجاعت کو دیکھکر دوست دشمن، سب کے لبوں سے کلمات تحسین نکل رہے تھے ایک شخص نے عقب سے آکر ایک لٹھ اس کے سر پر مارنا چاہا جو اتفاق سے سر پر لگنے کے بجائے اس کی شمشیر پر پڑا اور تلوار ہاتھ سے چھوٹ

Marfat.com

کر پڑے جا گری۔ یہ حالت دیکھکر وہ جوان مایوس ہوکر ایک اجل رسیدہ سے لپٹ گیا اور اس کی تلوار چھین کر جہنم واصل کرنا چاہتا تھا کہ وہ خوف کے مارے تالاب میں کود گیا۔ اس جوان نے بھی شکار کے نکل جانے کو غیرت سے بعید جانتے ہوئے خود بھی اس کے تعاقب میں تالاب میں چھلانگ لگا دی لیکن اس کو تیرنا نہ آتا تھا۔ دشمن تو ہاتھ پاؤں مارتا ہوا تالاب سے باہر نکل آیا لیکن وہ جوان ڈوب گیا۔ وہ نازنین بھی تالاب میں کود جانا چاہتی تھی۔ لیکن غش کھا کر گر پڑی اس کے اقربا زبردستی اسے گھر لے گئے محبوب کے غم میں اس کی حالت بری تھی لیکن مصلحت کے تحت اس نے اپنے غم کو دبائے رکھا اور گھر آکر اپنی سہیلیوں اور عزیز اقارب کے ہمراہ شاداں و فرحاں پھرتی رہی۔ چار پانچ دن کے بعد سہیلیوں کے ہمراہ پوجا پاٹ کے لئے پھر باغ کی طرف جانے کو گھر سے نکلی اور اس تالاب کے کنارے پہنچی۔ تالاب پر اس وقت بھی مرد و زن کا ہجوم تھا۔ یہ بھی ان لوگوں کے درمیان جاکر کھڑی ہوگئی اور دفعتاً تالاب میں چھلانگ لگا دی۔ کھڑے ہوئے لوگوں میں ایک شور برپا ہوگیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ان دونوں کی لاشیں سطح آب پر اس طرح تیرتی ہوئی نمودار ہوئیں کہ عاشق و معشوق دونوں ہم آغوش تھے جب دونوں لاشیں کنارے پر پہنچیں تو دام داروں نے لاشوں کو باہر نکالنا چاہا لیکن وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب نہ ہوسکے اور دونوں لاشیں دوبارہ زیر آب چلی گئیں اور پھر کبھی کسی نے انھیں نہ دیکھا۔"

جذب عشق کا موضوع

جذب عشق کا موضوع روایتی عشقیہ داستان ہے اردو کے روایتی عشقیہ قصوں میں محبت کا آغاز، عاشق معشوق کی نگاہوں کے ٹکرانے سے ہوتا ہے۔ اور اکثر ان کا انجام المناک ہوتا ہے۔ اس قسم کے عشقیہ قصوں میں عاشق اور معشوق کا وصال زندگی میں نہیں دکھایا جاتا۔ چنانچہ اس روایت کو جذب عشق میں پیش نظر رکھا گیا ہے۔ اس کا انجام حزنیہ ہے ناقابل یقین اور غیر فطری ہے یعنی

Marfat.com

مرنے کے بعد عاشق ومعشوق کی لاشوں کا ہم آغوشی کی حالت میں سطح آب پر ظاہر ہونا۔ اور بعدازاں دوبارہ زیرآب چلے جانا۔ داستان کے آغاز میں اس کا اظہار کیا گیا ہے کہ یہ واقعات سچے ہیں لیکن اگر مصنف کے اس دعوے کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ انجام جو اکثر مثنویوں میں بیان ہوا ہے غیر فطری ہے؟

میر کی مثنوی دریائے عشق میں بھی عاشق ومعشوق کا انجام یہی دکھایا گیا ہے اور اس قصے میں بھی دونوں کی لاشیں سطح آب پر باہم دگر ہم آغوشی کی حالت میں نمایاں ہوتی ہیں۔ اصل میں ایسے قصوں میں قصہ نگار کا مقصد اس سچی محبت کو نمایاں کرنا اور عاشق ومعشوق کے کرداروں کی نیک نیتی، پاکدامنی اور مخلصانہ محبت کا نقش اہل دنیا کے دل پر بٹھانا مقصود ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات تو مشاہدے میں ہے کہ ڈوبنے کے بعد لاش ایک دفعہ ضرور سطح آب پر آتی ہے چنانچہ اس کا امکان ہے کہ یہ دو لاشیں اتفاق سے ایک دوسرے کے ساتھ ملی ہوئی سطح آب پر نمایاں ہوئی ہیں۔ تاہم ہلکا سا فوق فطرت عنصر اس داستان میں موجود تسلیم کرنا پڑتا ہے۔

اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ جذب عشق میں فوق فطرت عنصر موجود ہے اور اس کی موجودگی میں کہانی کی اس خوبی میں کہ اس میں حقیقت بیان کی گئی ہے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ شاہ حسین حقیقت نے ہیرا من طوطا یا مثنوی ہشت گلزار میں جو واقعات منظوم کیے ہیں ان میں فوق فطرت عنصر موجود ہے۔ مثنویات ہوں یا داستانیں ان میں فوق فطرت عنصر کی موجودگی لازمی سمجھی جاتی تھی۔ اگر اس زمانے کی روایت کو مدنظر رکھا جائے جس کے تحت داستانوں کی بنیادی شرط اور اس کی مقبولیت کا اہم سبب فوق فطرت عنصر ہوتا تھا تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا حقیقت نے شعوری طور پر اس داستان میں فوق فطرت عنصر سے گریز کرتے ہوئے حقیقت نگاری کو اختیار کیا تھا۔ اس دور کی داستانوں کو مدنظر رکھتے ہوئے حقیقت کی اس کوشش کو ہم داستانوں کی روایت میں ایک اہم موڑ

Marfat.com

اور تبدیلی قرار دے سکتے ہیں ڈاکٹر لطیف حسین ادیب اس سلسلے میں لکھتے ہیں۔

"دراصل اس کی اہمیت دو وجوہ سے ہے۔ یہ مختصر کہانی اردو کی ضخیم داستانوں اور انیسویں صدی کے ناولوں کے درمیانی عہد کی ہے[1]۔"

ہمارے خیال میں بھی اس داستان کی بنیادی اہمیت یہی ہے اس داستان یا اس نوع کی دوسری منثور و منظوم داستانوں نے اردو ناول کے ابتدائی دور میں یقیناً اثر ڈالا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہم اسے ایک داستان ہی کہیں گے کہ جس میں حقیقت پسندی سے کام لیا گیا ہے۔ اس میں جو کردار ہیں، وہ ناولوں کی طرح معاشرتی الجھنوں" کی علامت تو نہیں ہیں لیکن اپنے آغاز و انجام اور نفس قصہ کے اعتبار سے اسے اردو ناول کے ابتدائی نقوش کہا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر لطیف حسین ادیب نے جذب عشق کا تجزیہ کرتے ہوئے اور انیسویں صدی کے ناولوں پر اس کے اثرات کے امکان کے سلسلے میں لکھا ہے: "اس کے کردار معاشرتی الجھنوں کی علامت نہیں ہیں۔ اس کا مقصد نہ اصلاح ہے اور نہ معاشرہ پر تنقید، اس طرح یہ کہانی ناول سے مختلف ہے اور صرف کہانی ہے ناول نہیں ہے۔ البتہ ایک نظری عشق، خفیہ ملاقاتیں، اعزہ کی مسلح یورش، وصل بعد موت اور خانگی زندگی کے مشرقی آداب، مجبوریاں اور جرأتیں جو اس مختصر کہانی میں ملتی ہیں انیسویں صدی کے اواخر میں لکھے ہوئے اردو ناولوں میں مشترک ہیں۔ انگریزی ناول نے نیا شعور بخشا، نئی بلندیاں اور نئی پستیاں دکھائیں مگر مشرقی تصور عشق اور خانگی زندگی کے آداب کو ابتداء میں نہیں بدلا۔ جذب عشق سے جو ہر کشید ہو کر انیسویں صدی کے ناولوں میں بغیر عزم وارادے کے داخل ہوا جو تاریخ کا فطری عمل تھا آج بھی مجبوری عشق اور وصل بعد موت میں زیادہ کشش محسوس کی جاتی ہے جو ہر فنا نہیں ہوا ہے خارجی اثرات کے تحت قالب بدلتا رہا ہے[2]۔"

۱:۔ میر شاہ حسین حقیقت۔ رسالہ معارف جلد ۱۰۲ اعظم گڑھ ماہ اگست ۱۹۶۸ء ص ۱۲۷

۲:۔ " " " " " ص ۱۲۸

Marfat.com

جذبِ عشق داستان یا کہانی

"یہ کہانی دوسری داستانوں سے مختلف ہے یہ صرف کہانی ہے داستان نہیں ہے۔" اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر لطیف نے جذبِ عشق میں فوق فطرت عنصر کی عدم موجودگی اس کے کرداروں کے عام انسانوں سے مشابہ ہوتے، اور داستان کا اختصار بیان کیا ہے۔ لہٰذا یہاں ضروری ہو جاتا ہے کہ داستان اور کہانی کے فرق کو بیان کیا جائے۔

عموماً داستانیں طویل ہوتی ہیں اور ان میں قصہ در قصہ واقعات کو بیان کر کے داستان کی دلچسپی، تحیّر، اور آئندہ پیش آنے والے حالات کے بارے میں تجسس پیدا کیا جاتا ہے۔ جذبِ عشق نہ تو طویل ہے اور نہ ہی اس میں قصہ در قصہ بیان ہوا ہے اس لحاظ سے اس کو داستان نہیں کہنا چاہیئے۔ لیکن ہمارے خیال میں صرف ان وجوہ کی بیان پر اسے داستان قرار نہ دینا صحیح نہیں ہے۔ اردو میں ایسی بہت سی داستانیں موجود ہیں جو طویل ہونے کے بجائے حکایت کی طرح مختصر ہیں لیکن اس میں داستان کے تمام امکانات اور لوازم موجود ہیں۔ ڈاکٹر گیان چند کے الفاظ میں داستان بھی حکایت کی طرح کوزے میں بند کی جا سکتی ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے توتا کہانی کی چوبیسویں کہانی کو بطور مثال پیش کیا ہے جو ہے تو مختصر لیکن اپنے خصائص کے اعتبار سے داستان کہلائے جانے کی مستحق ہے[۱]۔

اگر جذبِ عشق کے انجام سے قطع نظر کیا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس داستان میں فوق فطرت عنصر بالکل بھی موجود نہیں ہے بعض لوگ تو اس انجام کو (جس میں مرنے کے بعد عاشق و معشوق کی لاشوں کو ہم آغوش دکھایا گیا ہے[۲]) بھی غیر فطری تسلیم نہیں کرتے۔ اور لاشوں کے تہہ سے سطح آب پر آ جانے اور ہم آغوشی کی حالت میں ہونے کے اتفاق کے منکر نہیں ہیں۔ ڈاکٹر لطیف حسین ادیب

۱۔ اردو کی نثری داستانیں از ڈاکٹر گیان چند مطبوعہ انجمن ترقی اردو پاکستان ص۔ (۲) میر کی مثنویوں میں بھی یہی انجام ہے۔

Marfat.com

کے نزدیک اس داستان میں فوق فطرت عنصر نہ ہونے کی وجہ سے اسے داستان کے بجائے کہانی کہنا زیادہ صحیح ہے۔ اس سلسلے میں بھی بعض ایسی داستانوں کی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں کہ جن میں فوق فطرت عنصر سرے سے موجود ہی نہیں ہے ان میں الف لیلہ کی "سوتے جاگتے کی کہانی" کی مثال موجود ہے جس کو ناقدین نے اعلیٰ درجے کی داستان قرار دیا ہے۔ لیکن اس میں نہ تو کوئی فوق فطرت واقعہ ہے اور نہ ہی کسی فوق فطرت مخلوق کا تذکرہ ہے۔ اسی طرح توتا کہانی کی بیسویں کہانی، جس کا اوپر بھی تذکرہ آچکا ہے، ایک مختصر داستان ہے اس میں بھی نہ تو کوئی فوق فطرت عنصر موجود ہے اور نہ ہی اس کا ہیرو کوئی شہزادہ یا سوداگر وغیرہ ہے لیکن اس کے باوجود یہ بھی داستان کے زمرے میں آتی ہے

داستان اور کہانی کو اگر اس کے قدیم معنوں میں استعمال کیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ کہانی میں بھی داستان کا عنصر موجود ہوتا ہے لیکن اس میں داستان کی سی طوالت نہیں ہوتی میرے خیال میں داستان اور کہانی کے درمیان حد فاصل کھینچنا مناسب نہیں ہے کیونکہ اپنی بیشتر خصوصیات میں یہ دونوں مشترک ہیں البتہ داستان اور حکایت میں فرق کیا جا سکتا ہے۔ ان دونوں کے درمیان ایک نمایاں فرق پایا بھی جاتا ہے۔ داستان کے جو معنی متعین کیے گئے ہیں اس کے مطابق یہ انگریزی زبان کے لفظ رومانس کے معنوں میں اردو میں مستعمل ہے سب سے پہلے فرانس میں پھر دوسرے ممالک میں کسی بھی غیر معمولی واقعے کے نثری یا منظوم بیان کو رومانس کہا گیا۔" اس کے خاص اجزا محاربات، حسن و عشق اور ایمان و مذہب ہوتے ہیں۔[۱] مشرق و مغرب کی داستانوں کے نمایاں اور بنیادی موضوع بھی یہی ہیں۔ یہ تمام موضوع یعنی محاربات، حسن و عشق، ایمان و مذہب اور فوق فطرت عناصر کا بیان وغیرہ ان میں سے ہر ایک داستان کی اہم خصوصیت تو ہو سکتی ہے لیکن کسی ایک موضوع کے داستان میں نہ ہونے کے باوجود وہ داستان کہلائے جانے کی مستحق رہتی ہے

۱:- اردو کی نثری داستان از ڈاکٹر گیان چند مطبوعہ انجمن ترقی اردو کراچی۔

Marfat.com

مثال کے طور پر داستانوں کے ایک اہم اور غالب ترین عنصر حسن وعشق کو لیجئے اس کو بھی داستان کی نمایاں ترین خصوصیت قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ ایسی بہت سی داستانیں یا ضمنی کہانیاں ہیں جن میں حسن عشق کا تذکرہ موجود نہیں ہے مثلاً الف لیلہ میں سندباد جہازی، سوتے جاگتے کی کہانی علی بابا چالیس چور وغیرہ۔ ان میں حسن وعشق کا کوئی تذکرہ موجود نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان میں سے ہر ایک اپنی جگہ علیحدہ اور مکمل داستان تسلیم کی گئی ہے۔

پھر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ داستان ہمیشہ رومانی اور غیر اصلی اور خیالی جذباتی قصہ پر مشتمل ہوتی ہے رومان کا عشق سے گہرا تعلق ہے لیکن اس تعلق سے آزاد رہ کر بھی رومانس لکھا جا سکتا ہے رومانوی واقعات میں چونکہ ساری کارفرمائی تخیل کی ہوتی ہے۔ لہذا اگر فوق فطرت عنصر موجود نہ بھی ہو تو بھی داستان میں دلچسپی کا عنصر باقی رہتا ہے۔

اگر داستان میں بیان کئے جانے والے قصے کو غیر اصلی اور خیالی جذباتی قصے کی موجودگی کو بنیادی شرط قرار دے دیا جائے تو جذب عشق کو داستان کے زمرے سے نکالنا پڑتا۔ کیونکہ مصنف کا دعویٰ یہ ہے کہ یہ واقعہ حقیقت پر مبنی ہے۔

ڈاکٹر گیان چند لکھتے ہیں "معلوم ہوتا ہے کہ ایسا کوئی رشتہ نہیں جو تمام داستانوں کو منسلک کرتا ہو ان میں یک رنگی نہیں بوقلمونی ہے پھر بھی ہم داستانوں کو حکایتوں یا جدید ناولوں سے الگ شناخت کر سکتے ہیں[۱]۔"

حکایت کے لئے انگریزی میں لفظ فیبل FABLE استعمال ہوتا ہے۔

ڈاکٹر جانسن نے حکایت کی تعریف یوں کی ہے" یہ ایک بیانیہ ہے جس میں حیوان یا بے جان اشیاء اخلاقی تلقین کے لئے آدمی کی طرح بولتے چالتے ہیں اور انسانوں جیسا کام کرتے ہیں[۲]۔"

۱۔ اردو کی نثری داستانیں (۲) حوالہ منقول از اردو کی نثری داستان

Marfat.com

اس تعریف کی روشنی میں کلیلہ و دمنہ کو ہم حکایات کا مجموعہ کہہ سکتے ہیں جس میں جانوروں کو اخلاقی تلقین کے سلسلے میں انسانوں کی طرح گفتگو کرتے ہوئے بیان کیا گیا ہے۔ حکایت اور داستان کے فرق اور ان کے بیان کرنے والوں کے فرق اور تعریف میں ڈاکٹر گیان چند نے خوب لکھا ہے کہ " حکایت نویس ایک حکیم بزرگ ہوتا ہے داستان گو ایک رند خانہ سوز ہے[1]۔"

البتہ داستانوں کے لئے طوالت ہی زیادہ مناسب رہتی ہے کیونکہ اجمال میں داستان کا رنگ و روپ اور اس کی تحیر خیزی، سنسنی خیزی وغیرہ کو پورے طور پر بیان نہیں کیا جا سکتا لہذا ، طوالت حسن و خوبی کے سلسلے میں ایک معیار ٹھہرا۔ ڈاکٹر گیان چند لکھتے ہیں " اجمال میں داستان کا رنگ روپ اجاگر نہیں ہونے پاتا، مہمات کا تواتر، پیچیدگی، کشش و پیچ، استعجاب اور اضطراب یہ بھی تو داستان کے اجزاء ہیں، اور یہ سب اطناب میں ہی رونما ہو سکتے ہیں اس لئے عرف عام میں داستان کا اطلاق محض طویل داستان پر ہوتا ہے رواج عام کو آسودہ کرنے کے لئے ہم مختصر داستانوں کو رومانی کہانیاں کہہ سکتے ہیں کہانی چونکہ کہی جاتی ہے اس لئے وہ شیطان کی آنت نہیں ہو سکتی۔ رومانی کی صفت لگا کر ہم ایک طرف ان کہانیوں کا داستان سے رشتہ اتحاد ظاہر کرتے ہیں تو دوسری طرف انھیں حکایات سے بھی ممیز کر دیتے ہیں[2]۔"

جذب عشق داستان ہے یا رومانی کہانی

گزشتہ صفحات میں داستان اور رومانی کہانی کا فرق ظاہر کر دیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں جو مباحث زیر بحث آئے اس کے نتیجے میں ہم جذب عشق کو مختصر داستان یا رومانی کہانی قرار دے سکتے ہیں۔

جذب عشق میں نہ تو طویل داستانوں کی طرح کا تواتر اور پیچیدگی پائی جاتی ہے اور نہ ہی

۱۔ اردو کی نثری داستانیں صفحہ ۵۴ (۲) اردو کی نثری داستانیں صفحہ ۵۵

Marfat.com

اس میں قصہ در قصہ کوئی ایسا پھیلاؤ ہے، جو داستان کے بنیادی قصے کو بھی مربوط رکھتا ہو۔ اس کا قصہ اکہرا قصہ ہے جس میں کوئی ضمنی قصہ ساتھ ساتھ بیان نہیں ہوتا ہے اس میں نہ تو طوالت ہے اور نہ ہی پیچیدگی یا جہات کا تواتر، اس کا پلاٹ واحد ہے جس میں سیدھے سادے انداز میں عاشق و معشوق کا کردار، ان کی ملاقاتیں، ہجر و وصال وغیرہ کو مسلسل بیان کیا گیا ہے اور درمیان میں کوئی ذیلی قصہ نہ تو اس کو داستانوں کی طرح پھیلاتا ہے اور نہ ہی اس قصے کے تسلسل و تواتر میں کوئی انقطاع پیدا کرتا ہے اس فرق کو مزید واضح کرنے کے لئے یہ عرض کرتا چلوں کہ داستانوں میں واضح طور پر دو طرح کے پلاٹ ہوتے ہیں ایک تو واحد پلاٹ جس میں بغیر انقطاع واقعات اور ذیلی کہانیوں کے اصل قصہ بیان کیا جاتا ہے۔ دوسری قسم کے پلاٹ میں بنیادی پلاٹ بہت نحیف اور کاہیدہ ہوتا ہے اصل دلچسپی کی حامل ضمنی کہانیاں ہوتی ہیں[1]۔"

جذب عشق کو نثر اور نظم کے امتزاج سے لکھا گیا ہے بلکہ اس میں اشعار کی اس قدر بھرمار ہے اور نثر میں ایک بات کہہ کر اس کو اشعار کے ذریعے بیان کیا گیا ہے کہ اگر کوشش کی جائے تو ان اشعار کو علیحدہ کر کے اس کو صرف مثنوی کی شکل بھی دی جا سکتی ہے۔

حقیقت نے نثر اور نظم کی آمیزش سے اس قصے کو مرتب کیا ہے۔ اس عہد میں ہم اس کو ایک تجربہ قرار دے سکتے ہیں۔ اردو میں ایسی بہت سی داستانیں ملتی ہیں کہ جن میں کوئی کہانی وغیرہ بیان کر کے آخر میں مختلف اساتذہ کے چند اشعار دے دیئے جاتے ہیں۔ بعض حکایات کی کتابیں بھی ایسی ہیں کہ جن کے اخلاقی نتیجے کو حکایت بیان کرنے کے بعد، نظم میں پیش کیا گیا ہے مثلاً جیمز گلکرائسٹ کی جواہر اخلاق وغیرہ۔

حقیقت سے قبل داستانوں میں نظم و نثر کی آمیزش کے تجربات کربل کتھا گل بکاؤلی اور

---

[1] اردو کی نثری داستانیں ص ۵۹

وجہی کی سب رس وغیرہ میں بھی تھوڑے بہت ملتے ہیں۔ اس عہد میں شہادت نامول، واقعات کربلا پر مبنی داستانوں میں بھی یہی انداز پایا جاتا تھا اور اب تک بھی اس قسم کی کتابوں کا انداز یہی ہے علاقائی ادب میں ملتانی زبان کے ذاکرین آج بھی بالکل اسی انداز میں پڑھتے ہیں۔ یعنی پہلے نثر میں واقعے کو بیان کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ کثیر تعداد میں اشعار پڑھ کر اس واقعے کے تاثر میں شدت پیدا کرتے ہیں۔

جذب عشق کے پلاٹ کی انفرادیت

حقیقت نے آغاز داستان میں یہ کہا ہے کہ یہ داستان حقیقی ہے۔ ممکن ہے حقیقت نے اپنی داستان کی بنیاد کسی سچے واقعے پر رکھی ہو۔ لیکن اردو میں اس قسم کی کہانیاں مثنوی کی شکل میں موجود ہیں چنانچہ میر کی مثنوی "دریائے عشق" اور مصحفی کی مثنوی "بحر المحبت" کے نام پیش کئے جا سکتے ہیں۔ مصحفی نے تو خیر بحر المحبت، میر کی تقلید میں اس دعوے کے ساتھ لکھی ہے کہ وہ اس کہانی کو نیا حسن اور ندرت عطا کریں گے لیکن خود میر تقی میر کی مثنوی بھی طبعزاد نہیں ہے اور میر نے اس مثنوی کا خیال، مثنوی "قضاد قدر" سے لیا تھا جو ۱۱۱۲ھ میں تصنیف ہوئی تھی اور جسے تقریباً سو سال بعد میر نے اردو میں منتقل کیا تھا[1]۔ ڈاکٹر غلام مصطفٰے خاں نے بھی میر کی مثنوی کا ماخذ "قضاد قدر" کو قرار دیا ہے اور بعض دوسرے محققین نے بھی اس سے اتفاق کیا ہے اس سلسلے میں ڈاکٹر خواجہ فاروقی لکھتے ہیں۔ "میر نے عشق کی واردات اور دایہ کے قصے کا اضافہ کیا ہے[2]۔"

مذکورہ فارسی مثنوی کے علاوہ بھی قدیم دکھنی اردو میں ایسے کئی قصے موجود ہیں۔ جن کا پلاٹ اور انجام دریائے عشق اور حقیقت کی داستان "جذب عشق" سے مماثل ہیں۔ ان قدیم قصوں میں مقیمی کی چندر بدن و مہیار (۱۰۲۵ھ ۱۰۵۰ھ) اور دالہ کی مثنوی "طالب و موہنی" (۱۱۷۱ھ) وغیرہ

۱۔ رسالہ اردو اپریل ۱۹۵۱ء ص (۲)

Marfat.com

ہیں۔ چند ریلی و ہیاریں بھی عاشق و معشوق کی لاشوں کو ہم آغوش دکھایا گیا ہے جو مرنے کے بعد بھی جدا نہیں ہوتے اور انھیں اسی صورت میں دفن کر دیا جاتا ہے اسی طرح والہ کی مثنوی میں بھی عاشق و معشوق کا انجام یہی بیان ہوا ہے۔ میر کی مثنوی دریائے عشق اور حقیقت کی جذب عشق کا موازنہ آئندہ صفحات میں مناسب مقام پر آئے گا۔

جذب عشق اور مستعار اشعار

حقیقت نے اس داستان میں جابجا اپنے اور مختلف اساتذہ کے فارسی اردو اشعار دیئے ہیں۔ اس سلسلے میں جو بات سب سے زیادہ کھٹکتی ہے وہ یہ ہے کہ انھوں نے بعض جگہ تو صاحب شعر کے نام دے دیئے ہیں۔ اور اکثر جگہ اس بات کی وضاحت نہیں کی کہ وہ کن شعراء کے ہیں۔ اور اکثر جگہ اگر قاری کا حافظہ ساتھ نہ دے تو یہ التباس ہوتا ہے کہ جن اشعار کے شاعروں کے نام چھوڑ دیئے گئے ہیں وہ خود حقیقت کے اپنے ہوں گے لیکن ایسا نہیں ہے۔ اکثر اشعار دوسرے اساتذہ کے ہیں البتہ کچھ اشعار حقیقت کے اپنے بھی ضرور ہوں گے۔ داستانوں میں نثر کے ساتھ ساتھ شدت تاثر کے لئے مختلف شاعروں کے اشعار دیئے جانے کی روایت عام ہے۔ چنانچہ اردو میں بکثرت ایسی داستانیں پائی جاتی ہیں کہ جن کے مولف یا مترجم نے مختلف اساتذہ کے اشعار سے داستان کو مزین کیا ہے مثلاً نہال چند لاہوری کی مذہب عشق الموسوم بہ گل بکاولی۔ لیکن " مذہب عشق " میں مولف نے اس بات کا خیال رکھا ہے کہ جہاں جہاں بھی اساتذہ کے اشعار استعمال ہوں وہاں ان کے نام ضرور دے دیئے جائیں۔ اس داستان میں بیشتر اشعار تو میر حسن کے ہی ہیں۔ مذہب عشق وغیرہ میں ترتیب و تزئین کے اس سلیقے کو دیکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ چونکہ مذہب عشق، فورٹ ولیم کالج کے زیر اثر لکھی گئی تھی۔ اور اس ادارے اور اس سے متعلق مصنفین کی ادبی رہنمائی انگریز عالم کر رہے تھے لہذا انگریزی ادب کی بعض روایات اور تحقیق و تنقید کا مزاج ضرور اثر انداز ہوتا ہوگا چنانچہ اس قسم کا التزام، اس

Marfat.com

اثر کے تحت تھا البتہ مصنف نے میر کے اشعار اور اپنے استاد جرأت کے اشعار جہاں جہاں بھی دیئے ہیں وہاں ان کے نام ضرور بیان کر دیئے ہیں۔

جذب عشق کا اسلوب اور انشا

ڈاکٹر گیان چند نے داستانوں کی اہمیت کے دو پہلو بیان کئے ہیں "ادبی اور افسانوی.... ادبی پہلو اسلوب، انشا، منظر نگاری اور تہذیبی بیانات پر مشتمل ہوتا ہے۔ افسانوی پہلو سے مراد قصہ پن ہے[1]۔" ہم یہاں جذب عشق کا ان دونوں پہلوؤں سے جائزہ لیں گے۔

جذب عشق میں کئی اسلوب یکجا ہیں۔ اس کا اسلوب فارسی آمیز اور دقیق رنگین نثر کا بھی ہے اور اس میں ایسا اسلوب بھی نظر آتا ہے جو سادگی سے عبارت ہے۔ اور سادگی میں اس داستان کے بعض ٹکڑے فورٹ ولیم کالج کے زیر اثر لکھی جانے والی سادہ و سلیس نثر کے برابر ہیں۔ اس کو روایتی انداز میں لکھی ہوئی پُر تکلف اور مقفع طرز تحریر بھی قرار دی جا سکتی ہے کیونکہ اس کے بیشتر حصے کی امتیازی خصوصیت یہی ہے حقیقت کے اسلوب پر فارسی کا گہرا اثر ہے، جو اس زمانے میں ایک عام روش تھی اور اسی اندازِ بیان کو پسند کیا جاتا تھا اور ادبی معیار بھی یہی تھا۔ جذب عشق میں صفت و موصوف کی تبدیلی کے ساتھ فارسی مرکبات کا لہجہ اختیار کیا گیا ہے۔ شمالی ہند میں اس زمانے میں اردو نثر کے مزاج میں فارسی کے اسالیب اس حد تک رچے بسے تھے کہ وہ فطری طور پر اسی انداز کو اختیار کرتے تھے اور نثر میں اس قسم کی ترکیبیں عام طور پر لائی جاتی تھیں۔ یہاں جذب عشق سے فارسی مرکبات کی چند مثالیں دی جاتی ہیں۔ ان میں صفت، موصوف کے بعد لانے کا التزام ہے۔

• غم مفارقت یار و دیار کے۔"

۱۔ اردو کی نثری داستانیں ص۱۰۱

"گرفتاری اپنی سے لوگوں ناجنس میں۔"

• واسطے خالی کرنے دل پر اندوہ اور شگفتگی پانے غنچہ خاطر پژمردہ کے۔" وغیرہ وغیرہ

فنی نقطہ نظر سے سجع اور قافیے سے بے نیاز عبارت کو صرف رنگین نثر کہا جاتا ہے۔ جذب عشق کی نثر میں صرف رنگین نثر بھی ملتی ہے اور دقیق رنگین نثر بھی، رنگین نثر کی مثال ملاحظہ ہو۔

"القصہ بے یار دلنواز گلگشت باغ سے آتش اندوہ اور شعلہ زن ہوئی۔ بے اختیار بلبل زبان کو شاخسار بیان پر نغمہ سرا اس ترانے کا کیا۔" (جذب عشق ص۵)

"..... گر گل کو دیکھتا تھا گل رخسار کے غیرت گل کا یاد آتا تھا۔ اور اگر سرو پر نظر کرتا تھا۔ قد موزوں کسی رشک شمشاد کا جلوہ دکھاتا تھا۔ نظارے، نرگس نیم مست سے چشم کسی مے نوش کی آنکھوں تلے پھر جاتی تھی اور مشاہدہ سنبل سے ناگن زلف تابعدار کسی عنبریں موئے کی دل پر لہراتی تھی ناچار وہ گل رخسار لالہ وار داغ بر دل ....." (جذب عشق ص۲)

مقفیٰ نثر کی مثالیں:۔

"...... کہتے ہیں کہ مرہٹے کے لشکر میں ایک جوان رعنا تھا انگریز کا رفیق اور سراپا وہ دُر نایاب بحر حسن میں غرق، نہایت ہی حسین اور صاحب جمال، قیامت ہی لطیف طبع اور شیریں مقال سرو قد لالہ رخسار سراسر آفت اور قیامت رفتار، تیغ نگاہ، جلاد اور فتنہ انگیز خنجر ابرو سفاک اور خونریز......" (جذب عشق)

"..... کیا دیکھے کہ نیچے ایک درخت کے چار عورتیں پری صورت جو فی الحقیقت چار چمن گلستان رعنائی اور چار رکن قصر زیبائی کے تھیں چار بالش ناز و ادا پر جلوہ افروز دلبری اور دلربائی کی تھیں، اگرچہ ایک ایک ان چار میں عشوہ سنج اور کرشمہ ساز تھی لیکن وہ ماہ پیکر ان میں بلا اغراق کا ثانی تہ آفاق نہیں......" (جذب عشق)

Marfat.com

لفظی صنعتوں کا استعمال حقیقتؔ نے اس داستان میں لفظی صنعتوں سے بھی کام لیا ہے۔ لیکن ان لفظی صنعتوں کا استعمال کثرت سے ان کے ہاں نہیں ملتا۔ لفظی صنعتوں کے سلسلے میں سیاقۃ الاعداد کی مثال یہاں پیش کی جاتی ہے۔

"..... قضارا ایک جفاکار سیاہ باطن نے نہایت نامردی سے پیچھے سے آکر ایک لٹھ سر کو تاک کر مارا۔ پر وہ لٹھ خواہش الٰہی سے تلوار پر بیٹھا اور تلوار دو ٹکڑے ہوئی۔ نوجوان ناساعدت بخت واژوں اور نامددگاری چرخ بوقلموں سے لاچار ہو کر ششدر رہ گیا۔۔۔" (جذب عشق ص۱۱)

کاف بیانیہ کا استعمال:۔ حقیقتؔ نے جذب عشق میں کاف بیانیہ (کہ) کی جگہ لفظ "جو" کا استعمال کیا ہے۔ حقیقتؔ نے جس جس جگہ لفظ "جو" کا استعمال کیا ہے۔ حقیقت کے پیشرؤں کے ہاں نثر میں اس جگہ کاف بیانیہ ہی ملتا ہے۔ اس سلسلے میں حقیقت کی نثر اور دوسرے مصنفین کی نثر سے مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

کربل کتھا فضلی:۔ "..... یہ گوہر گراں بہا ..... کہ ..... بتائید بحر رحمت الٰہی صدف امید سے سلک عبارت میں منسلک ہوا ..... کہ ..... مبرا از کذب و گزاف۔"

سودا کے ہاں کاف بیانیہ کا استعمال:۔ "..... پس یہ چند مصرعے کہ از قبیل ریختہ ..... تحریر پائے یا مدوازہ رسوائی کے پاٹ ہیں ..... کہ ..... عمداً اپنے منہ پر رکھ لے۔"

نوطرز مرصع میں کاف بیانیہ کا استعمال:۔ تحسین کی نوطرز مرصع میں بھی اس کا استعمال یوں ملتا ہے: "..... محارسان شہر نے ..... کہ ..... بموجب حکم والی اس دیار کے مامور تھے ..."

دوسری جگہ ملاحظہ کیجئے:۔

" نوفل نے اس جھوٹے بدذات کے تئیں ..... کہ ..... گرفتار کرنا حاتم ..... کا مدعا رکھ کر بولا تھا۔

Marfat.com

اس سلسلے میں حقیقت کے ہاں کاف بیانیہ کا عدم استعمال قاری کو تعجب میں ڈالتا ہے۔ حقیقت
کے جذب عشق میں ان جگہوں پر لفظ " جو " کا استعمال تو کیا ہی ہے کہ جہاں اسے استعمال کیا جانا چاہیئے مثلاً
" و دریان سیری کے ..... جو..... متصل قصبہ جاتا ہے۔"
" ایک روز کمال سرفرازی ادھر سے ..... جو ..... بزرگوں کو خوردوں کے حال پر ہمیشہ مبذول
ہے....."

اب ایسی عبارت میں لفظ " جو " کا استعمال ملاحظہ ہو۔ اس جگہ لفظ " جو " کا استعمال کسی
طرح بھی مناسب نہیں ہے، اور یہاں کاف بیانیہ کا ہی استعمال ہونا چاہیئے تھا۔
" اس نوجوان نے ایک نعرہ مارا اور کہا ..... جو ..... اے حیوان مطلق۔" (جذب عشق ص۲۲)
" اتنے میں ایک عورت نے گھر میں سے اس نازنین کو پکارا، اور کسی کا نام لے کر کہا ..... جو
..... تو فلانی جگہ چل ....." (جذب عشق ص۳۳)
" کیا دیکھے کہ نیچے ایک درخت کے چار عورتیں پری صورت ..... جو ..... نہایت
اور چمن گلستان رعنائی اور حارر... ربائی کے تھیں۔" (جذب عشق ص۴۰)

شمالی ہند میں اردو نثر اور جذب عشق

شمالی ہند میں اردو نثر کے ارتقا کی ایک اہم کڑی
حقیقت کی جذب عشق بھی ہے جذب عشق کا سنہ
تصنیف ۱۲۱۲ ہجری بمطابق ۹۸-۱۷۹۷ ہے گویا اس داستان کے لکھے جانے کے تقریباً پانچ سال
بعد (۱۸۰۱ء) فورٹ ولیم کالج کا قیام عمل میں آیا جس نے شمالی ہند میں اردو نثر نگاروں کی ایک
ایسی جماعت پیدا کی جن کی نثر کا طرۂ امتیاز عام فہم اسلوب سلاست، روانی اور شگفتگی تھی جذب
عشق تحریر کئے جانے کے وقت شمالی ہند میں بعض ایسی داستانیں ملتی ہیں جن میں فارسی کے زیر اثر اسلوب
چھوڑ کر سادہ انداز بیان اختیار کیا گیا تھا۔ لیکن ان داستانوں کے مصنف، سادہ نثر لکھنے کی شعوری

Marfat.com

کوشش اور دعوے کے باوجود، فارسی تراکیب اور اسلوب کی فارسی ساخت سے اپنے آپ کو کلیتاً نہ بچا سکے ان معروف داستان میں میر عطا حسین خان تحسین اور مہر چند مہر کھتری کے نام لئے جاسکتے ہیں۔ یہ دونوں نثر نگار انگریزوں سے وابستہ تھے گو فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد اردو میں سادہ نثر نگاری کے آغاز کو متعین کیا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کالج کے قیام سے پہلے ہی انفرادی سطح پر انگریزوں سے میل میلاپ کے نتیجے میں یا ان کی فرمائش پر قدیم قصوں کو سادہ نثر میں لکھے جانے کی کوششیں کی جاتی رہی تھیں۔ چنانچہ عطا حسین کی نوطرز مرصع اور مہر چند مہر کھتری کا قصہ ملک محمد و گیتی افروز کی شہ ان اثرات کی نشاندہی کے لئے کافی ہے۔

اس کے علاوہ سودا نے بھی میر تقی میر کی مثنوی شعلۂ عشق کے قصے کو اردو نثر میں لکھا تھا شمالی ہند میں اردو نثر کے ارتقا کے مطالعے کے سلسلے میں میر عطا حسین خان تحسین کی نوطرز مرصع کو بنیادی اہمیت حاصل ہے اس کا آغاز ۱۷۶۸ء میں ہوا اور یہ داستان ۱۷۷۵ء میں اختتام کو پہنچی۔ جذب عشق کا سال تصنیف ۱۷۹۷ء ہے گویا جذب عشق، تحسین کی نوطرز مرصع کے تقریباً بائیس سال بعد لکھی گئی۔ اس عرصہ میں زبان و بیان اور اسلوب و انشا میں کافی تبدیلی آچکی تھی نوطرز مرصع کی اہمیت اپنی جگہ، لیکن اس کے اسلوب میں اس کی شہرت کے مقابلے میں سادگی بیان کم پائی جاتی ہے۔ یہ چار درویش کا قصہ ہے اور بقول ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی کے[۱]

" یہ تصنیف اپنے اسلوب کے اعتبار سے ان ہندوستانی فارسی ادیبوں کی یاد تازہ کرتی ہے جن کی کتابیں سہ نثری ظہوری، مینا بازار، شبنم شاداب، پنج رقعہ، بہار دانش وغیرہ، آخر عہد مغلیہ میں فارسی کی انشا پردازی کی سنگ میل سمجھی جاتی تھیں۔"

نوطرز مرصع کی زبان، جملوں کی ترکیب اور الفاظ کی نشست کے لحاظ سے فارسی کی نقل ہے

۱۔ نوطرز مرصع :- مرتبہ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی مطبوعہ ہندوستانی اکیڈمی، الہ آباد ۱۹۵۸ء ص ۴۰

Marfat.com

"مگر بالفعل، کہ درازی سررشتہ شب تارکی نے زنجیر بے خوابی کی (اردو)

اما بالفعل، کہ درازی سررشتۂ شب تار زنجیر بے خوابی (فارسی)

بیچ پائے استراحت کے ڈالی ہے اس سے صلاح وقت یہ ہے (اردو)

درمیان پائے استراحت افگندہ است ازیں صلاح وقت این است (فارسی)

"کہ واسطے شغل بیداری کے ہر ایک قفل گنجینہ زبان کے تئیں (اردو)

کہ پیر شغل بیداری ہر یک قفل گنجینہ زبان را (فارسی)

ساتھ کلید تشریح تفصیل قصہ و سرگذشت واقعی اپنی کے کھولے (اردو)

با کلید تشریح تفصیل قصہ و سرگذشت واقعی خود بگشاید (فارسی)

کہ اس وسیلے سے متاع فوائد صحبت سراپا برکت یک دیگر کی بیچ لذت تمنا کے (اردو)

کہ بدیں وسیلہ متاع فوائد صحبت سراپا برکت یک دیگر بسینہ تمنا (فارسی)

حاصل کریں یاران دیگر نے انگشت قبولیت کی اوپر دیدۂ رضا و رغبت کے (اردو)

حاصل کنیم یاران دیگر انگشت قبولیت بر دیدہ رضا و رغبت (فارسی)

کہ در لیا کر کہا منظا قہر
نہادہ گفتند چہ مضائقہ[1]

نوطرز مرصع کی طرح اردو میں جتنی داستانیں فارسی سے ترجمہ کی گئی ہیں ان کے اسلوب اور جملوں کی ساخت پر فارسی اسلوب کا اثر نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہی ہے کہ فارسی اسلوب کی تقلید ہی اظہار علمیت کا ذریعہ اور عام لوگوں میں پسندیدگی کا سبب تھی دوسرے ہمارے بعض مترجمین نے بھی آزاد ترجمہ کرنے کے بجائے لفظ بہ لفظ ترجمہ کرنے کی کوشش کی اور

۱۔ نوطرز مرصع مرتبہ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی ص؁

چونکہ اردو میں فارسی کے الفاظ بہ کثرت ہیں۔ لہٰذا صرف فارسی کے ان الفاظ کی تبدیلی کرکے کہ جو ناگزیر تھے باقی وہی الفاظ استعمال کر لئے جاتے تھے۔

نوطرزِ مرصع میں سادگی کی مثال

"نوفل نے اس بات کے سننے سے نہایت متحیر اور متعجب ہو کر اس جھوٹے بدذات کے تئیں کہ.... اشرفیوں کے لالچ میں گرفتار کرنا حاکم سے شخص مخیر کا روا رکھ بولا تھا کہ "عرش پہ جھنڈا ہم نے گاڑا..." بہت زجر و توبیخ سے کہا کہ "اے حارث ملعون! سچ کہہ یہ کیا حرام زدگی تھی کہ حاتم بے چارے پر وار کیا آپئے بیچے اشرفیاں موجود ہیں! اور مشکیں بندھوا کر ایسی ہی بالوں کاری کی کہ سر گنجا ہو کے مانند توبنے کے بن گیا[1]۔"

نوطرزِ مرصع میں اضافت کا استعمال بھی ابھی اردو نثر کے ارتقا کے ابتدائی عہد کی غمازی کرتا ہے۔ اسی طرح وہ فارسی الفاظ میں علامت کی جمع کی جستی کے لئے اضافت لگانے کے بجائے ہندوستانی بندشیں استعمال کرتے ہیں۔

تحسین کی نوطرزِ مرصع در حقیقت فسانۂ عجائب کے اسلوب کی ابتدائی صورت ہے۔ اس کی نثر کی سادگی کا چرچا عام ہے لیکن اس کی بنیادی اہمیت اصل میں اس وجہ سے ہے کہ شمالی ہند میں یہ پہلی نثری کتاب ہے جس میں ایک طرف وہ اسلوب بھی انگڑائیاں لیتا ہوا نظر آتا ہے۔ جو فسانہ عجائب کا پیش رو ہے۔ دوسری طرف اس میں بعض مقامات پر ایسی سادگی بھی ملتی ہے جس کی اعلیٰ ترین صورت میر امن کی باغ و بہار ہے۔ گو اس نثر کا انداز مغلق، دقیق اور رنگین ہے لیکن اس میں سرور کی نثر کی سی رنگینی، شستگی اور روانی و برجستگی بھی نہیں ہے اور ایسا نہ ہونا عین فطری بات بھی۔ ڈاکٹر گیان چند لکھتے ہیں "اس کی نثر اکھڑی اکھڑی غیر متوازن اور زیادہ فرسودہ ہے فسانہ عجائب

۱:۔ نوطرزِ مرصع۔ مرتبہ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی ص ۱۵۴، ۱۵۵ (۲)

Marfat.com

میں یہی نثر ایک مشاق استاد کے قلم سے رواں دواں ہو کر نکلتی ہے۔[1]"

شمالی ہند میں اردو نثر کے ارتقا کے مطالعے کے لئے مہر چند مہری کھتری کا نام نہایت اہم ہے جس نے نو طرز مرصع کے تحریر کئے جانے کے چودہ سال بعد قصہ ملک محمد و گیتی افروز" لکھا تھا اس قصے کو اردو نثر کے ارتقائی مطالعے میں نہ جانے کیوں اہمیت نہ حاصل ہو سکی حالانکہ سلاست و صفائی اور زبان کی خوبیوں کے اعتبار سے یہ کسی صورت فورٹ ولیم کالج کے مصنفین کی نثری کتابوں سے کم نہیں۔

مہر چند مہر کھتری نے یہ قصہ ۱۲۰۳ھ (بمطابق ۸۹-۱۷۸۸) میں لکھا تھا۔ مہر چند کھتری کی یہ نثری داستان اردو کی اہم ترین داستانوں میں اپنے زبان و بیان اور اسلوب کے نقطۂ نظر سے شمار کئے جانے کے قابل ہے۔ اس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

"ایک دن خورشید چہر برسات کے موسم میں موافق معمول کے اپنے محل میں آرام کرتا تھا کہ یکایک آندھی چلنے لگی اور ہوا کی شدت سے بادشاہ کی آنکھ کھل گئی۔ گھڑی دو ایک کے بعد (آندھی) تھم گئی اور ہوا موقوف ہوئی تو بادشاہ کے کان میں ایک عورت کی آواز آئی کہ آہ آہ کر کے کہتی تھی کہ میں جاتی ہوں کوئی ایسا ہے جو مجھے رکھ سکے۔ بادشاہ نے پلنگ پر لیٹے لیٹے پیہم دو تین دفعہ یہی آواز سنی پھر خوابگاہ سے نکل کر چھت پر آیا کہ آواز کا حال دریافت کرے۔ باہر نکل کر کیا دیکھتا ہے کہ زر یوند تیر کمان ہاتھ میں لئے کھڑا ہے اور چھوٹی چھوٹی پھوار پڑتی ہے اور چاروں طرف اندھیاری جھکی تھی کہ اپنا ہاتھ بھی نہیں سوجھتا تھا۔ زریوند نے برق کی چمکاہٹ میں دیکھا کہ کوئی محل سرا پر کھڑا ہے[2]"

ان دونوں مصنفین کی کتابوں پر بحث اور اقتباسات دینے کا مقصد بنیادی طور پر اردو نثر کے ارتقا اور اس کے حوالے سے حقیقت کے اسلوب نثر کا جائزہ لینا تھا۔ مہر چند مہر کھتری کی تصنیف

۱۔ اردو کی نثری داستانیں ص ۱۴۴ (۲)

Marfat.com

نوآئینِ ہندی یا قصہ ملک محمد و گیتی افروز کے سلسلے میں تو اکثر ناقدین متفق ہیں کہ اس کو وہ شہرت نہیں ملی کہ جس کی وہ حقدار تھی دوسری طرف تحسین کی نثر کو شمالی ہند میں اولیت کا فخر تو حاصل ہے لیکن مہر چند مہر کی داستان کا اندازِ بیان کی سادگی کا موازنہ میر امن کی باغ و بہار سے کیا جاسکتا ہے

حقیقت کی جذب عشق میں سادہ نثر بھی ہے اس لئے ہم اس کو تحسین کی نوطرز مرصع کی نثر کی ایک کڑی کہہ سکتے ہیں جس کی ارتقائی صورت سرور کے فسانۂ عجائب میں ملتی ہے۔

تحسین نے اپنی کتاب میں لکھا تھا "مضمون اس داستان بہارستان کے نیئں بھی بیچ عبارت رنگین زبان ہندی کے لکھا چاہیئے کیونکہ آگے سلف میں کوئی شخص موجد اس ایجاد تازہ کا نہیں ہوا۔" تحسین کے نزدیک ان کی یہ بزاردستی تھی اور اردو سیکھنے کے لئے اس کا مطالعہ مفید اور سود مند تھا۔ اٹھارویں صدی کے آخر تک بھی اردو میں نثر نگاری کو جدت اور ندرت سمجھا جاتا تھا لیکن فارسی ترکیبات اور استعارات کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا تھا لہذا شعوری یا غیر شعوری طور پر اردو میں لکھنے کا دعویٰ کرنے کے باوجود اس زمانے کے ہر مصنف پر فارسی اسلوب کا رنگ غالب رہتا تھا۔ چنانچہ تحسین، حقیقت اور سرور کے ہاں ہم یہ اثر نمایاں طور پر دیکھتے ہیں۔ ڈاکٹر سگیان چند لکھتے ہیں "نوطرز مرصع جس وقت لکھی گئی اس وقت تک اردو نثر کو علمی درجہ نصیب نہ تھا۔ نوطرز مرصع کے پون صدی بعد تک اردو کے شعرا اردو نثر کو مایۂ ننگ سمجھتے تھے۔ مثنویوں کی فصلیں کے عنوان فارسی میں لکھے جاتے تھے فارسی انشا پردازوں کی تصانیف شگرف نامہ، رقعہ، مینا بازار سہ نثر ظہوری وغیرہ کا بول بالا تھا۔ اردو میں نثر لکھی جاتی تو اس کے بغیر چارہ نہ تھا۔ نوطرز مرصع کا اسلوب سب سے زیادہ مغلق مصنوعی اور پر تکلف ہے اگر ایک طرف اس کتاب میں تشبیہ و استعارہ کی افراط، مبالغہ کی بلند پروازی، تخیل کی نکتہ رسی ہے تو ساتھ ہی ساتھ عربی و فارسی کے موٹے لغات، فارسی کے انداز پر جار و مجرور اور صفت کی ترکیب، توازن و ہمواری کا فقدان، تعقید

گنجلک بھی ہے قصہ تو فارسی سے لیا ہی ہے ان کی عبارت بھی اس انداز کی ہوتی ہے جیسے پہلے فارسی میں لکھ کر لفظی ترجمہ کیا ہو۔[۱]"

حقیقت بھی اس رنگین اردو نثری دبستان کے ایک اہم رکن ہیں۔ جذبِ عشق میں ہمیں وہ نقائص کم سے کم نظر آتے ہیں جن کی طرف اشارے کئے جا چکے ہیں۔

جذبِ عشق رنگین اور سادہ نثر کا امتزاج لئے ہوئے ہے۔ اس میں فارسی الفاظ کا بکثرت استعمال ہے اس میں صفت و موصوف کے استعمال میں فارسی اسلوب کی تقلید کی گئی ہے اور یہ فارسی مرکبات کے لہجے کی حامل ہے لیکن اس کے باوجود اس میں نوطرز مرصع کا سا کھردرا پن مغلق الفاظ تعقید، اور اکھڑی اکھڑی ہوئی کیفیت نہیں ملتی اور اس میں کسی قسم کا ابہام، ژولیدگی اور الجھاؤ نہیں پایا جاتا۔

جذبِ عشق میں اکثر مقامات پر رنگین نثر کے ساتھ ساتھ سادہ اور سلیس نثر بھی لکھی گئی ہے۔ اس کا معیار وہی ہے جو بعد ازاں فورٹ ولیم کالج کے مصنفین کی سادہ نثر کا متعین کیا گیا۔ فورٹ ولیم کالج کی نثری تحریک، انگریزوں کے زیر اثر شروع ہوئی تھی۔ تحسین نے نوطرز مرصع اور مہر چند مہر نے قصہ ملک محمد و گیتی افروز اپنے ان انگریز افسران کی ہدایت اور مشورے پر لکھی تھیں جن سے وہ وابستہ تھے۔ اس طرح اردو نثر کی یہ دونوں کتابیں بھی انگریزوں کی ہدایات پر لکھی گئیں جو ان سے اردو سیکھنا چاہتے تھے۔ کیا حقیقت نے کسی انگریز افسر کے مشورے پر یہ داستان لکھی تھی؟ اس کی وضاحت ان کی تحریر میں تو نہیں ملتی۔ حقیقت نے یہ مثنوی کرناٹک کے سفر کے بعد لکھی تھی۔ اس زمانے میں انھوں نے ایک انگریز افسر کی فرمائش پر ہشت گلزار کو فارسی نثر میں لکھا تھا۔ ممکن ہے جذبِ عشق کے تخلیقی محرک اور اس کے انداز بیان کے پس پشت ان کے اس انگریز

۱:۔ اردو کی نثری داستانیں صفحہ ۲۱۱

افسر کی فرمائش کو دخل رہا ہو جس کا تذکرہ ہشت بہشت کے سلسلے میں اوپر آچکا ہے۔ علاوہ ازیں اس امکان کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ حقیقت نے مستقبل قریب کے پسندیدہ اسلوب کا اندازہ لگا لیا ہو اور بدلتی ہوئی نثری ساخت کو شعوری طور پر استعمال کرنے کی کوشش کی ہو۔

جذبِ عشق سے سادہ نثر کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔ اس سادہ نثر کو ہم فورٹ ولیم کالج میں لکھی جانے والی نثر کا نقشِ اولین کہہ سکتے ہیں۔

" اور یہ بیدل مایوسِ وصال اس ریا سے ہو کر نظارے کی امید پر ٹھیک دوپہر کو عین شدت گرمی میں بام خانہ پر جو بلندی میں طعنہ زن الوند تھا، ساتھ تینوں ہمدم محرم کے چڑھ کر نگاہیں ناامیدانہ کرنے لگی[۱] "

جذبِ عشق میں مصنف نے لفظ "قدر" کو نذر کے معنوں میں استعمال کیا ہے

" اور واسطے ...... قدر ...... بھائی کے رکھتی تھی۔"

اسی طرح لفظ " فکر " کو جو عام طور پر مونث باندھا جاتا ہے بطور مذکر کے ایک شعر میں بیان کیا گیا ہے۔ مہ

بہے گا چشم سے خوناب دل کا
کروں گا فکر کیا بے تاب دل کا

اسی طرح گھر کو پلٹنا کے بجائے " گھر کو ہٹی " لکھا ہے۔ جواب متروک ہے۔

" بے حصول دولت وصال اور دلارام کے مایوس اور ناامید بحال تباہ جو بیان اس کا عزت دشوار ہے ..... گھر کو ہٹی ..... "

اکثر مقامات پر حقیقت نے ضرب المثل بھی استعمال کئے ہیں خلاؤں تھوڑی اور سانگ بہت۔"

---

۱. جذبِ عشق

Marfat.com

اور شیطان کے کان بہرے۔" وغیرہ

جذبِ عشق کا آغاز اُردو اور فارسی کی داستانوں اور مثنویوں کی طرح حمد باری تعالےٰ اور نعت رسولِ مقبولؐ سے ہوتا ہے اس داستان میں اشعار کثرت سے استعمال کئے گئے ہیں۔ اس کا قصہ اگر مکمل طور پر نہیں تو اپنے موضوع اور انجام کے اعتبار سے میر تقی میر کی مختصر مثنوی دریائے عشق سے ملتا جلتا ہے۔ عشق خانہ خراب کی نیرنگیوں کو ظاہر کرنے کے لئے حقیقت نے میرؔ کے "آبدار شعر" شروع میں دیئے ہیں۔ سہ

عشق ہے تازہ کار و تازہ خیال — ہر جگہ اس کی اِک نئی ہے چال
کہیں ناحق ہیں اس نے خون کئے — کہیں .... تیغ لئے
خار تعار دل عزیباں ہے ! — انتظار بلانصیباں ہے !
جس کو ہر التفات اس کا نصیب — ہے وہ مہمان چند روز غریب
عشق کے دلفگار سارے ہیں ! — اس نے کیا کیا جوان مارے ہیں
کہیں آنکھوں سے خوں ہو کے بہا — کہیں سر میں جنون ہو کے رہا
کہیں بیٹھے ہے دل میں ہو کر چاہ — کہیں رہتا ہے قتل تک ہمراہ
کشش اس کی ہے ایک اعجوبہ — ڈوبا عاشق تو یار بھی ڈوبا
ایسی تقریب ڈھونڈ لاتا ہے !! — کہ وہ ناچار جی سے جاتا ہے

حقیقت نے میر کے ان اشعار کو بیان کرنے کے بعد کہا ہے کہ "القصہ انہی واقعوں میں سے یہ بھی ایک عجیب واقعہ ہے۔" یعنی عشق و محبت کے دلگداز افسانوں میں اس قصے کو بھی شمار کیا جانا چاہیئے۔

میر نے اپنی تمام مثنویوں کے آغاز میں عشق کی ماہیت و کیفیت پر روشنی ڈالی ہے۔ اور

Marfat.com

عشق کی کرامات، وصفات کے اظہار کے طور پر کئی قصہ بیان کیا ہے۔ حقیقت نے بھی جذبِ عشق کے آغاز میں عشق کے جذبے، اس کی شوریدگی اور صفات وکرامات کے اظہار کے لئے میرؔ کے اشعار ہی دیئے ہیں۔ اصل داستان سے یہ حصہ علیحدہ ہے لیکن آگے چل کر جو دردانگیز واقعہ جس سبب سے رونما ہونے والا ہے یہ حصہ گویا اس کی تمہید ہے۔ داستان کی شدتِ تاثر کے سلسلے میں یہ ایک ناگزیر حصہ ہے۔

حقیقت نے جوان رعنا کی خوبصورتی ورعنائی نثر میں بھی بیان کی ہے۔ اور اس کی خوبصورتی کو نظم میں بھی بیان کیا ہے۔

"کہتے ہیں کہ مرہٹے کے لشکر میں ایک جوان رعنا تھا، انگریزہ کا رفیق اور سراپا وہ دُرِ نایاب بحرِ حسُن میں غرق نہایت ہی حسین اور صاحبِ جمال، قیامت ہی لطیف طبع اور شیریں مقال سرو قد اور لالہ رخسار سراسر آفت اور قیامت رفتار، تیغ نگاہ جلّاد اور فتنہ انگیز خنجر ابرو سفاک اور خونریز۔"

نظم میں اسی جوان رعنا کی خوبصورتی کو یوں بیان کیا ہے۔

یہ کیفی انکھڑیاں تھیں وہ خماری　　　کہ نرگس جس سے کھینچے شرمساری
یہ سج دھج اور یہ محبوب صورت　　　کہ تھا ایسا نہ کوئی خوبصورت
غرض صورت یہ تھی اوس دلربا کی　　　نمایاں جس سے تھی قدرت خدا کی
یہ سن چاردہ وہ رشکِ ماہ تھا　　　خجل دیکھ اوس کو ماہ چاردہ تھا
اگرچہ حسُن میں تھا آپ یکتا!　　　ولے دم مارتا تھا عاشقی کا

مثنوی دریائے عشق کے آغاز میں میر تقی میرؔ اپنی مثنوی کے جوان رعنا کی تصویر یوں کھینچتے ہیں۔

Marfat.com

ایک جا اک جوان رعنا تھا — لالہ رخسار سرو بالا تھا !!
عشق رکھتا تھا اس کی چھاتی گرم — دل وہ رکھتا تھا موم سے بھی نرم
تھا طرحدار آپ بھی لیکن ! — رہ نہ سکتا تھا اچھی صورت بن
دیکھتا گر کوئی وہ خوش پرکار — رہتا خمیازہ کش ہی لیل و نہار
سر میں تھا شوق، ذوق دل میں تھا — عشق ہی عشق آب و گل میں تھا

حقیقت اور میر کے ان اشعار کے موازنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حقیقت کے انداز بیان اور ان کے شعروں میں وہ تاثر نہیں ہے جو میر کے ان اشعار میں ہے۔

سمیری گاؤں کی تعریف

سمیری گاؤں کی تعریف حقیقت نے اس داستان میں منظوم بیان کی ہے۔ اردو میں بہت سی ایسی مثنویات ہیں جن میں شاعروں نے مناظر قدرت کی نہایت خوبصورت تصویر کھینچی ہیں اور اپنے الفاظ سے باغ کی ایک ایک روش کو زندہ کر دیا ہے۔ میر حسن کا سا انداز بیان تو اردو کے کم مثنوی نگاروں کو حاصل ہے لیکن حقیقت نے جہاں سمیری گاؤں کی تعریف کی ہے وہ بھی اپنے انداز بیان، جزئیات نگاری اور روانی کی بنا پر داد کی مستحق ہے۔

کہیں سبزہ ہے اور کہیں آبشار — کہیں ہیں درختاں خوش سایہ دار
یہ نقشہ ہے بستی کی تعمیر کا — کہ گویا اک عالم ہے تصویر کا
سر پا وہ اک کان ہے حسن کی — وہ بستی نہیں جان ہے حسن کی
ہر اک کوچہ اتنا ہی مرغوب ہے — کہ جیوں کوچۂ زلف محبوب ہے !
غرض جو گلی ہے سو گلزار ہے ! — بہار گل و رشک گلنار ہے۔

اسی طرح بھوانی باغ کے منظر کا بیان ملاحظہ ہو۔

Marfat.com

رکھے یہ رابنی کا سرد عالم   قد موزوں ہو جس کو دیکھ کر خم
سمن بالا و ریحاں ہم آغوش!   زمیں از سبزہ تر پرنیاں پوش
کسی جانب کو پھولوں کی مہک تھی   کسی جانب کو سبزے کی لہک تھی
ہر اک سنبل کا ایسا پیچ تھا خوب   کہ بل بل جائے جس پر زلف محبوب
جہاں میں باغ ایسا کوئی کم ہے!   نمونہ جس کا اک باغ ارم ہے

چشمۂ خوشگوار کا پانی، آب حیات کو شرمسار کر رہا ہے ۔

یہ جاں بخش وہ چشمۂ خوشگوار   کہ آب حیات اوس سے ہے شرمسار

میلے کا ہجوم باغ کی خوبصورتی میں اضافہ کر رہا ہے۔ پوجا پاٹ کرنے والوں اور بھوانی کے میلے میں شریک ہونے والوں کا ہجوم ہے۔ ہر ایک اپنے آپ میں مگن ہے۔ لوگ خوب بن سنور کر آئے ہیں۔ پری جمالوں کی آمد اور ان کی زرق برق پوشاکوں نے ایک سماں باندھ رکھا ہے حقیقت نے اس میلے کی جزئیات کو نہایت خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے۔ اس منظر کو بیان کرنے میں حقیقت نے حسب عادت مختلف شاعروں کے اشعار دیئے ہیں۔ ان میں سے جن اشعار کے شاعر کی شناخت میں حافظے نے مدد دی ہے۔ ان کے آگے شاعر کا نام بھی لکھ دیا گیا ہے۔

میلے کا منظر

لباس زری [illegible] ملبس تمام   بجے اور سجائے سبھی خاص و عام (میرحسن)
کوئی بت کی پوجا میں مالوف واں   کوئی یاد میں حق کی مصروف واں (")
کرے کوئی اشنان جا نہر میں   لب نہر اک اور ہے گہر میں
لڑا ئے ہے نظروں سے نظریں کوئی   لڑائے ہے آنکھوں سے آنکھیں کوئی

نوٹ: جیسا کہ صراحت کر چکا ہوں کہ حقیقت نے بہت سے دوسرے اساتذہ کے اشعار جذب عشق میں دیدیئے اور ان شعرا کے نام نہیں لکھے ہیں جس کی بنا پر التباس ہوتا ہے۔

Marfat.com

بجا دے کوئی دمدمے کوئی دف | بھبن بیٹھا گا دے کوئی اک طرف
کہے کوئی قصہ کرے کوئی نقل | جسے سن کے حیران رہ جائے عقل
ہنڈولوں پہ بیٹھے کئی رشک ماہ | دلوں کو تہہ و بالا کرتے تھے آہ
کہیں ریچھ بندر قلندر لڑائیں ! | مداری پریوں کے کبوتر بتائیں (میرحسن)
کہیں نٹ تماشا دکھاتے نیا | جواں کو دیا کوئی بوڑھا بنا
جدھر دیکھو اک پارۂ ماہ ہے | وہ مکھڑا کہ بس اللہ ہی اللہ ہے
دکھاوے کوئی اپنی چھب مسکرا | کوئی ناز سے لے بدن کو چھپا
جسے دیکھو اک آفت جان ہے | نہیں حسن اک گویا طوفان ہے
اگر دیکھو صورت نہ ہر ماہ کی | نظر آوے بس قدرت اللہ کی
ادھر اور ادھر آتیاں جاتیاں | پھریں اپنے جوبن کو دکھلاتیاں (میرحسن)

سراپا

حقیقت نے جذب عشق میں نثر کے تاثر میں شدت پیدا کرنے کے لئے جو اشعار دیئے ہیں وہ نہایت موزوں و مناسب ہیں اور ان کا استعمال برمحل ہے۔ اس کے علاوہ اس داستان میں جو سراپا کھینچا گیا ہے۔ وہ مختلف اساتذہ کے اشعار پر مشتمل ہے جہاں مختلف اساتذہ کے اشعار دیئے ہیں وہاں ان کے انتخاب میں ایک ہی بحر ہونے کی نزاکت بھی رکھی گئی ہے۔ ان منتخب اشعار میں کچھ تو مفاعلین مفاعلین مفعول کی بحر میں ہیں اس میں نعت اور حمد بھی شامل ہیں۔ لیکن بیشتر مفعولن مفعولن فعل کی بحر میں ہیں۔ جو مثنوی کی مرغوب و پسندیدہ بحر ہے۔ حقیقت کی اس محنت و جانفشانی کی داد دینی چاہیئے کہ انھوں نے ایک ہی بحر اور وزن کے مختلف فارسی اور اردو کے اشعار یکجا کر کے محبوب کا سراپا بیان کیا ہے۔ جذب عشق میں اشعار کے استعمال میں حقیقت نے شاعر کا نام نہیں بتایا لیکن سراپا میں انھوں نے اس بات کی

Marfat.com

صراحت کردی ہے کہ یہ سراپا مختلف اساتذہ کے اشعار کے ملا دینے سے ظہور میں آیا ہے۔

"اس لئے چند اشعار دُر نثار کو استادوں کے بیچ وصف سراپا اوس آفت جان کے لکھتا ہوں"۔ ؎

زسرتا پا فزودایم چو مویش | شوم روشن ضمیر از عکس رویش
عیاں یوں موئے سر تھے عنبر آلود | کہ جیسے شمع کی شعاع پہ ہو دود
زفرق او دو نیمہ نافہ را دل!! | درآوردہ بہ نافہ کار مشکل!!
پریشاں رخ پہ یوں زلفیں تھیں یکسر | رگ ابر سیہ ہو جیسے مہ پر!
نکرد دید از جبیں چوں ماہ ہمسر | زخجلت داغ بردل گشت یکسر
یہ خونریزی پہ تھے ابروئے پرخم | بیک جنبش کریں قتل دو عالم
دو گوش ایسے رکھے تھی وہ سمن بر | کہ پکڑیں جس کے آگے کان گلر د
کریں مژگاں جھپک کر کچھ جو تقریر | دلوں کے پار ہو ویں دشنۂ تیر
وہ کیفی اوس کی آنکھیں چشم بد دور | ہے نرگس جس کے آگے چشم بے نور
نگہہ کافر وہ گر جس سے لڑ جائے | تو گویا اوس پہ اک بجلی سی پڑ جائے
غرض وہ نرگ چشم ایسی ہیں خونریز | کرے ہیں خون ناحق دن میں سوبار
ابھی بلائے خون مرداں ہو!! | جو حق بینی نہ ان کے درمیاں ہو
بلندی حسن کی بینی دکھادے | بھڑک نتھنوں کی دل کو تلملائے
رخ اوس کا ایک شعلہ حسن کا تھا | نظر کو خیرگی جس سے ہو پیدا
جہاں میں شور سن کر اوس کے لب کا | گیا چرخ چہارم پہ مسیحا!
دے اوس کے تئیں شہد و شکر باج | در دنداں کو دے سلک گہر باج

Marfat.com

وہ دنداں آبدار اس سیم بر کے — کہ سوراخ اون سے ہیں دل میں گہر کے
مسی آلودلب پر رنگ پاں یوں[1] — سوادِ ابر میں قوس قزح جوں!
اگر تنگی دہن کی دیکھ پاوے — تو پھر خجلت سے غنچہ منہ چھپاوے
ادسے کیا کیا جھکاوے عشق اسے آہ — جسے چاہ زنخ کے اوس کی ہو چاہ
ہوئی غبغب سے خوبی اوس کی دونی — فقط یہ حسن ہی کی ہے فزونی!
قرارِ دل بود پایاب ایں جا! — کہ ہم چاہ است وہم گرداب ایں جا
نہیں گردن کی کچھ تعریف ہوتی! — وہ ہے گویا صراحی دار موتی
کہے وہ اس کی خوبی ہائے گردن — جو تیغ عشق سے کٹوائے گردن
اگرچہ اوس کی جگنی بھی بھلی تھی! — گلے کے ہار کی چمپا کلی تھی!
بر دوشش زدہ طعنہ سمنارا! — گل اندر جیب کردہ پیراہن را
یہ ساعد پر نزاکت تھی عذدار — رگ گل کی بھی نسبت جس پہ ہو بار
کلائی یہ کہ گویا وہ کلائی!! — خدا نے اپنے ہاتھوں سے بنائی
حنا سے سرخ یوں تھا پنجۂ ماہ — کہ جیوں خوش خط لکھیں سرخی سے اللہ
دو پستاں ہر یکے چوں قبۂ نور — حباب خاستہ از عین کافور!
یہ گورے گورے اونچے پیارے پیارے — کہ دیکھے سے ہو دل کو بے قراری
یہ پستاں اوس کے رکھتے تھے کہ سختی — دکھاوے جن کا عشق ایام سختی!
اگر دیکھے انھیں ناز ذاتی!! — عجب کیا وہ بھی کوٹے اپنی چھاتی
شکم تا سینہ لوح صاف ہے ایک — جو ہے اوس میں تو نون ناف ہے ایک

---

[1] میر حسن نے مسی آلودلب پر رنگ پاں کو یوں بیان کیا ہے ؎ سواد دیار بدخشاں کی شام

Marfat.com

بیانش ہوئے بل از موئے بیمیں — ز باریکی بر او از موئے سیمیں
کروں کیا ظاہر اب وصف نہاں کو — حیا دانتوں میں لاتی ہے زباں کو
سخن تم زساق اوکر چوں مست — بنائے حسن اس میں ستون مست
صفائی اوس کی رانوں نے یہ پائی — کہ جوں آئینہ میں صورت دکھائی
کہوں اوس پشت پا سا کیونکہ مہ کو — مقابل اوس کے ہووے منہ تو دیکھو
کف پا اوس کے ایسے پیچھے لال — کیا ہے خون ابھی گویا کر پامال !
یہ پوشاک اوس کی سے تڑپاتی ہے برق — کہ پیدا ہوئے پھر چھپ جائے ہے برق
یہ زرق و برق اور یہ غرق زیور — نہ ٹھہرے ٹک نگاہ اوس ماہرو پر
خرام اب کیا کہوں اوس فتنہ گر کا — کہ تھا ہر اک قدم پر حشر برپا
لکھوں کیا گفتگو کا یہ تھا انداز ! — کہ تھا ہر اک سخن میں عشوہ و ناز
ادا و انداز و شوخی دلربائی !! — ہر اک طناز نے اوس سے اڑائی
بہ گرمی حسن کی اوس نازنیں پر — کہ گویا مہ اتر آیا زمیں پر
سبھی حیرت سے اوس کے محو دیدار — وہ اک یوسف تھی اور لاکھوں خریدار
بہ سن و سال آں کافر ستمگار — مثال ماہ دو ہفتہ وہ و چار
نہ ہرگز بد دلش بارے نشستہ — نہ یکبار شش بپا خارے شکستہ !
بنود عاشق و معشوق کس را ! — ندارہ رہ بخاطر ایں ہوس را
زبیرنگ فلک آں ماہ غافل — کہ می آید بہ پیش اکنون مشکل [1]

۱۔ جذب عشق ص ۷، ۸، ۹

Marfat.com

جذبِ عشق کی ہیروئن

اردو ادب میں مثنوی زہرِ عشق کی ہیروئن کو اپنے کردار کی خصوصیات کی بنا پر نقادوں نے ایک مکمل ہیروئن قرار دیا ہے۔ جذبِ عشق کی ہیروئن بھی اپنی صفات میں ایک مکمل عورت کا کردار ہے۔ وہ بہادر اور نڈر ہے اور راہِ عشق کی سختیوں سے بھی آگاہ ہے۔ ہر چند کہ اس کا عشق ایک نظری عشق ہے۔ اور وہ اپنے محبوب کے بارے میں زیادہ نہیں جانتی۔ لیکن اسے اپنے محبوب کی محبت کا کامل یقین ہے اور کسی صورت نہ تو اس کے خلاف کسی بدگمانی کو اپنے دل میں راہ دیتی ہے اور نہ ترکِ عشق پر آمادہ ہے چنانچہ جب اس کی بے قراری کو دیکھتے ہوئے اس کی سہیلیاں اس کو صبر و ضبط کی تلقین کرتی ہیں اور اس کو اس اجنبی کی خاطر اپنی حالت خراب کر لینے پر برا بھلا کہتی ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی سہیلیوں کے لئے تو یہ نظارہ بازی محض ایک تماشہ کی صورت رکھتی ہے لیکن اس کے دل میں ہرجائی پن نہیں۔ بلکہ ایک ہی شخص کا ہو رہنے کی تمنا ہے۔ اپنی سہیلیوں کے جواب میں وہ کہتی ہے کہ نہ جانے اس یارِ وفادار پر کیا گزری ہو گی۔ ایک طرف وہ اپنی سہیلیوں کو ان کی نصیحتوں کے جواب میں کہتی ہے۔ ؎

کہیں ان کا بھی دل اب تو لگا دے مری بے تابیاں ان کو بتا دے
پڑے گر بارِ عشق ان پر یہ بھاری تو سمجھیں کچھ یہ میری بے قراری!
لگے دل ان کا اک خونخوار سے جب نصیحت اپنی یہ نہ کر رکھیں تب

پھر خیالِ محبوب سے مخاطب ہو کر یہ کہتی ہے۔ ؎

نہیں اب نیند بھی آتی مجھے ہائے جو دیکھوں خواب میں پائے تجھے ہائے
یہ کیسی کر گیا تو مجھ سے ظالم توقع تو نہ تھی یہ تجھ سے ظالم
نہیں کچھ بس مرا اب آہ چلتا کہ دل کو لے گیا اک راہ چلتا!

Marfat.com

بتا تو کب تلک تجھ سے رہوں دور
نہ رکھ اب تو مجھے اپنے سے مجبور

بلالے پاس مجھکو یا تو ہی آ !
بہر صورت مجھے صورت دکھا جا

نہ پاتی جب جواب اس سے تو روتی
یونہی رو رو کے اپنی جان کھوتی

خیال یار سے یہ تھی شکایات
کہ اس میں ہوئی سحر اور کٹ گئی رات

فراق

چھٹے دل سے ہزاروں بال تا لب
وہ لے دل جاتا تھا اوس کو یا لب

نہ آنکھیں دیکھتی تھیں صورت خواب
نہ تن میں کچھ رہی تھی طاقت و تاب

جلاتی تھی جگر کو آہ غم کی !
بسان برق تھی آہ اوس صنم کی

یہ سینے میں بھڑکتا تھا دل زار
قفس میں جوں ہو مرغ نو گرفتار

کبھی تھی نوحہ گر با دیدۂ تر !!
کبھی وہ پیٹتی تھی سینہ و سر

کبھی آنسو بہاتی چشم تر سے !
کبھی کہتی وہ کچھ دیوار و در سے

کبھی منہ نوچتی سر پیٹ بیٹھی
کبھی روتی تڑپتی جان دیتی !

کسی صورت نہ صدمہ غم کا جاتا
مگر آرام غش آتا تو آتا !

اگر بالفرض تھی وہ عید کی صبح
شب ماتم سے بھی گزری بہت تلخ

عجب حالت رہی تا صبح طاری
نہ تھا کچھ کام جز اختر شماری

یہ آخر کو اوس کا حال اور اک
گریباں صبح صادق نے کیا چاک

جذب عشق کی ہیروئن کا دل لہو لہو ہے۔ اور ساری رات اس نے محبوب کے فراق میں تڑپ کر کاٹی ہے لیکن احتیاط لازم ہے اور راز عشق کو چھپانا ہی عشق میں ضروری ہے لہذا وہ اپنی بے قراری کو جس صورت سے چھپاتی ہے وہ قابل داد ہے۔ سہ

Marfat.com

ہوئی جب صبح تب بستر سے اٹھ کر — سرشک چشم سے منہ دھو سراسر
ہوئی مشغول کاروبار خانہ — کہ تھی خود آپ ہی مختارِ خانہ
نہ ہو اس راز سے تا کوئی آگاہ — بہانے سینکڑوں کرتی تھی وہ آہ
سبھوں سے بولتی ہنستی بظاہر — نہ ہوں تا حالِ باطن سے وہ ماہر

لیکن مشہور ہے کہ عشق اور مشک نہیں چھپتے ؎

چھپاتی تھی وہ گو حالِ دلِ زار — کہیں چھپتے ہیں عشق و مشک پر یار
وہ تا مقدور رکھتی تھی چھپائے — دے سر پیر واں ہر دم نہ جانے
سرشک سرخ وہ رنگ زرد اس کا — بتاتا انتہائی درد اس کا
جو دانا تھے وہ اس کو بھانپ گئے تھے — جو تھے ناداں وہ سب گھبرا رہے تھے

عاشق کے ڈوبنے سے قبل جب مقررہ مقام پر تالاب کے کنارے ہیر دُن اپنے محبوب سے ملنے آتی ہے تو وہاں موجود ہجوم کو پا کر نہ تو گھبراتی ہے اور نہ ہی ملاقات کا ارادہ ملتوی کیا محبوب سے ملاقات کرتی ہے۔ اور کہتی ہے کہ میں خلق میں تمھارے لئے بدنام ہوئی لیکن اس کا کیا خطرہ عاشقوں کو بدنامی سے نام آوری ہے اگر عاشق ننگ و نام سے گزرے اور قید ناموس میں رہے تو اس کو فرقہ عشاق میں سب نام رکھیں۔" جب اس کے عزیز نوجوان کو قتل کرنا چاہتے ہیں اور وہ ڈوب جاتا ہے تو یہ نازنین بھی اپنے قول سے پیچھے نہیں ہٹتی اور آخر ایک دن آکر اسی تالاب میں ڈوب جاتی ہے۔ جذب عشق کی ہیر دُن راہ عشق میں ثابت قدم رہتی ہے۔

نوجوان کا کردار

جذب عشق میں یہ بات تو واضح ہے کہ ہیر دُن مذہباً ہندو ہے لیکن ہیرو کے مذہب کے بارے میں کوئی صراحت نہیں ملتی۔ چنانچہ یہ وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ آیا ہیرو بھی ہندو ہے البتہ اسے مرہٹہ لشکر کا ایک سپاہی

Marfat.com

بتایا گیا ہے لیکن بعض مسلمان افراد بھی مرہٹوں کے لشکر میں شامل ہوتے تھے۔ بہرحال اس بات کی اتنی زیادہ اہمیت نہیں ہے کیونکہ عشق ان تمام باتوں سے بالاتر ہوتا ہے اس داستان کا ہیرو ایک مکمل ہیرو ہے۔ اور اس کی پاکدامنی اس کو عام داستانوں کے ہیروؤں سے ایک علیحدہ اور امتیازی مقام عطا کرتی ہے۔ اس داستان میں بھی اظہار عشق عورت کی طرف سے ہے ایک ہندو عورت کی طرف سے، ہندی شاعری میں بھی عورتوں کو ہی عاشق بتایا گیا ہے۔ جذبۂ عشق میں وصل کے اعتبار سے عام داستانوں کی سی فضا ہے۔ یعنی ہیروئن سپردگی کا شدید جذبہ رکھتی ہے اور اکثر مقامات پر ہیرو کو دولت وصل سے شاد کام ہونے کا مشورہ دیتی ہے۔

اس کی بے قراری کو بیان کرتے ہوئے خود مصنف نے اسے عاشق ہی ظاہر کیا ہے " عزیزو اس عاشق زار نے یہ پیغام شکوہ آمیز اپنے معشوق کا جو مقام لیلائی سے نکل کر دشت مجنوں میں قدم زن تھی " چنانچہ اولین ملاقات میں ہی داستانوں کی روایت کے مطابق جذبۂ عشق کی ہیروئن دعوت شب بسری دیتی نظر آتی ہے۔

" یکدم کلبۂ احزاں اور تاریک میرے کو نور قدم نے رشک افزائی شب ماہ کا کیو۔۔۔۔۔" سہ

بھلا آپس میں مل بیٹھیں کوئی دم — کہ پھر پیارے کہاں تم اور کہاں ہم
غنیمت ہے جو کوئی دم دید کر لیں — شب ماتم کو روز عید کر لیں!

لیکن ہیرو اس مرحلے پر اس دعوت کو قبول نہیں کرتا۔ داستان میں بہت سے ایسے نازک موقع آتے ہیں جب ہیرو اس دعوت کو قبول کر کے اپنے آپ کو وصل کی دولت سے شاد کام کر سکتا ہے لیکن اس کا عشق سچا ہے اور وہ بوالہوس نہیں۔ اس اعتبار سے وہ اردو کی عام داستانوں کے روایتی ہیروؤں سے بالکل مختلف نظر آتا ہے۔

Marfat.com

اور موقع پر وہ اپنی محبوبہ کی دعوت کو نہایت خوبصورتی سے ٹال دیتا ہے۔ بار بار اس کی محبوبہ کی طرف سے اصرار ہوتا ہے کہ "اے خدا ناترس جلدی اپنی دولت وصل سے خرسند کر۔۔" لیکن اس کے پائے ثبات میں لغزش نہیں آتی او ہوس پہ ہمیشہ عشق غالب آتا ہے اور وہ جواب دیتا ہے" بہتر ہے کہ ابھی اس قدر تعجیل کو کام مت فرما کس لیئے جو

بمطلب می رسد جویائے کام آہستہ آہستہ زدریا می کشد صیاد دام آہستہ آہستہ

مجھکو تو فریق بحر تفکر کا جان جو شبانہ روز اسی منصوبے میں غرق ہوں جو کیونکر نہال وصال تیرے سے متمتع اور کامیاب ہوں پر تو دل قوی رکھ جو اگر تقدیر سے تدبیر لڑ جاتی ہے تو کوئی دم کو بے زحمت اغیار تا ابد دولت ملاقات یکدگیر سے بہرہ مند ہوتے ہیں۔ ۔

زار نالے نہ کر شکیبا ہو !! عشق کا تا نہ کام رسوا ہو !!"

گو ہیرو بھی انسان ہے۔ اور اس کی بھی حالت عشق میں بری ہے۔ لیکن ہر مرحلے پر وہ جنسی بے راہروی سے بچ جاتا ہے اور آخر کار راہ عشق میں مردانہ وار جان دے دیتا ہے۔ ہیرو کے اسی کردار اور عمل کی بنا پر جذب عشق کا ہیرو، عام داستانوں کے ہیرو سے علیحدہ اور ممتاز نظر آتا ہے۔ دشمنوں سے مقابلہ کرنے سے وہ نہیں ڈرتا۔ اس وقت بھی وہ گھبراتا نہیں اور اپنی محبوبہ کو مقام فساد سے دور چلے جانے کو کہتا ہے وہ ہمت، شجاعت، بہادری، نیک نفسی اور پاکیزگی کردار کا نمونہ ہے۔ اپنی بہادری اور جوش کے عالم میں وہ یہ بھی بھول جاتا ہے کہ اسے تیرنا نہیں آتا۔ لیکن دشمن کے تعاقب کو ترک کرنا وہ بہادری کے لئے عار سمجھتا ہے چنانچہ اپنے ہی جوش و جذبے کے سبب تالاب میں ڈوب جاتا ہے۔

گزشتہ صفحات میں بیان کیا جا چکا ہے کہ اس کا انجام میر تقی میر کی مثنوی دریائے عشق سے ملتا ہے۔ حقیقتاً تینے ہیرو کی موت کے سلسلے میں جو اشعار دیئے ہیں وہ بھی دریائے عشق

Marfat.com

سے ہی لئے ہیں۔ اور بعض اشعار حقیقت کے اپنے ہیں

میر کی مثنوی دریائے عشق کے انجام سے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

خلق یکجا ہوئی کنارے پر !　　　حشر برپا ہوئی کنارے پر !
نکلے باہم دبے موئے نکلے　　　دونوں دست و بغل ہوئے نکلے
جو نظر ان کو آن کرتے تھے　　　ایک قالب گمان کرتے تھے

جذب عشق کا انجام ملاحظہ ہو۔ اس میں میر کے اشعار بھی مصنف نے شامل کر دیئے ہیں۔ سه

اب و عم مادر و برادر سب !　　　خاک افشاں و نالہ آہ بہ لب
آئے نوحہ گر وہاں سبھی گریاں　　　آتش غم سے دل جگر بریاں
خلق یکجا ہوئی کنارے پر　　　حشر برپا ہوئی کنارے پر
دام داروں سے سب نے کام لیا　　　آخر اونکو اسیر دام کیا !
نکلے باہر دبے موئے نکلے　　　دونوں دست و بغل ہوئے نکلے
ربط چسپاں بہم ہویدا تھا !!　　　مر گئے تب بھی شوق پیدا تھا
ایک کا لب تھا ایک کی بالیں　　　ایک کے لب سے ایک کو تسکین
جو نظر ان کو آن کرتے تھے　　　ایک قالب گمان کرتے تھے
مل رہے تھے یہ دونوں وصلی دار　　　کہ جدا ہونا ان کا تھا دشوار !
کیوں نہ دشوار ہووے ان کا فصل　　　جان دے دے ہوا ہو جن کا وصل
حیرت کار عشق سے مردم　　　شکل تصویر آپ میں تھے گم

حقیقت نے بھی میر کی مثنوی کی طرح آخر میں عشق کی تاثیر بیان کی ہے لیکن ان اشعار

Marfat.com

میں وہ سوز و گداز، تاثیر اور روانی نہیں ہے جو میر کے ہاں ہے۔ سہ

فقط یہ کیا محبت سے ہوا ہے — محبت نے تو کیا کیا کچھ کیا ہے !
محبت ہے اک آفت سے عبارت — محبت نے کیا لاکھوں کو غارت
محبت ہے وہ کچھ جس نے کہ ناگاہ — ملا دیں خاک میں یہ صورتیں آہ
نہ چھوڑے پر نہ چھوڑے جان و دل عشق — کہ ہے غارت گر ایمان و دل عشق !
یہ آتش کب بجھے ہے کے جانو ! — اس آتش نے جلایا اک جہاں کو
سبھی کچھ پھونکدے جیدھر ہو سرکش — یہ آتش ہے یہ آتش ہے یہ آتش
یہ آتش جس کے سر پر شمع ساں ہے — تو یہ بھڑکے کہ قدموں سے گزر جائے
بیاں کس سے ہو اس آتش کی طاقت — غرض یہ آگ ہے سوز محبت
محبت نے بہت بے جاں کئے ہیں — کہوں کیا کیا جو کارستاں کئے ہیں
نہو جو قائل تاثیر عشق آہ ! — سنے وہ آگے یہ احوال جانکاہ

تاثیر عشق کے بیان میں میر تقی میر کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

عشق ہے تازہ کار و تازہ خیال — ہر جگہ اس کی اک نئی ہے چال
کہیں ناسق ہیں اس نے خون کئے — کہیں . تیغ لئے
خارِ خارِ دل غریباں ہے۔ — انتظار بلا نصیباں ہے !
جس کو ہو التفات اس کا نصیب — ہے وہ مہمان چند روزہ غریب
عشق کے دلفگار سارے ہیں — اس نے کیا کیا جوان مارے ہیں
کہیں آنکھوں سے خون ہو کے بہے — کہیں سر میں جنون ہو کے رہے
کہیں بیٹھے ہے دل میں ہو کر چاہ — کہیں رہتا ہے قتل تک ہمراہ
کشش اوکی ہے ایک اعجوبہ — ڈوبا عاشق تو یار بھی ڈوبا !

Marfat.com

مثنوی ہشت گلزار

مثنوی ہشت گلزار حقیقت کی سب سے طویل مثنوی ہے۔ اس مثنوی کا تنقیدی جائزہ لینے سے قبل یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مختصراً اردو مثنوی کی روایات اور تاریخ پر ایک نظر ڈال لی جائے۔

اردو مثنوی کی تاریخ

اردو کی دیگر اصناف شاعری کی طرح مثنوی بھی فارسی کی تقلید میں لکھی گئی۔ فارسی زبان کی مثنویوں کے موضوعات متنوع تھے۔ رزم و بزم اخلاق و تصوف اور عشق و عاشقی ان مثنویوں کے موضوع تھے۔ اردو میں بھی ابتدائی دور میں کم و بیش تمام موضوعات پر مثنویاں لکھی گئیں۔ لیکن رفتہ رفتہ تہذیبی زندگی کے عروج اور شخصی حکومتوں میں تکلف و تصنع اور مجلسی زندگی کی رنگینیوں نے تمام مثنوی نگاروں کی توجہ عشق و عاشقی تک محدود کر دی۔

اردو کی سب سے پہلی مثنوی فخر دین نظامی کی کدم راؤ پدم راؤ ہے۔ جو ۸۶۵ھ اور ۸۶۷ھ کے درمیان لکھی گئی۔ اس کے بعد ابتدائی دکنی دور کی مثنویاں معرفت و سلوک اور مذہبی عقائد پر مشتمل ہیں۔ اشرف، فیروز بیدری، خوب محمد چشتی شمس العشاق میراں جی اور شاہ برہان الدین کے بعد نمایاں مثنوی نگاروں میں ملا وجہی کا نام سرفہرست ہے۔ وجہی کے بعد لکھی جانے والی مثنویوں میں معدودے چند کے علاوہ

Marfat.com

بیشتر مثنویوں کا موضوع عشق و رومان ہے۔ ایسی مثنویوں میں پیلے مجنوں، طوطی نامہ سیف الملوک و بدیع الجمال، چندربدن مہیار، بہرام و حسن بانو، پھول بن، وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

دکن ہی میں سترھویں صدی میں سماجی و سیاسی حالات کے اثرات سے متاثر ہو کر متصوفانہ مثنویاں بھی لکھی گئیں۔ نقادوں کا متفقہ فیصلہ ہے کہ اس دَور میں چند بہترین متصوفانہ مثنویاں لکھی گئیں۔ جن میں ذوقی کی وصال العاشقین ہاشمی کی جیت نگن، اور بحری کی من لگن خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ عشقیہ مثنویوں میں سراج کی "بوستانِ خیال" نہایت اہم ہے۔

مثنوی شمالی ہند میں

شمالی ہند کی پہلی مثنوی افضل کی بکٹ کہانی ہے۔ شمالی ہند کی متصوفانہ مثنویاں، دکنی مثنویوں کے مقابلے میں بلندپایہ نہیں ہیں۔

شمالی ہند کی پہلی قابلِ ذکر مثنوی نقادوں کے خیال میں شاہ حاتم کی بہاریہ مثنوی ہے۔ یہ مثنوی بھی بہت زیادہ طویل نہیں ہے۔ عہد محمد شاہی میں میر فضائل علی کی مثنوی قابلِ ذکر ہے۔

اس کے بعد میر و سودا کا دَور مثنوی نگاری کا بھی بہترین دور ہے۔ اس عہد کو شمالی ہند میں دبستانِ دہلی کی مثنوی نگاری کا زمانہ شباب کہا جاسکتا ہے۔ اس دَور میں مثنوی کے موضوع متنوع ہیں۔ ڈاکٹر گیان چند لکھتے ہیں "سودا اور میر کے یہاں مثنوی کا موضوع بے پایاں ہو گیا۔ سودا نے مثنوی کو ہجو، اخلاق، ادبی تنقید موسم، خط و کتابت، مدح وغیرہ کے اظہار کا ذریعہ بنا دیا۔ میر نے جانوروں کے

Marfat.com

احوال، گھر کی حالت، شکارنامہ، بیان مرغ بازاں، بے ثباتی دنیا، ہولی، جشن شادی ہجو و مدح وغیرہ کے موضوعات پر کچھ لکھ کر مثنوی کی افادیت اور صلاحیتوں کو اجاگر کیا۔"

لیکن اس قدر متنوع موضوعات کے باوجود اس دور کی مثنوی نگاری کی خصوصیت اس کی رومانیت اور میر و سودا کی مثنویوں میں پایا جانے والا سوز و گداز، دلی کے دبستان شاعری کے مزاج کی غمازی کرتا ہے۔

میر کی تقلید میں یا اس سے متاثر ہو کر راسخ عظیم آبادی، قائم چاندپوری اور مصحفی نے مثنویاں لکھیں۔ ان کے بعد حکیم بسمل فیض آبادی، اعظم الدولہ سرور دہلوی جعفر علیخاں راغب، قاضی محمد صادق اختر اور طالب علی عیشی کی لکھی ہوئی مثنویاں ملتی ہیں۔ یہ سب شعرا ناسخ و آتش کے ہم عصر تھے۔ اور اردو مثنوی کے ارتقا میں ان کا نام ناگزیر ہے۔

ادھر لکھنؤ میں میر حسن نے سحر البیان لکھ کر مثنوی نگاری کا ایک معیار قائم کیا۔ لیکن کوئی بھی اس کی تقلید میں کامیاب نہ ہو سکا اور رفتہ رفتہ درباری اور عام لکھنوی مذاق سخن نے جس طرح شعرا کو متاثر کیا اس کا اثر غزل گوئی کے ساتھ ساتھ مثنوی نگاری پر بھی پڑا۔

لکھنؤ کے دبستان شاعری میں سحر البیان کے بعد دوسری اہم ترین مثنوی گلزار نسیم ہے۔ سحر البیان اگر سادگی میں ممتاز ہے تو گلزار نسیم تخیل، حسن تعلیل رعایت لفظی، ایہام وغیرہ کے سبب نمایاں ہے۔ اس میں لکھنؤ کی زبان کے بہترین

۱:- شمالی ہند میں مثنوی کا ارتقا صـ ۱۲۵۔ مطبوعہ انجمن ترقی اردو علی گڑھ۔

Marfat.com

نمونے ہیں۔ لکھنؤ کے خاص قسم کے تہذیبی ماحول میں اس کے بعد آنے والے مثنوی نگاروں کو گلزار نسیم کی مرصع بیانی پسند آئی۔

گلزار نسیم لکھنوی مثنوی نگاری کا نقطۂ عروج ہے۔ مرصع بیان کے اعتبار سے بھی بعد کے مثنوی نگار اس پایے کی مثنوی نہ لکھ سکے۔

اس دور کے نمایاں مثنوی نگاروں میں تلق، نواب محبت خان محبت، میر محمد حسین عرف تجلّی، اور میر غلام علی عشرت وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

تقریباً اسی دور میں ایک نمایاں نام شاہ حسین حقیقت کا ہے۔ شاہ حسین حقیقت کی طویل مثنوی "ہشت گلزار" میں دبستان لکھنؤ کی رنگینی اور عبارت آرائی کے ساتھ ساتھ صفائی بیان اور سادگی اور منظر نگاری کی خوبیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ ان کی مثنوی ہشت گلزار امیر خسرو کی مثنوی "ہشت بہشت" کا آزاد ترجمہ ہے جس کے اشعار کی تعداد چار ہزار سے زیادہ ہے۔

ڈاکٹر گیان چند جین نے اپنی عالمانہ کتاب "شمالی ہند میں اردو مثنوی کا ارتقا" میں بہت سے لکھنوی مثنوی نگاروں کا تذکرہ کیا ہے اور ان کے فنی کارناموں کی قدر و قیمت کا یقین کیا ہے۔ لیکن حیرت ہے کہ وہ شاہ حسین حقیقت کو بالکل ہی نظر انداز کر گئے ہیں۔ حالانکہ حقیقت بھی لکھنؤ کے اہم مثنوی نگاروں میں شمار کئے جانے کے قابل ہیں۔ آئندہ صفحات میں ان کی مثنوی ہشت گلزار کا جائزہ لیا جائے گا۔

Marfat.com

شاہ حسین حقیقت کی یہ مثنوی چار ہزار سے زائد اشعار پر مشتمل ہے۔ حقیقت نے یہ مثنوی اپنے سفر کرناٹک کے دوران نواب عبدالقادر خاں بہادر ثابت جنگ ابن نواب والاجاہ والی کرناٹک کی خدمت میں پیش کرنے کی خاطر لکھی تھی۔

مندرجہ ذیل شعر سے اس مثنوی کا مادہ تاریخ تصنیف برآمد ہوتا ہے۔ جو ۱۲۲۵ھ ہے

ع مثنوی یہ جو گل سے ہے رنگین　　ہے گل نو بہار خلد بریں

تاریخ تصنیف کے سلسلے میں حقیقت لکھتے ہیں۔ ع　۱۲۲۵ھ

نامۂ نامی جب ہوا یہ طے　　سنہ تھے پچیس اور بارہ سے ۱۲۲۵

ختم جس روز مثنوی یہ ہوئی　　گیارہویں تھی ربیع الاول کی

یہ طویل مثنوی حقیقت نے صرف تین ماہ کے مختصر سے عرصے میں لکھی تھی جس سے ان کی زود گوئی اور قادر الکلامی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس مثنوی کا ماخذ امیر خسرو کی مثنوی ہشت بہشت ہے۔ اردو نظم میں ڈھالنے سے قبل حقیقت نے خسرو کی اس مثنوی کو کڈ نامی ایک انگریز کی فرمائش پر جو ہولکر کی فوج میں جنرل کے عہدے پر فائز تھا۔ آسان نثر میں لکھا تھا۔

طباعت

ہشت گلزار مطبع مصطفائی سے شائع ہوئی۔ اشرف علی اشرف نے اس کی تاریخ طباعت کہی جس سے سنہ طباعت ۱۲۶۷ برآمد ہوتا ہے

کیا چھپی مثنوی حقیقت کی!　　کھل گیا جس سے لالہ زار طبع

لکھا اشرف نے مصرع تاریخ　　ہشت گلزار ہے بہار طبع

۱۲۶۷ھ

وجہ تالیف حقیقت مثنوی کی وجہ تالیف یں لکھتے ہیں :-

بولا اے جوہری دُرِ سخن ! — ہے تجھے یاد شاعری کا فن
شعر تو لعل و دُر سے بہتر ہے — کب وہ لعل و گہر برابر ہے
ہیں ترے پاس اب جو دُرِ ثمین — آج شاہوں کے گنج میں تو نہیں
بے بہا گوہر خوش آب ہر ایک — درخور گوش آفتاب ہر ایک
ایسے کمیاب دُرِ بیش بہا ! — دُرجِ دل میں ہیں کیوں چھپائے بتا
ہیں پر آنسو تیرساں یکسر — منسلک اون کو بسلک نظم میں کر
بے خطر جا پھر اس جناب کو تو — نذر دے اون در خوش آب کو تو
بس یہی تیرے تئیں وسیلہ ہے — بلنے کا واں یہ روز حیلہ ہے
کیونکہ وہ قدردانِ فیض ہنر — مشتری سخن ہے شام و سحر
ہے سخن کا بجان و دل خواہاں — ہے خریدار وہ سخن کا بجان[۱]

ماخذ اس مثنوی کا ماخذ امیر خسرو کی فارسی مثنوی ہشت بہشت ہے جو قصہ بہرام گور کے نام سے بھی مشہور ہے۔ بہشت گلزار نام کی کئی اور مثنویاں بھی موجود ہیں۔ جو دوسرے شاعروں کی لکھی ہوئی ہیں۔ دکنی شاعر یقینی کی ایک مثنوی بھی ہشت گلزار کے نام سے ملتی ہے۔ لیکن نام کی اس یکسانیت کے باوجود اس کا موضوع تصوف ہے۔ اسی طرح سندھی زبان میں بھی میر ٹھٹھوی کی ایک مثنوی ہشت بہشت کے نام سے موجود ہے۔

۱۔ بہشت گلزار ص۲

Marfat.com

حقیقت کی یہ مثنوی طبع زاد نہیں ہے۔ انھوں نے اعتراف کیا ہے کہ ان کی حیثیت اس نظم کے مترجم کی ہے۔ گو یہ ترجمہ لفظی نہیں آزاد ہے۔ چنانچہ حقیقت لکھتے ہیں سہ

گو کہ ہے خوب یا کہ ہے یہ زشت
لیک قصہ ہے یہ بہ ہشت بہشت

خسرو شاعراں نے جس کو کہا
فارسی کی زبان میں سرتاپا!

پیش ازیں اوس کو ہیں بہ نقش و نگار
فارسی میں کیا تھا نثر اے یار

نثر بھی ایسی ہی ہوئی وہ رقم
نثر جس پر نثار ہے ہر دم

طوطی ہند کا میں خوشہ چین
ہندی میں اب لکھوں ہوں اوس کے تئیں

ترجمہ اس کا میں نہیں کرتا
پر وہ قصہ کروں ہوں نظم جدا

ریختی کی زبان میں باانداز!
خوش ہو سن جس کو بلبل شیراز[۱]

اس صراحت کے ساتھ ساتھ حقیقت امیر خسرو کے مقابلے میں نہایت عجز و انکساری کا اظہار کرتا ہے۔ سہ

لی الحقیقت کہوں میں دو دوست
یعنی وہ مغز اور یہ ہے پوست

پوست گرچہ جو مغز شیریں نیست
بہر آں مغز پوست بہ زیں نسبت

الحقیقت کہا غلط تو نے!!
کی یہ بے منفعی غلط تو نے!!

مغز سے پوست کیونکہ ہوگا مغز
پوست ہے پوست اور مغز ہے مغز

ہے وہ لبّ لباب مغز سخن
خاربن یہ ہے اور وہ گلبن!

یہ سہا اور وہ مہر عالمتاب
ہے وہ آب حیات اور یہ سراب

رشتہ یہ اور وہ در شاہوار
وہ گل تر ہے اور خشک یہ خار

۱: ہشت گلزار ص ۳

لیک اس خار کو اگر وہ جناب — چشمۂ لطف سے کرے سیراب [1]

بہرام کے قصّے

شاہ بہرام گور کے قصّے کو امیر خسرو کے علاوہ کئی اور شاعروں نے بھی لکھا ہے۔ لیکن جو مقبولیت امیر خسرو کی مثنوی ہشت بہشت کو حاصل ہوئی۔ وہ کسی دوسرے شاعر کو حاصل نہ ہو سکی۔ حقیقت کا لکھا ہوا یہ قصہ تو شاعر کے بقول ترجمہ ہے۔ جن دیگر شعرأ نے اس قصے کو بیان کیا ہے ان میں دکنی شعرأ پیش پیش ہیں۔ دولت دکنی نے ۱۰۵۰ ہجری میں بہرام و حسن بانو کے عنوان سے اس قصے کو اردو نظم میں باندھا تھا۔ ملک خوشنود نے بھی "ہشت بہشت" کے عنوان سے ایک مثنوی لکھی تھی۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری اس سلسلے میں لکھتے ہیں "ملک خوشنود نے ۱۰۵۶ ہجری میں مثنوی ہشت بہشت کے نام سے خسرو کی فارسی مثنوی "ہشت بہشت" کو اردو نظم کا جامہ پہنایا تھا۔"[2] محمد باقر آگاہ کی ایک مثنوی ہشت بہشت ہے۔ لیکن اس کا موضوع آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک اور ان کے معجزات اور صحابہ ہیں۔ طبعی دکنی نے اپنی مثنوی بہرام و گل اندام، نظامی گنجوی کی مثنوی ہفت پیکر کی تقلید میں لکھی تھی۔ شمالی ہند میں حیدر بخش حیدری نے ۱۲۲۰ھ میں اس قصے کو اردو میں منتقل کیا تھا۔ اسی طرح میر فرخندہ علی نوتنوی نے قصہ بہرام گور کو اردو نثر میں ترجمہ کیا تھا جس کا دوسرا ایڈیشن ۱۲۶۲ھ (۱۸۴۵ سنہ عیسوی) میں شائع ہوا تھا۔[3] گارساں دتاسی بہرام گور کے قصّوں کے بارے میں لکھتا ہے۔

"ہندوستان میں بہرام گور کے تین نسخوں سے واقف ہوں۔ ایک حیدری کا جس کا نام ہفت پیکر ہے۔ جو نظامی کی مثنوی کا نام ہے۔ دوسرا طبعی (ساکن گولکنڈہ) کا جو سنہ ۱۰۸۱ھ (۱۶۷۱-۱۶۷۰) میں لکھا گیا۔ تیسرا حقیقت بریلوی کا

۱:- ہشت گلزار ص۳ (۲) اردو کی منظوم داستانیں مطبوعہ انجمن ترقی اردو پاکستان ص۸۹

Marfat.com

جس کا سال تصنیف ۱۲۲۵ھ (۱۸۱۰-۱۱) اور نام ہشت گلزار ہے۔ غالباً یہ نام آٹھویں آسمان کی مناسبت سے رکھا گیا ہے۔ ورنہ نظامی کی ہفت پیکر اور ہاتفی کی ہفت منظر کی مناسبت سے ہفت گلزار ہونا چاہیئے تھا۔ وجہ یہ ہے کہ ایران کے بادشاہ بہرام گور پسر یزد جرد کا قصہ ہے۔ جس کی سات بیویاں تھیں جو سات باغوں میں الگ الگ رہتی تھیں[۱]۔"

فنی جائزہ

ہشت گلزار ایک ڈھیلے ڈھالے پلاٹ کی داستان ہے۔ یہ ایسی داستان نہیں ہے جس کی ذیلی داستانیں باہم مربوط ہوں۔ اس میں سات داستانیں بیان کی گئی ہیں۔ ہر داستان اپنی جگہ مکمل ہے۔ اور ہر داستان میں ذیلی قصے اور اتار چڑھاؤ اور انجام و آغاز موجود ہے۔ ان ساتوں داستانوں میں سوائے اس کے اور کوئی باہمی ربط موجود نہیں ہے کہ یہ ایک ہی کردار یعنی شاہ بہرام گور کے سامنے بیان کی جا رہی ہیں۔

آغاز داستان میں بہرام گور کی وجہ تسمیہ اور دلارام کنیز سے اس کی شدید محبت بیان کی گئی ہے۔ بعد ازاں دونوں میں جدائی ہوتی ہے اور دلارام دوبارہ اپنے حسن تدبیر سے شاہ بہرام کو اپنا لیتی ہے۔ بہرام اور دلارام کی داستان یہاں تک ختم ہو جاتی ہے۔ باقی سات داستانوں میں دلارام آخر تک غائب ہے۔ چونکہ بہرام گور، دلارام کا فریفتہ ہو کر شب و روز سیر و شکار میں مصروف رہنے لگتا ہے۔ جس کے سبب اس کے ملازمین اور رعایا تنگ آ جاتے ہیں۔ لہٰذا شاہ کا وزیر لقمان سات ایوان تیار کراتا ہے۔ ہر ایوان مختلف رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ ان کی ساخت اور ساز و سامان اور ان میں موجود بادشاہ کی محبوبائیں مختلف ملکوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ باقی داستان میں دلارام کا کہیں تذکرہ

۱: مخطبات گارساں دتاسی صفحہ ۱۸۳

نہیں آتا کہ آیا اس کا کیا حشر ہوا۔کیونکہ بادشاہ اپنے شب و روز ان ایوانوں میں اور ان میں موجود مختلف ملکوں کی عورتوں کے ساتھ گزارتا تھا۔ لہذا بحیثیت مجموعی ہم اس پوری داستان کی ہیروئن دلارام کو نہیں قرار دے سکتے۔آغاز داستان ہی میں ہی اس کا کردار اپنا رول ختم کر دیتا ہے۔یوں بنیادی طور پر یہ کوئی ایسا عشقیہ قصہ بھی نہیں کہلا جا سکتا جس کی ہیروئن اور ہیرو داستان کے روایتی انداز میں کسی کشمکش کا شکار ہوں۔ بلاشبہ دلارام اپنی حق گوئی کے سبب سے بادشاہ کے عتاب کا شکار ہو جاتی ہے۔لیکن وہ مکمل ہیروئن نہیں ہے جو ہر داستان میں موجود ہو۔

ہشت گلزار میں بیان کی جانے والی تمام داستانیں علیحدہ علیحدہ ہیں۔یہ مختصر داستانیں ہیں لیکن داستانوں میں پائی جانے والی دلچسپی اور تجسس جو قاری کے ذہن میں انجام سے جلد آشنا ہو جانے کی کیفیت جگاتی ہے ان داستانوں میں موجود ہے۔ان داستانوں کا قاری ایک داستان کے ختم ہو جانے کے بعد دوسری داستان میں بیان کئے جانے والے حالات جاننے کا متمنی رہتا ہے۔

ان ساتوں داستانوں کے بیان کرنے کے بعد شاعر نے بہرام گور کی موت کا منظر بیان کیا ہے اور چند اشعار دنیا کی بے ثباتی کے بارے میں بھی تحریر کئے ہیں۔اختتام میں شاعر نے اپنے حالات زندگی، اور اپنی اور اپنے استاد جرأت کی تعریف کی ہے۔

ان داستانوں میں بیان کئے جانے والے بہت سے واقعات اردو میں لکھی جانے والی بعض داستانوں میں بھی ہمیں ملتے ہیں۔اور بعض جگہ سنسکرت کہانیوں کے اثرات بھی ملتے ہیں۔مثلاً آٹھویں گلزار میں جو قصہ بیان ہوا ہے۔یعنی بادشاہ کا عورتوں کی بے وفائی سے ڈرنا اور اس خوف کے سبب شادی نہ کرنا۔اور بعد میں شادی کرنا اور آخر کار صحیح اور باوفا عورت کا مل جانا۔عورتوں کی بے وفائی کے قصے سنسکرت کی داستانوں کا محبوب موضوع ہیں۔غالباً"

Marfat.com

اس کا سبب برہمنی مزاج تھا۔ جہاں ترک دنیا کو بہتر سمجھا جاتا تھا۔ اور سنیاسیوں کی سی زندگی اور مجرّد زندگی گزارنے کو بہتر سمجھا جاتا تھا اور اس شے کو زیادہ سے زیادہ تقویت دینے کے لئے عورتوں کی بے وفائی کا پرچار کیا جاتا تھا۔ تاکہ لوگ اس طرف متوجہ نہ ہوں اور دنیا کے بکھیڑوں میں نہ پڑیں۔

اس طرح جنوبی ہند اور جنوب مشرقی ایشیا کے ملکوں میں پائی جانے والی تبدیلی قالب کی داستانوں کا اثر بھی اس داستان میں ملتا ہے چنانچہ پانچویں گلزار میں ہیرامن طوطا کا قصّہ اسی کا ثبوت ہے۔

کردار نگاری

ان داستانوں میں ایسے کردار بہت کم ملتے ہیں جن کے کردار کی خوبیاں یا خرابیاں داستان کے واقعات و مصائب کی، کشمکش سے ابھر کر سامنے آتی ہیں۔ اور شاید بنیادی طور پر ایسے کرداروں کی عدم موجودگی کا سبب، ان داستانوں کا اختصار ہے۔ جہاں داستانوں کے اختصار کے سبب، کردار بہت نمایاں ہو کر سامنے نہیں آتے اور اپنا کوئی نقش، قائم نہیں کر پاتے۔ تاہم بعض ایسے کردار ان داستانوں میں موجود ہیں جن کو مصنف نے حقیقت پسندی سے بیان کیا ہے۔ اور ان کرداروں کے نقوش اجاگر کئے ہیں۔

ساتویں گلزار میں ملکہ یمن کا کردار ایسا ہی ہے جس کا مکمل نقش ابھارنے کی مصنف نے کامیاب کوشش کی ہے۔ اس گلزار میں ملک یمن کے بادشاہ، اس کی ملکہ، ملکہ کے سوتیلے بیٹے اور وزیر کی داستان بیان کی گئی ہے۔ ملکہ ایک بدکردار عورت ہے۔ اور اس کے وزیر سے ناجائز تعلقات ہیں۔ ایک دن شہزادہ ان دونوں کو ہم آغوش دیکھ لیتا ہے۔ ملکہ کی بدکرداری کے سبب سے کسی بھی انتہائی اقدام اور تریا چرتر کی توقع کی جا سکتی ہے۔

Marfat.com

جو عین فطری ہے۔ اس سلسلے میں جغرافیائی حدود کی کوئی پابندی عائد نہیں کی جاسکتی کو مکر و فریب ہر خطے کی عورت سے متوقع ہو سکتا ہے۔ لیکن جس طرح میر انیس پر یہ اعتراض کیا کیا جاسکتا ہے کہ وہ عرب کی خواتین اور مردوں سے جو گفتگو کراتے ہیں۔ وہ ہندوستان سے مخصوص ہے اور امام حسینؓ کے خاندان کے اہل خانہ جس وقت گریہ وزاری کرتے ہیں تو ان سے کاملاً لکھنوی بیگمات کا تصور ابھرتا ہے۔ اسی صورت سے شاہ حسین حقیقت نے ملکہ مین کا جو کردار پیش کیا ہے اور اپنی بے گناہی بادشاہ کے روبرو پیش کرنے کے سلسلے میں جو گفتگو کرائی ہے اس سے کسی لکھنوی بیگم کا سراپا ابھرتا ہے۔

چونکہ شہزادہ اپنی سوتیلی ماں کے جرم سے آگاہ ہو چکا ہے۔ لہذا ملکہ شہزادے کو راہ سے ہٹانے کے لئے اس پر دست درازی کا الزام لگاتی ہے۔ اور جس انداز میں، نالہ و شیون کرکے بادشاہ پر اپنی پاکدامنی کا اثر قائم کرتی ہے۔ اس کے پیش کرنے میں شاعر کامیاب ہے۔ سہ

آتے خسرو کو دیکھ وہ مکار — آنسو بھر لائی آنکھوں میں یکبار
نوچ کر گال اور کھسوٹ کے بال — کر دیا پیٹ پیٹ چہرہ لال
ٹکڑے کرکپڑے اور گریبان پھاڑ — گر پڑی بس زمین پہ کھا کے پچھاڑ
دھجی دھجی کی کرتی اور انگیا — چوڑیاں توڑ نتھ کو پھینک دیا
گھر دو ہتڑ زمین پہ مارے تھی — ہائے اور وائے کہہ پکارتی تھی
پیٹتی تھی کبھی تو سینہ و سر — کوستی تھی کبھی یہ کہہ کہہ کر!
مریو ناشاد و بے مراد بچے! — اوڑیو دنیا سے شکل باد بچے
تیرے ہاتھوں سے جی مرا بکا — لگیو شبدیں کا تجھے دھکا!

Marfat.com

لے تری خاک میں جوانی ملاؤں | موئے تو ہیں تیرے پھٹے کھاؤں
لگے تجھ کو کڑی کمان کا تیر! | ہو نشانہ اجل کا تو بے پیر!

تمام باتوں سے ملکہ، بادشاہ کے دل میں اصل واقعات سے آگاہ ہونے کی خواہش بیدار کر رہی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اس کا نفسیاتی اثر بھی بادشاہ کے دل پر ملکہ کے حسب دلخواہ ہو رہا ہے۔ بادشاہ کے استفسار پر ملکہ صورت حال کو یوں بیان کرتی ہے۔ ۵۰

بولی وہ لبے لبے آنسو بہا | نخرے سے ٹھن ٹھنا پکڑ ماتھا
آسماں سے نہ برسیں کیوں پتھر | چاہے بیٹا ہو ماں سے ہم بستر
ہائے اس دور پہ میری پٹکی | بیٹا لے ماں کی ران میں چٹکی
شعلہ شہوت کا ماں پر جو مارے | کیوں نہ برسیں فلک سے انگارے
سوئی تھی میں پلنگ پر بے ہوش | بے حیا آن لپٹا کھول آغوش
ہاتھ بندازار پر ڈالا!! | چاہا اپنا کرے وہ منہ کالا!!
چونک کر میں نے ایک ماری لات | بھاگا تب خوف کھا کے وہ بدذات
بھاگ کر بچ گیا جوانا مرگ | ورنہ چکھتا مزا جوانا مرگ!
ماں تو ہوں گو نہیں اسے میں جنی | ہو وے پیوند خاک ناب شدنی
ہے ستم جس کو پالا چھاتی پر | وہ نوازے مرا تلا اوپر!
دے نہ اولاد ایسی حق زنہار | مادر آزاد در پدر بیزار!
کاٹوں دانتوں سے بوٹیاں گر پاؤں | بس چلے تو موئے کو کچا کھاؤں
ایڑی چوٹی پہ سے اوسے واروں | ہو نہ پانی جہاں وہاں ماروں
ابھی اوس روسیاہ کو کر مے عاق | زندگی ہے وگرنہ مجھ پہ شاق!

Marfat.com

کرکے منہ کالا اور گدھے پہ سوار — شہر سے دے نکال بس یک بار
آنکھیں اوس کی نکال کر مجھے دے — تا ملوں اپنے تلوؤں کے نیچے
کچھ نہ کچھ دے غرض اسے تو سزا — تو کلیجہ ہو ٹھنڈ مرا ٹھنڈا
زہر ورنہ منگا کے کھاتی ہوں — ڈوبنے کو کنویں میں جاتی ہوں !
دے تو اوس نا سزا کو جلد سزا — کاٹتی ہوں وگرنہ اپنا گلا !

ان اشعار میں جس انداز میں ملکہ یمن کو محوِ تکلّم دکھایا گیا ہے۔ اس سے لکھنوی بیگمات کا سراپا ابھر کر سامنے آتا ہے۔

وزیر زادی کا کردار

ملکہ یمن کے بادشاہ کے وزیر کی شہزادی کا کردار ایک باعصمت اور باحیا شہزادی کا کردار ہے۔ یہ کردار بھی ساتویں گلزار میں ہی ہے۔ شہزادی باحیا اور پاکدامن ہے۔ لیکن شہزادہ جوشِ انتقام میں الوپ انجن لگاکر وزیر زادی سے دوبارہ محبت کرتا ہے۔ اس سے قبل وہ وزیر کے محل کی تمام بیگمات اور کنیزوں سے محبت کر چکا ہے اور پھر خود ہی ترکیب بنا کر آخر وزیر زادی کے سامنے اپنے اصل روپ میں آجاتا ہے۔ اس وقت وزیر زادی دل و جان سے شہزادہ پر عاشق ہو جاتی ہے۔ اس وقت وزیر زادی کی کیفیت عجیب ہے۔ ایک طرف اسے اپنی عصمت کے داغدار ہو جانے کا ملال بھی ہے۔ اور دوسری طرف یہ تجسس بھی کہ اس کا گل چین کون ہے۔ فطری شرم و حیا بھی دامن گیر ہے۔ زبانِ حال سے یوں استفسار کرتی ہے۔

کام دل سے فراغ حاصل کر — درفشاں یوں ہوئی وہ عشوہ گر
یعنی اے نوجوان زیبا رو ! — اب تو سچ سچ بتا کہ کون ہے تو
تھا جو ناسفتہ مرا گوہر پاک — بیندھا دوبار ہائے رے بے باک

Marfat.com

پھر گیا تیسپہ نامتاں سے دور   باپ سے دور اور ماں سے دور
ہو گیا پارہ پردۂ عصمت!   گھر سے نکلی تو کیا رہی عفت
ہو کے بدنام زیست کی تو کیا   مرگ ہے اس سے ہی بھلی بخدا
گھر میں ہو گی مری جو صبح تلاش   ہو گا افسوس مرا پردہ فاش
دل میں کیا کیا ہر ایک سوچے گا   ہو دیں گی بدگمانیاں کیا کیا!
کاش جنتی مجھے نہ میری ماں   ہوتی رسوا میں تا نہ یوں بہ جہاں
تو ہے بے باک شوخ اے عیار   نہ کھلا تیرا مجھ پر کچھ اسرار!
نہ کیا اپنے نام سے آگاہ!   اور بدنام یوں ہوئی میں آہ
ننگ و ناموس سب گیا میرا   بخدا اے شوخ کہہ تو کیا تیرا
کیا ستم کیا جفا و جور ہے یہ   دلربائی کا کون طور ہے یہ

دلارام کا کردار

دلارام کا کردار ہشت گلزار کے تمہیدی باب میں متعارف ہوتا ہے۔ دلارام ایک سمجھدار، ذہین اور عقل مند کنیز ہے وہ حسن صورت اور حسن سیرت دونوں سے آراستہ ہے۔ عموماً خوبصورت عورتیں عقل و شعور اور سمجھ بوجھ سے عاری ہوتی ہیں۔ لیکن دلارام کے کردار میں ہمیں یہ بات بھی ملتی ہے۔

شاہ بہرام اپنی عقل و فہم بہادری و شجاعت اور تیر اندازی میں یکتائے روزگار ہے۔

دلارام اس کی بہی خواہ اور ہمدرد بھی ہے اور اس سے بے پناہ محبت کرنے والی بھی، عام طور سے دیکھنے میں آیا ہے کہ مال و دولت کی فراوانی اور رتبے کی بلندی آدمی کو مغرور بنا دیتی ہے۔ گو اس بات کا کہیں مثنوی نگار نے تذکرہ نہیں کیا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دلارام جب جنگل میں شکار کے وقت شاہ بہرام گور سے کمال کے دیکھنے کی فرمائش

Marfat.com

تی ہے تو اس میں اس کی یہ خواہش مضمر ہے کہ بادشاہ، جو اپنی خوبیوں میں منفرد اور یکتا ہے اور اس کا محبوب بھی ہے کہیں غلط روش کا شکار نہ ہو جائے۔ چنانچہ وہ اس سے کسی کمال کے دیکھنے کی آرزو مند ہوتی ہے۔ اور جب شاہ بہرام نر کو مادہ اور مادہ کو نر میں تبدیل کر کے اپنی تیر اندازی کے کمال کو ثابت کرتا ہے۔ تو دلارام کہتی ہے کہ آدمی کو غرور نہیں کرنا چاہیئے۔ اس دنیا میں ایک سے ایک بڑھ کر ہنرمند اور صاحب کمال ہے۔ دلارام کے اس اندازِ گفتگو میں اندازِ محبوبی کے ساتھ ساتھ بے خوفی اور جرأت و بہادری بھی ہے۔ شاہ بہرام اس صاف گوئی پر ناراض ہو کر دلارام کو اس وسیع جنگل میں بے یار و مددگار چھوڑ جاتا ہے۔ ہر چند کہ دلارام بہادر عورت ہے اور بادشاہ کے ساتھ سیر و شکار میں مصروف رہی ہے۔ لیکن ایسی بے بسی اور مجبوری کا عالم اگر کسی مرد پر ہوتا تو یقیناً وہ بھی گھبرا جاتا۔ پھر دلارام کا تعلق تو صنفِ نازک سے ہے۔ چنانچہ وہ گھبرا جاتی ہے۔ دلارام کی اس گھبراہٹ، بے چینی اور خوف کی تصویر حقیقت نے بہت خوبصورتی سے کھینچی ہے۔ ؎

دلارام کی کیفیت

ہر قدم پر تھی خائف و لرزاں — گاہ گریاں تھی اور گہے حیراں
سائے سے اپنے خوف کھاتی تھی — سایہ ساں جاں نہ تھی پہ جاتی تھی
چبھتے تھے ہر قدم پہ سینکڑوں خار — کف پا دونوں خار سے تھے فگار
برگِ گل سے جو اس کے تھے کف پا — خاراں میں تھا ہر قدم چبھتا !
اپنی گفتار سے پشیماں تھی ! — حالت اس کی غرض پریشاں تھی
گرم ریتی وہ اور خوف رواں — دل سوزاں سے آہ سرد کشاں

Marfat.com

بس کہ ہر ہر قدم تھا خوفِ ہلاک — تھی اڑاتی وہ اپنے سر پہ خاک
بات اگر کوئی کھڑکتا تھا !! — تو کلیجہ وہیں دھڑکتا تھا !!
گاہ آتا نظر جو بیشہ شیر !! — شیر غم لیتا آ ہوئے دلگیر !
کرتے جاتے تھے آبلے پابوس — شب چلی اس طرح سے وہ کئی کوس

ان اشعار میں حقیقت نے نہایت خوبی کے ساتھ صحرا میں دلارام کی پریشانی کی کیفیت کی جزئیات نگاری سے مکمل تصویر بنا دی ہے۔

مشترک عنصر ہشت گلزار میں بعض ایسے جزئی قصے بھی ملتے ہیں جو بہت سی دوسری داستانوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ چونکہ یہ کتاب خسرو کی مثنوی کا آزاد ترجمہ ہے۔ لہٰذا ہم اس سلسلے میں امیر خسرو کا ہی ذکر کریں گے۔ ممکن ہے امیر خسرو نے پنجاب کی لوک داستان سوہنی مہینوال سُنی ہوگی۔ چنانچہ ہشت گلزار میں بادشاہ کی ایک بیوی کا کردار بیان ہوا ہے۔ جو گھڑے کے ذریعے دریا پار کرکے اپنے فقیر عاشق کے پاس رات کے وقت جاتی ہے۔ اس کردار کا انجام بھی سوہنی کے انجام سے مماثلت رکھتا ہے۔ جس کا کچا گھڑا دریا میں گھل جاتا ہے۔ بادشاہ ایک کچا گھڑا، رکھوا دیتا ہے۔ جب ملکہ اس گھڑے کو ندی میں ڈال کر ندی عبور کرتی ہے تو منجدھار میں گھڑا گھل جاتا ہے اور ملکہ ڈوب جاتی ہے۔

قیاس کہتا ہے کہ امیر خسرو پنجاب کی اس مشہور لوک داستان سے واقف رہے ہوں گے۔ لیکن چونکہ ہشت بہشت اور ہشت گلزار کا تفصیلی موازنہ کرنا ممکن نہ تھا۔ لہٰذا ممکن ہے حقیقت نے جو بعض اضافے اپنی طرف سے ہشت گلزار میں کئے ہیں۔ یہ بھی انہی اضافوں میں سے ہو۔ اگر ایسا ہے تو یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ حقیقت پنجاب کی ان مشہور

Marfat.com

نسلاً لوگ داستانوں سے واقف ہوں گے۔ چونکہ ان سے قبل کے اردو شعرا ان داستانوں سے واقف تھے۔ انشا کا تو ایک شعر بھی پنجاب کی ایک اور مشہور داستان ہیر رانجھا کے بارے میں ہے ؎

سنایا رات کو قصہ جو ہیر رانجھے کا ۔۔۔ تو اہل درد کو پنجابیوں نے لوٹ لیا

بادشاہ کی تیسری بیوی کے سبو چہ خام کے ذریعے غرقابی کو حقیقت نے یوں بیان کیا ہے۔ ؎

جلد سے اک منگا سبوچہ خام! ۔۔۔ پانی لگتے ہی گل جو جائے تمام
تھی دھری پختہ جس مقام سبو ۔۔۔ رکھدی اس کی جگہ وہ خام سبو!
آئی جب اپنے وقت پردہ نگار ۔۔۔ کر سبو لے کے جائے دریا پار!
رکھ سبو چھاتی کے تلے بے غم ۔۔۔ قطرہ زن پہنچی بیچ میں جس دم
مرکب خام گھل چلا افسوس! ۔۔۔ قعر کی سمت ڈھل چلا افسوس
دی۔۔۔۔۔کش اجل کو لگام! ۔۔۔ رہ گیا نصف رہ میں مرکب خام
جا تہہ آب میں وہ دُرِ یتیم!! ۔۔۔ پہنچی پانی سے جا بہ نار جحیم!

• لقمان وزیر، شاہ بہرام گور کا دانا وزیر ہے۔ اور شاہ کے امرا وزراء، خدام وغیرہ کی درخواست پر اس بات کا اہتمام کرتا ہے کہ بادشاہ کو اپنے دار الخلافے میں ہی عیش و راحت کا سامان میسر آجائے اور وہ یکسانیت سے بھی نہ گھبرائے۔ اس مقصد کے لئے ماہرین تعمیر اور مہندسوں سے سات ایوان تیار کراتا ہے۔ ان ایوانات کی تعمیر میں یہ خوبی رکھی گئی تھی کہ ہر ایوان کسی نہ کسی ستارے سے منسوب تھا اور اس اعتبار سے ہر ایوان کا رنگ اور اس کی تزئین و آرائش تھی۔

سات ایسے کئے مکان طیار ۔۔۔ جس پہ تھے ساتوں آسمان نثار

Marfat.com

ساتھ گنبد بنائے رشک سپہر — رات دن جس پر صدقے ماہ و مہر
جب کہ طیار ہو چکے یہ مکان! — رنگیں اس رنگ وہ کئے ایوان
بہر شنبہ بنایا تھا جو محل — سیہ اسکو کیا برنگ زحل
جس کی اتوار کے لئے تھی بنا — شکل خود زعفرانی اس کو کیا
تھا دو شنبہ کے واسطے جو واہ — سبز ریحان رنگا برنگ ماہ!
تھا سہ شنبہ کے واسطے جو مقام — رنگا گلنار اس کو جوں بہرام!
چار شنبہ سے جو کہ تھا منسوب — جوں عطارد کیا کبود اسے خوب
پنجشنبہ کے واسطے جو بنا! — صندلی رنگ مشتری سا کیا
جس کو نسبت تھی جمعہ سے پوری — زہرہ آسا رنگا وہ کافوری

منظر نگاری اور جذبات نگاری کے اعتبار سے محلات اور مناظر قدرت کی تصویر کشی ہمیں اردو کی کم و بیش تمام مثنویوں میں ملتی ہیں۔ ان مثنویوں میں سر فہرست زور بیان، سلاست روانی اور شاعرانہ طرز بیان کے اعتبار سے مثنوی سحرالبیان اور مثنوی گلزار نسیم کا درجہ سب سے بڑھا ہوا ہے۔ تاہم حقیقت بھی ایسے کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ورنع پر پیچھے نہیں رہتے۔ اور اپنی شاعرانہ قوت بیان کا بھرپور اظہار کرتے ہیں۔ شاہ بہرام کے ان سات عشرت کدوں کو جس خوبصورتی سے سجایا گیا تھا۔ ان کی تصویر کشی حقیقت نے نہایت خوبی کے ساتھ کھینچی ہے ان محلات کے در و دیوار ان کی زیبائش اور اس کے مکینوں کے پیراہنوں، ان کے رنگوں، اور ناز و انداز کو کامل مہارت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ ان کی خاص خوبی یہ ہے کہ ہر ایوان اور اس کی آرائشی اشیا حتی کہ گلستان تک اسی رنگ میں ہیں۔ ان محلات میں جشن کا سا سماں ہے۔

تھے ملون و مکان وہ جیسے — پردے اور فرش بھی بنے ویسے

Marfat.com

دخل واں دوسرے نہ رنگ کو تھا — ویسے ہی گل چمن میں تھے ہر جا
بن چکے جب مکاں یہ خاطر خواہ — اون میں آکر مکیں ہوئے وہ ماہ
کر کے ساتوں کے سات رنگ سنگار — اپنے اپنے دیا مکان میں آثار !
تھی بہر رنگ جس مکان کی اساس — تھا اوسی رنگ پر مکیں کا لباس
صندلی کوئی کوئی سبزہ رنگ ! — بہتوں کا چمپئی سنہرا رنگ !
کوئی سرخ و سفید کوئی گلفام — یاسمن بو وہ یاسمن اندام !!
نسترن نرگس اور چنبیلی !! — سیوتی و گلاب و البیلی !!
گل بہار و بنفشہ و سوسن — گیندا رابیل کوئی غنچہ دہن
چنبیلی صد برگ کیتکی گلنار ! — رعنا زیبا و ارغوان گلنار
زعفران مشکی اور رنگیلی کوئی — خوش قدم مہ لقا چھبیلی کوئی
چاندنی گلبدن ادجاگر کوئی — دل لگن ہنس مکھ اور دلبر کوئی
سب یہ پوشاک سج سجا رنگیں — اپنے اپنے مکاں میں جا کے رہیں
جو لباس اپنے رنگ کا پہنے — دونی ہم رنگ کے نہ کیوں وہ کرے
ہر بت اپنے نگار خانے میں — پھرتی عاشق کا دل لبھانے میں
کوئی بیٹھی کہیں سنگار کرے — پھر خود بینی آئینے کو دھرے
کوئی اپنی اکڑ کی چھب دکھلائے — کر اشارہ کوئی کسی کو بلائے !
اک غزل خواں و ایک نغمہ سرا — بیٹھی اک باڈلی ہر میں لٹکا
کھیلے چوسر کوئی، کوئی شطرنج — کھیلے پچیس اک کرشمہ رنگ
لے کے چٹکی کسی کی بھاگے کوئی — گدگدی کرتے اوس کو وہ لاگے

Marfat.com

کوئی دے بیٹھی ایک کو گالی ۔۔۔ کوئی چٹکی بجائے کوئی تالی!
چپکے سے کوئی کسی کو جڑ دے دھول ۔۔۔ ہنس دے وہ اک ادا سے پڑھ لاحول
کوئی پھبتی کسی پہ کچھ بولے ۔۔۔ کوئی جگت پہ زبان کو کھولے
کہیں خندہ کہیں قہقہے تھے ۔۔۔ تالیوں کے کہیں تڑاقے تھے
منہ بنا کوئی کسی کے منہ کو چڑاتے ۔۔۔ کہہ پتے کی کوئی کسی کو کھجائے
لے کے پینگ ایک اس طرح جھولے ۔۔۔ کنگرہ جا کے عرش کا چھو لے
باندھ کر اک دو شالے کی گاتی ۔۔۔ گاتی پھرتی وہ گات دکھلاتی
چلتی جب کوئی دکھا کے چھب تختی ۔۔۔ دیکھنے والوں کی تھی کم بختی!
کوئی مسی لگا کے کھاوے پان ۔۔۔ خون عاشق کرے بہر عنوان
بوسے اک گلعذار پھول کو توڑ ۔۔۔ ڈالے اک ہاتھ دوسرے کا مروڑ
کہے خندی کسی کو کوئی چھنال ۔۔۔ کوئی برا مانے کوئی جاوے ٹال
جدی ہر ایک کی سجاوٹ تھی ۔۔۔ کہیں لگاوٹ کہیں رکاوٹ تھی
اونکا کب تک کیا کروں میں بیاں ۔۔۔ الغرض تھی ہر ایک آفت جاں
اک طرف ساقیان میگوں لب ۔۔۔ لے کے اسباب مے خوری کا سب
مستعد پینے اور پلانے ہیں! ۔۔۔ مشتغل کوئی گزک کے کھاتے ہیں

سمیری باغ کا منظر

سرو شمشاد جھومتے ہیں کھڑے ۔۔۔ داد لبتوں پہ تاک مست پڑے
بلبلیں شاخ گل پہ نغمہ سرا! ۔۔۔ نعرہ زن قمری چمن پیرا!

Marfat.com

لالہ و گل کھلے چمن بہ چمن ! نرگس شوخ چشم چشمک زن
شاخیں سنبل کی یوں بہ گرد گل عارض گل رخساں پہ جیوں کاکل
یوں لب آبجو پہ سبزۂ تر ! سبزہ جس رنگ لعل خوباں پر
شاخ ہر نخل میوے سے پربار نونہالوں تلک تھے برخوردار
تھے ثمرداں جہاں کے سارے نہروں میں چھٹ رہے تھے فوارے
تھیں نسیم و صبا عبیر سرشت باغ تھا وہ غرض کہ رشک بہشت
بہر بستان باغ مرغ چمن ! دیکھ کر بے نظیر وہ گلشن !!
گل کے سیپارے میں تھے پڑھتے سبق مثلہا فی البلاد لم تخلق
طوطی مینا کی ہر شجر پہ صدا بسط اللہ ظلکم ابدا !!
مانگتا تھا دعا درخت چنار وقنار بنا عذاب النار
شعلہ زن تھا چنار تو سارا ! لالہ دہکے تھا جیسے انگارا !

محاورات و ضرب الامثال

شاعری میں تلمیحات اور محاورات و ضرب الامثال کا استعمال، اختصار کو برقرار رکھتے ہوئے نفس مضمون کو دور تک پھیلا دیتا ہے۔ اس طرح شاعر کے خیال میں وسعت اور پھیلاؤ کا اضافہ ہو جاتا ہے اور شاعرانہ حسن بھی بڑھ جاتا ہے۔ مثنوی ہشت گلزار میں کثیر تعداد میں شاعر نے محاورات و ضرب الامثال کو استعمال کیا ہے۔ اور یہ شعوری کوشش کا نتیجہ ہے۔

ویسے بھی صنم کدۂ چین اور گنجینۂ امثال اس بات کا ثبوت ہیں کہ حقیقت کو ضرب الامثال اور محاورات سے خصوصی دلچسپی تھی۔ چنانچہ گنجینۂ امثال تو بنیادی طور پر امثال و محاورات کی کتاب ہے۔ اس میں اردو، فارسی اور عربی کی ہم معنی ضرب الامثال و محاورات

Marfat.com

کو حقیقت نے نہایت محنت اور عرق ریزی کے ساتھ جمع کیا تھا۔ اب ذیل میں وہ اشعار دیئے جا رہے ہیں جن میں کوئی نہ کوئی ضرب المثل یا محاورہ بیان ہوا ہے۔

سچ مثل کہہ گئے ہیں دانشور
کہ جگر ہے جگر دگر ہے دگر

اس سوا اور بھی ہیں بے حد عیب
ہے مثل یہ کہ پیری و صد عیب

سمت کو سنتے ہی وہ بدخصلت
اشتر بے مہار کی صورت

دے پتے کو یہ گھر کے نکلے چل
دیکھیں پر اونٹ بیٹھے ہے کس کل

تیر جب شست سے رہائی پائے
نہیں ممکن کہ پھر پلٹ کر آئے

اونٹ اور ابن کا مال لاد و سب
نہ بتاؤ اڑان گھاٹیاں اب

کہتے آپس میں تھے یہ شور مچا
ہم پہ ہوئی روشنی طبع بلا

کیا وہ پائے حسد سے آہ اخلاص
ہے مثل قاص لا یحب القاص

اس لئے کر رہے تھے بس وہ داؤں
ہاتھی کے پاؤں میں ہے سب کا پاؤں

ہاتھ آیا ہے رشتۂ سر در گم
گیا ہاتھی نکل ہے اٹکی دم

پھر رہے ہاتھی اگرچہ گاؤں گاؤں
جس کا ہاتھی پہ ہے اوسی کا ناؤں

کام جس کا اسی کو چھاجے ہے
کرے کوئی اور تو ٹھینگا باجے ہے

روبرو تیرے کون آوے گا
گنّے ہاتھی سے کون کھاوے گا

ہٹ لگی کرنے اور ہٹ بیٹھی
ماش کے آٹے کی طرح اینٹھی

ہائے سمجھا نہ وہ محال سکال
گھر میں راجہ کے موتی کا کیا کال

ہے کڑی بس کہ دھوپ اور ہوا
چیل اوپر سے چھوڑے ہے انڈا

قدر نعمت است بعد زوال

Marfat.com

بعض جگہ پنجابی الفاظ بھی استعمال کئے گئے ہیں ؎

لب ہلاتے پہ لگتا تھا پیٹر

ایک شعر میں تلمیح استعمال ہوئی ہے۔ جہاں شاعر نے محمود کے غلام ایاز کو ایاس باندھا ہے۔ غالباً ردیف کی مجبوری کے مخلتف شاعر ایسا کرنے پر مجبور ہوا ہوگا۔ ؎

اپنی حد خوب جانتا ہے ایاس　　　کہہ گئے ہیں یہ مرد رتبہ شناس

یا لسانیاتی اعتبار سے حرف "س" کا حرف "ز" سے تبادلہ بھی ممکن ہے۔ جو غالباً ادھی لہجے اور تلفظ کا نتیجہ ہو۔

اسی طرح "فرقے" کو شعبہ کے معنی ہیں اور کسی خاص فن سے تعلق رکھنے والے کے معنی میں بیان کیا ہے۔ فرقے کا یہ مفہوم جدید ادبیات میں متروک ہے۔ قدیم زمانے میں اس سے شعبہ کا مفہوم بھی لیا جاتا تھا۔ ؎

پوچھا شہ نے کہ کیا ہے یاد ہنر　　　ہو گا کس فرقے میں بتا نوکر

"بحر فکر" کی ترکیب عام طور پر مستعمل ہے۔ حقیقت نے ایک جگہ اسے بحر فکرت کر دیا ہے۔ ؎

دیکھ کر شکل نیل اعجوبا　　　بحرِ فکرت میں وہ کھڑا ڈوبا

حقیقت نے ہر جگہ لفظ "یادگار" کو مذکر باندھا ہے جبکہ عام طور پر یہ مونث ہی استعمال ہوتا ہے۔ ؎

یادگار اپنا کچھ تو یاں رہ جائے　　　دم کا کیا اعتبار آئے نہ آئے

میر درد کا مشہور شعر ہے۔ ؎

فرصتِ زندگی بہت کم ہے　　　مغتنم ہے یہ دید جو دم ہے

Marfat.com

حقیقت نے بھی زندگی کے نفوس مختصر کو تقریباً اسی صورت سے ایک شعر میں بیان کیا ہے جو کسی بھی اعتبار سے زیادہ فصیح اور سلیس نہیں ہے۔ ع

دم غنیمت ہے دید جو دم ہے

ایک محاورے میں لفظ سابے کی جگہ چھابے باندھا ہے۔ یہ دونوں صورتوں میں مستعمل ہے۔

حالاتِ زندگی کا ماخذ اس مثنوی سے حقیقت کی عمر کے آخری دور کے حالات پر بھی کافی روشنی پڑتی ہے۔ اس سے حقیقت کی شخصی زندگی کا خاکہ بھی بہ آسانی مرتب ہو سکتا ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کے اس دور میں بھی فکر معاش نے ان کا پیچھا نہ چھوڑا تھا۔ اور تنگدستی کے علاوہ انھیں بہت سے دوسرے شدید جسمانی اور ذہنی عوارض بھی لاحق ہو چکے تھے۔ ایسی صورت میں ان کی ہمت کی داد دینا چاہیے کہ چار ہزار سے زائد اشعار پر مشتمل مثنوی کو انھوں نے صرف بیس دن کی قلیل مدت میں پایہ اختتام کو پہنچا دیا تھا۔ اب ہم ذیل میں سرگذشت سے وہ اشعار پیش کر رہے ہیں جن کی حیثیت خود نوشت سوانح کی ہے۔ سہ

یعنی کیا زیست کا بھروسہ ہے — اس سے بے اعتبار تر نہیں شئے
یادگار اپنا کچھ تو یاں رہ جائے — دم کیا اعتبار آئے نہ آئے
باقی رہنے کا میں نہیں ناکام! — باقی رہ جائے گا پر اس سے نام
حق مطلق سے ہے یہ مجھکو امید — کہ رہوں اس سے زندۂ جاوید
ایں ورق کز نشاط وارد بہر! — یادگار یست از من اندر دہر
ذہن ناقص میں جب کہ یہ آیا — اس کو میں قید نظم میں لایا!
تھا پریشان اگرچہ دل میرا — لفظ و معنی کو کر جمع یک جا

Marfat.com

اک تو تھا میں اسیر دام مرض — مجھ کو انواع کے مرض تھے غرض
درد سر، سرفہ اور نفث الدم — نزلے سے ناک میں تھا پہنچا دم
تپ بلا ایسی اور درد مراق ! — ان کے ہاتھوں سے بھی تھا جینا شاق
دق اور کلہ اور خارشش و داد — کرتے تھے جدے ہی یہ بیداد
اس سوا اور تھے بہت آلام — لوں میں کس کس کا تیرے آگے نام
لاحق افکار دنیوی تس پر — ان میں پھر فکر شعر کیوں کر ہو
تیسرے روزگار کا عالم! — تھا نہ کچھ اختیار کا عالم
فرصت اس کے سبب نہ تھی دم بھر — دم بھی لے سکتا نہ تھا میں مضطر
صبح سے اک پہر تلک اے یار — تھا فراق اور باقی تھا دربار !
اتنی فرصت میں بھی غرض کہ مدام — متعلق تھے اپنی ذات کے کام
اس طرح سے بہ عرصہ سہ ماہ — مثنوی میں نے یہ لکھی ہے آہ
کیجیے ساعات کا حساب اگر — نظم جن میں ہوئے ہیں یہ گوہر
بیس دن سے فزوں نہیں ہوتے — بلکہ کم اس سے ہیں کہیں ہوتے

فحش الفاظ

حقیقت کی کوئی سی تصنیف اٹھا کر دیکھ لیجیے۔ وہ اس سلسلے میں کسی قسم کے اخلاقی ضابطے کے پابند نظر نہیں آتے کہ نثر و نظم میں فحش الفاظ نہ لائے جائیں۔ خزینۃ الامثال جس میں انھوں نے عربی، فارسی اور اردو کی ہم معنی ضرب الامثال یکجا کی ہیں۔ اس میں بھی یہ عیب موجود ہے۔ اسی طرح ہشت گلزار میں بھی فحش الفاظ ملتے ہیں۔ سے

رام کے آگے گوشے میں جا کر — کھول کر... پڑ گیا اوندھا

Marfat.com

یا

دیر تک اس طرح سے کرکے سلوک ‌ ‌ ‌ ‌ کہہ کے چھو۔۔۔ میں دیا بس تھوک

مدح استاد

حقیقتاً، شیخ قلندر بخش جرأت کے شاگرد تھے۔ ان کے بڑے بھائی سید حسن شاہ ضبط بھی جرأت ہی کے شاگرد تھے۔ لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ استاد کی محبت اور عزت و احترام میں اپنے بھائی سے بھی سبقت لے گئے ہیں۔ ایک مشرقی طالب علم کے اپنے استاد کے بارے میں محبت، عزت و احترام کے جو جذبات ہو سکتے ہیں۔ وہ حقیقت میں موجود ہیں اور کسی بھی جگہ وہ اس کا برملا اظہار کرنے سے نہیں چوکتے۔ اور استاد کی محبت کے جذبے میں سرشار نظر آتے ہیں۔ اور اپنے استاد کو وقت کا سب سے بڑا شاعر سمجھتے ہیں۔ اور استاد سے اپنی اس مثنوی کی داد کے خواہاں بھی ہیں۔ ؎

جیتا رہتا اگر میرا استاد ‌ ‌ ‌ ‌ سرہ و ناسرہ کا وہ نقاد
خسرو شاعران ہندوستان ‌ ‌ ‌ ‌ ملکہ سلطان شاعران جہاں
مفتخر انوری و خاقانی !! ‌ ‌ ‌ ‌ سعدی وقت و خسرو ثانی !!
وہ بلاغت میں ابلغ البلغا! ‌ ‌ ‌ ‌ بفصاحت۔ وہ افصح الفصحا
لفظ پیدا کرے تھا کیا موزوں ‌ ‌ ‌ ‌ تھا وہ خلاق معنی و مضموں !
غلغلہ اس کا پہنچا تھا بسمک ‌ ‌ ‌ ‌ گوش سُکانِ عرشِ اعلیٰ تک
ایسا آوازہ کس کا تھا سمجھا ‌ ‌ ‌ ‌ یعنی یحییٰ امان جرأت کا !
عرف میں نام تھا قلندر بخش ‌ ‌ ‌ ‌ در معنی سے تھا وہ گوہر بخش
دوسرا ایسا کب غزل خواں ہے ‌ ‌ ‌ ‌ جس کا ہر حرف ایک دیواں ہے

Marfat.com

اس کے دیواں کا کیا کہوں عالم　　جس پہ مفتوں ہوا ہے اک عالم
حجت قاطع اوس کا ہر قطعہ　　جس نے اقتطاع ملک شعر لیا
ہر رباعی ہے ربع مسکوں گیر　　شکل ارکان اربعہ ہے شہیر
اوسکی ہر ہر غزل ہے غزالی　　فیض لینے سے تک نہیں خالی
ہے قصیدے کا قصد یہ بخدا　　کہ ہے قاصد جہاں کے لینے کا
مثنوی بھی ہیں اوس کی مثنا　　منقطع جس سے سب کا ہے کہنا
بیت معمور سے تھی بیت　　قدر عالم میں اپنے ہر ہر بیت
کیا کہوں اوسکی میں ادا بندی　　کیوں نہ پھر اوسکی ہو ادا بندی
نہ رہا وہ مگر رہے گا نام !　　زندہ شعر و سخن سے تا بہ قیام
وہ نہیں مر گیا ہے اوسکو حیات　　ریختہ مر گیا مگر ہیہات
جبکہ خلاق ہو سخن کا فوت　　آتش کیوں کر نہ پھر سخن کو موت
حق ہے حقا سخن حقیقت کا　　ثانی پیدا نہ ہوگا جرأت کا !
شمع بزم سخن طرازاں تھا !　　گل ہوئی وہ تو ہے اندھیرا سا
نہ رہا اس جہاں میں وہ مرحوم　　آسمان ہنر جہان علوم !
دے کے اصلاح تا وہ سر تا پا　　رہنے دیتا نہ سقم اس میں ذرا
گر صحیح اس کا قول ہو جاتا !　　کس کا منہ تھا غلط جو ٹھہراتا
ملتجی تجھ سے تب نہ میں ہوتا　　نہ رہا وہ رہوں نہ کیوں روتا
عجز کرتی بلا نہ تب میری　　عاجزی اس میں اب ہے سب میری

Marfat.com

ایک غلط فہمی کا ازالہ

ڈاکٹر اقتدا حسن اپنے مضمون میں لکھتے ہیں۔
"حقیقت نے چارلس پیرون (جنرل پیرون ملازم سندھیا) کی فرمائش پر خسرو کی ہشت بہشت کو اردو کا بھی جامہ پہنایا تھا یہ ترجمہ ۱۲۱۱ھ یا ۱۲۱۵ھ میں ہوا۔"

حقیقت اور میر محسن لکھنوی پر اپنے مضامین میں بیشتر اہلِ علم نے وہی بات کہی ہے جس کا تذکرہ ڈاکٹر اقتدا حسن اپنے مضمون میں کر چکے ہیں۔ اور اس غلط فہمی کی بنیاد آگرہ کالج کے پروفیسر ٹامسن کا ایک مکتوب ہے جو میر محسن کے پڑپوتے میجر جنرل سید شاہد حامد کے خاندانی کاغذات میں موجود ہے۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ وقیع اور معتبر و مستند رائے خود مصنف کی ہو سکتی ہے۔ اگر اس مثنوی کا حقیقت نے اردو میں ترجمہ کیا ہوتا تو یقیناً اس کا تذکرہ کہیں نہ کہیں کرتے۔ البتہ ہشت گلزار میں ایک جگہ وہ بہ صراحت یہ کہتے ہیں کہ اس مثنوی کو اردو زبان میں منظوم کرنے سے قبل وہ آسان فارسی نثر میں منتقل کر چکے تھے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں۔ ۱؎

گو کہ ہے خوب پاکر ہے یہ زرشت!
ایک قصہ یہ ہے بہ بہشت بہشت

خسروِ شاعراں نے جس کو کہا — فارسی کی زبان میں سرتا پا!
پیش ازیں او سکو میں بہ نقش و نگار — فارسی میں کیا تھا نثر اے یار
نثر بھی ایسی ہی ہوئی وہ رقم! — مصرعہ جس پر نثار ہے ہر دم
طوطیٔ ہند کا میں توشہ چیں! — ہندی میں اب لکھوں ہوں اسکے تئیں

۱؎ میر محسن لکھنوی۔ مطبوعہ صحیفہ لاہور۔

Marfat.com

چنانچہ حقیقت نے خسرو کی اس مثنوی کو آسان فارسی نثر میں لکھا تھا جس کا اردو ترجمہ غلام احمد دہلوی نے کیا تھا جس کا تذکرہ پروفیسر بلوم ہارٹ کی دو فہرست کتب خانہ انڈیا آفس کے اردو مخطوطات میں ملتا ہے۔ اس فہرست کا اور ترجمہ حکیم شمس اللہ قادری نے کیا تھا۔

"غلام احمد دہلوی نے ہنری مارٹن کی فرمائش سے ۱۲۱۲ ہجری میں سید حسین حقیقت کی ہشت گلزار کا ترجمہ کیا۔" ہشت گلزار نثر ہے امیر خسرو کی مثنوی ہشت بہشت کی۔ ۱۲۱ ورق۔

حقیقت کا اسلوب شاعری

شاہ حسین حقیقت کا انداز بیان خالصتاً لکھنوی ہے۔ لیکن اس مثنوی کو اعلیٰ درجے کی فنکارانہ تخلیق شاعرانہ خوبیوں کی بناء پر نہیں قرار دیا جا سکتا۔ جس عہد میں حقیقت یہ مثنوی لکھ رہے تھے۔ تو مثنوی سحر البیان اپنے انداز بیان سلاست اور مجلسی و تہذیبی زندگی کے مرقعے کھینچنے اور جذبات نگاری کے سبب نہ صرف غیر معمولی شہرت حاصل کر چکی تھی بلکہ فن کی انتہائی بلندیوں کو چھو کر مثنوی نگاری کی میں ایک اعلیٰ درجے کا معیار قائم کر چکی تھی۔ چنانچہ لکھنؤ کے تقریباً ہر شاعر کے دل میں اس بات کی خواہش پیدا ہونا فطری تھی کہ وہ بھی اس درجے کی کوئی مثنوی لکھ کر شہرت عام اور بقائے دوام پا سکے۔ چنانچہ ہم یہاں ڈاکٹر لطیف حسین ادیب کی اس رائے سے متفق ہیں کہ ہشت گلزار کی تصنیف کے وقت اس کا ردِ عمل فطری تھا۔ لیکن انھوں نے سحر البیان کے مقابلے میں نہ تو کوئی نئی بنیاد رکھی اور نہ آرائش کے لئے کوئی نیا سامان فراہم کیا۔ بس یہ تاثر ضرور دیا ہے کہ ہشت گلزار کے مقابلے میں سحر البیان پانے میں دھونے کے قابل ہو گئی ہے۔

له انڈیا آفس لائبریری میں ہندوستانی مخطوطات کی فہرست از پروفیسر بلوم ہارٹ۔ مطبوعہ آکسفورڈ پریس ۱۹۲۶ء ص ۱۵-۴۲

Marfat.com

اس شاعرانہ تعلی کا اظہار حقیقت نے مثنوی کے آخر میں یوں کیا ہے۔ ؎

معنی تازہ ہیں لفظ بھی رنگین !
جوں گل نوبہار خلد بریں ! !

ہے ہر ایک لفظ غیرت گلزار
ہر سطر سے عیاں ہے سنبل زار

معنی یوں لفظ میں ہیں جلوہ گرا
ہو بھری جیسے شیشے میں صہبا

ملاں حسن دہلوی اگر ہوتے !
مثنوی اپنی پانی میں دھوتے

لن ترانی نہ کر حقیقت تو
اپنے منہ سے نہ بن میاں مٹھو

شاعر کو اس حد تک تو تعلی کی اجازت دینا ہی چاہیئے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر تخلیق کار میں یہ احساس موجود نہ ہو تو بیشتر عظیم شعری وفنی کارناموں کی ہیئت اس سے کوئی تخلیق نہیں کرا سکتی۔ جہاں تک موازنے کا تعلق ہے تو بلا خوف تردید کیا جا سکتا ہے کہ سلاست بیان مجلسی۔ ذنہذیبی زندگی کے مرقعوں، انسانی جذبات کے اظہار اور فنکارانہ چابکدستی اور شاعرانہ محاسن کے اعتبار سے ہشت گلزار سحر البیان کی گرد کو بھی نہیں پہنچتی۔

ڈاکٹر ادیب :۔ مذکورہ مثنویوں کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"ہشت گلزار کو سہ ر قندی تو ملی مگر حسن چمن بندی سے محروم رہی اس کی معاشرتی جھلکیاں، رسوم کے بیانات، جذبات نگاری اور منظر کشی مثنوی سحر البیان کے فن کی اس بلندی کو نہیں پاتے جو حسن بیان کی مربوط یکجائی کا نتیجہ ہوتی ہے۔"

ہشت گلزار کی زبان میں سادگی ہے اور اس میں حتی الامکان متروک الفاظ کے استعمال سے بھی پرہیز کیا گیا ہے۔ جو لکھنو میں تحریک اصلاح زبان کے زیر اثر معلوم ہوتا

Marfat.com

ہے۔ اس کی بحر، سحر البیان کی بحر کی طرح رواں دواں نہیں ہے۔
اکثر جگہ اشعار میں کسی قسم کے شاعرانہ محاسن نہیں ملتے۔ اور شاعر کا اندازِ بیان سپاٹ اور کھردرا ہو جاتا ہے۔ اور یہ گمان گزرنے لگتا ہے کہ شاید ہم نثر کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ ایسے مقامات پر آمد کی بجائے آورد معلوم ہوتی ہے۔ اور قاری کے طبع رواں کو یک لخت جھٹکا سا محسوس ہوتا ہے۔ بعض جگہ یہ خیال آتا ہے کہ شاعر نے بڑی مشکل سے خیال کو نظم کا روپ دیا ہے۔ اکثر اشعار میں ترنم اور موسیقیت بھی موجود ہے۔ لیکن بیشتر جگہ سپاٹ نثری انداز ہی ہے۔ اس تمام کے باوجود اس بات سے اتفاق کرنا پڑے گا۔

"یہ مثنوی اس زمانے کی زبان کا بہتر نمونہ ہے۔ سحر البیان کے بعد اس کے زیرِ اثر وجود میں آنے والی مثنویات میں اس کا نام بلاشبہ سرِ فہرست ہی لکھنا ہو گا۔"

ہشت بہشت اور ہشت گلزار کا موازنہ

شاہ حسین حقیقت نے اپنی مثنوی کے آغاز میں ہی اس بات کا اعلان کر دیا ہے کہ وہ امیر خسرو کے مقابلے میں خود کو کم تر شاعر اور اپنی کاوشوں کو فرومایہ سمجھتے ہیں۔ انھوں نے خسرو کی مثنوی کو مغز اور اپنی شاعری کو پوست قرار دیا ہے۔ تاہم ہم یہاں اس غرض سے ہشت گلزار اور ہشت بہشت کا موازنہ پیش کر رہے ہیں تاکہ ایک طرف تو یہ واضح ہو جائے کہ جب ایک بڑا شاعر کسی موضوع کو اختیار کرتا ہے تو اس میں کیا کیا خوبیاں پیدا کر دیتا ہے اور ایک کم تر درجے کے فنکار کے ہاتھوں وہی موضوع کس شکل میں قارئین کے سامنے آتا ہے۔ خسرو کی مثنوی میں اختصار کا فن جا بجا نظر آتا ہے۔ حقیقت گو کہ اختصار سے بات کہنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ان کے ہاں وہ شدت تاثر پیدا نہیں ہوتا۔ خسرو کی مثنوی کے

۱: شاہ حسین حقیقت از ڈاکٹر لطیف بحوالہ سابق

Marfat.com

حوالے سے ہی حقیقت، کی مثنوی کے مختلف رخوں پر بحث کی جا سکتی ہے۔ علاوہ ازیں اس اعتبار سے بھی دونوں مثنویوں کا موازنہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ حقیقت کس حد تک امیر خسرو کی تقلید میں کامیاب ہے اور ان کی مثنوی کو جملہ فنی محاسن کے ساتھ ترجمہ کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں یا نہیں ؟

ہشت بہشت امیر خسرو کی آخری دور کی تصنیف ہے۔ اس وقت تک امیر خسرو کا فن ارتقا کے منازل طے کرتا ہوا اپنے عروج تک پہنچ گیا تھا۔ خسرو نے ۷۰۱ ہجری میں اس کو تخلیق کیا تھا۔ اس کے کل اشعار کی تعداد خسرو کے بقول تین ہزار تین سو پچاس ہے ۔

همه بیتش بگاه عرض شمار
سه صد و پنجه آمد و سه هزار !
سال هجری یکے ز هفته بود
کس بنا برد ، بچرخ کبود !

ہشت گلزار کے اشعار کی تعداد چار ہزار سات سو پینسٹھ ہے۔ ؎

شعر کتنے ہوئے کیا جو شمار !
سات سو پینسٹھ اور چار ہزار !

بحر امیر خسرو کی مثنوی کی بحر "خفیف مسدس مخبون مستور" ہے یعنی فاعلاتن مفاعلن مفلات۔

حقیقت کی مثنوی کی بحر :۔ فاعلاتن مفاعلن فعلن

ابواب ہشت بہشت کو سب سے پہلے مولانا نظامی گنجوی نے ہفت پیکر کے نام سے لکھا تھا۔ ہفت پیکر میں چند ابواب امیر خسرو کی ہشت بہشت سے زیادہ ہیں۔ نامد ابواب میں خاقان چین و بہرام کی لڑائی، شیر مارنے کی تعریف، اور

ا۔ ہشت بہشت از امیر خسرو مرتبہ مطبوعہ انجمن ترقی اردو علیگڑھ۔

Marfat.com

اژدہا مارنے وغیرہ کا تذکرہ تقریباً پندرہ بیس عنوانات نامذ ہیں۔ ان عنوانات کے ذیل میں کہیں کہیں کوئی حکایت اور تمثیل بھی آجاتی ہے۔ خسرو نے یہ عنوانات اپنی مثنوی میں قائم نہیں کئے تھے۔ ہفت پیکر میں نصیحت کا مخاطب بیٹا ہے اور ہشت بہشت میں بیٹی ہے۔ اب ہم خسرو اور حقیقت کی مثنویوں کے ابواب پیش کرتے ہیں۔ امیر خسرو کی مثنوی میں حسب ذیل اکیس ابواب ہیں۔

(۱) حمد (۲) نعت (۳) معراج (۴) تعریف بادشاہ (۵) خطاب بسوئے بادشاہ (۶) سبب تالیف (۷) نصیحت بدختر (۸) صفت دلارام (۹) شکار بہرام (۱۰) رنجیدن بہرام وگذاشتن دلارام (۱۱) آراستہ شدن محل بہرام (۱۲) گنبد مشکیں (۱۳) گنبد زعفرانی (۱۴) گنبد ریحانی (۱۵) گنبد گلناری (۱۶) گنبد بنفشئی (۱۷) گنبد صندلی (۱۸) گنبد کافوری (۱۹) وفات بہرام (۲۰) خاتمہ (۲۱) شکرگزاری حق تعالیٰ۔

حقیقت نے ہشت گلزار میں جو ابواب قائم کئے ہیں ان کی تعداد اٹھارہ ہے۔

(۱) حمد باری تعالیٰ (۲) نعت (۳) مجیب الدعوات سے حاجات (۴) چمنستان مناجات (۵) نالہ مصنف بہ رنگ ہزار داستان (۶) مدح امیر کبیر عبدالقادر خان ثابت جنگ (۷) گلزار اول نخل بندی آغاز داستان (۸) بہرام اور دلارام کا شکار کو جانا (۹) سات ایوانوں کی تیاری (۱۰) گنبد مشکیں (۱۱) گنبد زعفرانی (۱۲) گنبد ریحانی (۱۳) گنبد گلناری (۱۴) گنبد بنفشہ گوں (۱۵) گنبد صندلی محل (۱۶) برج کافوری (۱۷) بہرام گور کی وفات (۱۸) خاتمہ و عجز و نیاز مصنف۔

اصل فارسی مثنوی میں تمام گنبدوں کا رنگ جداگانہ ہے حقیقت نے بھی اس کی تقلید کی ہے۔ ہر شہزادی کا لباس جس گنبد میں وہ رہتی ہے۔ اس کی مناسبت سے ہے۔

Marfat.com

بہرام گور کا لباس بھی ہر شب گنبد کے رنگ کے مطابق اور نیا ہوتا ہے۔ بہرام گور جس روز جس گنبد میں جاتا ہے۔ اس میں بھی ستارے کے رنگ کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اہلِ نجوم کے مطابق تمام سیاروں کا رنگ منفرد ہوتا ہے۔ ان میں کوئی سیاہ، کوئی سبز کوئی سرخ ہے۔ اور اہلِ نجوم کی تقسیم کے مطابق ہفتے کے ساتوں دن انہی سیاروں سے تعلق رکھتے ہیں۔ حقیقت نے بھی یہی انداز اختیار کیا ہے۔ اور اضافوں کے باوجود مثنوی کی کہانی میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں کی ہے۔

امیر خسرو نے گنبد مشکیں کو یوں بیان کیا ہے۔

روز شنبہ کہ بادِ مشک انگیز — شد بداماں صبح غالیہ ریز!

شہ بہ گنبد سرائے مشکیں شد — خانہ او ہمچو نافۂ چیں شد

جامہ را ہم بہ رنگ کیوانی! — داد ترتیب غبر افشانی!

حقیقت نے اسی خیال کو اس صورت سے ادا کیا ہے

روز شنبہ ہوا جو غالیہ سا — شب کا باد سحر نے مشک گھسا

شاہ کیواں ہمم بلند مقام — مہر برج شرف وشہ بہرام!

سج کے پوشاک سب وہ کیواں رنگ — دیکھ کر جس کو ہو زحل بھی دنگ

برج مشکیں میں جلوہ گر وہ ہوا — نافۂ مشک چیں گہر وہ ہوا

خسرو جس بہشت کا بیان شروع کرتے ہیں اس کے رنگ کو اس خوبی سے بیان کرتے ہیں کہ ابتدا سے آخر تک پورے قصے پر اسی رنگ کی کیفیت چھائی رہتی ہے۔ اور وہ اس رنگ کے فلسفے کو بیان کرتے ہیں۔ حقیقت نے ترجمے میں اس خوبی کو کامیابی کی حد تک برقرار رکھا ہے۔ جس کا اندازہ مذکورہ مثال سے بخوبی ہو سکتا ہے۔

Marfat.com

کردار نگاری امیر خسرو کی مثنوی میں نہایت اعلیٰ درجے کی کردار نگاری ملتی ہے۔ جس شخص کا تذکرہ خسرو کرتے ہیں اس کی حیثیت اور مرتبے کا پورا پورا خیال رکھتے ہیں اور اس صورت سے جزیات نگاری اور تفصیلات بیان کرتے ہیں کہ کردار مکمل طور پر نمایاں ہو جاتا ہے۔ حقیقت تے اس کا خاص خیال رکھا ہے اور جذبات نگاری سے کردار کو ابھارنے کی کامیاب کوشش کی ہیں۔

دلارام بہرام گور کی معشوقہ ہے اور جملہ مہمات میں اس کی رفیق و دمساز رہی ہے۔ وہ بہادر اور جفاکش بھی ہے لیکن عورت ہونے کے سبب اپنی صنفی کمزوریاں بھی رکھتی ہے۔ پھر یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ جو آفت ناگہانی ایک دم دلارام پر نازل ہوتی ہے۔ ایسی صورت حال سے اگر کوئی مرد بھی دوچار ہوتا تو اس کی بھی نفسیاتی و ذہنی کیفیت یہی ہوتی جب بہرام گور، دلارام کو اس صحرا میں بے یار و مددگار چھوڑ جاتا ہے۔ تو اس یک بیک تبدیلی سے وہ گھبرا جاتی ہے۔ اس وقت دلارام کی جو ذہنی کیفیت ہے۔ اس ڈر، خوف، گھبراہٹ اور اندیشوں اور وسوسوں کی تصویر امیر خسرو نے نہایت کامیابی سے کھینچی ہے جو مرقع نگاری کا کمال ہے۔ اور یہ کیفیت عین فطری ہے۔ ۵۰

ماند بے خویشتن صنم تا دیر !

تشنہ دعزق آب۔ واز جاں سیر !

پس بصد خستگی زجا برخاست	راہ صحرا گرفت و می شد راست
بسکہ منزل بدشت ویران داشت	سایہ خویش دیو می پنداشت
بسکہ رہ بر سناں تیز رشش بود !	موزہ غربال خاک بیز رشش بود
از کف پائے خارہائے چو تیر	میگذشتن چو سوزنے چہ حریر

Marfat.com

پاکہ از برگ گل فگار بود ! | چمل شرر چوں بروئے خار شود
کس نہ ہمراہ در رہنمائش مگر | سایہ درزیرو آفتاب زبر
می نمود اندراں پریشانی ! | گفتہ و کردہ را پشیمانی ! !
زاں بساط دواں آہو خائے | کرد بیم دو آتش آہو پائے

بیم بود کش کہ پا شود بطواف !
چمل سم آہو از میانہ شگاف !

امیر خسرو نے ان اشعار میں دلارام کی جو کیفیت بیان کی ہے وہ بالکل فطری ہے۔ اس آفت ناگہانی کا پہلا اثر تو یہی ہوا کہ دلارام ایسی متحیر اور تشدد رہ گئی کہ تھوڑی دیر تک تو وہ یہی نہ سمجھ سکی کہ اس کے ساتھ کیا بیت چکی ہے جب ہوش و حواس بجا ہوتے ہیں تو اسے اپنی نازک حالت کا اندازہ ہوتا ہے۔ زبان سوکھ کر کانٹا ہوگئی ہے اور دہشت و غم سے نڈھال ہوگئی ہے۔ اور حیران و متوحش ہے۔ غرض خسرو نے نہایت کامیابی کے ساتھ اس بے سرو سامانی کی تصویر کھینچ دی ہے۔ دلارام کو پیش آنے والے اس واقع کو حقیقت نے کس طرح بیان کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

ہر قدم پر تھی خائف و لرزاں
گاہ گریاں تھی اور گہے گریاں !

سائے سے اپنے خوف کھاتی تھی | سایہ ساں جاں نہ تھی پہ جاتی تھی
چھبتے تھے ہر قدم پہ سینکڑوں خار | کف پا دونوں خار سے تھے فگار
برگ گل سے جو اس کے تھے کف پا | خاروں میں تھا ہر قدم چھبتا !
اپنی گفتار سے پشیماں تھی ! | حالت اس کی غرض پریشاں تھی

گرم رتیل وہ اور خوف رواں — دل سوزاں سے آہ سرد کشاں
بسکہ ہر ہر قدم تھا خوف ہلاک — تھی اڑاتی وہ اپنے سر پہ خاک
پات کوئی اگر کھڑکتا تھا — تو کلیجہ وہیں دھڑکتا تھا!
گاہ آتا نظر جو بیشۂ شیر! — شیر غم لیتا آ ہوئے دلگیر!

کرتے جاتے تھے آبلے پابوس
جب چلی اس طرح سے وہ کئی کوس

اسی طرح امیر خسرو نے ہشت بہشت کی بہشت ہفتم کے بیان میں اس واقعے کا ذکر کیا ہے جب شہزادہ طلسمی سرمہ آنکھوں میں لگا کر اہل دربار کی نگاہوں سے پوشیدہ ہو جاتا ہے اور اپنے مُوکّل کو اشارہ کر دیتا ہے کہ بدکار وزیر کو دھول لگائے۔ خسرو نے اس واقعے کو جزئیات کے ساتھ یوں پیش کیا ہے کہ نظر کے سامنے تصویر کھنچ جاتی ہے۔

کرد اشارت بہ دیو تا برخاست
دست خود کرد بہر سیلی راست

زد قفائے بہ خواجۂ دیواں — کہ بلرزید زاں طراق ایواں!
کارداراں نہ جائے بر جستند — سرِ آں حال طاپچے جستند
ہمدریں گفتگوئے بُد ہر کس — کاہرمن باز در رسید ز پس
زد چناں سیلی دگر ناگاہ! — کز سرِ خواجہ بر فتاد کلاہ!
کلہ گرد خوردہ رازاں گرد! — تا ستانہ قفائے دیگر خورد
حیرتے درمیان خلق افتاد — دوست آزردہ گشت دشمن شاد
مرداں از خجالت دستور — دور گشتند یک بیک ز حضور

Marfat.com

این زسو وائے سیلیش خنداں — واں دگر پشت دست بر دنداں

خواجہ جست از خجالت سیلی !

بارخ زرد گردن نیلی ! !

ان اشعار میں امیر خسرو نے نہایت تفصیل کے ساتھ دیو کا ہاتھ اٹھانا، دھول مارنے کے لئے اس کو سنبھالنا اور پھر دھول رسید کر کے ایک لمحے کے لئے ٹھہر جانا تاکہ لوگ متحیّر ہوں۔ اور ایک دوسرے کی طرف تعجب و استعجاب کے ساتھ دیکھنا ان تمام تفصیلات کو اس صورت سے پیش کیا گیا ہے کہ واقعہ آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتا ہے۔ اُس کو جزئیات نگاری اور مرقع نگاری کا کمال کہا جا سکتا ہے۔

شاہ حسین حقیقت نے بھی اس منظر کو بیان کرتے ہوئے یہ امر ملحوظ رکھا ہے کہ واقعہ کو جزئی تفصیلات کے ساتھ لکھا جائے اور وہ اس میں کامیاب بھی رہے ہیں۔ سه

آکے دیوانِ عام میں یک بار

بولا یوں دیو سے کہ رہ ہشیار

یعنی جس کو کروں اشارہ میں — خوب ہی دھولیانا اسکے تئیں

آیا جس دم وزیر گردن کش — سر پُر از بادِ کبر جوں آتش

کج رکھے فرق پر کلاہ غرور — مجرے کو خم ہوا جو شہ کے حضور

دیو نے ایسی ہی جڑی اک دھول — کہ خطا ہو گیا وزیر کا بول !

ہو کے حیران اور پھرا گردن ! — دیکھا یعنی ہے کون سیلی زن

سر پھرانے کے ساتھ ہی بس جب — لگ گئی اور ایک سر پر دھپ

گر پڑی سر پہ سے کلاہ اے واے — جھک کے چاہا زمین پر سے اوٹھائے

Marfat.com

نہ ابھی تھی اٹھائی جو دی جڑ — دیو نے پھر یہ بارہ ایک چھکڑ
دوڑے مردم یہ دیکھ بوالعجبی ! — یعنی کی کس نے ایسی بے ادبی
کوئی ادھر دوڑا کوئی ادھر آیا — بے ادب پر نہ وہ نظر آیا !
بے ستم پڑنے پھر لگی شپ شپ — دھول پر دھول اور دھپ پر دھپ
دیکھ یہ حال سب ہوئے حیران — دوست غمگین اور عدو شاداں
چھپتا پھرتا تھا گو ادھر اور ادھر — سر کھجاتا ہوا برہنہ سر
پر نہ موقوف تھے جم و سر خپک — دیکھ یہ حال ہر کوئی تھا دنگ
ایک ہنسے ایک دکھ عجب تھا حال — کوئی ہنستا تھا منہ پہ دھر رومال
کوئی انگشت زیر دنداں تھا ! — کوئی گریاں تھا کوئی خنداں تھا
پڑتے تھے جوں جوں دھل پر بس دھول — کہتے تھے لوگ الاماں لاحول
دھول جس دم وزیر تھا کھاتا — شرم سے تھا زمیں میں گڑ جاتا
دیکھ کر لوگ خجلت دستور — ٹل کے جاتے رہے تھے پاس سے دور
لوٹے تھا کوئی ہنسی سے پکڑے پیٹ — ہنستے ہنستے گیا تھا کوئی لیٹ
کوئی کہتا کسی پہ غصہ کر ! — ہنس نہ آتا خدا کے قہر سے ڈر

چاند ہوتی ہے ایک کی گنجی !
سوجھتی کس طرح ہے تجھکو ہنسی

اس واقعے کے بیان میں حقیقت نے جزئیات نگاری سے کام لیتے ہوئے پورے واقعے کی تصویر کھینچ دی ہے۔ بادشاہ کا دربار ہے۔ وزیر آ کر بیٹھتا ہے کہ دیو جو نظر نہیں آتا۔ دھول لگانا شروع کر دیتا ہے۔ دوست دشمن سب کے ہوتے ہیں۔ ہر چند کہ اس بلائے

Marfat.com

ناگہانی نے سب کو دہشت زدہ کر دیا ہے۔ لیکن وزیر کے دشمن اسے اس حال میں دیکھ کر دل میں خوش ہو رہے ہیں۔ ایسے موقعوں پر معاملہ چاہے کتنا ہی سنگین کیوں نہ ہو لیکن اگر اس میں کوئی مزاح کا پہلو ہو تو یقیناً زندہ دل لوگ اس سے عبرت پکڑنے کے ساتھ ساتھ اپنی ہنسی کو بھی نہیں روک سکتے۔ ایسے لوگ یہاں بھی موجود ہیں جو ہنس بھی رہے ہیں اور ایسی ہنسی کے دوران دوسروں کو سنجیدہ ہونے کے لئے کہہ رہے ہیں۔

امیر خسرو کی مثنوی ہشت بہشت مرتب ایک جگہ لکھتے ہیں[۱]۔

"فن ہمیشہ ایسے اختصار کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہے کہ جس میں خیال آفرینی کے وسیع امکانات کو سمو دیا گیا ہو۔ امیر خسرو نے تمام شعبہ ہائے تیر اندازی کے کمال کو صرف تین اشعار میں بیان کر دیا ہے۔ جس سے ان کے قدرت فن، صفائی و سلاست اور کلام کی پختگی و چستی کا اظہار ہوتا ہے۔"

اس کے بعد انھوں نے مندرجہ ذیل تین شعر دیے ہیں۔ جن کا تعلق بہرام گور کی تیر اندازی سے ہے۔ سہ

آہن زچوں محک کردے | خط گوراں زپشت حک کردے
ورزآہو بدے نشانۂ او ! | موئے بشگافتے زشانۂ او !
ورشدے بر نشانہ سخت انداز | رخنہ درناف کوہ کردے باز

"بہرام گور جس طرح چاہتا تھا تیر چلاتا تھا کبھی تو گورخر کی پشت پر جو خطوط ہوتے تھے انھیں تیر سے اڑا دیتا تھا۔ کبھی ہرن کے بالوں کی موشگافی کرتا اور شکار کو کچھ آزار نہ پہنچتا اور جو زخم پہنچانا چاہتا تو ایسی قوت و طاقت سے

۱۔ ہشت بہشت مرتبہ محمد حنیف اشرف ندوی، مطبوعہ انجمن ترقی اردو علیگڑھ

Marfat.com

تیر بیٹھتا کہ گورخر کا تو کیا ذکر پہاڑ میں بھی سوراخ ہو جاتا۔"

ان اشعار میں شاعرانہ مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا ہے۔ لیکن شاعری میں اس مبالغہ آرائی کو جائز قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس میں شاعر نے بہرام گور کی ماہرانہ تیر اندازی کی تعریف کی ہے۔ اور صرف تین اشعار میں اس کو بیان کر دیا ہے۔

حقیقت نے بہرام گور کی تیر اندازی کو ذرا پھیلا کر بیان کیا ہے ؎

قادر انداز یوں بہ فن تیر
مارے اک تیر سے جو سو نخچیر

تیرہ شب میں وہ چھید تا تھا بال — تیر سے اوس کے تھا بچاؤ محال
تیر کے حق میں تھا وہ سخت کمان — الغرض کوئی تو دہ طوفان!
تیر جب ہاتھ اوس کے آتا تھا — تیر گردوں بھی سہم جاتا تھا!

اوس کے قبضے میں آتی جب کہ کمان
قوس چرخ اوس پہ جاتا تھا قرباں

اسی طرح بہشت ششم کے قصے میں جب سوداگر زادہ ایک سال غائب رہنے کے بعد طلسمی حمام سے برآمد ہوتا ہے تو اس وقت اس کے غلاموں کی جو کیفیت خسرو نے بیان کی ہے ان میں ان کے طبقاتی مزاج اور سماجی حیثیت کو ملحوظ رکھا ہے۔ ؎

چوں بدیدند روئے منعم خویش — در دویدند خواجہ را در پیش
ہر یک از بندگان بہ آزادی! — گریہ میکرد لیکن از شادی!
بندہ وارش بپا در افتادند — بوسہ بر دست و پاش میدادند

حقیقت نے اس واقعے کو جس طرح بیان کیا ہے اس میں اثر آفرینی اور خاص

Marfat.com

کیفیت جو ایسے موقع پر غلاموں میں دکھائی چاہیئے تھے، انہیں پیش کر سکے ۔

تھے غلام اس کے جو نمک بہ حلال — آتے تھے روز واں وہ خستہ حال

منتظر در پہ رہتے تھے بیٹھے — بارے موجود واں وہ اس دم تھے

دیکھ آقا کو دوڑے وہ اک بار — اور رونے لگے پکار پکار !

امیر خسرو نے اس وقت غلاموں کے رونے کو "گریہ شادی" کہا ہے۔ حقیقت نے بس پکار پکار کر رونے کی کیفیت بیان کی ہے جس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ ان غلاموں کی یہ کیفیت، مدت مدید کے بعد اور آقا کی زندگی سے مایوس ہو جانے کے بعد ہوئی ہے۔

Marfat.com

قصہ ہیرامن طوطا

بعض تذکرہ نویسوں نے مثنوی ہیرامن طوطا کو بھی حقیقت کی ایک علیحدہ تصنیف قرار دیا ہے۔ اس غلط فہمی کی وجہ یہ ہے کہ حقیقت نے خود بھی اس داستان کو علیحدہ کتابی شکل میں کانتھ پریس لکھنؤ سے شائع کرایا تھا۔ لیکن اصل میں یہ ہشت گلزار کی ہی ایک داستان ہے۔ حقیقت نے اس مثنوی کی حمد و نعت کے بعض اشعار اور آخر میں اپنی اشعار میں سے انتخاب کیا ہے۔ ——— جس میں شاعر نے اپنے حالات زندگی بیان کئے تھے۔ یہ داستان علیحدہ سے ۵۲-۱۸۵۱ میں شائع ہوئی تھی لہذا ہشت گلزار کی اس داستان پر خصوصیت سے بحث کی جا رہی ہے۔

مثنوی ہیرامن طوطا

شاہ حسین حقیقت کی یہ مثنوی کانتھ پریس لکھنؤ سے حسب فرمائش مرزا اصابت علی بیگ عنایت تخلص کے شائع ہوئی تھی۔ اس وقت ہمارے سامنے کانتھ پریس کا طبع شدہ نسخہ ہی ہے۔ اس قصے کو مصنف نے مثنوی نے کہا۔ بلکہ اس کا عنوان "قصہ ہیرامن طوطا" ہے۔ جس کو با اجازت مصنف، ناشر نے شائع کیا ہے۔ ہیرامن طوطا، حقیقت نے کس سنہ میں تصنیف کیا تھا اس کے بارے میں زیر تذکرہ مطبوعہ نسخے سے کچھ پتہ نہیں چلتا۔ البتہ عنایت کے قطعے

Marfat.com

سے جو کتاب کے آخر میں دیا گیا ہے۔ اس کے سال طباعت کا پتہ چلتا ہے۔

قصہ یہ نیا جولے عنایت چھاپا ۔۔۔ محظوظ ہوا وہ جس نے اوسے پڑھا
آواز غیب سے یکایک آئی! ۔۔۔ لکھ قصہ دلپذیر مطبوع !

۱۲۶۸ھ

عنایت کے اس قطعے قصہ ہیرامن طوطا کا سن طباعت ۱۱۹۹ ہجری برآمد ہوتا ہے۔ جیسا کہ زیر تبصرہ نسخے میں شائع ہوا ہے۔ پروفیسر لطیف حسین ادیب نے مثنوی ہیرامن طوطا کا سن طباعت ۱۲۶۸ ہجری (۱۸۵۱-۱۸۵۲) بتایا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔" یہ مثنوی ۱۲۶۸ھ (۱۸۵۱-۱۸۵۲) سن عیسوی میں کانتھ پریس لکھنؤ میں طبع ہوئی۔" قصہ دلپذیر مطبوع۔" (۱۲۶۸ھ) سے سن طباعت برآمد ہوتا ہے[1]۔ حقیقت نے پوری مثنوی ۱۲۲۵ھ میں سپرد قلم کی تھی۔ جس کا یہ حصہ" قصہ ہیرامن طوطا" کے عنوان سے ۱۲۶۸ ہجری میں علیحدہ مطبوع ہوا۔

حقیقت نے یہ مثنوی سفر کرناٹک وغیرہ کے بعد لکھی تھی۔ جس کے شواہد خود اس قصے میں ملتے ہیں۔ سفر وسیلہ ظفر ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت کے معاملے میں جنوبی ہند کا یہ سفر، وسیلہ ظفر کی بجائے اور پریشانیوں کا موجب تھا۔ چنانچہ ہیرامن طوطا میں وہ لکھتے ہیں۔

نہ سفر سے تو کچھ ہوئی بہبود ! ۔۔۔ کار بستہ نے کچھ نہ پائے کشود

تلاش معاش کے سلسلے میں لکھنؤ جیسے وطن کا چھوٹنا اور پھر دیار غیر میں بھی کسی مناسب ذریعۂ روزگار کے نہ ملنے نے حقیقت کے دل میں لکھنؤ کی محبت کو اور

۱:۔ شاہ حسین حقیقت۔ از پروفیسر لطیف حسین ادیب معارف ص ۱۲۷ قسط دوم۔

Marfat.com

زیادہ شدت سے ابھارا ہے

ایک شب گفتگو یہ دل سے تھی
لائی قسمت مجھے کہاں میری

چھوٹے یار دیار اور حبیب — طالع شوم وائے ہائے نصیب
یاں کسی سے نہیں شناسائی — پاس نہیں کوئی غیر تنہائی
گھر سے جانا کہیں نہ آنا ہے — خانہ کیا ہے کہ قید خانہ ہے

جلد یاں سے نجات دیوے خدا
مجھکو دکھلائے پھر وطن میرا

معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ واپس آنے کے بعد بھی معاشی حالات بدستور خراب رہے ہے

جب میرا دل بہت ہی گھبرایا
مجھ سے ہاتف نے آکے فرمایا!

کس لئے اس قدر ہراساں ہے — ارے تیرا ہر ایک خواہاں ہے
مصطفائی دوکان تک تو جا — واں پہ ہیں ایک قدر دان مرزا
ہے عنایت علی جو نام ان کا — لطف احسان ہی ہے نام اونکا
تجھ کو جس وقت دیکھ پائیں گے — رائے عمدہ کوئی بتائیں گے!
اے حقیقت تو ان کے پاس تو جا — لیتا جا کوئی عمدہ سا قصہ
جبکہ ہاتف نے یہ کہا مجھ سے — اٹھکے بیٹھا قلم دکا غذ لے
کہا میں نے یہ ہیرا من طوطا — گو کہ تھا کچھ نہیں میں کہہ سکتا[۱]

۱: قصہ ہیرا من طوطا ص۲

Marfat.com

پروفیسر لطیف حسین ادیب اس سلسلے میں لکھتے ہیں۔

"انھوں (حقیقت) نے جس طرح مثنوی ہشت گلزار نواب عبدالقادر خاں کا تقریب حاصل کرنے کے لئے لکھی تھی۔ اسی طرح یہ مثنوی مرزا عنایت علی بیگ مہتمم مطبع مصطفائی کو پیش کرنے کے لئے لکھی تھی۔"

اس سلسلے میں دو آرا نہیں ہوسکتیں کہ حقیقت نے یہ مثنوی نواب کرناٹک تک رسائی حاصل کرنے کے لئے لکھی تھی۔ شخصی بادشاہتوں کے دور میں یہ روایت عام رہی ہے کہ شعرا ادبا بادشاہ تک رسائی حاصل کرنے کے لئے یا کوئی فن پارہ بادشاہ کی خدمت میں لے کر جاتے تھے اس سے باریابی کا موقعہ ملتا تھا اور فنکارانہ اظہار بادشاہ کے دل میں شاعر یا ادیب کی قدر و منزلت کا احساس جگاتا تھا۔

چونکہ قصہ ہیرامن طوطا، اصل داستان کی ایک مختصر داستان ہے جس کو اگر علیحدہ صورت میں بھی پیش کیا جاتا تو اس کی افادیت اور دلچسپی اور فنی لوازمات کے اعتبار سے کوئی فرق نہ پڑتا تھا۔ لہذا سفر کرناٹک سے واپسی کے بعد حقیقت نے صرف اس داستان کو باقی کتاب سے جدا کر کے طباعت کے لئے دے دیا ہوگا۔ ناشر سے ملاقات کے سلسلے میں جو جواز حقیقت نے پیش کیا ہے۔ اس نے یہ سوال ذہن میں آتا ہے کہ کیا اس قصے کو لے جانے کا مقصد تقریب بہر ملاقات ہوگا یا حقیقت اس کے کسی معاوضے یا مطبع میں کام ملنے کی توقع رکھتے تھے۔ بہر حال اس قدر تو یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ قصہ ان کی آخر عمر کے قصوں میں سے ہے اور اس وقت تک حقیقت لکھنؤ میں غیر معروف نہیں تھے غالباً ان اشعار میں بھی شاعرانہ افتاد طبع کو دخل ہے اور اس زمانے میں یہ ایک رواج سا تھا کہ ناشر وغیرہ کے بارے میں بھی شکر گزاری کے اشعار درج کئے جاتے تھے۔ اس قصے کو

Marfat.com

طباعت کے لئے دینے کا مقصد شاعر کے نزدیک مالی منفعت ہی ہوگی۔

سبب تالیف کے عنوان سے حقیقت نے جو اشعار قصہ ہیرامن طوطا میں دیئے ہیں۔ ان میں اور ہشت گلزار مثنوی کے سبب تالیف کے ذیل میں بیان کئے جانے والے بعض اشعار میں مشابہت ہے۔ البتہ الفاظ میں مناسب رد و بدل کیا گیا ہے۔

ہشت گلزار کا یہ شعر ہے۔

دیکھا پھر آ کے ملک کرناٹک   کہتے دکھن کا ہیں جسے پھاٹک[1]

ہیرامن طوطا میں معمولی سی تبدیلی کے بعد اس شعر کو یوں کر دیا گیا ہے۔

دیکھا پھر آ کے لکھنؤ جس آں   کہتے ہیں ہند کی جسے سب جان[2]

قصہ ہیرامن طوطا میں کل ۴۸۲ اشعار ہیں۔ اردو مثنوی کی روایت کے باوصف اس مثنوی کا موضوع عشقیہ نہیں ہے۔ بلکہ یوگ کا علم ہے۔ اور دوستی کے پردے میں دشمنی کرنے والوں کا کردار اس میں پیش کیا گیا ہے۔ اردو کی تمام مثنویات کی طرح اس مثنوی میں بھی شروع میں حمد اور پھر نعت ہے۔ اس کے بعد سبب تالیف بیان کیا گیا ہے اور پھر اصل قصے کا آغاز ہوتا ہے۔ اگر حمد نعت اور سبب تالیف کے سلسلے میں کہے جانے والے اشعار جن کے اشعار کی تعداد ۶۴ ہے، نکال دیئے جائیں تو کہا جا سکتا ہے کہ اصل قصہ ۴۱۸ اشعار میں بیان کیا گیا ہے۔

یوگ کا علم ایک قدیم ہندوستانی علم ہے۔ جس سے ہندو سنیاسی واقف ہوا کرتے تھے۔ اس علم کو علم کایا پلٹ بھی کہتے ہیں۔ جس میں کسی بھی ذی روح کی روح ایک قالب سے دوسرے قالب میں منتر کے ذریعے منتقل کی جاتی تھی۔ اس قسم کی داستانوں

Marfat.com

کا سراغ ہمیں جنوبی ہند کی قدیم داستانوں میں ملتا ہے یہ قصہ مستعار ہے۔ لیکن اس کے ماخذ کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ یہ بات قرین قیاس ہے۔ جسے بعد میں انھوں نے قصہ کے طور پر پیش کر دیا۔ پروفیسر لطیف حسین ادیب صاحب اپنے مضمون شاہ حسین حقیقت میں اس قصے کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"اس قصے کا ماخذ کوئی پرانی کہانی ہے جو حقیقت نے دکن میں پڑھی یا سُنی تھی۔ دکنی مثنویات میں فخرالدین نظامی (نویں صدی ہجری) کی مثنوی، کدم راؤ پدم راؤ کا قصہ مثنوی ہیرا من طوطا کے قصہ سے مشابہ ہے[۱]۔"

سخاوت مرزا صاحب کا بھی یہی خیال ہے۔" البتہ متاخرین میں شاہ حسین حقیقت لکھنوی ثم مدراسی کی ایک مثنوی ہیرا من طوطا تصنیف ۱۲۶۸ھ میری نظر سے گزری جو کا لتھو پریس سے با تصویر شائع ہوئی تھی۔ کدم راؤ کا قصہ اس سے ملتا جلتا ہے[۲]۔ غالباً ان ہر دو حضرات نے قصہ" ہیرا من طوطا" کو ایک علیحدہ تصنیف سمجھتے ہوئے یہ رائے قائم کی ہے غالباً خسرو کی ہشت بہشت کا آزاد ترجمہ ہشت گلزار ان لوگوں کی نظر سے نہیں گزرا دکن میں ---- اردو زبان و ادب کے آغاز کے بارے میں اہل علم میں جو تحقیق کا سلسلہ جاری ہے۔ اس کے مطابق اردو کی پہلی تصنیف مثنوی کدم راؤ پدم راؤ ہے جس کے مصنف فخرالدین نظامی ہے۔ اس مثنوی کا قصہ، قصہ ہیرا من طوطا سے بعض جگہ پر ملتا ہے۔ اور دونوں کا موضوع یوگ کا علم ہے۔ اس قسم کے قصے جنوبی ہند کی بعض داستانوں میں بیان ہوتے ہیں۔ ممکن ہے خسرو نے بھی کبھی ایسا ہی قصہ یا تو کسی سے سنا ہوگا یا کوئی ایسی داستان ان کے زیر مطالعہ رہی ہوگی جس میں یوگ کا علم بیان کیا گیا ہوگا۔ اور یہ داستان

۱: بحوالہ سابق ص ۱۴۲

Marfat.com

بھی شاہ بہرام کی ہندو نژاد بیوی سنائی ہے۔ ہم یہاں قصہ ہیرا من طوطا اور مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کا خلاصہ مختصراً پیش کرتے ہیں۔

خلاصہ کدم راؤ پدم راؤ [۱]

کدم راؤ ہیرا نگر کا راجہ ہے اور پدم راؤ اس کا وزیر ہے۔ دونوں کے درمیان ابتدا میں کچھ باتیں ہوتی ہیں جن کا تعلق داستان سے معلوم نہیں ہوتا۔ کدم راؤ اپنے وزیر پدم راؤ سے کہتا ہے کہ بے سوچے سمجھے بات کرنا اچھا نہیں ہے۔ میں نے تجھ سے جو کہا تھا (چونکہ درمیان میں اشعار موجود نہیں تھے۔ لہٰذا فاضل محقق جمیل جالبی صاحب نے اس جگہ کو عبارت لکھنے کے بعد خالی چھوڑ دیا ہے) راجہ کدم راؤ نے غصے میں پدم راؤ سے یہ بھی کہا کہ اگر تو اپنی خطا بخشوانا چاہتا ہے اور بعد میں پچھتانا نہیں چاہتا تو مجھے (راجہ) صحیح صحیح جواب دے۔ داستان میں یہ بات معلوم نہیں ہوتی کہ پدم راؤ سے کیا خطا سرزد ہوئی تھی۔

راجہ اس کے بعد محل میں جاتا ہے۔ وہ محل میں کسی سے بات نہیں کرتا۔ تمام عورتیں اس کے غصے کو دور کرنے میں ناکام ہو گئیں۔ آخر رانی آگے بڑھی۔ تو راجہ کدم راؤ نے کہا کہ مجھے یہ بتا کہ ناگن نے کیا چھند کیا تھا۔ ادھر ناگن سے بات کرکے پدم کدم کو ڈسنے کے لئے جاتا ہے۔ اور جا کر پھول پان میں جو سرہانے رکھے ہوتے ہیں چھپ جاتا ہے تاکہ جیسے ہی راجہ پھول پان کی طرف رخ کرے تو وہ اسے ڈس لے۔ پدم راؤ ابھی اسی خیال میں تھا کہ رانی کدم راؤ کے پاس آ جاتی ہے۔ راجہ کے پاؤں دبانے سے کدم راؤ جاگ جاتا ہے۔ رانی اس سے کہتی ہے کہ ہماری زندگی تمہاری محبت پر قائم ہے۔ اگر راجہ کھل کر بات کرے تو میں اس کا صحیح جواب دوں۔ کدم راؤ، رانی سے کہتا ہے کہ سنا تھا عورت فریب جانتی ہے میں نے ایسا فریب آج اپنی آنکھ سے دیکھ لیا ہے میں نے دیکھا کہ ناگن، کوڑیال سانپ سے میل کھا رہی ہے۔ خدا نے مجھے حاکم بنایا ہے۔ مجھ سے منبط

۱: مثنوی کدم راؤ پدم راؤ مرتبہ ڈاکٹر جمیل جالبی، مطبوعہ انجمن ترقی اردو کراچی۔

Marfat.com

نہ ہو سکا لہذا میں نے تلوار نکال کر اسی وقت سانپ کو مار ڈالا۔ لیکن ناگن جان بچا کر نکل گئی اور صرف اس کی دم کٹ سکی یہ واقعہ دیکھ کر مجھے عورت پر بھروسہ نہیں رہا۔

اس داستان کا اہم حصہ یہ ہے۔ کہ کدم راؤ پدم راؤ سے کہتا ہے کہ پردیسیوں کو میرے پاس لے کر آ کیونکہ میں ابھی تک پردیسیوں کی خدمت سے محروم ہوں۔ حالانکہ ہمیشہ سے یہ قاعدہ رہا ہے اور سارا ان دھرم بھی اسی ریت پر چلتے رہے ہیں۔ لہذا کسی پردیسی کو لے آ تاکہ میں اس کی خدمت کروں اور دان دوں۔

پدم راؤ عاجزی سے کہتا ہے کہ دنیا کے چلنے پھرنے والوں کو اپنے پاس مت بلاؤ کہ یہ آس دے کر نراس کر جاتے ہیں۔ ان لوگوں کی عادتیں خراب ہوتی ہیں۔ کدم راؤ ناراض ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ آخر تو پردیسیوں کو برا کیوں کہتا ہے۔ ایک مسافر کو بلا کر لا۔ پدم راؤ ہر طرح سے عاجزی کرتا ہے اور راجہ سے پھر کہتا ہے کہ کسی سادھو کو اپنے پاس نہ بلا۔ جوگی لوگ بغیر شراب اور گوشت کے نہیں رہتے میں ڈرتا ہوں کہ کہیں مجھے بھی اسی راہ پر نہ ڈال دیں۔ اس میں گھڑی بھر کا سکھ ہے لیکن اس خمار کا دکھ زیادہ بھاری ہوتا ہے۔

پدم راؤ آخر میں کچھ ایسی وفاداری کی باتیں کرتا ہے کہ کدم راؤ خوش ہو کر اس کو خلعت سے نوازتا ہے۔ اور پھر پورے شاہی خاندان کو بلا کر ان کو اپنی عنایات سے سرفراز کرتا ہے۔

اس کے بعد کدم راؤ کہتا ہے کہ اب کسی پردیسی کو بلا کر مہمان داری بھی کرنی چاہیئے۔ اہل دربار میں سے ایک کہتا ہے کہ مچھندر کا بیٹا اگھورناتھ آیا ہوا ہے۔ بہت بڑا جوگی ہے۔ بہت سے علوم سے واقف ہے۔ وہ یقیناً آپ کے دربار کے لائق ہے۔ چنانچہ اگھورناتھ کو بلوایا جاتا ہے جو بادشاہ کے استفسارات پر بے حد لاف زنی کرتا ہے اور باتوں سے بادشاہ کو اپنا گرویدہ بنا لیتا ہے۔ راجہ کو اس کے بغیر ایک پل زندگی گزارنا بھی دشوار معلوم ہوتا ہے۔ جوگی نے راجہ

Marfat.com

کو دھنور بید سکھلایا۔ جسے کدم راؤ نے ایک مہینے میں سیکھ لیا۔ ادھر رعایا حیران تھی کہ آخر راجہ نے ایک جوگی کی صحبت کیوں قبول کر لی ہے۔

"ایک دن اگھورناتھ نے کہا کہ اے راجہ دھنور بید تو معمولی بات ہے میں تو آپ کو "امر بید" بھی سکھا سکتا ہوں۔ مگر مجھے قول دینا ہوگا کہ یہ کسی دوسرے کو آپ نہیں بتائیں گے۔ یہ کہہ کر اگھورناتھ نے راجہ سے کہا کہ اگر عجائبات دیکھنے ہیں تو ایک جانور لے کر آئیے۔ راجہ محل میں گیا اور وہاں سے ایک طوطا لے کر آیا جسے رانی نے بڑی محبت سے پالا تھا۔ راجہ اسے پھل کھلاتا اپنے ہاتھ میں لئے جوگی کے پاس آیا۔ اگھورناتھ نے کہا کہ اے راجہ اب اس کا گلا چبا ڈال میں ابھی کرامات دکھاتا ہوں۔ راجہ نے ایسا ہی کیا۔ طوطا مر گیا۔ اور سادھو نے اپنی روح طوطے کے جسم میں داخل کر دی۔ اور اڑ کر راجہ کے ہاتھ پر آ بیٹھا۔ طوطے نے کہا کہ راجہ بتائیں کون ہوں۔ کچھ دیر کے بعد وہ پھر اپنے جسم میں واپس آ گیا۔ اور طوطا بھی زندہ ہو گیا۔ یہ دیکھ کر راجہ ششدر رہ گیا اور جوگی کا پہلے سے بھی زیادہ قائل اور گرویدہ ہو گیا۔ پھر کہا کہ یہ عمل مجھے بھی سکھا دو۔ راجہ سے جوگی نے قبول کر لیا۔ اور پھر جیسے ہی راجہ نے یہ علم سیکھنا شروع کیا تو محل کا کلس ٹوٹ گیا لیکن راجہ نے اس بدشگونی کی کوئی پرواہ نہ کی اور علم سیکھتا رہا۔ جب راجہ نے "امر بید" سیکھ لیا تو جوگی نے کہا کہ اب اس کا تجربہ بھی کر کے دیکھنا چاہیئے چنانچہ راجہ نے جیسے ہی اپنی روح کو طوطے کے قالب میں منتقل کیا تو جوگی نے اسی وقت اپنی روح کو کدم راؤ کے قالب میں منتقل کر دیا۔ چنانچہ راجہ طوطا بن گیا اور جنگل کی جانب چلا گیا اور جوگی راجہ بن گیا۔

جوگی، کدم راؤ کے قالب میں آ تو گیا لیکن ابھی وہ آداب شاہی اور بادشاہ کی بیگمات سے واقف نہ ہوا تھا۔ چونکہ جوگی کو طوطے کے زندہ رہنے سے راز افشا ہو جانے کا ڈر تھا لہذا اس نے کدم راؤ سے کہا کہ طوطا مجھے گالیاں دے کر گیا ہے لہذا اسے پکڑنے کے لئے منادی کرا

Marfat.com

دی جائے۔ پدم راؤ بادشاہ کو ایسا کرنے سے منع کرتا ہے۔

راجہ طوطے کے روپ میں پریشان پھرتا رہا۔ آخر ایک دن اپنے محل کی طرف آ گیا جہاں اپنے وزیر پدم راؤ کو دیکھتا ہے۔ اس کو اپنی نشانی بتاتا ہے۔ جس سے پدم راؤ کو اس کی گفتگو کا یقین آ جاتا ہے۔ وزیر، راجہ سے وفاداری دکھاتا ہے۔ اور ایک دن چپکے سے جوگی (جو راجہ کے قالب میں تھا) کے پاؤں میں کاٹ لیتا ہے۔ جوگی مر جاتا ہے۔ راجہ پھر اپنے قالب میں آ جاتا ہے۔ پدم راؤ ہی کدم راؤ کو بتاتا ہے کہ جوگی ایک دن بھی آرام سے نہیں بیٹھا۔ اور نہ ہی رانی کے پاس گیا۔ راجہ خوش ہوتا ہے۔ غرض راجہ سنگھاسن پر پھر رونق افروز ہوتا ہے۔ اور چھ ماہ تک جشن منایا جاتا ہے۔"

ہیرامن طوطا کا خلاصہ

ملک ہندوستان میں ایک جلیل القدر فرمانروا تھا جس کے تمام بادشاہ مطیع تھے۔ اور ہم زمین و ہم زمان سبھی لوگ اس کے تابع تھے۔ وہ باج خواہوں سے باج لیتا تھا۔ اور بے تاج لوگوں کو تاج دیتا تھا۔ بادشاہ عدل گستر تھا اور اس کی تمام رعایا اس کے زیر فرمانی شاد و آباد تھی۔ فتح و ظفر اس کے گھر کی باندیاں تھیں۔ اس بادشاہ کو نہ کسی چیز کی حاجت تھی اور نہ کسی چیز کی طلب، کیونکہ تمام نعمتیں اس کے خوان نعمت پر موجود تھیں۔

شب و روز پردیسیوں اور مسافروں کی مہمانداری اور دلجوئی میں مصروف رہتا تھا اور بڑا مہمان پرور اور مسافر دوست تھا۔ اس نے بر سر شاہراہ ایک مہمان سرائے بنا رکھی تھی جہاں جملہ سامان مہمانداری موجود تھے اور نوکر چاکر خدمت کے لئے ہر ہمہ وقت موجود رہتے تھے۔ چہار جانب سے آنے والے مسافر اس سرائے میں آکر قیام کرتے تھے۔ اس بادشاہ کا دستور یہ تھا کہ

Marfat.com

بھی کوئی جب مسافر آتا تو وہ اس سے حال احوال پوچھتا اور یہ دریافت کرتا جہاں گردی و بادیہ پیمائی سے اسے کیا حاصل ہوا۔ بادشاہ کا یہ روزانہ کا معمول تھا غرض سب مسافروں سے ملاقات کر کے بادشاہ اپنی معلومات میں اضافہ کرتا تھا۔

ایک روز ایک نو وارد شخص بادشاہ کی خدمت میں آیا۔ اس شخص کو علم یوگ اور نیرنجات میں کمال حاصل تھا۔ حسب معمول رات کے وقت بادشاہ نے اس نووارد کو اپنے حضور میں طلب کیا اور رسم مزاج پرسی اور آداب مہمانداری کے بعد بادشاہ نے اس سے دریافت کیا۔ کہ جہاں گردی سے اسے کیا کچھ حاصل ہوا ہے۔ اس نے بادشاہ کے اس استفسار کے جواب میں اپنے مشاہدات بیان کرنا شروع کئے۔ لیکن اتفاق سے بادشاہ کو اس کی بیان کردہ بہت سی باتیں پہلے ہی معلوم تھیں۔ بادشاہ نے اس شخص کے جملہ علوم کے بارے میں سن کر ایک آہ سرد کھینچی اور پھر اس سے یوں گویا ہوا کہ میں نے تم جیسے لوگوں سے ہی بہت سے علوم کو سیکھا ہے۔ لیکن افسوس کہ جس گوہر مراد کی مجھے تمنا تھی وہ آج تک ہاتھ نہ آیا۔ آج تک میں نے موت کا علاج نہ پایا۔ آخر کار تھک ہار کر اس خیال سے ہی دست بردار ہو گیا۔

وہ مسافر بادشاہ کی بات سن کر مسکرایا۔ بادشاہ نے اس کے مسکرانے کا سبب دریافت کیا تو پہلے تو مسافر نے بات ٹالنا چاہی آخر بادشاہ کے اصرار پر یوں گویا ہوا کہ مجھے بھی بادشاہ کی طرح نوادرات و عجائبات جہاں دیکھنے کا شوق تھا۔ چنانچہ اسی شوق میں صورت گرد باد دنیا میں مارا مارا پھرتا تھا۔ اس جہاں نوردی میں کچھ ہنر و کمال حاصل تو ہوئے لیکن دل خوب سے خوب تر کی جستجو میں رہا۔ اتفاقاً ایک دن ایک استاد سے ملاقات ہوئی جو علم کایا پلٹ کا ماہر تھا۔ میں نے آوارہ گردی ترک کی اور اس جوگی کی خدمت میں پائے طلب کو توڑ کر بیٹھ رہا۔ میری خدمت و ریاضت کام آئی اور آخر کار اس نے مجھے کایا پلٹ کا علم سکھا دیا۔ جس کے

Marfat.com

لئے میں اس کا مرہون احسان ہوں۔ اے بادشاہ اگر آپ کہیں تو میں یہ علم آپ کو سکھا دوں اس بادشاہ نے کہا ضرور سکھا دے لیکن پہلے اس کا کوئی تجربہ کر کے دکھلاؤ۔ اس مسافر نے اسی وقت ایک مکھی کو مارا اور اس کے مردہ جسم میں اپنی روح منتقل کر دی۔ غرض اس کا لاشہ تو زمین پہ گر گیا اور مکھی کے جسم میں داخل ہو کر اڑتا رہا۔ بعد چند ثانیے کے مسافر دوبارہ اپنے قالب میں آ گیا۔

بادشاہ کی حیرت کی کوئی حد نہ رہی۔ بادشاہ نے اس علم کو سیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا اور کہا کہ اگر اس کے بدلے میرے مال و زر اور سلطنت کا نصف لے کر بھی تو یہ کام مجھے سکھا دے گا تو میں تیرا شکر گزار ہوں گا۔

بادشاہ کی اس فیاضی کے جواب میں اس مسافر نے جواب دیا کہ اے بادشاہ میں تیرے مال و زر اور ملک و سلطنت سے اپنے اس علم کو بہتر سمجھتا ہوں۔ اور مجھے تیری کسی چیز کی کوئی تمنا نہیں ہے۔ البتہ بلا کسی طمع و لالچ کے میں تمھیں یہ علم سکھا ضرور دوں گا۔ الغرض اس نے بادشاہ کو یہ علم سکھا دیا۔ اور بادشاہ نے اس کا تجربہ بھی کر کے دیکھ لیا۔ بادشاہ نے اس علم کو ازبر ہو جانے کے بعد مسافر کو عزت و تکریم کے ساتھ رخصت کیا۔

کچھ عرصہ تک تو بادشاہ نے اس علم کو اپنی ذات تک محدود رکھا۔ لیکن پھر ایک دن اس کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ ایسی چیز جو جان سے بھی زیادہ قیمتی ہو اگر اس سے میرے سوا کسی کو فائدہ نہ ہو تو بے کار ہے اور اس کا وجود و عدم برابر ہے۔ میں شمع کی مانند نہیں۔ جو ایک مکان کو منور کرتی ہے۔ بلکہ میں خورشید کے مانند ہوں جس کی روشنی سے سارا عالم فیضیاب ہوتا ہے۔ آخر بادشاہ اس راز کو چھپا نہ سکا اور اپنے وزیر کو اپنا رازدار بنا لیا۔

ایک دن بادشاہ اور وزیر شکار کے لئے نکلے۔ شکار کی تلاش میں دونوں خادموں سے

Marfat.com

باہر نکل آئے۔ آخر دامن کوہ میں بادشاہ نے تیر سے ایک ہرن کو شکار کیا۔ اس کے بعد بادشاہ نے ہرن کو باندھنا چاہا تو وزیر بولا کہ اے بادشاہ زمن! ایک زمانہ ہو گیا کہ علم کایا پلٹ کا فن نہیں آزمایا۔ اور کچھ کچھ وہ مجھے بھول گیا ہے جس کی وجہ سے میں اداس ہوں۔ اتفاق سے اس وقت ایک صید بے جان بھی مہیا ہے اور ہم دونوں کے علاوہ کوئی یہاں موجود بھی نہیں ہے۔ لہٰذا اگر بادشاہ سلامت ایک بار پھر وہی دکھلا دیں تو مجھے ازبر ہو جائے گا۔

بادشاہ نے وزیر کی مکاری سے بے خبر ہونے کے سبب اپنی روح ہرن کے قالب میں منتقل کر دی۔ اور وزیر نے اسی وقت اپنی روح بادشاہ کے قالب میں منتقل کر دی۔ اور بادشاہ کے گھوڑے پر سوار ہو کر اس کی پوشاک پہن کر اپنے خدم و حشم کی طرف واپس پلٹا۔ وزیر نے شاہ کے روپ میں شاہی محل کا رخ کیا۔ اور جملہ حرم شاہی سے حرام کیا۔ غرض ہر عورت اس کی ہوس کا شکار ہوئی لیکن شاہ کی کدبانو نے جو بادشاہ کی ہمدم و ہم جلیس تھی۔ اس نے جب بادشاہ کے جملہ معاملات و عادات میں اس کے برعکس پایا تو اس کے دل میں کھٹکا ہوا جس کی وجہ سے اس نے بادشاہ (وزیر) سے نشست و برخواست اور ملنا جلنا، اٹھنا بیٹھنا موقوف کیا۔ اس نے دل میں سوچا کہ ضرور شاہ پر کوئی مصیبت آئی ہے۔ کیونکہ بظاہر تو وہ بادشاہ لگ رہا ہے لیکن محل میں ہر چیز کو اجنبیوں کی طرح تکتا ہے۔ چنانچہ یہ سب سوچ کر اس نے بادشاہ سے کہا کہ میرے دل میں تیرے خلاف کچھ شکوک و شبہات پیدا ہو گئے ہیں۔ جب تک وہ تمام دور نہ ہوں مجھے ہاتھ لگانے کی کوشش مت کرنا۔

ادھر بادشاہ کا حال سنیئے:۔

ہرن کے قالب میں آ کر بادشاہ دشت و دیار میں آوارہ و سرگرداں پھرتا رہا۔ کبھی ہرنوں کی ڈار میں شامل ہو جاتا اور کبھی ان سے علیحدہ ہو جاتا۔ اسی طرح دشت و صحرا میں آوارہ و سرگرداں

Marfat.com

پھرتے ہوئے ایک دن بادشاہ نے جو آہو کے قالب میں تھا۔ ایک مردہ طوطے کو دیکھا۔ بادشاہ نے اسی وقت آہو کا قالب چھوڑ کر اپنی روح طوطے کے مردہ جسم میں منتقل کر لی۔ اور اس کے بعد بہت سے طوطوں کے ساتھ محو پرواز ہوا۔ پھر اپنے ہمراہی طوطوں کے ساتھ اپنے ملک کی جانب چلا تاکہ جاکر وہاں کے حال احوال سے واقف ہو۔ طوطوں نے جو اپنے درمیان ایک دانش مند طوطا پایا تو اسے اپنا بادشاہ بنالیا۔ بادشاہ بھی جو پرندے کے قالب میں تھا ان طوطوں کے ہمراہ اڑتا ہوا ایک فرحت بخش مقام تک جا پہنچا۔ طوطوں نے اس مقام کی آب وہوا کو دیکھتے ہوئے وہاں ایک درخت پر کچھ دیر آرام کیا۔ اس درخت کے نیچے صیاد نے دام بچھا رکھا تھا اور دانا بکھرا ہوا تھا۔ طوطوں نے صیاد کی چال نہ سمجھتے ہوئے اس دانے کو چگنے کے لئے اترنا چاہا لیکن بادشاہ نے جو طوطے کے قالب میں تھا۔ انھیں ایسا کرنے سے منع کیا اور کہا کہ ذرا سا لالچ ان کی جانوں کے اتلاف کا باعث بن جائے گا۔ لیکن طوطوں نے اس کی بات نہ مانی، اور جال میں پھنس گئے۔ بادشاہ نے بھی جانتے بوجھتے ہوئے خود کو جال میں پھنسوا دیا۔ اتفاق سے جس وقت طوطے دام میں پھنسے ہیں تو صیاد کہیں پانی پینے گیا ہوا تھا۔ اپنے بادشاہ کی نافرمانی کے سبب، اسیر دام ہو کر طوطوں نے بہت شور مچایا لیکن اب گریہ وزاری بے سود تھی۔ بادشاہ نے اب ان طوطوں سے کہا کہ تم نے میری بات نہ مانی اور جال میں پھنس گئے۔ اب میں ایک بات کہتا ہوں اگر اس پر عمل کرو تو رہائی کی امید ہے۔ ابھی صیاد نے تمہیں نہیں دیکھا ہے لہٰذا تم سب مردہ بن کر جال میں لیٹ جاؤ۔ مگر میں زندہ رہوں گا۔ صیاد مجھے زندہ دیکھ کر پکڑے گا اور تمہیں مردہ سمجھ کر جال سے نکال کر پھینک دے گا۔ اور میں بھی کسی نہ کسی ترکیب سے رہائی حاصل کر کے تم سے آملوں گا۔ غرض طوطوں نے اس کے کہنے پر عمل کیا اور مردہ بن کر لیٹ گئے۔ تھوڑی دیر بعد صیاد آیا۔ اتنے سارے طوطوں کو دیکھ کر خوش ہوا۔ لیکن ان میں سے ایک کو زندہ اور باقی طوطوں کو مردہ دیکھ کر افسوس کرنے لگا۔

Marfat.com

افسوس کرتے ہوئے جال میں سے ایک ایک طوطے کو نکالتا رہا۔ جب تمام جال خالی کر چکا تو طوطے اڑ گئے۔ جب صیاد اپنا جال جھاڑ چکا تو تمام طوطے پھر پھڑا کر زندہ ہو گئے۔ صیاد یہ ماجرا دیکھ کر حیران ہوا اور کھسیانا ہو کر زندہ طوطے کو بھی مارنا چاہتا تھا۔ کہ طوطے نے صیاد سے کہا کہ مجھے مارنے کی بجائے بازار لے جا کر بیچ دو میں تمھیں تمہاری حسب منشا رقم دلواؤں گا۔

طوطے کی یہ باتیں سن کر صیاد کی دل گرفتگی اور غصہ رخصت ہوا۔ چنانچہ وہ اسے لے کر شہر آیا۔ اور چوک میں اس کا پنجرہ رکھ دیا۔ اور صدا لگانے لگا کہ لے خریدارو، ہیرامن طوطا خریدو۔

وہ صیاد ابھی یہ صدا ہی لگا رہا تھا کہ اتنے میں ایک جانب سے انتہائی خوبصورت عورت ناز و انداز دکھاتی ہوئی آنکلی اور ایک مہاجن بچے کی دوکان پر جا کر کھڑی ہو گئی۔ یہ مہاجن بچہ اس وقت روپیہ پیسے گننے میں مصروف تھا۔ اس عورت کی ہر ادا سے بیسوا پن برس رہا تھا۔ اپنی اداؤں سے خرمن ہوش کو جلاتی چلی آئی تھی۔ چلتی ہوئی آ کر ایک مہاجن بچے کی دوکان پر آ کر کھڑی ہو گئی۔ یہ مہاجن بچہ بھی جوان اور حسین تھا اور اپنی خوبصورتی کے اعتبار سے رشک آفتاب تھا۔ اس عورت نے اس مہاجن بچے کو یہ کہا کہ تو شب کو خواب میں میری خلوت میں رہا ہے۔ اور ہر طرح سے مجھ سے لطف اندوز ہوا ہے لہذا ایک ہزار دینار کا جو معاوضہ تو نے رات خواب میں مجھ سے طے کیا تھا وہ مجھے جلد دے دے۔ وہ مہاجن بچہ اس بیسوا کے اس عجیب و غریب مطالبے پر حیران ہوا۔ اور مارے شرمندگی اور خجالت کے اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا اور خوف کے سبب اس کا رنگ زرد ہو گیا۔ ان دونوں کے درمیان یہ گفتگو ہوتے دیکھ کر بہت بڑا ہجوم وہاں جمع ہو گیا۔ لوگ طرح طرح کی باتیں تو بنا رہے تھے لیکن کوئی شخص ایسا مشورہ نہ دے پا رہا تھا کہ جس سے اس جھگڑے کا فیصلہ ہوتا۔ اس عجیب و غریب اور دلچسپ واقعے کو دیکھ کر صیاد بھی حیران ہوا اور طوطے کی فروخت کے لئے صدائیں لگانا بھول گیا۔ ہیرامن طوطے نے

Marfat.com

یہ ماجرا دیکھ کر اپنے صیاد سے کہا کہ ان دونوں کو میرے پاس بلا لو تاکہ میں کوئی فیصلہ کرا دوں۔ صیاد جا کر دونوں فریقوں کو بلا لیا۔ ان کے پیچھے پیچھے ہجوم بھی چلا آیا۔ طوطے کے پاس آ کر اس رنڈی نے پھر اپنا تمام دعویٰ دہرایا۔ طوطے نے کہا کہ اگر تم دونوں میرے فیصلے کو قبول کرنے کا عہد کرو تو میں کوئی فیصلہ کروں۔ دونوں نے اس کے فیصلے پر قبول کرنے کا عہد کیا۔

اس کے بعد طوطے نے مہاجن بچے کو ایک ہزار دینار کا توڑا لانے کا حکم دیا۔ مہاجن بچہ چونکہ عہد کر چکا تھا لہٰذا اسی وقت دوکان سے جا کر ایک توڑا اٹھا لایا۔ اس کے بعد اس مہاجن بچے نے نہایت اداسی و مایوسی کے ساتھ رقم گننا شروع کی۔ جب مہاجن بچہ رقم گن چکا تو اس بیسوا نے جلدی سے بڑھ کر رقم اٹھانا چاہی لیکن طوطے نے اس سے کہا کہ اس قدر جلدی مت کر یہ تیرا ہی حق ہے۔ اس کے بعد طوطے نے ایک قد آدم آئینہ منگوایا۔ جب آئینہ لایا جا چکا تو رقم کو آئینے کے سامنے رکھوا کر بیسوا سے بولا کہ آئینے میں جو رقم نظر آ رہی ہے اسے اٹھا لے اور اپنا زر شمار کرے لیکن خبردار زر نقد کی جانب نگاہ نہ اٹھے۔ کیونکہ جو کام خواب و خیال میں ہوا ہے اس کا معاوضہ بھی خیال کی صورت میں ملے گا۔ طوطے کا یہ حکم سن کر وہ بیسوا بالکل خاموش ہو گئی اور کوئی جواب نہ پاتے ہوئے اپنے گھر کو ناشاد و نامراد روانہ ہو گئی۔ اس کے پیچھے پیچھے ہجوم تالیاں بجاتا ہوا چلا۔ ادھر مہاجن بچہ طوطے کا ممنون ہو کر ہنسی خوشی اپنے گھر کو روانہ ہوا۔ اب تو طوطے کے خریداروں کی بھیڑ لگ گئی۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی اتنی قیمت نہ دے سکا کہ طوطے کو خرید سکتا۔

طوطے کی خبر اڑتے اڑتے رانی تک پہنچی جو اپنے طوطے کی یاد میں اداس و رنجیدہ تھی۔ اس نے اپنے خادموں کو حکم دیا کہ فوراً جا کر ہیرامن طوطا کو خرید لائیں چنانچہ اسی وقت رانی کے نوکروں نے آ کر صیاد کو خطیر رقم ادا کی اور طوطے کا پنجرہ ہاتھ میں لے کر رانی کی خدمت میں حاضر

Marfat.com

ہوئے۔ طوطے نے اپنی شیریں بیانی اور خوش گفتاری سے رانی کا دل موہ لیا۔ رانی نے اس کے لئے سونے کا جڑاؤ پنجرہ بنوایا۔ اور اپنے کلیہ احزاں میں اسے لٹکا دیا۔ غرض طوطا اپنی دلچسپ باتوں سے رانی کے غم والم کو بھلا دیتا تھا۔

ایک رات رانی نے طوطے سے کہا کہ میاں مٹھو کوئی کہانی سناؤ۔ طوطے نے اس کے جواب میں پوچھا کہ آیا جگ بیتی سناؤں یا آپ بیتی۔ رانی نے آپ بیتی سنانے کا حکم دیا۔ طوطے نے یوں کہنا شروع کیا کہ اے ماہ لقا، ایک تھا بادشاہ، ہمارا تمہارا خدا بادشاہ۔ اس بادشاہ نے ایک محل سرا بنوا رکھی تھی جس میں تمام مسافروں کو دعوت دیا کرتا تھا۔ ایک دن ایک مسافر آیا کہ جس نے بادشاہ کو علم کایا پلٹ سکھا دیا۔ جس کے سبب سے روح ایک تن سے دوسرے میں جا سکتی تھی۔ بادشاہ یہ علم سیکھ کر مختلف مخلوقات کے تن مردہ میں نقل روح کیا کرتا تھا۔ اور شہر دیار میں سیر کرتا ہوا پھرتا تھا۔ لیکن افسوس کہ بادشاہ اس راز کو راز نہ رکھ سکا اور اس نے یہ علم اپنے وزیر کو بھی سکھا دیا۔ ایک دن بادشاہ وزیر کے ساتھ شکار کو نکلا۔ بادشاہ نے ایک ہرن مارا۔ وزیر نے بادشاہ سے کایا پلٹ کے علم کے اظہار کی فرمائش کی۔ بادشاہ جو اس کی نیت سے بے خبر تھا۔ ہرن کے قالب میں چلا گیا اور وزیر فوراً بادشاہ کے قالب میں چلا گیا۔ شاہ ہرن کے تن میں منتقل ہو کر جان کے خوف سے کوہ و دشت میں مارا مارا پھرتا رہا۔ اے شہزادی ذرا غور کیجئے کہ بستر گل پر سونے والا بادشاہ جس کے بدن قاقم و سمور سے بھی اثر انداز ہوتا ہو وہ یوں کسمپرسی کے عالم میں خار و خس پر گزارہ کرے۔ اور جس کی زبان پر پان کے پتے گراں ہوں وہ جنگل میں برگ و کاہ کھا کر گزارا کرے۔ جو بادشاہ خود آہوؤں کو صید کرتا ہو۔ وہ اپنی گرفتاری کے خوف سے منہ چھپائے پھرتا ہوا۔ الغرض اے شہزادی جب اس حالت پہ غور کرتا ہوں تو جگر ٹکڑے ٹکڑے ہوتا ہے۔

Marfat.com

اسی عالم بے چارگی میں ایک دن بادشاہ کو ایک مردہ طوطا نظر آیا چنانچہ اس نے فوراً اپنی روح کو ہرن کے قالب سے نکال کر اس مردہ طوطے کے تن میں ڈالا جس کے سبب پہلے کی زندگی سے کچھ آسودگی اور اطمینان اسے حاصل ہوا۔ اس کے بعد اس طوطے نے اڑکر اپنے شہر کو جانا چاہا۔ راستے میں کچھ طوطے اس کے رفیق ہوئے۔ انھوں نے اسے اپنا بادشاہ بنالیا۔ ایک جگہ وہ طوطے آب و دانہ کی حرص میں اسیر بلا ہوئے۔ اور بادشاہ نے بھی جو طوطے کے روپ میں تھا۔ اپنے ساتھیوں کی رفاقت کا حق ادا کرتے ہوئے گرفتاری قبول کی۔ جہاں سے صیاد اس طوطے کو پکڑ کر شہر میں لایا۔ شہر میں ایک بیسوا نے اپنی مکاری سے ایک مہاجن بچے کو تنگ کرنا چاہا۔ بالآخر طوطے کی دانش مندی نے خوب اچھا فیصلہ کرا دیا۔"

شہزادی طوطے کی سرگذشت سن کر چونکی۔ اور پھر بولی کہ اے میاں مٹھو اس بیسوا نے کیا کیا۔ طوطا جو شہزادی کے دل میں شوقِ جستجو بیدار کرنا چاہتا تھا یہاں تک داستان کہہ کر خاموش ہو گیا۔

شہزادی نے شوقِ جستجو میں طوطے سے قصے کو آگے بیان کرنے کی خواہش کی۔ لیکن طوطے نے جواب دیا کہ میں اب اونگھ رہا ہوں ایسی بھی کیا جلدی ہے باقی قصہ کل پہ رکھو۔ شہزادی نے کہا کہ اچھا باقی قصہ کل پہ سہی لیکن اتنا تو بتا دو کہ کیا اس بادشاہ کا نام آغا شاہ تھا۔ طوطے نے اس کے جواب میں کہا کہ اے بی بی تمھیں نام سے کیا کام۔ طوطا تو یہ کہہ کر چپ ہو گیا۔ اور شہزادی نے دل میں سوچا کہ اس قصے سے کچھ نہ کچھ پتہ مجھے اپنے گمشدہ بادشاہ کا ملتا ہے۔ اور بیسوا کا جھگڑا تو خود اس طوطے نے طے کرایا تھا۔ اور جس وزیر کی شبیہہ بیان کی ہے اس سے میرے بادشاہ کے وزیر کی شبیہہ ملتی ہے۔ تاہم پھر بھی کچھ یقین سے نہیں کہا جا سکتا۔ نہ جانے یہ قصہ کس کا ہے۔ ممکن ہے طوطا کسی کی سنی سنائی بات کر رہا ہو اور پھر میں ایسی خوش نصیب کہاں کہ میرا منلادم شاہ مجھے مل جائے۔

Marfat.com

دوسری رات سر شام ہی سے شہزادی نے کنیزوں کو رخصت کیا۔ اور طوطے سے باقی داستان سنی۔ جب طوطا داستان بیان کر چکا تو شہزادی اس کے پاؤں پر گر پڑی۔ اور بولی کہ تو ہی میرا شاہ ہے۔ لیکن نصیب دیکھئے کہ وصل بھی کس عالم میں ہو رہا ہے کہ میں انسان ہوں اور تو طائر،

طوطے نے جواب دیا کہ ملکہ رانی! اس بات کا غم نہ کر میں ایک ترکیب بتاتا ہوں کہ اب کے جو وزیر تیرے پاس آئے تو کسی صورت سے کایا پلٹ پر آمادہ کر لو۔ اس طرح میں فوراً اپنے قالب میں آ جاؤں گا۔

"دوسرے دن جب وزیر، رانی کے پاس آیا۔ تو رانی نے خلاف توقع اس سے لطف و عنایت کا سلوک کیا اور احترام سے ملی۔ وزیر نے جو بادشاہ کے روپ میں تھا۔ برعکس سلوک دیکھ کر اس کی وجہ دریافت کی۔ رانی نے جواب دیا کہ میں نے ایک عرصے تک تجھے آزمایا۔ آخر تم ہی میرا شاہ نکلا۔ لیکن ایک امتحان اب بھی باقی ہے۔ اگر اس میں بھی تو پورا اترے تو پھر مجھے تجھے تسلیم کرنے میں کوئی عار نہ ہوگا۔ میرے شاہ کو علم کایا پلٹ آتا تھا اگر تو وہی ہے تو یقیناً تجھے بھی علم کایا پلٹ آتا ہوگا۔ لہٰذا اس کا مظاہرہ کر کے دکھا بصورت دیگر میں تیری گردن تن سے جدا کر دوں گی۔

وزیر جو بادشاہ کے روپ میں تھا رانی کی یہ بات سن کر مسرور ہوا اور بولا کہ یہ امتحان تو، تو جب چاہے کر لے۔ چنانچہ اسی وقت ایک مرغ منگوا کر ملا اور وزیر نے اپنی روح کو اس مرغ کے قالب میں منتقل کیا۔ جب شاہ کا لاشہ بے جان ہو کر گرا تو بادشاہ نے فوراً اپنی روح کو جسد طوطی سے اپنے قالب میں منتقل کیا۔ اور بادشاہ بنتے ہی ایک خنجر سے اس مرغ کو ہلاک کر ڈالا اور بادشاہ کی وفادار رانی نے اپنے ہاتھ سے اس مرغ کی دونوں ٹانگیں چیر ڈالیں۔

سلطنت میں خوشی کے شادیانے بجنے لگے۔ شاہی حرم کی ان تمام خواتین کو جن کے ساتھ وزیر نے شاہ کا روپ بدل کر حرام کیا تھا۔ شاہی محل سے نکال دی گئیں۔ "در مردہ طوطے

Marfat.com

کی کھال پوست کو بادشاہ نے ایک صندوق میں رکھوا دیا اور روزانہ اس کو دیکھتا تھا۔ اس کے بعد اس نے اپنا لقب طوطی الملک اختیار کیا اور خود بھی سبز لباس میں رہنے لگا اور طوطوں سے بے پناہ پیار کرنے لگا۔

ہیرامن طوطا اور کدم راؤ پدم راؤ کا موازنہ

سخاوت مرزا صاحب نے اپنے ایک مضمون میں (جس کا حوالہ سابقہ سطور میں آچکا ہے) مثنوی ہیرامن طوطا کا ماخذ یا اس سے ملتا جلتا قصہ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کو قرار دیا ہے۔ جس زمانے میں سخاوت مرزا صاحب نے یہ حوالا دیا تھا۔ اس وقت مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کو رسم الخط کے سبب پڑھا نہیں جا سکا تھا۔ اور وہ غیر مطبوعہ صورت میں تھی۔ اب یہ مثنوی مطبوعہ صورت میں موجود ہے۔ قصہ ہیرامن طوطا اور مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کا موازنہ کرتے ہوئے جو حقائق سامنے آتے ہیں۔ انکی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ کدم راؤ پدم راؤ اور ہیرامن طوطا دونوں کا موضوع تو ایک ہی یعنی علم یوگ یا علم کایا پلیٹ ہے۔ لیکن دونوں داستانوں میں واضح فرق موجود ہے۔ جس کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ حقیقت نے اپنا قصہ اس داستان سے مستعار نہیں لیا ہوگا جبکہ یہ بات بھی واضح ہے کہ یہ قصہ خسرو کی ہشت گلزار کا ایک قصہ ہے اور حقیقت نے صرف اس کا آزاد ترجمہ کیا تھا۔

مثنوی کدم راؤ پدم راؤ میں ایک اعلےٰ ذات کی ناگن اور ایک کوڑیالے سانپ کے باہمی تعلق کو دیکھ کر کدم راؤ کے دل سے عورتوں کی وفاداری کا اعتبار اٹھ جاتا ہے۔

لیکن مثنوی ہیرامن طوطا میں رانی سے بادشاہ کو ایسی کسی بے وفائی کا اندیشہ نہیں۔ اور نہ ہی ان دونوں کے درمیان اس قسم کی کوئی بات زیر بحث آتی ہے۔ البتہ کدم راؤ پدم راؤ میں، کدم راؤ کی رانی بھی آخر میں صاحب عصمت ثابت ہوتی ہے۔ جب جوگی راجہ کو مارنے کے بعد

Marfat.com

اور راجہ کے روپ میں آنے کے بعد بھی رانی سے خلوت حاصل نہ کر سکا۔ مثنوی ہیرا من طوطا میں تو آغاز داستان میں رانی کسی قسم کا دعویٰ نہیں کرتی۔ لیکن جب وزیر، بادشاہ کے قالب میں آنے کے بعد بادشاہ کے ایک ایک حرم سے خلوت میں ملاقات کر چکتا ہے۔ اور رانی سے ہم بستری کرنے میں ناکام رہتا ہے تو رانی کی باوفائی ثابت ہو جاتی ہے۔

مثنوی کدم راؤ پدم راؤ میں راجہ کے ساتھ ایک جوگی جو اس کو علم کایا پلٹ سکھاتا ہے۔ فریب کرتا ہے اور اس کا وزیر جو ناگ ہے آخر میں اپنے راجہ کو پہچان کر جوگی کو ڈس کر ہلاک کر ڈالتا ہے۔ اور راجہ پھر اپنے قالب میں آ جاتا ہے۔

ہیرا من طوطا میں بادشاہ کا وزیر اس کے ساتھ فریب کرتا ہے۔ اور آخر میں رانی کی عقلمندی اور تعاون سے وزیر ہلاک ہوتا ہے اور بادشاہ اپنے قالب میں واپس آتا ہے۔

کدم راؤ پدم راؤ میں راجہ کا وزیر ایک ناگ ہے۔ ہندی دیومالا کے قصوں میں اور سنسکرت کے ایسے قصے ملتے ہیں جن میں انسانوں کے مشیر دوسری مخلوقات سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہیرا من طوطا میں بادشاہ کا وزیر بھی انسان ہی ہے۔ اس اعتبار سے مثنوی کدم راؤ پدم راؤ میں مافوق الفطرت عنصر موجود ہے۔ جبکہ ہیرا من طوطا میں ایسا نہیں ہے۔ اور اس کے سارے کردار انسان ہیں۔ تاہم اس کے باوجود بحیثیت مجموعی اس داستان کو فرضی قرار دیا جا سکتا ہے۔

علم کایا پلٹ کا موضوع

یقیناً امیر خسرو نے دکنی زبان یا سنسکرت کے ایسے قصے سنے ہونگے جن کا موضوع علم کایا پلٹ ہوگا۔ لہذا اس قسم کے قصے کو ایک داستان کی صورت میں بیان کر دیا ہوگا۔ دراصل مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کی طرح اس قصے کے ماخذ بھی سنسکرت کی کہانیاں ہیں۔ اصل میں ان دونوں مثنویوں

Marfat.com

کے قصے قدیم دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ جب انسان جادو اور طلسمات پر یقین رکھتا تھا۔ انتقال روح کے ایسے قصے عام ہیں۔ ایسے قصے برصغیر سے لے کر ہیبرڈیز تک آریائی نسل کی تمام قوموں میں ملتے ہیں۔

سر جیمس فریزر نے اپنی کتاب "شاخ زریں" میں انتقال روح کے بعض قصوں کو بنایا گیا ہے۔

ایک قصہ فریزر نے ایک ہندوستانی بیان کیا ہے۔ جس میں ایک راجہ ایک برہمن کے قالب میں اپنی روح منتقل کر دیتا ہے۔ اور ایک کبڑا راجہ کے قالب میں اپنی روح منتقل کر دیتا ہے۔ اس طرح کبڑا راجہ اور راجہ برہمن بن جاتا ہے۔ پھر کبڑے کو ایک مرے ہوئے طوطے کے قالب میں منتقل ہو کر ماہر فن ہونے کا ثبوت دیئے جانے کے لئے کہا جاتا ہے۔ اس طرح جب کبڑا راجہ کا قالب چھوڑ کر طوطے کے قالب میں جاتا ہے تو راجہ فوراً دوبارہ اپنی روح اپنے بدن میں منتقل کر لیتا ہے۔

اسی طرح انتقال روح کی ایک کہانی ملایا والوں کی زبان میں بھی ملتی ہے۔ یونان کی قدیم کہانیوں میں ایک ایسے شخص کی داستان ملتی ہے جو اپنی روح منتقل کر دیا کرتا تھا۔

مثنوی گلزار نسیم میں بھی ایک جگہ انتقال روح کا واقعہ ملتا ہے۔ ایپلیس (APELIUS) کا زریں گدھا جو یورپ کا طویل ترین اور یونان کے آخری دور کا قصہ ہے۔ اس میں بھی ایک لڑکے کی روح ایک گدھے میں ڈالی جاتی ہے۔

مثنوی ہیرا من طوطا میں ایک جگہ بیان کیا گیا ہے کہ جب شاہ ہرن کے قالب سے اپنی روح کو طوطے کے قالب میں منتقل کر کے طوطوں کے ایک غول کے ہمراہ ان کا سردار بن

۱: شاخ زریں ص ۲۷۳-۲۷۲ مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور۔
۲: " " " " " "

Marfat.com

کر اپنے شہر کی طرف روانہ ہوتا ہے تو راستے میں ایک سرسبز مقام پر درخت کے نیچے پڑا ہوا دانہ دیکھ کر طوطے لالچ میں جاتے ہیں۔ بادشاہ ان کو سمجھاتا ہے لیکن وہ لالچ میں اتنے اندھے ہو جاتے ہیں کہ اپنے بادشاہ (طیور کا بھی بادشاہ ہی تھا) کی نصیحت نہیں مانتے جب وہ طوطے اسیر دام ہو جاتے ہیں تو بادشاہ بھی ان کے ساتھ گرفتار ہوتا ہے۔ بیتال پچیسی میں بھی یہی واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ لیکن اس میں طوطوں کے بجائے کردار کبوتر ہیں جو اپنے اتحاد سے اور کبوتروں کے سردار کے مشورے سے پورا جال اڑا کر لے جاتے ہیں اور جا کر اپنے دوست چوہے سے جال کے بند کھلواتے ہیں۔

بلا خوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ قصہ قدیم سنسکرت کہانیوں سے یا تو براہِ راست ماخوذ ہے یا پھر انہی تصورات کے زیر اثر لکھا گیا ہے اور اس قصہ پر بیتال پچیسی اور کتھا سرت ساگر کے اثرات ہیں۔ یوں بھی قالب بدلنا، راج پر غاصبانہ قبضہ کرنا اور حیوان کرداروں کا انسانی عقل و فراست سے کام لینا سنسکرت کہانیوں کے تصورات ہیں۔ لیکن اس امکان کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ بیتال پچیسی اور کتھا سرت ساگر کی قدیم کہانیوں سے مشابہ ہونے کے باوجود یہ امیر خسرو کے اپنے ذہن کی پیداوار ہو۔ اور انھوں نے کسی کہانی یا مثنوی سے استفادہ نہیں کیا بلکہ مشہور العوام افسانے کو اپنے طور پر مرتب کر کے مثنوی لکھ دی۔ یہ بات حقیقت کی بجائے امیر خسرو کے بارے میں کہی جانی چاہیے تھی۔

مثنوی ہیرامن طوطا کا تنقیدی جائزہ اور محاسن

حقیقت کی اس مثنوی کا موضوع عشقیہ نہیں ہے۔ قصہ کی ترتیب اور داستان کے بیان میں جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے وہ فنکارانہ ہے۔ اندازِ بیان صاف اور سادہ ہے اور نثر کی

۱۔ پروفیسر لطیف حسین ادیب ص ۱۹

سی سادگی لئے ہوئے ہے۔ اس میں شاعرانہ محاسن کی کمی ہے جس کی ایک وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ چونکہ اس کا موضوع عشقیہ نہ تھا۔ اس وجہ سے اس وہ رنگین اور دلپذیر پیرایہ اختیار کرنا مشکل تھا۔ ادیب صاحب نے اسے عام فہم زبان میں بیانیہ شاعری کا ایک عمدہ نمونہ قرار دیا ہے۔ یہ ایک مختصر مثنوی ہے جس میں نہ تو فوق الفطرت عنصر کی فراوانی ہے اور نہ ہی قصے کو بہت زیادہ الجھایا گیا ہے۔ البتہ حقیقت قصہ کہنے کے فن سے واقف نظر آتے ہیں۔ انھوں نے فنی مہارت کے ساتھ قصہ بیان کیا ہے اور قصے میں نہ تو ناگوار حاطر طولانی مہمات کو بیان کیا گیا ہے اور نہ ہی کوئی ژولیدگی یا الجھاؤ ہے۔ یہ مثنوی یک رخ پلاٹ کی حامل ہے۔

کردار نگاری مثنوی سیراس طوطا میں شاہ کی بیوی کا کردار ایک باحیا اور باعصمت بیوی کا کردار ہے جو ہر مصیبت برداشت کرتی ہے اور اپنے محبوب شوہر کے فراق اور جدائی میں بے قرار رہتی ہے۔ جب بادشاہ سے فریب کر کے وزیر بادشاہ کے قالب میں اپنی روح منتقل کرنے کے بعد محل میں آتا ہے تو رانی کے علاوہ محل کی ہر حرم کے ساتھ خلوت میں بسر کرتا ہے اور محل کی کوئی کنیز اور کوئی حرم اس کی نفسانی خواہشات سے نہیں بچتیں۔ بظاہر کسی کو وہم و گمان بھی نہیں ہے کہ بادشاہ کے روپ میں کون شخص ہے اور خود مثنوی نگار ایک جگہ ان تمام حرم اور کنیزوں کو بے قصور ٹھہراتا ہے۔ لیکن رانی وہ واحد عورت ہے جو بادشاہ میں کچھ خلاف معمول باتیں پاکر خبردار ہو جاتی ہے۔ چنانچہ جب بادشاہ کے روپ میں وزیر محل میں آتا ہے تو رانی سمجھ جاتی ہے کہ ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔ اس وقت خوف و خطر، وہم اور اندیشوں کے ساتھ ساتھ رانی کے کردار معاملہ فہمی اور

۱؎ ایضاً محولہ سابق ص ۱۴۹

Marfat.com

بے خونی کی تصویر حقیقت نے خوب کھینچی ہے۔

پلٹے برعکس شاہ ساری چال!
ہو کے رو گرداں اوس سے وہ فی الحال

آمد و شد نشست اور برخاست | جز کجی ایک بھی نہ پائے راست
سوچی کچھ شہ پر آئی ہے آفت | اولٹی کھیل ورنہ ہو گئی ہے مت
شکل شہ کی ہے یک شاہ نہیں | راست میں شاہ کج کلاہ نہیں

ہر کا بکا ہے یہ نو یلی اے دل سے
اجنبی جیسے کوئی گھر میں آئے

رانی بادشاہ میں غیر معمولی تبدیلیاں پانے کے بعد جس طرح اس سے دور رہنے اور نہ چھونے کو منع کرتی ہے۔ اس سے رانی کی پاکدامنی اور پاک سیرتی واضح ہوتی ہے اور اس موقع پر ایک پاکدامن عورت کے جذبات جس صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ ان کی تصویر حقیقت نے خوب کھینچی ہے۔ اگرچہ یہ داستان خیالی ہے لیکن رانی کی زبان سے اس موقع پر جس گفتگو کا مثنوی نگار اظہار کراتا ہے۔ وہ لکھنوی بیگمات کا سا طور و طریقہ ہے۔

نہ بڑھانا تو ہاتھ میری طرف
ورنہ اپنے تئیں کروں گی تلف

تو نے میرا اگر چھوا دامن! | ہاتھ میرا ہے اور ترا دامن
لہو کی ندیاں بہاؤں گی! | خاک وتوں میں تجھے رلاؤں گی
گر گلے سے مرے تو آن لگا | کاٹوں گی اپنا اور تیرا گلا
میرا اچھا نہ آہ ہر دم لے! | تھوڑے دن تو چھری تلے دم لے

Marfat.com

رانی، بادشاہ سے اپنے شک کا اظہار کر دیتی ہے۔

ہو گیا رفع شک مرا جس دن
نہ رہوں گی میں ایک دن تجھ بن

جب میں سمجھی ہے میرا تو ہی شاہ — کام دل مجھ سے لیجو خاطر خواہ
اب نہ کر کچھ ارادہ میرے ساتھ — نہ لگی ہوں نہ لگوں گی تیرے ہاتھ
ساتھ اب تیرے گو نہیں سوتی — مانع دید پر نہیں ہوتی!

پردہ شک ہو جب فلک پارہ
پس کیا کر نہ دور نظارہ!

آخر میں جب ہیرامن طوطا کے قالب میں بادشاہ اپنے محل میں جاتا ہے اور اپنی رانی کو آپ بیتی سناتا ہے تو رانی اس کو پہچان لیتی ہے۔ اور آخر بادشاہ اور رانی کے باہمی مشورے سے رانی وزیر کو ایک بار قالب بدلنے کے علم کا اظہار چاہتی ہے۔ اور یوں اپنی رانی کی دانش مندی کے سبب، بادشاہ پھر دوبارہ اپنے اصلی قالب میں آجاتا ہے۔

صبح کے وقت معمول کے مطابق جب جعلی بادشاہ آتا ہے۔ تو رانی اپنی چالاکی اور ہوشیاری سے اسے قالب بدلنے پر مجبور کرتی ہے۔ ؎

صبح ہوتے ہی بارے آیا وزیر — غافل از حقہ بازی تقدیر
اٹھی یہ سرو قد پئے تکریم — سرو قد اوس کی کرنیکو تعظیم
کر کے تسلیم تخت پر بٹھلا — لے لیں چٹ پٹ بلائیں سرتاپا

رانی کا یہ ظاہری اخلاص و محبت اس کے گزشتہ سلوک کے برعکس تھا جس کے سبب وزیر حیران تھا۔

Marfat.com

اوس نے دیکھا جو ایسا سازد برگ — تھا نہ نزدیک ہووے شادی و مرگ
ہو کے حیران لگا وہ یوں کہنے — یہ نوازش ہے آج مجھ پر کیوں !

رانی، اس گرفتار ہوس کو زیر دام لانے کے لئے ان جذبات کا اظہار کرتی ہے۔

بولی وہ نازنین بہ کر کے نیاز
ہوں میں تیری قدیم سے دمساز

پر کئی بات سے گئی تھی سہم — رہ رہ آتا تھا میرے دل کو وہم
دیکھ برعکس تیری کتنی چال ! — بندھ گیا دل میں تھا کچھ اور خیال
کہ خدا جانے کیا ہوا شہ کو ! — گئی یکایک بدل جو اوسکی خو !
رفع وہ شبے سو ہوئے یک یک — للہ الحمد اب نہیں کچھ شک
امتحان کر چکی جو کرنا تھا ! — گیا گزرا جو کچھ گزرنا تھا !

آزمائش رہی ہے اک باقی
ہے کمال آج اوسکی مشتاقی !

اوپر کا آخری شعر ایک خاص نفسیاتی کیفیت کا مظہر ہے۔ جس کی تمہید رانی کے الفاظ میں شاعر نے اس طرح سے باندھی ہے۔ یہ شعر اس جذبے کا نقطہ عروج ہے شاہ اور رانی کی محبت، درمیان میں ان تعلقات میں ایک کشیدگی کے سبب ان شکوک و شبہات کے رفع ہو جانے کے بعد، رانی کی طرف سے اس بے قراری کی کیفیت کا اظہار مین فطری ہے کیونکہ اس نے اپنے شاہ سے ملاقات کے لئے جو شرط رکھی ہے۔ ان کے پورا ہونے کے بعد صرف علم کا یا ملیٹ کے مظاہرے کی جس انداز میں رانی مطالبہ کرتی ہے۔ اس سے یہاں صرف یہی ظاہر کرنا مقصود تھا کہ اب وہ اس دوری کو تا دیر قائم نہیں

Marfat.com

رکھنا چاہتی۔ چنانچہ اپنے اس بے کانہ اظہار کی بدولت وہ وزیر پر تزویر کو اپنے دام میں لانے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ اور وزیر بقالب شاہ اس سے جواب میں کہتا ہے۔
وزیر نے جو جواب دیا اور جس طرح فی الفور علم کایا پلٹ دکھانے کا اظہار کرتا ہے۔ وہ بھی عین فطری ہے اور اس سے اس بے قراری کا پتہ بھی چلتا ہے جو وہ بادشاہ کے روپ میں ہو کر اپنے گوہر مراد کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔ رانی کہتی ہے کہ میرے بادشاہ کو علم کایا پلٹ یاد تھا۔ اگر تجھے بھی وہ علم آتا ہے تو میں تجھے اپنا بادشاہ مان لوں گی۔ ورنہ

گر نہیں یاد تجھ کو کایا پلٹ !
مار ڈالوں گی میں تجھے جھٹ پٹ

وزیر کا جواب:۔

بولا وہ میں ہوں تابع فرمان !
تجھ پہ ہو جاؤں دل سے میں قربان

یہ بھی کوئی بات ہے جو تو نے کہی — چاہتی جب تو امتحان کرتی
وہیں اس مرغی نے منگا کر مرغ — مار ڈالا گلا دبا کر مرغ !
پڑھ کے کچھ اور کہہ کے چھو منتر — ڈالی جان اپنی مرغ کے اندر
بولا مرغا وہ او ٹھکے ککڑوں کوں — شہ کا لاشہ گرا زمین پہ نگوں
نعش دیکھی تو کر کے کایا پلٹ — طوطا وہ شاہ بن گیا جھٹ پٹ
مار کر ایک خنجر خونخوار ! — کیا اس مرغ کے تئیں مردار

بانوئے باوفا نے بے تاخیر !!
ڈالیں مرغے کی دونوں ٹانگیں چیر

Marfat.com

یوں شاہ کی کہ بانو کے تدبر و دانش مندی سے شاہ دوبارہ اپنے قالب میں آتا ہے اور وزیر اپنے کیفرِ کردار کو پہنچتا ہے۔

بیسوا کا سراپا

حقیقت نے بیسوا کا سراپا بھی خوب بیان کیا ہے اور اس کی بے حیائی، لوگوں کو اپنی جانب متوجہ کرنے کے انداز کی تصویر خوب کھینچی ہے۔ یہ ایک ایسی بیسوا کا کردار ہے جو حسن میں لاثانی بھی ہے اور چالاکی سے شریف لوگوں کو اپنے دام میں پھنساتی اور ان سے دام کھرے کرتی ہے۔ اپنے مطالبے سے وہ انتہائی ڈھیٹ ظاہر ہوتی ہے اور اس کا یہ مطالبہ دلچسپ بھی ہے اور عجیب و غریب بھی، عام انسانی زندگی میں اس قسم کے واقعے کا رونما ہونا ناممکن ہے۔ لیکن داستانوں میں اس قسم کے واقعات، داستان کی دلچسپی کو بڑھانے کے لئے بیان کئے جاتے ہیں۔ مثنوی نگار کا اس قسم کا دلچسپ واقعہ بیان کرنے کا مقصد ایک تو داستان کی دلچسپی بڑھانا ہو سکتا ہے۔ دوسرے اس سے طوطے کی دانش مندی کا اظہار بھی مقصود تھا۔ یہی واقعہ صیاد کو طوطے کی اچھی قیمت دلاتا ہے جس کا وعدہ ہیرامن طوطے نے صیاد سے کیا تھا۔ اور پھر بیسوا اور مہاجن بچے کے قصے کا ہیرامن طوطا جس طرح تصفیہ کرتا ہے۔ وہ رانی تک اس کی رسائی کا سبب بنتا ہے۔ یوں یہ دلچسپ قصہ اس داستان کے ارتقا میں ایک مربوط سلسلے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اس سے وہی نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ جن کی طرف داستان کے سننے یا مطالعہ کے دوران قاری کی توجہ ہوتی ہے۔

بیسوا کے کردار کو جس طرح حقیقت نے بیان کیا ہے۔ اس میں بیسواپن کی ساری باتیں نمایاں ہو جاتی ہیں۔ اور خود شاعر کو شاید یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہ رہتی کہ ؎

Marfat.com

بیسوا بن بھرا ہوا سارا !
جس کو دیکھو وہ محو نظارہ

اتنے میں ایک سرو گل اندام — تھی قیامت ہی جس کی طرز خرام
مہر رخسار و رشک مہ صورت — زہرہ پیشانی مشتری طلعت
بیسوا بن بھرا ہوا سارا ! — جس کو دیکھو محو نظارہ
شوخ پر فتنہ شکل پر بھولی — سادہ پرکار دلربا بولی !
...... ادا و عشوہ و ناز — غمزہ پرواز اور کرشمہ ساز
گرم سر تا بپا بڑی چنچل — برق ساں چال میں بھرے چھل بل

عربدہ جو وہ خشم آلودہ !
ہوئی آ اک دوکان پہ استادہ

یہاں حقیقت نے بیسوا کے شکار جس کردار کو منتخب کیا ہے۔ وہ خوبصورت بھی اور مالدار بھی، جس سے اس بیسوا کے ذہن کی چالاکی اور ہوشیاری کا پتہ بھی چلتا ہے کہ وہ آخر کیوں ایک خوش شکل اور امیر شخص کو اپنے الزام کا ہدف بناتی ہے۔ اس میں یہ مصلحت نظر آتی ہے کہ ایسی صورت میں لوگ، اس الزام کو بھی سچ تسلیم کریں گے۔ یا اس معشوقانہ انداز کو مذاق سمجھ کر جوہری بچہ، اسیر محبت ہو جائے۔ یا بدنامی کی صورت میں رقم ادا کر دے وغیرہ۔

دامن اوس کا پکڑ وہ شور انگیز
لگی کرنے ستیز اور آویز !!

یعنی تو شب کو خواب میں مرے آ — سینہ بر سینہ لب بہ لب ہے رہا
بوسے لیتا رہا ہے تو چٹ چٹ — ساتھ سویا ہے میرے ہونٹ پٹ

Marfat.com

تو نے چاہا جو میرے ساتھ کیا ۔۔۔ اور مانع ہوئی نہ میں اصلا
میرے جو کے ہزار ہیں دینار ۔۔۔ دے مجھے جلد اور نہ کر تکرار
گر خوشی سے دے تو واہ جی وا ۔۔۔ ہو گی رسوائی تو لطف ہے کیا۔

خرچی دینے میں اب مکرنا واہ
اور گپت عیش شب کو کرنا واہ

صیاد کی تصویر کشی بھی حقیقت نے خوب کی ہے۔ شروع میں تو اس کی مایوسی کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہوتا۔ جب وہ ہیرامن طوطا کے علاوہ طوطوں کو مردہ پاتا ہے اور اپنی ہتھیلیاں غم میں کاٹتا ہے کہ اس کی غفلت سے شکار مر گئے اس وقت بھی صیاد کے غم و غصے کی بالکل فطری کیفیت مثنوی نگار نے بیان کی ہے۔ پھر جب ہیرامن طوطا اس سے گفتگو کرتا ہے اور بازار میں لے جاکر فروخت کرنے کے لئے کہتا ہے تو بھی صیاد اسے کوئی غیر معمولی شے نہیں سمجھتا۔ البتہ جب طوطا اپنی دانش مندی سے بیلا اور مہاجن بچے کا فیصلہ چکاتا ہے۔ اور ایک ہجوم سے اپنے فیصلے کی دادِ تحسین وصول کرتا ہے تو صیاد کو اس کی قدر و قیمت کا احساس ہوتا ہے۔ اس وقت بہت سے لوگ طوطے کے جو دام لگاتے ہیں۔ وہ مصر کے بازار میں یوسف علیہ السلام کی نیلامی کے موقع پر موجود ایسے خریداروں کی مانند نظر آتے ہیں جنھیں جنس کمیاب کی قدر و قیمت کا اندازہ نہیں ہوتا۔ اس واقعے کے بعد صیاد کی جو کیفیت ہو جاتی ہے اور جو خود اعتمادی اس میں پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ بالکل فطری ہے اور حقیقت نے اس کا نقشہ خوب کھینچا ہے۔

خریداروں کی دونی ہمتی کا اظہار :-

کوئی کہتا تھا دو ڑ صد کو توق ! ۔۔۔ لیوے یوسف کو بن زلیخا کون

Marfat.com

کوئی کہتا تھا ڈیڑھ کوئی | پون | کیوں سے یوسف کو بن زلیخا کون

صیاد کا احساس فتحمندی :-

کم جو کہتا تھا سن کے بول زیادہ !
ناک بھوں بھیڑ کر وہیں صیاد

پھیر کر ادھر سے منہ کہتا ادنوں | لیں گے طوطا یہ دیکھو ان کا منہ
دیں گے چھپن ٹکے ساتھی کھول | طوطا ہی نت رہے ہیں لیتے مول
لینے دیتے نہیں یں کچھ متعلق بہ | ٹین ٹین ٹین ٹین لگائی ہے ناحق
میاں مٹھو یہ میرا لو گے کیا | ٹیاں کوئی تو دھیلے کا طوطا !
جب خریدار جائیں گے سب مر | لیجیے گا آپ اس کو تب آکر
کوئی زیبو سے گا تو دو دل گا تم کو پھیر | جاؤ جی مت پھراؤ میرا سر

طوطے اور رانی کی گفتگو جب طوطے کی شہرت رانی تک پہنچتی ہے اور رانی صیاد کو منہ مانگے دام دے کر طوطے کو خرید والیتی ہے۔

اس کے بعد طوطا ایک شب رانی کی فرمائش پر اپنی داستان سناتا ہے۔

بولا اچھا یہ تو کہدو جی ! | آپ بیتی کہوں کہ پر بیتی !
بولی کہ آپ بیتی اسے مٹھو | لگا کہنے وہ مرغ شیریں گو

طوطا نصف داستان سنانے کے بعد داستان کو اگلی شب کے لئے ملتوی کر دیتا ہے گویا رانی کی آتش شوق کو تیز تر کرنا چاہتا تھا۔ رانی زیادہ ضد کرتی ہے اور آخر میں بادشاہ کا صرف نام سننے کی آرزو کرتی ہے۔ رانی کی اس خواہش کو بھی طوطا بہ لطائف الحیل ٹال دیتا ہے یہیں مثنوی نگار کا مقصد، اس جستجو کو رانی میں پیدا کرنا مقصود تھی۔ چنانچہ رانی تمام رات ایک

Marfat.com

کش مکش کے عالم میں رہتی ہے اور اضطراب و بے چینی میں وہ شب اور دن کا وقت گزار کر سرِ شام طوطے سے پھر باقی داستان کو سنانے کے لئے کہتی ہے۔ اس عرصے میں کبھی رانی مایوس ہوتی ہے اور کبھی امید کی کرن مایوسی کے اندھیروں میں روشنی کرتی ہے اور پھر معدوم ہو جاتی ہے۔ کبھی رانی سوچتی ہے کہ پرند کا کیا اعتبار، ممکن ہے کہیں کی سنی سنائی داستان بیان کر رہا ہے۔ پھر سوچتی ہے کہ تمام آثار و قرائن سے تو میرے گمشدہ شاہ کا پتہ چلتا ہے۔

غرض دوسری شب وہ حقیقتِ حال سے باخبر ہوتی ہے۔ لیکن ستم ظریفی اور بدنصیبی ملاحظہ ہو کہ بچھڑے ہوؤں کا ملاپ اس صورت میں ہوتا ہے کہ ایک انسان ہے اور دوسرا پرند۔

ہجر نے گو کیا یہ مرگ قریب — پر یہ کیسا ہے وصل ہائے نصیب
کہ میں انسان ہوں اور تو طائر — غیر جنسیت ان کی ہے ظاہر

مثنوی کے اسلوب اور طرزِ بیان میں شاعرانہ لطافتوں اور ادبی نزاکتوں کے استعمال کی بڑی گنجائش رہتی ہے۔ لیکن مثنوی کی اصلی خوبی اس کا ربط اور تسلسل ہے۔ شاعرانہ لطافتوں اور نزاکتوں کی نمائندہ مثنویوں میں سحر البیان اور گلزار نسیم کا نام لیا جاسکتا ہے۔ جن میں جملہ شاعرانہ محاسن کے ساتھ واقعات کے ارتقا، ترکیب اور مثنوی کی ہیئت اور ربط و تسلسل کی طرف بھی مکمل توجہ دی گئی ہے۔ لیکن بیشتر مثنویوں میں ساری خوبیوں کا جمع ہو جانا ناممکن ہے۔

ہیرا من طوطا میں شاعرانہ لطافتیں اور نزاکتیں کمیاب ہیں جس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ بنیادی طور پر قصّہ کا موضوع عشقیہ نہیں ہے۔ وگرنہ شاعر کو ضرور ایسے کمالات دکھانے کا موقع ملتا۔ جہاں تک ربط اور تسلسل کا تعلق ہے یہ مثنوی اس پر پورا اترتی ہے۔ اس میں واقعات کا بتدریج ارتقا موجود ہے۔ اور ترتیب میں موقع محل کی موزونیت کا خیال رکھا گیا

Marfat.com

ہے۔ مثنوی ہیرامن طوطا میں اختیار کردہ موضوع کے مطابق اس داستان کو نہ تو زیادہ پھیلانے اور پیچ در پیچ واقعات کو بیان کرنے کی ضرورت تھی۔ اور نہ کسی طویل مرقعے کو بیان کرنا ممکن تھا۔ ڈاکٹر گیان چند نے داستانوں کے ڈھانچوں کی دو اقسام بیان کی ہیں۔ ایک شکل میں پلاٹ واحد ہوتا ہے۔ یعنی داستان ایک یا چند کرداروں کی سرگزشت ہوتی ہے۔ جو بغیر کسی انقطاع کے مسلسل بیان کر دی جاتی ہے۔ دوسری صورت میں بنیادی پلاٹ بہت خفیف اور کاہیدہ ہوتا ہے۔ ہیرامن طوطا اکہرے پلاٹ کا قصہ ہے۔ جس میں راوی صرف ایک ہی کردار رہتے۔ اور صرف ایک ضمنی کہانی درمیان میں بیان ہوتی ہے اور اس ضمنی کہانی کا بھی بنیادی پلاٹ سے گہرا تعلق ہے۔ اس اعتبار سے یہ واحد پلاٹ کی داستان ہے۔ بیتال پچیسی، چار درویش، آرائش محفل اور بعض دوسری داستانوں کی طرح ہیرامن طوطا میں بھی بیوا اور مہاجن بچے کی کہانی، اپنے انجام اور آغاز کے اعتبار سے اپنی جگہ ایک مختصر سی کہانی بھی ہے۔ لیکن اس کا داستان کے بنیادی پلاٹ سے بھی گہرا تعلق ہے۔ ہیرامن طوطا کی تمہید و بندش میں نہ تو اردو مضمون ہے اور نہ ہی تکرار بیان پایا جاتا ہے۔ البتہ اس میں ایسے ڈرامائی موڑ نہیں آتے کہ جو ذوق و تجسس کو ہر ہر قدم پر افزوں کرتے رہیں۔ زبان کی سادگی، اور اسلوب کی روانی داستان کو سریع الفہم بناتی ہے۔ اور یہ سریع الفہمی ہی فن قصہ گوئی کا لازمی جزو ہے۔ حقیقت کے انداز شاعری کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ ان کی غزلوں میں تو لکھنویت کا اثر نمایاں ہے لیکن مثنویوں میں ایسی بات نہیں ہے۔ جو تعجب خیز امر ہے۔ حقیقت کی یہ مثنوی ایک متوسط درجے کی مثنوی ہے۔

Marfat.com

خزینۃ الامثال

حقیقت نے اپنی اس تالیف میں عربی، فارسی اور ہندی (یعنی اردو) ضرب الامثال یکجا کی ہیں۔

وجۂ تالیف کتاب کے آخر میں حقیقت نے اس کتاب کی وجہ تالیف بیان کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"حسین شاہ تخلص بہ حقیقت عفا اللہ تعالٰے عن سیاتہٖ فی یوم القیامۃ صاحب سخن کی خدمت میں ملتمس ہے کہ ایک روز غریب خانے میں مجمع ان دوستان موافق اور یارانِ صادق کا مانند عقد پروین دپرن کے تھا۔ جو ہر ایک ان میں سے سخن فہمی ونکتہ شناسی، بذلہ گوئی و لطیفہ سنجی میں ضرب المثال اہلِ سخن کا تھا۔ سب شکل بلبل نغمہ سرا اور طوطی شکریں نوا کے چہچہے بھر رہے تھے اور باہم چرچا ہر ایک فن کا اور تذکرہ شعر وسخن کا کر رہے تھے۔ اتفاقاً بر سبیل مذکورہ ذکر امثال کا درمیان آیا۔ سب نے یک زبان ہو کر بندے کو فرمایا کہ دفتر کے دفتر انواع علوم سے آراستہ ہیں اور اقسام فنون سے پیراستہ مگر ایسی کتاب جو مجمع امثال ہو نظر نہیں آتی۔ اگر تو ہمارے پاس خاطر سے موافق اس مثل کے بیکار مباش کچھ کیا کر امثال پریشان کو جمع کرے تو خالی لطف اور فائدے

Marfat.com

سے نہ ہوگا۔ ہرچند بندہ اپنے تئیں مرد اس میدان کا نہ جانتا تھا لیکن دوستوں کے کہنے سے اس وادی پُرخطر میں گامزن ہوا۔ اور بعونہ تعالیٰ بہت سی محنت اور مشقت کر کے ایک مدت مدید اور عرصہ بعید میں امثال عربی و فارسی اور ہندی کو زبان زد خواص و عام کے تئیں جمع کیں اور ہر مثل کو مواضع اور مواقع لائقہ میں مانند سبحہ لآلی کے منظم اور منسلک کر کے موسوم بہ خزینۃ الامثال کیا[۱]۔"

سنہ تصنیف

شاہ حسین حقیقت کے بیان کے مطابق اس کا سال تالیف ۱۲۱۵ھ ہجری مطابق ۱۸۰۱ سنہ عیسوی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"الحمد اللہ کہ باجود حوادث انگیزی ہائے فلک خلل انداز تفرقہ پرداز این بحر ذخار و محیط ناپیدا کنار بہ توفیق سا صنع عقل بالادست غواصان قلزم ہمہ دانی لطمہ خور بحر امواج حیرانست بنا بر حسن نیت طالباں در ۱۲۱۵ھ یکہزار و دو صد و پانزدہ ہجری نبوی گرداب دارد گوہر کرد از یکجا و دریک صدف قرار گزید الخ ۔"

حسین الحمد ہذہ السنۃ ... مینعنا عربی المتعال

سال تاریخ خواستم کہ کنم ! ... ہم زبانش عیاں بر اہل کمال ! !

کر خزینے سے فرو ساٹھ عدد ... بولا ہاتف خزینۃ الامثال

مندرجہ ذیل حساب سے اس سے جو اعداد بنتے ہیں۔ ان کے مطابق سال تصنیف ۱۸۰۱ سنہ عیسوی برآمد ہوتا ہے۔:

۱۔ خزینۃ الامثال ص ۴، ۵ مطبع سلطانی ۱۸۵۴

Marfat.com

اعداد

خزینہ :- ۶۷۲ — ۶۰ = ۶۱۲

الامثال :- ۶۰۳ + ۶۱۲ = ۱۲۱۵ (۱۸۰۱ سنہ عیسوی)

طباعت

ہمارے پیشِ نظر جو نسخہ ہے وہ مصطفائی کا طبع کردہ ہے۔ سال طباعت ۱۲۷۰ ہجری مطابق ۱۸۵۴ء ہے۔ ناشر کے بیان سے واضح ہے کہ یہ کتاب اس سے قبل بھی شائع ہو چکی تھی۔ ناشر نے طبع اوّل کا سنہ اشاعت نہیں لکھا ہے لہذا کچھ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کب طبع ہوئی تھی؟ ناشر نے جو کچھ لکھا ہے اس سے یہ پتا چلتا ہے کہ حقیقت کے خلف الرشید میر محسن لکھنوی جو خود بھی لکھنؤ کے مشہور شاعروں میں سے تھے اس کتاب کو بغرض اشاعت لائے تھے۔ نیز زمانہ شاہی میں یہ کتاب مطبع نظامی لکھنؤ سے شائع ہوئی تھی۔ چنانچہ ناشر لکھتا ہے۔

"بہ توجہ برگزیدہ حضرت میاں عبدالرحمٰن خان صاحب مہتمم مطبع نظامی زمانہ شاہی میں یہ کتاب بمقام لکھنؤ طبع ہوئی تھی۔ اور بوجہ عدم قدردانی رواج وقت کے ایسی اچھی کتاب مکرّر طبع نہیں ہوئی۔ چونکہ فی الحال زمانہ فیض تعلیم سرکار دولت انگلیشہ میں ہر ایک فن اور علوم کی قدردانی ہو چلی ہے اس لئے بہ نظر ترویج مدارس و علّہ شائق علوم کی نظر سے یہ کتاب اس مطبع میں باضافہ و چند لطیفہ و اشارات لغات آداب مجلس میں طبع ہوئی۔"[1]

اس کتاب کی طبع دوم میں بعض اضافے بھی کئے گئے ہیں جن کی صراحت ناشر نے یوں کی ہے۔

۱:- خزینۃ الامثال ص۲۔ مطبوعہ مطبع مصطفائی لکھنؤ۔ ۱۸۵۴ء

Marfat.com

"جو امثال عرب کتاب میں داخل تھیں اور سمجھنا ان کا ہر ایک کو مشکل تھا
خیال میں آیا کہ اگر ان کا ترجمہ ہو جاوے تو باسہل وجوہ سب کی سمجھ میں آوے
اس واسطے ماضی الضمیر اپنا خدمت میں حضرت حبر المحققین تحریر المدققین
یکتائے ماہران فنون عقلی یگانہ واقفان علوم نقلی ادیب بے بدیل فلسفی،
فقید المثال حکیم حکمت مصطفویہ متبع سنت سنیہ نبویہ، الوذعی علمائے روزگار
المعی کملائے احصار مورد فیوضات نامتناہی لم یزیلی مولانا بالفضل والکمال اولانا جناب
مولانا ابوالبرکات رکن الدین محمد الہشیر مولوی تراب علی لازالت شموس افادات
بازغۃ وماہر برحت اقمار افاضاۃ ساطعۃ عرض کیا۔ جناب معظم الیہ بالقابہ نے
برحسب پذیرائی التماس اعراب اور ترجمہ اور مورد استعمال امثال عرب لکھا بلکہ
جس جا حل مطلب ترجمہ سے بخوبی نہ ہوا وہاں توضیح حاشیے پر چڑھائی اور جو مثل
پوری کتاب میں نہ تھی وہ بہ تحریر باقی کامل فرمائیں[۱]۔"

گویا مولوی ابوالبرکات نے بھی اپنی طرف سے مزید ضرب الامثال یکجا کر دیں۔
خزینۃ الامثال کی ترتیب حقیقت نے اس طرح رکھی ہے کہ حروف تہجی کے اعتبار
سے ضرب الامثال پیش کی گئی ہیں۔ چنانچہ الف سے شروع ہونے والی ضرب الامثال پہلے دی
گئی ہیں۔ لسانی اعتبار سے ترتیب یوں رکھی گئی ہے کہ پہلے فارسی زبان کی ضرب الامثال پھر عربی کی
اور اس کے بعد ہندی کی ضرب الامثال ہیں۔ فارسی ضرب الامثال کا اردو ترجمہ یا ان کا محل استعمال
بیان نہیں کیا گیا۔ حقیقت نے تو دراصل عربی ضرب الامثال کے اردو ترجمہ کا اہتمام بھی نہیں کیا
تھا، اور کتاب کی اشاعت بغیر ترجمے کے ہوئی تھی۔ لیکن طبع دوم میں عربی ضرب الامثال کے اردو

۱۔ خزینۃ الامثال ص۲ مطبوعہ مطبع مصطفائی لکھنؤ ۱۸۵۴ء

Marfat.com

جمے دینے کی ضرورت خاص طور پر محسوس کی گئی۔ اس کی ایک بنیادی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ چونکہ اس زمانے میں فارسی زبان کا رواج عام تھا۔ اور گو استداد زمانہ کے سبب اردو زبان فارسی کی حریف بن کر ابھر چکی تھی۔ اور رفتہ رفتہ فارسی کا اثر اور مقبولیت ختم ہو رہی تھی۔ تاہم اس کے باوجود ابھی برصغیر پاک و ہند میں فارسی زبان سے واقفیت عام تھی۔ اور ہر پڑھا لکھا آدمی ... سمجھ جاتا اور اس میں کچھ نہ کچھ لکھنے پڑھنے کی استطاعت بھی رکھتا تھا۔ اس سبب سے مصنف کے فرزند محسن لکھنوی نے اور نہ کتاب کے ناشر نے یہ ضروری سمجھا ہوگا کہ فارسی زبان کی ضرب الامثال کا اردو ترجمہ شریک اشاعت کیا جائے۔ لیکن عربی ضرب الامثال کے اردو ترجمے کی ضرورت سمجھی گئی۔ ہر چند کہ اس زمانے میں عام پڑھا لکھا آدمی بھی عربی زبان سے تھوڑی بہت شناسائی رکھتا تھا۔ لیکن اس زبان کی واقفیت کا دائرہ، فارسی کے مقابلے میں بہت محدود تھا۔

اس کتاب کی افادیت میں اور بھی اضافہ ہو جاتا اگر ہر ضرب المثل کے پس پردہ واقعہ کو بھی اختصار کے ساتھ بیان کر دیا جاتا۔

گو خزینۃ الامثال کی عربی، فارسی اور ہندی ضرب الامثال میں سے بیشتر ہم معنی ہیں۔ لیکن چونکہ مولف کے پیش نظر کتاب کی ترتیب کے وقت یہ خیال نہ تھا۔ کہ وہ تینوں زبانوں کی ہم معنی ضرب الامثال یکجا کر رہا ہے۔ لہذا اس سبب سے مولف نے کتاب کی ترتیب دوسرے انداز میں رکھی ہے۔

حقیقت اس ترتیب کے بارے میں لکھتے ہیں۔

" بنا اس خزانۂ عامرہ کی بہ ترتیب حروف تہجی اکتیس خزینے پر ہوئی اور بنا ہر خزینے کی گئی گنجینے پر اور لکھنے میں کہاوتوں کی رعایت دوسرے

Marfat.com

بلکہ تیسرے حرف کے بھی واسطے سہولت نکال لینے مثل کے کی گئی۔ مثلاً یہ مثل اختلاط زیادہ بر آشنائی یا اعتبار" ۔ دوسرے حرف کے الف اور خ کے ساتھ لکھے گئے۔ اور اس کہاوت کو کہ ایک تو میاں بھتے ہی تھے اور دوسرے کہائے نہنگ" الف مع الیا کے مقام پر لکھا اور اول جس مثل عربی کے کر الف لام تعریف سے مثلاً یہ مثل کہ المکتوب نصف الملاقات" حرف میم اس کو لکھا نہ حرف الف ہیں۔ اس طرح سب کہاوتوں پر قیاس کیا جانا چاہیئے۔"[1]

ضرب المثل کیا ہے

ضرب المثل کس طرح وجود میں آتی ہے ؟ کہا جاتا ہے کہ یہ دانائی کے اظہار کی قدیم ترین شکل ہے۔ ان کہاوتوں کے خالق کون ہوتے ہیں ؟ ان کے بارے میں بھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ یہ بھی لوک ادب کی طرح خود ہی پھلتی پھولتی ہیں۔ اور زمانے کے ساتھ ساتھ عوام میں ان کی جڑیں گہری ہوتی جاتی ہیں۔ انھیں لوک داستانوں کی طرح خودرو پودوں کے مماثل قرار دیا جا سکتا جو رفتہ رفتہ ایک عالمگیر اور ابدی سچائی کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ ہر ضرب المثل کے پس پشت کوئی نہ کوئی واقعہ ضرور ہوتا ہے۔ یہ فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ آیا کوئی ضرب المثل پہلے وجود میں آئی۔ یا کسی خلاق ذہن نے یا معاشرے کے اجتماعی شعور نے ضرب المثل میں پوشیدہ تجربے کو صداقت کا روپ دینے کے لئے اس کے ساتھ کوئی نہ کوئی واقعہ متعلق کر دیا۔

ضرب المثل اصل میں طوالت کے بجائے اختصار کا فن ہے۔ اور کسی ضرب المثل سے لطف اندوز ہونے یا کسی خاص موقع پر اس کو حسب حال بولنے کا فن بھی اسی وقت کامیاب

---

[1]- خزینۃ الامثال۔ بحوالہ سابق ص ۵

Marfat.com

کہا جا سکتا ہے کہ جب فریق مخالف یا سننے والے بھی اس کہاوت یا ضرب المثل میں پوشیدہ معنوں سے پوری طرح آگاہ ہوں۔ گویا یوں کہا جا سکتا ہے کہ ایک خاص سطح کے تہذیب یافتہ معاشرے میں ضرب المثل کی اہمیت اور استعمال زیادہ بہتر اور سودمند ہوگا۔

شاہ حسین کا نقطہ نظر اس سلسلے میں کیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں۔

"یہ بھی دریافت کرنا ضرور ہے کہ مثل کیا ہے کہ جس سے احوال گزشتہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کہاوت کو کسی نے وقت ظاہر ہونے کسی حادثے کے یا واسطے مثال دینے کے ایک حال کے ساتھ حال دوسرے کے ایک لطف و عذابت کے ساتھ وضع کیا ہو۔ تو جس وقت ویسا ہی سانحہ ظاہر ہو۔ اس مثل کو کہیں تا سننے والوں کو شے مخیل محقق ہو جاوے۔ اور متوہم بصورت متیقن کے نظر آوے یا غائب بمنزلہ شاہد کے دکھائی دے۔ اور کچھ پردہ حقیقت میں اس چیز کے نہ رہے اور اگر ساتھ موقع کے کسی عبارت میں کوئی کہاوت درج کی جائے وہ کلام لاکلام ایک خوبی اور رنگینی، لطافت اور ملاحت بہم پہنچائے کہ سلف کے لوگ کہتے ہیں۔ المثل فی الکلام کالملح فی الطعام یعنی کہاوت کلام میں جیسے نمک ہے طعام میں۔"[۱]

یہاں ہم ضرب المثل کی وہ تعریف بھی پیش کر دیں۔ جس پر اکثر اہل علم میں اتفاق پایا جاتا ہے۔ جب ایک یا دو جملے مدت مدید سے کسی خاص موقع پر استعمال کئے جاتے ہوں۔ اور اپنے لفظی معنوں کے علاوہ کچھ اور معنی دیتے ہوں اور ان کی حقیقت و ماہیت بارہا تجربہ کرنے سے درست ثابت ہو چکی ہو تو ایسے جملے کو ضرب المثل

۱۔ بحوالہ سابق ص ۵

Marfat.com

کہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ضرب المثل ہمارے مشاہدات اور تجربات کا خلاصہ ہوتی ہیں۔ اور دلچسپ ہونے اور حکمت و دانائی کا پہلو رکھنے کے سبب زبان زد عوام ہوتی ہیں۔

ضرب المثل کی اہمیت

لسانی اور ادبی اعتبار سے بھی ضرب الامثال کی اہمیت مسلم ہے۔ ضرب الامثال ہر زبان میں پائی جاتی ہیں۔ اور کسی زبان سے مکمل واقفیت اور اس پر پورا عبور رکھنے کے لئے ضرب الامثال سے کما حقہ آگاہی اور موقع محل کے اعتبار سے ان کے مناسب اور برجستہ استعمال کو نہایت مستحسن سمجھا جاتا ہے۔

بعض ضرب الامثال میں تاریخی واقعات بھی مضمر ہوتے ہیں۔ ضرب الامثال کے استعمال کے وقت اسی ترتیب کو ملحوظ رکھنا چاہیئے لیکن بعض اوقات ایسا نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ ضرب الامثال ضابطہ تحریر میں کم لائی جاتی تھیں۔ اور ان کا استعمال بھی زبانی ہوتا تھا۔ لہذا افراد انھیں استعمال کرتے ہوئے بعض اوقات بعینہٖ وہی الفاظ استعمال کرنے کے بجائے کوئی دوسرا لفظ یا اس کے ہم معنی لفظ کو ضرب المثل میں پنہاں مفہوم کو ادا کرنے کے لئے استعمال کر لیتے تھے۔ اسی بنا پر ضرب المثل میں الفاظ کی تقدیم و تاخیر کو گوارا کر لیا جاتا ہے۔ لیکن محاورے کی طرح مصدر کے تمام مشتقات کے ساتھ استعمال کرنا، اہل علم نے ناجائز قرار دیا ہے۔

آخر میں خزینۃ الامثال سے چند ضرب الامثال دی جاتی ہیں۔ جن کی ترتیب گنجینہ کے حساب سے ہے۔

گنجینہ ۱ - جزو ۲ امثال فارسیہ - امثال الف

آب آمد تیمم برخواست - آب ندیدہ موزہ کشیدہ - آب و آتش را چہ آشنائی

Marfat.com

۱۔ پیری وداع عمر ست۔ اب صرف امثال ہندیہ پیش کی جاتی ہیں۔ گنجینہ سوم۔ در امثال ہندیہ (گنجینہ ۳۔ جزو ۲ امثال ہندیہ۔ امثال الف۔ آبرو جگ میں رہی تو جان جانا پشم ہے۔ آبلہ گلے پڑا۔ آ بیل مجھے مار یا آ پڑوسن لڑیں۔ آ پڑوسن مجھ سے ہو۔ آپ کاج مہا کاج۔ آپ ہی میاں مانگتے۔ اور باہر کھڑے درویش۔ آپ ہی ناک چوٹی میں گرفتار ہیں۔ آٹے کا چراغ گھر رکھو تو چوہا کھائے باہر رکھو تو کوا لے جائے۔ آٹے کے ساتھ کہیں گھن نہ پس جائے۔ آدمی آدمی انتر کوئی ہیرا کوئی کنکر۔ آدمی کا آدمی شیطان۔ آدمی سا پکھیرو کوئی نہیں۔ آنکھ پھوٹے گی تو کیا بھنوؤں سے دیکھیں گے۔ آنکھوں کے اندھے نام شیخ روشن۔ آنکھوں کے اندھے نام نین سکھ۔

امثال ہندیہ در مثل ہائے با

با پ نہ مارے پدڑی اور بیٹا تیر انداز۔ باپ نہ دادے مارخواہ مے۔ باپ کرے باپ کے آگے بیٹا کرے بیٹے کے آگے آئے۔ باپت پوت پتا پر گھوڑا بہت نہیں تو تھوڑا تھوڑا۔ بگ بگڑی کو ایک جگہ پانی پلایا ہے۔ بخت اڑ گئے بلندی رہ گئی۔ بخت دیں یاری تو گرگھوڑے اسواری۔ کم بخت کی حال بیلی۔ بخشو بی بلی چوہا لنڈورا ہو کے جیئے گا۔ براتی کنارے ہو جائیں گے۔ کام دولہا دلہن ہی سے آپڑتا ہے۔

گنجینہ چہارم در مثل ہائے حرف بھا

بھات ہو گا تو کوّے بہت آ رہیں گے۔ بھات چھوڑا جاتا ہے۔ سات نہیں چھوڑا جاتا ہے۔

بھاری پتھر دیکھا چوم کر چھوڑ دیا۔

بھاگل پور کے بھگیلے اور کل گاؤں کے ٹھگ۔ بھٹ پڑے وہ سونا جس سے ٹوٹیں کان۔ بھلے گھوڑے کو ایک چابک بھلے آدمی کو ایک بات۔

Marfat.com

گنجینہ ءِ امثال ہائے ہندی حرف پا

پاپی کا مال اکارت جائے، ڈانڈ بھرے یا چور لے جائے۔ پاپی کی ناؤ ڈوبے پر ڈوبے۔ بادشاہوں کا اور دریاؤں کا کس نے بھید پایا ہے۔ پاک رہ بے باک رہ۔ پال پال تیرے جی کا ہوگا کال۔ پانچویں پنڈت چھٹے نرائن۔

امثال ہندیہ ء حرف پھا

پھاٹک ٹوٹا گڑھ لوٹا۔ پھاوڑے کا نام گل صفا۔ پھل چڑھے تو پھل لگے۔ پھوئیں پھوئیں کال بھرتا ہے۔

امثال ہندیہ ء حرف جا

جا بدھ رہے رام تا ہے بدھ نہ ہے۔ جادو برحق کرنے والا کافر۔ جان ہے تو جہان ہے۔ جب چنے تھے تو دانت نہ تھے دانت ہوئے تو چنے نہیں۔ جب سے جمے بال تب سے یہی احوال۔

امثال ہندیہ ء حرف سا

سخی کا سر بلند۔ سخی شوم برسویں دن برابر ہوتے ہیں۔ سر سجدے میں من بدیوں میں۔ سگھڑ ہنس گئیں، پھوہڑوں کو آیا ہانسا۔ سلامت رہے بہو جس کا بڑا بھروسہ۔ سوکھے ساون روکھے بھادوں۔ سیاں بھئے کوتوال اب کاہے کا ڈر۔ سیر میں پن سیرے کا دھوکا۔ سیکھ پڑوسن تیرے لچھن

امثال ہندیہ حرف ص

صبح کی بوہنی اور اللہ میاں کی آس۔ صبر کی داد خدا کے ہاتھ میں ہے۔ صندل کے چھاپے منہ کو لگے۔ صورت نہ شکل چولہے میں سے نکل۔ صورت چڑیل کی نام پریوں کا۔

امثال ہندیہ حرف م

مکے میں رہتے ہیں پر حج نہیں کیا۔ مفلسی میں آٹا گیلا۔ مفلسی اور فالسے کا شربت۔ مفلس سے سوال حرام

Marfat.com

ہے۔ ملّا کی دوڑ مسیت تلک۔ منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت۔ منہ مانگے ستر بلا ٹالے۔

امثال ہندیہ حرف ہ

ہاتھ دیکھن آرسی کیا۔ ہاتھ نہ مٹھی ہلبلاتی اٹھی۔ ہاتھ پاؤں کی کاہلی اور منہ میں مونچھیں جائیں۔ ہاتھیوں سے گنّے کھانے۔ ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں۔ ہاتھی پھرے گاؤں گاؤں جس کا ہاتھی اسی کا ناؤں۔ ہتھیلی پر سرسوں جماتے ہیں۔ ہزار ہاتھی لٹا تو بھی سوا لاکھ ٹکے کا۔ ہزار لاٹھی لوٹی گھر بار کے باس توڑنے کو بہت۔

غرض اسی صورت سے تینوں زبانوں کی ضرب الامثال حرف یا تک دی گئی ہیں۔ مذاق عام کے پیشِ نظر صرف اردو ضرب الامثال کے حصّے سے کچھ نمونے نذرِ قارئین کئے ہیں۔

زیرِ نظر کتاب میں صرف اردو ضرب الامثال کی تعداد ڈھائی ہزار سے زائد ہے ان میں بہت سی ضربِ الامثال ایسی ہیں کہ جواب عام طور پر تحریر میں بھی کم ہی آتی ہیں اور سننے میں بھی نہیں آتیں۔ ہمارے حافظے اور ذہن ان میں سے بیشتر کو فراموش کر چکے ہیں۔ حقیقت کی یہ کاوش اس اعتبار سے بھی قابلِ قدر ہے کہ انھوں نے بڑی محنت اور جستجو کے ساتھ ان ضربِ الامثال کو یکجا کر کے انھیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا ہے۔

حقیقت نے بیشتر ایسی ضرب الامثال بھی اس کتاب میں شامل کر دی ہیں۔ جو فحش ہیں۔ اور جو عام طور پر طبقہ جہلا اور پست طبقے کے لوگ بولتے ہیں۔ بعض شاعروں کے ایسے مصرعے بھی دے دیئے گئے ہیں جو فحش اور متبذل ہیں۔

اسی طرح جنسی افعال کے لئے بھی بعض نہایت سوقیانہ لفظ ضرب الامثال میں پیش کئے گئے ہیں۔ حقیقت اس سلسلہ میں کسی قسم کے ادب و آداب یا تہذیب و

Marfat.com

شائستگی کو ملحوظ خاطر نہیں رکھتے۔

ممکن ہے یہ طریق کار بعض لوگوں کو ناپسند ہو۔ لیکن لغت اور لغت سے متعلق مسائل پر لکھتے ہوئے معاشرے کی عام اقدار اخلاق کو ملحوظ نہیں رکھا جا سکتا۔ لغت نگار کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ کسی لفظ یا محاورے کو اخلاقی معیار سے جانچے۔ اسے تو زبان کے ذخیرہ الفاظ کا جائزہ لینے کے لئے ہر طرح کے الفاظ سے سابقہ پڑتا ہے۔ اس بات کو یوں ذہن نشین کیا جا سکتا ہے کہ مذہبی کتابوں میں بہت سے ایسے فقہی مسائل پر بحث کی جاتی ہے۔ جن پر کھلم کھلا گفتگو کرنا ممکن نہیں ہوتا۔

ان مسائل پر بحث کی موجودگی میں ہم ہرگز یہ نہیں کہہ سکتے کہ ایسے مصنفین نے "اخلاق" کو پیش نظر نہیں رکھا۔ یہی حال طبی کتابوں کا ہے جن میں اعضائے جسمانی اور افعالِ جسمانی کا تذکرہ ہوتا ہے۔ کیا ان کے بارے میں بھی یہ کہا جائے گا کہ ایسی کتابوں کے مصنفین "اخلاق" سے بے بہرہ ہیں۔

Marfat.com

صنم کدۂ چین

شاہ حسین حقیقت کی یہ ایک اور مفید اور دلچسپ کتاب ہے۔ یہ ایک کھیل کا نام ہے۔ اس کا مقصد تعلیمی ہے۔ قدیم زمانے میں طلبہ میں علمی ذوق و تجسس، اور شعر و شاعری سے لگاؤ پیدا کرنے کے لئے یہ کھیل عام طور پر بچوں کی ذہنی مشق کی خاطر کھیلا جاتا تھا۔ اور طلبہ میں ذہانت و فطانت، حاضر جوابی اور برجستہ گوئی کی صلاحیت پیدا کرنا بھی اس کھیل کا مقصد ہوتا تھا۔

حقیقت کی یہ کاوش بھی انکے تبحر علمی پر دلالت کرتی ہے۔ یہ کتاب آسان فارسی زبان میں لکھی گئی تھی اس کے کل صفحات کی تعداد ۳۲ ہے۔

سنہ تصنیف

اس کتاب کا سنہ تصنیف ۱۲۰۹ ہجری مطابق ۱۷۹۵ ہے۔

سنہ طباعت

یہ کتاب ۶ ر صفر ۱۲۶۳ ہجری مطابق ۲۴ جنوری ۱۸۴۷ کو مطبع محمدی لکھنؤ سے شائع ہوئی تھی۔ اس کا مادہ تاریخ " صنم خانہ " ہے جس سے ۱۸۴۷ سنہ عیسوی برآمد ہوتا ہے۔

وجہ تسمیہ

" صنم آمد " ایک کھیل کا نام ہے۔ جس میں دو طالب علم ایک دوسرے سے سوال جواب کرتے ہیں۔ اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ ایک طالبعلم یہ کہتا ہے۔ " صنم آمد "۔ دوسرا سوال کرتا ہے " از کجا آمد "۔

Marfat.com

اس کے بعد پہلا طالب علم سوال کرتا ہے جس کا جواب دوسرا دیتا ہے اور پھر سلسل کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ سوالات اس قسم کے ہوتے ہیں۔

" صنم از کجا آمد ؟ "

کجا میرود

بر چہ سوار است

چہ پوشیدہ است

در دست چہ دارد

چہ می خورد

چہ می نوشد

چہ می سراید وغیرہ ، وغیرہ ،

اس کھیل کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اتنے دور ہوتے ہیں جتنے حروف تہجی ہیں۔ پہلے دور کے جوابات "الف" سے شروع ہوتے ہیں۔ دوسرے دور کے "ب" سے اسی طرح بعد کے ادوار حروف تہجی کے مطابق یکے بعد دیگرے آتے رہتے ہیں۔ جب کوئی طالب علم صحیح جواب نہیں دے سکتا تو وہ ہار جاتا ہے۔

شاہ حسین حقیقت نے اس کھیل "صنم آمد" کی مناسبت سے یہ کتاب لکھی ہے اس میں "الف" سے "یا" تک باب ہیں۔ ہر باب میں کھیل کی مناسبت سے جوابات دیئے گئے ہیں۔ حقیقت نے اس میں یہ بھی اضافہ کیا ہے کہ اشعار، امثال اور پہیلیوں وغیرہ کے بارے میں بھی سوالات قائم کئے ہیں۔ اشعار کے ضمن میں یہ التزام رکھا ہے کہ ایک عربی، ایک فارسی کا شعر درج کیا جائے۔ اور ایک یا دو اردو کے ہوں اور پھر ایک یا دو ہندی کے

Marfat.com

امثال اور پہیلیوں کے تحت بھی یہ خصوصیت قائم رکھی ہے اور عربی، فارسی، اردو، اور ہندی کی امثال دی ہیں۔

اس قسم کی کتاب میں ضروری ہے کہ بہت سے مشکل الفاظ بھی استعمال کئے جائیں تاکہ طلبہ کے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ ہو۔ حقیقت نے ایسے تمام مشکل الفاظ کے معانی حواشی میں دیئے ہیں اور عربی اشعار کا فارسی میں ترجمہ بھی دیا ہے۔

اس کتاب کی حیثیت تعلیمی ہے۔ اس کے مطالعے سے عربی، فارسی، ہندی اور اردو کی استعداد میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ اس کی ادبی حیثیت یہ ہے کہ مصنف نے اس میں بہت سے اچھے اشعار جمع کر دیئے ہیں۔

صنم کدۂ چین سے ایک مثال ملاحظہ ہو۔

"صنم آمد از کجا ؟"

"از آذر بائیجان ."

"کجا می رود ؟"

"به اصفہان ."

"بر چہ سوار است ؟"

"اسپ."

"اسپ چہ پوشیدہ است ؟"

"اچکن ، اطلس."

"در دست چہ دارد ؟"

"انگشتری ."

Marfat.com

"چہ می خورد ؟"

"آتش انگور اندرسی ."

"چہ می نوشد ؟"

"آب ."

چہ می سراہے ؟"

" اوج ایمن ."

ہر اسم ، شعر ، ریختہ ، دوہا ، کبت ، مثل ، چیستاں اور پہیلی کا پہلا حرف الف سے شروع ہوتا ہے۔ پوری کتاب میں یہ التزام ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اس سلسلے میں چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ اس میں سب سے پہلے عربی شعر دیا گیا ہے۔ جو الف سے شروع ہوتا ہے۔ پھر اس کے ہم معنی فارسی ، ریختہ ، دوہرہ ، کبت وغیرہ دیئے گئے ہیں۔

(عربی) اَنْ لم امتَ یوم الوداعِ تاسفاً
لاتحبدانی المودۃ معسفاً !

(فارسی) او سخن از کشتن من میکنید
نہ من بمیس خوش نہ سخن میکنید

(ریختہ) اس طرف وہ ہاتھ سے دامن چھڑا جانے لگا
اس طرف چاک گریباں ہاتھ پھیلانے لگا (رقت)

(دوہرہ) انگ انگ پرت بینہ پہ درپن سے سب کات
دوہری تیہری جوہری پھوکن جانی جات

(کبت) آوت ہو پھر مون رہی نیت ایسے کھچایئں ناوک ہیں نہ پہنی نزادتر دیکی جبتک

Marfat.com

جب تک پوچھت ہی اگ گھائیں ہیں کہیو کسو کچھ بول جہہ کی پاؤں پری
اور سوسنہ دوا ین نہ لوٹ پری راگ تیں آنسو آنکھ کھولت ہی پنچھورہ کی نائیں

کدام شل ہم . دارد ؟ آری

عربی :- ! اجا القفا البصر (پارسی)

فارسی :- آمدن بارادت رفتن باجازت

ہندی :- ان نینن کا یہی لیکھ - وہ بھی دیکھا یہ بھی دیکھ

اس کتاب کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ حقیقت نے اس میں لاتعداد خوبصورت اور چھے ، اردو ، فارسی ، عربی اور ہندی اشعار یکجا کر دیئے ہیں ۔ اردو کے علاوہ فارسی عربی ، ہندی کے جو اشعار دیئے گئے ہیں یا ان زبانوں کی ضرب الامثال جہاں جہاں پیش کی گئی ہیں ۔

حقیقت نے ان کا اردو ترجمہ بھی ساتھ پیش کر دیا ہے ۔ اور مزید تشریحات حواشی میں دے دی ہیں جس سے کتاب کی افادیت میں اضافہ ہو گیا ہے ۔

Marfat.com

تحفۃ العجم

حسین شاہ حقیقت کی فارسی تالیف ہے جس میں فارسی زبان کے قواعد اور رموز و نکات پر بڑی نادر بحثیں کی گئی ہیں۔ برصغیر پاک و ہند کے مختلف کتب خانوں میں اس کے نسخے دستیاب ہیں۔ انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی کے کتب خانہ خاص میں اس کے نسخے موجود ہیں یہ بعض خط شکستہ میں لکھے گئے ہیں۔

حقیقت نے تحفۃ العجم نواب سعادت علی خان کے تخت پر بیٹھنے کے بعد تالیف کی جیناں چہ اس کا تذکرہ خود دیباچہ میں کیا گیا ہے اور اس کے مطابق اس کا سنہ تالیف ۱۲۱۲ھ ہجری ہے، اور کل تین ماہ کی مدت میں اختتام کو پہنچی۔ آغاز کتاب میں حمد و نعت کے بعد یہ عبارت درج ہے:

"۔۔۔ بعد می گوید بندہ سراسر گنہگار رامی برحمت رب غفار جامع این عبارات سید حسین شاہ المتخلص بہ حقیقت عفی اللہ تعالیٰ عن سیاتہ وضاعف ثواب حسناتہ کہ از مدت مذکور خاطر نیاز ماثر بود کہ نسخہ مفید درغایت ایضاح ونہایت اختصار در قواعد فارسی کہ بہترین السنہ است با فوائد دیگر ہیچوں کہ مبتدیان را بکار آید و منتہیان را ضیافت طبع نماید تالیف کردہ یادگارے در روزگار ناپایدار گزارد الحق بیت یادگاری کہ آدمی زاد است سخن است و دگر ہمہ باد است۔ للہ الحمد والمنہ کہ شاہد این تمنا در ایام بشاشت التیام یعنی بعد از مرافقت لکھنو کہ عبارت از عزل نواب وزیر علی خان و نصب نواب

سعادت علی خان روز یکشنبہ بتاریخ بست وہفتم شوال المکرم سنہ یکہزار و دوصد و دوازدہ ہجریہ نبویہ شروع آراستگی نمودہ در عرصہ سہ ماہ سلخ محرم الحرام سنہ سیزدہ بہ زیور اختتام وحلیہ انصرام نقشگیر و صورت پذیر شد و باللہ التوفیق ۔

اہم مباحث :

تقسیم کلام، نظم و نثر و بیان، اقسام کلمہ، حروف کا تفرقہ۔ ان لفظوں کا بیان جن سے کلام میں حسن و فصاحت پیدا ہوتی ہے۔ اسماء افعال، منقوطہ و غیر منقوطہ کی بحثیں، مضارع کی بحث۔ اسمائے مرکبہ۔ اقسام جملہ، تلفظ کی بحث، منفصلات اور مباحث کی بحث۔

ان بحثوں اور قواعد کی افادیت کے علاوہ 'تحفۃ العجم' میں اور بھی بہت سی مفید بحثیں ہیں۔ اکثر شہروں کے نئے پرانے نام اور ان کی وجہ تسمیہ بیان کی گئی ہیں۔ جیسے 'نہاوند' کے متعلق لکھا ہے کہ اصل میں 'آباد' میں 'نوح' اور 'ند' تھا جو نوح یا ان کی قوم کے کچھ لوگوں نے آباد کیا تھا۔ جو بعد میں نہاوند ہو گیا وغیرہ وغیرہ۔

سند میں ہندی شاعروں کے اشعار بھی پیش کیے گئے ہیں اور ساتھ شاعروں کے نام بھی درج ہیں اسی طرح بعض ایسے شاعر بھی نظر آتے ہیں جو تراجم تذکروں میں موجود نہیں یا اگر موجود ہیں تو شاذ کا حکم رکھتے ہیں۔[1]

---

[1] یہاں تحفۃ العجم کا اجمالی تعارف مقصود تھا اسی لیے تفصیلی بحث نہیں کی گئی اور اس لیے بھی کہ میرے چھوٹے بھائی سید سعید احمد اس کی ترتیب و تدوین میں مصروف ہیں۔ کئی نسخے رکھ کر متن تیار کیا ہے۔ تعلیقات و حواشی اور قواعد و بیان کی دوسری کتابوں کے تقابل کا کام باقی ہے۔

Marfat.com

دیوانِ حقیقت

شاہ حسین حقیقت ممتاز شعرا میں سے تھے۔ ان کا دیوان کبھی شائع نہ ہو سکا۔ ان کے کلام کا ایک مجموعہ، جو غالباً دیوان کا انتخاب ہے، قلمی صورت میں انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی کے کتب خانہ خاص میں موجود ہے۔ اس کا کتب خانہ نمبر ق ۳/ ۱۵۶ سائز ۲۱ x ۱۵ ہے، اوراق پچاس ہیں۔ اور ہر صفحے میں گیارہ سطریں ہیں۔

یہ نسخہ مصنف کی زندگی کا معلوم ہوتا ہے۔ اس کا سنہ کتابت ۱۲۴۹ھ مطابق ۴-۱۸۳۳ء ہے۔ یہ خط نستعلیق مائل بہ شکستہ میں لکھا ہوا ہے۔ اور اس کا کاغذ دبیز، چکنا اور سفید ہے۔ تمام مقطعوں میں تخلص پر سرخ روشنائی سے تخلص کی علامت بنائی گئی ہے۔ عنوانات بھی سرخ ہیں۔ متن ورق ۱ ب سے شروع ہوتا ہے، اور ۵۰ الف پر ختم۔ ورق ۱ الف اور ۵۰ ب سادہ ہیں:

مندرجات: ۱۔ ورق ۱ ب مطلع (چھ عدد)

۲۔ ورق ۲ الف تا ۲ ب ملمع غزل حافظ شیرازی (اس میں حافظ کی مشہور غزل کے مصرعوں پر اردو کے مصرعے لگائے گئے ہیں۔ مثلاً

لانے میں اس صنم کے جاتا ہے کیا تمہارا	دل میرود ز دستم صاحبدلاں خدا را
گر درد دل کا میرے کیجے گا کچھ نہ چارا	دردا کہ رازِ پنہاں خواہد شد آشکارا

Marfat.com

۳۔ ورق ۲ ب تا ۳۹ الف غزلیات (تعداد اشعار ۴۳۴)
۴۔ ورق ۳ الف تا ۴۱ ب مخمسات (مخمس دو ہیں۔ پہلا جرأت کی غزل
پر جس کا مطلع یہ ہے ؎

کل جو بیٹھا پاس میں یک جا تیرے ہم نام کے
رہ گیا بس نام سنتے ہی کلیجہ تھام کے

دوسرا انبس کی غزل پر ہے جس کا مطلع یہ ہے ؎

دل سے مطلب نہ کام جی سے ہے
مدّعا یار کی خوشی سے ہے

یہ حقیقت کا مکمل دیوان نہیں ہے۔ اور نہ ان کا اپنا مرتبہ انتخاب معلوم ہوتا ہے، بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی اور نے ان کے دیوان کا انتخاب کیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ت اور ی کی ردیفوں کے سوا تمام ردیفوں میں ایک ایک دو دو غزلیں ہیں۔ ردیف الف میں ایک بھی مکمل غزل نہیں ہے۔ تذکروں میں حقیقت کے جو اشعار ملتے ہیں وہ اس دیوان میں نہیں ہیں۔ مثلاً خمخانہ جاوید (دوم ص ۴۹۱-۲) میں جو آٹھ اشعار ہیں وہ دیوان میں موجود نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ سخن شعراء، تذکرہ ہندی، اور سراپا سخن میں مندرج حقیقت کے بہت سے اشعار اس دیوان میں موجود نہیں ہیں

حقیقت کی شاعری دبستان لکھنؤ کی روایتی شاعری سے الگ نہیں ہے۔ البتہ شاعرانہ صنعتوں کے استعمال کا وہ شوق ان کی شاعری میں کار فرما نظر نہیں آتا جس نے لکھنوی شاعری کے معتدبہ حصے کو چیستان بنا کر رکھ دیا ہے اور شاعری کی

Marfat.com

اصل روح، سلاست، علوئے تخیل اور اثر آفرینی کی خوبیاں اس لفظی بازی گری کے سبب رخصت ہوگئیں۔

جس طرح حقیقت کی مثنویوں میں ان کا خاص انداز نظر آتا ہے۔ اسی طرح غزل گوئی میں بھی وہ بڑی حد تک منفرد نظر آتے ہیں۔ انھیں کوئی بڑا اور عہد آفریں شاعر تو نہیں کہا جاسکتا۔ وہ اپنے استاد جرأت کے مقابلے میں بھی کم درجے کے شاعر نظر آتے ہیں۔ جرأت کی شاعری کو چوما چاٹی کی شاعری کہا جاتا ہے۔ اور اس میں جنسی ہیجان اور لذت پرستی کی کیفیت ملتی ہے۔ حقیقت کے ہاں یہ کیفیت ناپید ہے۔ جرأت کی شاعری کی ایک بڑی خوبی ان کی زبان کی سلاست اور روانی وصفائی ہے۔ حقیقت اس معاملے میں کسی حد تک اپنے استاد کی کامیاب پیروی کرتے نظر آتے ہیں۔

لکھنوی زندگی کے تہذیبی اور مجلسی اثرات کی کارفرمائی حقیقت کی شاعری میں نظر نہیں آتی۔ اس کا سبب ایک تو یہ ہے کہ ان کی زندگی کا بڑا حصہ لکھنؤ سے باہر گذرا۔ دوسرے ان کی طبیعت کے ثقہ پن یا ان کے اندر پنہاں سید زادے نے انھیں اظہار عشق کے اس انداز سے روکا ہے۔ میر تقی میر کی طرح وہ کوچہ عشق کی رسوائیوں کو مول لینے کے لیے آمادہ نظر نہیں آتے۔ جس سے دل کی وہ آگ جنم لیتی ہے جو میر جیسے شاعروں کی شخصیت کو آب و تاب بخشتی ہے حقیقت کی شاعری میں ہمیں ان کی شخصیت دولخت نظر آتی ہے۔ ان کے ہاں عشق میں رہ و رسم دنیا کی پاسداری زیادہ نظر آتی ہے۔ اور عشق کے اظہار میں ان کے اندر پنہاں "معزز فرد" اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ عشق ان کے لیے وجہ رسوائی بن جائے اور بہت نہ سہی تو کم از کم لکھنوی معیار کی پرجوش عاشقانہ شاعری ہی تخلیق ہوسکے۔

حقیقت کے ہاں ہمیں ایسے اشعار بھی مل جاتے ہیں۔ جن میں محبوب کو رام کرنے کے

Marfat.com

لیے تسخیر کے عملیات کا ذکر ہے۔تعویذ گنڈوں کا تذکرہ انکے بھائی سید حسن شاہ ضبط کے اول نشتر میں بھی پایا جاتا ہے۔ اردو شاعری میں عشاق اپنے محبوب کو رام کرنے کے لیے صرف جذبہ صادق کو کام میں لاتے ہیں۔ بظاہر حقیقت کی شاعری میں اس رجحان یا رویے کے ... تاہم یہ ... کہہ سکتے ہیں کہ اس زمانے کے زوال آمادہ معاشرے میں اس نوع کے توہمات عام تھے۔

ممکن ہے حقیقت اپنے خاندانی ماحول سے متاثر ہوئے ہوں۔ ان کے خاندان میں روحانیات کا عمل دخل بہت تھا۔ اور تعویذ گنڈوں اور عملیات کے سلسلے میں اکثر لوگ ان کے اہل خاندان سے رجوع کرتے تھے :

چند اس قسم کے اشعار ملاحظہ ہوں :

اک تو نگاہ میں اس کے ہے جادو حقیقت اور
تسخیر کا کرے ہے عمل یک نشد دو شد

کیسے کیا کیا نہ عمل ہم نے ولیکن اس کا
اپنے دل سے نہیں ملتا کسی تدبیر سے دل

ایک پوری غزل میں تسخیر اور مختلف عملیات کا تذکرہ موجود ہے۔

عمل اب ایسا کرتے ہو جو تم میں مجھ میں تعشق پڑے
گھول ... یا حب کے تعویذ پلائے جاتے تھے۔

اب تو ہیں رنجش کی باتیں یا میرے ہی ملنے کو آہ

نذریں مانی جاتی تھیں اور پیر منائے جاتے تھے

لہ کرم خوردہ۔

مرے جدا ہونے کی بابت پوچھتے ہو یہ ہمن سے
یا ملنے کے رمّالوں سے قرعے پھنکائے جاتے تھے

مری بدی کا نقش ہے دل پہ یا تب میرے ملنے کو
لکھ لکھ کر دریاؤں میں تعویذ بہائے جاتے"

حقیقت کی شاعری میں بہت کم ایسے اشعار ملتے ہیں جن میں کسی نوع کا فلسفیانہ یا فکر انگیز خیال بیان کیا گیا ہو۔ خال خال ایسے اشعار مل جاتے ہیں لیکن ان میں بہت زیادہ فلسفیانہ گہرائی نہیں پائی جاتی۔

عدم ہیں میں سوتا تھا آرام سے ۔۔۔ عبث زندگی نے جگایا مجھے

حقیقت کی شاعری میں بعض ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جو دامن کش دل ہوتے ہیں:

نخل تن سرو چراغاں کی طرح جلتا ہے ۔۔۔ نہ لگا کوئی ثمر آہ شجر میں میرے

ٹک دکھا اے مہروش مکھڑا کہ تیرے ہجر میں ۔۔۔ تعب گریہ سے ہے تر دامان چشم آئینہ

چمن دل کی مرے تو بھی تو کر سیر فدا ۔۔۔ روز یک رنگ کا یاں پھول کھلا رہتا ہے

"رقیب" اردو شاعری کا ایک ایسا کردار ہے جسے ہمارے شاعروں نے ہر ممکن تضحیک و تحقیر کا ہدف بنایا ہے۔ حقیقت بھی اپنے رقیب کو "کمینہ" کہہ کر دل کی بھڑاس نکالتے ہیں

دیکھ محفل میں اپنی تم صاحب ۔۔۔ نہ بلاؤ ہر اک کمینے کو

دراصل رقیب کا خوف، عاشق میں خود اعتمادی کی کمی کا مظہر ہے۔ ورنہ جن کے ہاں عشق کی جڑیں زیادہ

Marfat.com

کبھی ہیں ان کے انداز میں رقیب کے حوالے سے انسان دوستی کا جذبہ پیدا ہو گیا ہے۔ مومن کہتا ہے

سامنے اس کے نہ کہتے مگر اب کہتے ہیں　　　لذت عشق گئی غیر کے مر جانے سے

ہماری جدید شاعری میں تو رقیب کے لیے جن جذبات کا اظہار کیا گیا ہے۔ اس میں "غم الفت کے مشترکہ احسان" کو مد نظر رکھا گیا ہے فیض کی نظم "رقیب سے" کا موضوع سب پر عیاں ہے محبوب کے حوالے سے ہر چیز سے محبت کا اظہار جس میں خود رقیب بھی شامل ہے، احمد ندیم قاسمی کے اس شعر میں ملاحظہ ہو ؎

میرا دشمن بھی مرے پیار کا حقدار بنا　　　تجھ سے کی ہے کہ زمانے سے محبت میں نے

غالب محبوب کی محفل میں رقیب کے آنے سے ناخوش ہے مگر ایک خاص سطح پر رہتے ہوئے کہتا ہے ؎

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو　　　مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

اسی مفہوم کا شعر محشر بدایونی کے ہاں بھی ملتا ہے ؎

جیسے ہم آتے ہیں محفل میں سبھی آیا کریں　　　لیکن اے جان کرم جب ہم چلے جایا کریں

فن اور بالخصوص فن شاعری اور ادبیات میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ فنکار اپنی بات کو کس پیرائے میں بیان کرتا ہے یہی بات اس کا فن کارانہ درجہ متعین کرتی ہے حقیقت کے ہاں بات بیان کرنے کا بہت خوب صورت انداز کمیاب نہیں۔ ان کا ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

تو جو عشاق پہ کرتا ہے جفا اے کافر　　　کچھ خدا کا بھی تجھے خوف خطر ہے کہ نہیں

خواجہ میر درد کے ہاں اسی مضمون کا شعر اپنی سادگی اور بے ساختگی کی بنا پہ ایک جداگانہ اثر آفرینی کا حامل ہے ؎

کتنے بندوں کو جان سے کھویا　　　کچھ خدا کا بھی تو نے ڈر نہ کیا

Marfat.com

شاعروں نے اس مضمون کو اکثر باندھا ہے کہ وصل کی شب میں بھی ہجر کا خیال، الذ وصل کو متاثر کرتا ہے۔ حقیقت کے ہاں اس خیال کو اس انداز میں باندھا گیا ہے۔ ؎

ہجر میں تو وصل کا رہتا ہے مجھکو دھیان آہ　　وصل ہوتا ہے تو صدمہ ہجر کا یاد آئے ہے

حقیقت کا ایک اور شعر ہے ؎

عجب وقت پہ اس کا آنا ہوا ہے
کہ جی تن سے جس دم روانہ ہوا ہے

اسی خیال کو ایک اور شاعر نے اس طرح بیان کیا ہے :

منہ گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں ہے ہے
یار لائے مرے بالیں پہ اسے پر کس وقت

حقیقت کے ہاں بعض غزلیں سہل ممتنع کی اچھی مثال ہیں ؎

دن کو نالہ ہے شب کو زاری ہے　　روز و شب ہم کو بے قراری ہے
بات کرنی جو ترک کی ہم سے　　کہیے تقصیر کیا ہماری ہے
اور کچھ ذکر خوش نہیں آتا　　نام تیرا زباں پہ جاری ہے
رات بھر خواب کا خیال کہاں　　چشم تر ہے اور اشک باری ہے

حقیقت کے دیوان کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کسی شوخ بنگالی محبوب سے بھی تعلق خاطر رکھتے تھے ؎

اسے حقیقت گر طلب کرتا ہوں بوسہ اس سے میں
کیا مزے سے دے ہے گالی شوخ بنگالی مجھے

ان کے دیوان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ مدراس کی کسی طوائف زینت بائی پر بھی

Marfat.com

عاشق تھے۔ ان کے دیوان میں کئی جگہ مختلف غزلوں میں ایسے اشعار ملتے ہیں۔ مثلاً

حقیقت کیا کہیں ہم اور اپنی
یہ دل ہیں تجھ پہ زینت جان عاشق

انھوں نے ایک غزل نما نظم بھی زینت بائی کے نام لکھی تھی۔ شاعرانہ محاسن کے علاوہ اسکی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اسے اردو کی پہلی عشقیہ نظم قرار دیا جاسکتا ہے۔ نظم ملاحظہ ہو:

در توصیف رقص زینت بائی

یارا بزم میں گر آکے وہ زینت ناچے
رقص میں زہرۂ فلک زسر دواں گت ناچے

آکے رقصندہ و بخشندۂ راحت ہو جہاں
ہو تجمل بہ پر تو تہ واں بخشی و دولت ناچے

گانے اور باجنے والی جو ہیں سب پکڑیں کان
گا لڑیا کے جو دو کان سماعت ناچے

مشتری زہرا و خور اوسکے ہوں اونھیں بخدا
وہ بت ماہ جبیں جب کہ بہ شوکت ناچے

ہو نہ شرفوکو شرف گھسٹی ہی پھرے
منہ ہے کیا روبرو آ اوس کے جو عورت ناچے

ہاتھ اٹھاویں وہیں جینے سے قیامت ہو بپا
ہاتھ اٹھا سر پہ جو وہ خوش قد و قامت ناچے

پائے کوہاں نکل آوے سبھی اور دست ختاں
گرد وہ عشاق کے آ بہ سر تربت ناچے

شکر و مصری و میٹھا کا ہو نا پھیکا
بے نمک ہو جو حضور اوس کے ملاحت ناچے

دیکھے اوس بت کو جو رقصاں تو وہیں وجد میں آ
پیر اور شیخ بہ ایں فضل و مشیخت ناچے

ناچ عشاق کو جو جو وہ نچاوے ہے بجا
جو بایں شوخی و شنگی و شرارت ناچے

ہو کے جنگل کو نکل جائے دیوانے جنگلو
گا کے جنگلا وہ پری چہرہ اگر گت ناچے

جس کی رفتار ہی سے ہو تہ و بالا عالم
یہ قیامت جو وہ ٹک خوش قد و قامت ناچے

Marfat.com

منہ ہٹا کیوں کہ نہ اندر کی سبھا ہو روپوش — جب وہ سنگیت لیے سات کی سنگت ناچے

جان دل جانے کی کیا ناک ہے کیا .... — سامنے اس کے اچی کس کی ہے قدرت ناچے

ناچنے گانے کا لونی فلک چھیڑے خیال — ایک دو ٹپے ہی گر گا کے وہ دھرپت ناچے

واں کی کچھ اور ہی بس زینت و زیبائش ہو — فی الحقیقت ہے جہاں اُن کے زینت ناچے

اوس سی سر پہ ہو جو یہ گوڑ تو مجرا ہیں کیوں — ناچ کر زہرہ اٹھا دے گی خجالت ناچے

ناچ آتا نہیں آنگن کو کہے ہے ٹیڑھا — اس سے بہتر ہے یہی کر کے نہ سبقت ناچے

وجد میں کیوں کہ نہ آجاوے وہ بے خود ہو کر
جبکہ زینت سی صنم پیش حقیقت ناچے

انتخاب اشعار :

ثابت اب جوش جنوں سے کب ہے پیراہن مرا — رفتہ رفتہ کر دیا وحشت نے عریاں تن مرا

یہ تو فرما دو کہ ہوں ایسا میں کیا بد نظرا — دیکھ مجھ کو جو چھپاتے ہو بدن خال سے خوب

دل کو میرے کیا جا کے خراب — سوزش عشق کا ہو خانہ خراب

اور ہی کچھ حقیقت آئی نظر — کھولی جب آنکھ ہم نے مثل حباب

دو دمیں اس کے جو ہے عشق کا آزار بہت — ہر گلی کوچے نظر آتے ہیں بیمار بہت

ناصحا سایہ طوبیٰ کی نہ دے تو ترغیب — ہے مجھے یار کا ہی سایہ دیوار بہت

کچھ نہ کچھ چوٹ لگی دل کو بھی اس کے شاید — درد کے جیسے وہ اب سنتا ہے اشعار بہت

تصویر وہ بھی پہروں رکھتا نظر کے آگے — بہزاد کھینچتا گر اس بے وفا کی صورت

تیرے بن اترے مرے حلق سے یوں آب حیات — بصد اکراہ پیے جوں کوئی جلاب کے گھونٹ

Marfat.com

لی آہ کے ساتھ جان نکل یک نشد دو شد — اب ہے زبان پہ یہ مثل یک نشد دو شد

پیغام یار کا نہیں آتا تھا تس پہ آہ — آیا ہمیں پیام اجل یک نشد دو شد

گر حسن صبر لے کے چلا ہے تو میری جان — دل کو بھی رکھ لے زیر بغل یک نشد دو شد

اک تو نگاہ میں اس کے ہے جادو حقیقت اور — تسخیر کا کرے ہے عمل یک نشد دو شد

نکلے گا آفتاب تو اے ماہ جا یو — گھبرا کے ایسے وقت سحر تم چلے کدھر

سمجھو نہ گرد باد کہ یہ خاک قیس ہے — رقصاں صدائے ناقہ لیلیٰ ہے رنگ پر

فلک نے جور و ستم درد و غم دکھایا پھر — یہ اس کمینے نے دیکھو کہ سر اٹھایا پھر

جو کشور دل وصل سے آباد تھا دن رات — اوس بن نظر آتا ہے وہ برباد شب و روز

جو شخص گرفتار محبت ہے حقیقت — دنیا کے غموں سے ہے وہ آزاد شب و روز

ٹکڑے جو گریبان کیا گل نے کہا بس — رویا جو غم عشق میں بلبل نے کہا بس

سب دل سے بھلا دیجیے وے عشق بتاں آہ — ہم سے نہیں ہوتا کسی عنوان فراموش

میں جس کے ہاتھ اسے بھیجتا ہوں نامۂ شوق — وہ لے کے پر نہیں جاتا مرا [illegible] یار د خط

اب حقیقت کے جو ہے اک صاحب جرات سے عشق
شعر کا چرچا ہے اوس کے گھر کے گھر چاروں طرف

نہ کیوں کر تجھ پہ وارے جان عاشق — اسی لائق ہے تو قربان عاشق

قیامت کرتے ہیں گے حشر برپا — تری قامت کا کر کر دھیان عاشق

حقیقت کیا کہیں ہم اور اپنی — بدل ہیں تجھ پہ زینت جان عاشق

تمہاری یاد میں ہے رات دن ہمارا دل — ہمیں بھی یاد کرے ہے کبھی تمہارا دل

آپ اٹھ جاؤ کہو غیر سے تم اس کو اٹھاؤ — خوش نہیں ہونے کا اس آپ کی تدبیر سے دل

Marfat.com

ہم کو میخانے میں ہے ساقی گل فام سے کام
نہ غرض بادہ سے : مینا سے نہ کچھ جام سے کام

نہیں ہے تجھ سا کوئی آج گل عذاروں میں
خدا گواہ ہے تو ایک ہے ہزاروں میں

غم یار میں اشک گر ہم بہا دیں
تو یکدم میں دونوں جہاں کو ڈبو دیں

تصور تیرا جان جاتا نہیں
ترے بن کوئی یاد آتا نہیں

پھرے ہے تری شکل آنکھوں تلے
تصور ذرا تیرا جاتا نہیں

کونسی ہے وہ سحر جس کے تئیں شام نہیں
پہ شب ہجر کے آغاز کا انجام نہیں

اوس کا خط لایا ہے قاصد پہ کروں جان نثار
اور اس کام کے لائق کوئی انعام نہیں

وہ اپنے گھر میں بیکل ہم مضطر اپنے گھر میں
اب وہ بلانے والے کیا جانیے کدھر ہیں

گر موسم گل آیا تو کیا کریں صبا ہم
مژدہ یہ دے تو اون کو رکھتے جو بال و پر ہیں

برنگ موج دریا اضطراب دل کے مارے اب
چلے جاتے ہیں کیا جانے کدھر ہم بے قراری میں

حقیقت اب بقول استاد جرات اور کیا کہیے
کہ سب کچھ ہم بھلا بیٹھے کسی کی یادگاری میں

کس کے ہیں انتظار میں آنکھیں
جو کھلیں ہیں مزار میں آنکھیں

جو صورتیں تمھاری آنکھوں میں بستیاں ہیں
دیدار کو انھوں کے آنکھیں ترستیاں ہیں

خاک ہو جاوے تو جاہل سے نہ چھوٹے اس کا بل
گو کہ جل جاتی ہے رسّی پہ کہیں بل جائے ہے

ہجر میں تو وصل کا رہتا ہے مجھ کو دھیان آہ
وصل ہوتا ہے تو صدمہ ہجر کا یاد آئے ہے

کچھ حقیقت کو جو یاد آتا ہے جرات کی طرح
بس وہیں دو دو پہر چپ سی کچھ لگ جائے ہے

صورت اس کی مجھے پھر شکل سے دکھلائے کوئی
مجھ کو لے جائے کوئی یا اوسے لے آئے کوئی

سب سے بیگانہ ہوا میں تری خاطر پیارے
مجھ سا جب ہوئے تو عاشق تیرا کہلائے کوئی

Marfat.com

اک غزل اور بھی حقیقت پڑھ دیکھیں مضمون کیا تو لاتا ہے

کے نزع میں بالیں پہ وہ ذرا پھر جائے تو بھی اُلٹوں مری آئی ہوئی قضا پھر جائے

کھینچے ہوئے ہے تیغ نگہہ ترک چشم ناز اب جنس دل کا اس سے بچانا محال ہے

بات کرنی جو ترک کی ہم سے کہیے تقصیر کیا ہماری ہے

رات بھر خواب کا خیال کہاں چشم تر ہے اور اشک باری ہے

حقیقت میں ہے اور عاشق کا مذہب نہ یہ رافضی ہے نہ یہ چار یاری

ں مرے تن سے نکل جائے تو ہے مجھ کو قبول آہ پہ دل سے نہ اوس تیر کا پیکان نکلے

نئے معشوق میں برگشتہ ہوں عاشق اون سے شہر میں سیر کو جب وہ مہ خوباں نکلے

قیامت سایہ طوبیٰ کی مجھے دے ترغیب یار کا سایہ دیوار ہے درکار مجھے

لیچے کھینچا ہی کرتا اوس کے ملنے کے سدا گر سکھا دیتا کوئی تھوڑی سی رنالی مجھے

اے حقیقت گر طلب کرتا ہوں بوسہ اوس سے میں
کیا مزے سے دے ہے گالی شوخ بنگالی مجھے

Marfat.com

تذکرۂ احبا

- شاہ حسین حقیقت نے اس زمانے کی روش کے مطابق اردو شاعروں کا ایک تذکرہ بھی ترتیب دیا تھا بعض لوگوں کو شاید خیال ہو کہ یہ تذکرہ وہی ہوگا جس کا ذکر مصحفی نے کیا ہے اور حقیقت کو اپنے تذکرے کا چور کہا ہے ہم حقیقت کے حالات زندگی میں یہ دلائل بیان کر آئے ہیں کہ انہوں نے مصحفی کے تذکرے کی نقل شیخ امام بخش کشمیری کی فرمائش پہ تیار کی تھی ۔ اور حقیقت کی عمر اس وقت سترہ برس سے زائد نہ تھی ۔

تذکرۂ احبا کو مصحفی کے تذکرے کا چربہ نہیں قرار دیا جا سکتا جیسا کہ عام طور پہ مشہور ہو گیا ہے بلکہ یہ ایک جداگانہ تذکرہ ہے ۔ حقیقت جیسے صاحب عالم اور کثیر التعداد مصنف پہ کسی تذکرے کے چربے کا الزام لگانا درست معلوم نہیں ہوتا ۔

لیکن اس وقت تذکرۂ احبا کا کوئی قلمی نسخہ موجود نہیں ہے جس سے بظاہر اس کا وجود ثابت کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے ۔ البتہ مختلف تذکروں میں اس کے حوالے ملتے ہیں ۔ چنانچہ محسن لکھنوی نے اپنے تذکرے سراپا سخن میں اس کا کئی مقامات پہ تذکرہ کیا ہے ۔

خوش معرکۂ زیبا میں سعادت خاں ناصر نے بھی لکھا ہے کہ اس نے تذکرہ احبا سے استفادہ کیا ہے ۔ اس کے علاوہ عبداللہ ضیغم کے تذکرے یادگار ضیغم کے قلمی نسخے مملوکہ ادارۂ ادبیات اردو حیدر آباد دکن میں بھی تذکرۂ احبا کا حوالہ ملتا ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس صدی کے اوائل تک یہ تذکرہ موجود تھا ۔

Marfat.com

شاہ حسن ضبط

حالاتِ زندگی[1]

شاہ حسن ضبط، شاہ حسین حقیقت کے بڑے بھائی تھے۔ ضبط آنولہ بریلی میں ۱۱۸۳ ہجری مطابق ۱۷۷۰ سنہ عیسوی میں پیدا ہوئے۔ حقیقت نے ان تصانیف میں اپنے اہلِ خاندان کے بارے میں نہایت مختصر اشارات کئے ہیں۔ یہ ضبط کا ناول نشتری ہے جس سے ضبط اور حقیقت دونوں بھائیوں کے اجداد کے حالات اور ترکستان سے ہندوستان میں آمد اور پھر مختلف اضلاع ہندوستان میں قیام کرتے ہوئے مستقلاً آنولہ بریلی اور لکھنؤ میں قیام پذیر ہوتے تک حالات ملتے ہیں۔

ضبط کے نانا آنولہ بریلی کے ایک مشہور اور باعزت آدمی تھے۔ جو کسی زمانے میں حافظ رحمت خاں کے لڑکے کی سرکار سے بھی وابستہ رہ چکے تھے۔ اور بعد میں منگ نامی ایک انگریز سے وابستہ ہوئے تھے۔ انھوں نے ہی ان دونوں بھائیوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت کی تھی۔

شاہ حسن ضبط لکھتے ہیں۔

"بعد خرابی و تباہی حکومت ہندوستان، میرے نانا صاحب، مسٹر منگ صاحب ممبر کونسل کیمپ کانپور کی سرکار میں جو ہمشیر زادہ جنرل کورٹ کے تھے اور

---

[1] شاہ حسین حقیقت کے حالات زندگی، خاندان، پیدائش، ترکِ وطن اور ہندوستان کے مختلف اضلاع میں ان کے خاندان کے قیام کے بارے میں تفصیلی طور پر تذکرہ آچکا ہے لہذا یہاں صرف وہی حالات پیش کئے جا رہے ہیں جن کا تعلق براہِ راست شاہ حسن ضبط کی نجی زندگی سے ہے۔

Marfat.com

یہ جنرل صاحب ایک عالی مرتبت انگریز تھے۔ عہدہ منشی گری پر مامور ہوئے تھے۔[۱]
ضبط کے بیان سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ مسٹر منگ ،ان کے نانا سے پڑھتا تھا! کیا پڑھتا تھا اس کی وضاحت، انھوں نے نہیں کی صرف اتنا لکھا ہے کہ کلکتہ کے سفر سے واپسی کے بعد اس نے ضبط کے نانا سے پڑھنا چھوڑ دیا تھا۔ چونکہ اس زمانے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے تمام اہلکاروں کے لئے مقامی زبانیں سیکھنا لازمی تھیں اور صاحب استطاعت اور بڑے درجے کے انگریز یہ زبانیں سیکھنے کے لئے استادوں کو ذاتی ملازم کی حیثیت سے رکھ لیتے تھے۔ لہذا قیاس یہی کہتا ہے کہ ضبط کے نانا، منگ کو ہندوستانی اور فارسی زبانوں کی تعلیم دیتے ہوں گے۔
منگ کو جب اپنی سرکاری اور نجی مصروفیات کی بناء پر ذاتی تجارتی کاموں کی طرف توجہ دینے میں مشکلات ہوئیں تو اس نے حکیم میر محمد نواز کو اپنے کاروبار کی نگرانی کی خدمت بھی سونپنا چاہی لیکن انھوں نے اس نئی خدمت سے معذوری کا اظہار کیا۔ اور اس سلسلے میں اپنے نواسے شاہ حسن ضبط کا نام تجویز کیا۔ منگ نے حکیم صاحب موصوف کی اس تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے شاہ حسن ضبط کو اپنے کاروبار کی نگرانی کے لئے ملازم رکھ لیا۔ ضبط لکھتے ہیں کہ "اس وقت میری عمر پندرہ سولہ برس تھی"[۲]۔ گویا شاہ حسن ضبط نے ۱۷۸۵ سنہ عیسوی کے لگ بھگ یہ ملازمت اختیار کی۔

ضبط کے بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ منگ کے ہاں زمانۂ ملازمت کے دوران انھیں کبھی تنگدستی سے سابقہ نہیں پڑا اور وہ ہمیشہ خوشحال رہے۔ معاشی معاملات میں منگ نے انھیں سیاہ و سفید کا مالک بنا رکھا تھا۔ عموماً آقاؤں کی نظر میں ان کے جو ملازمین اپنا اعتبار جما لیتے ہیں۔ انھیں دوسرے ملازمین کے حسد اور شکوہ، شکایتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ منگ

---

(۱)۔ نسخہ ص۹ ترجمہ انجم حسین کمسنڈری مرتبہ عشرت رحمانی مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور (۲) نسخہ ص۹

Marfat.com

کے دیگر ملازمین بھی شاہ حسن ضبط کے مقام و مرتبے اور منگ کے مزاج میں ان کے دخیل ہونے کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے۔ لیکن منگ کو ان پر کلی اعتماد تھا۔ اور وہ اپنے منشی ضبط کے خلاف کسی کی لگائی بجھائی پر یقین نہیں کرتا تھا۔

دیکھنے میں آیا ہے کہ لوگ عورتوں کے بہکانے میں جلد آجاتے ہیں۔ لیکن منگ اس سلسلے میں بھی کانوں کا کچا نہیں تھا۔ چنانچہ ضبط نے منگ کی ایک ہندوستانی داشتہ کا واقعہ اپنے ناول کے دیباچے میں لکھا ہے جو ضبط کی دشمن تھی اور اس کو منشی گری کے عہدے سے موقوف کرا کر اپنے بھائی کو ملازم رکھوانا چاہتی تھی۔ ضبط لکھتے ہیں۔

"ایک دن اس کی داشتہ عورت نے جو ایک فرخ آبادی پٹھان کی بیٹی تھی۔ میری چغلی صاحب سے کھائی کہ تمہارا منشی سلاماًل غبن کرتا ہے۔ اگر آپ کی مرضی ہو میرا بھائی جو نہایت لائق ہے۔ اس کے سپرد یہ کارخانہ کرایا جائے، جس سے بڑی کفایت ہوگی۔ صاحب نے اس کو تو کچھ جواب نہ دیا اور کمرے کے باہر آکر مجھ سے کہا کہ آج ہماری بی بی آپ کی اس طرح سفارش کرتی تھی۔ میں نے کہا "بالکل سچ کہتی ہے میں آپ کا خیر خواہ ہوں۔ جس بات میں آپ کی کفایت اور بہبود ہو مجھے بدل و جان منظور ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی میں نے کنجیاں صاحب کے سامنے میز پر رکھ دیں اور کہا کہ مجھے اب زیادہ آپ کے پاس رہنا منظور نہیں ہے۔ کب تک حاسدوں کا نشانہ ملامت رہوں" صاحب پہلے تو چپ رہا پھر فرمایا کہ اچھا اس وقت کنجیاں اپنے پاس رکھنے میں پھر سے لوں گا۔ میں خوش ہوا کہ اس بلا سے نجات ملی۔ دوسرے دن صاحب نے اس عورت کو نکلوا دیا۔ میں نے سنتے ہی صاحب سے جا کر سفارش کی۔ مگر اس نے

Marfat.com

ہرگز قبول نہ کیا۔ تب میں نے کہا کہ "خیر اگر آپ اس کو نکالتے ہیں آپ کو اختیار ہے مگر میں بھی نہ رہوں گا۔ مجھے بھی رخصت کیجیے۔ صاحب نے کہا تم کیسی باتیں کرتے ہو۔ وہ تمھاری دشمن ہے۔ میں نے کہا ہوا کرے۔ اگر آپ مہربان ہیں تو کسی کی دشمنی ضرر نہیں پہنچا سکتی۔ ناچار صاحب نے پھر اس کو بلوالیا[1]۔"

ضبط کے حالات زندگی کا واحد ماخذ ان کا ناول نشتر ہی ہے۔ ضبط نے اس ناول کو آسان فارسی زبان میں لکھا تھا اور اس کا اصل نام "قصہ حسن و عشق" تھا۔ لیکن اردو دنیا میں یہ "نشتر" کے نام سے معروف ہوا۔ یہ نام منشی سجاد حسین انجم کسمنڈوی نے رکھا تھا۔ جو اس ناول کے مترجم بھی ہیں۔ اور جن کے پاس اس کا اصل فارسی نسخہ موجود تھا۔

ضبط کے چھوٹے بھائی حقیقت نے اپنی کسی بھی تالیف میں اپنے اور اپنے آباؤ اجداد کے حالات زیادہ تفصیل سے بیان نہیں کیے ہیں۔ چنانچہ ضبط اور حقیقت کے بارے میں سب سے زیادہ معلومات "نشتر" کے دیباچہ میں ملتی ہیں۔ لیکن افسوس کہ ضبط نے بھی اپنے اور اپنے خاندانی حالات بہت زیادہ تفصیل سے نہیں لکھے۔

نشتر کے مصنف نے اپنے جو حالات بیان کیے ہیں وہ نامکمل ہیں۔ انھوں نے بس اس قدر ہی لکھا ہے کہ منگ کی سرکار سے وابستہ ہو جانے کے بعد ان کے نانا میر محمد نواز خدمت سے سبکدوش ہو کر مستقلاً قصبہ جاجمؤ میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ اور خود مصنف نے اپنے آپ کو کانپور میں مقیم بتایا ہے۔ لیکن خانم جان سے عشق ہو جانے اور جدائی کے بعد، ضبط مستقل طور پر ترک ملازمت کرکے لکھنؤ آ گئے تھے۔ چنانچہ ان کے باقی ماندہ حالات زندگی کو ہم اردو تذکرہ نگاروں کے بیان کردہ واقعات کی روشنی میں یوں ترتیب

۱۔ نشتر ص۳۱ مطبوعہ مجلس ترقی ادب مرتبہ عشرت رحمانی ۱۹۶۵ء

۲۔ چونکہ شاد حسن ضبط کا ناول 'قصہ حسن و عشق' کا اصل مسودہ میری نظر سے نہیں گزرا اور 'نشتر' قصہ حسن و عشق کا ترجمہ ہے۔ لہٰذا اس ناول پر بحث کرتے ہوئے میں نے بعض جگہ "نشتر" کے نام کو ہی بطور متبادل کے استعمال کیا ہے۔

Marfat.com

دے سکتے ہیں۔

خاتم جان سے جدائی اور اس کی موت کے بعد حسن شاہ لکھنؤ میں آکر رہنے لگے تھے۔ یہاں انھوں نے جرأت کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ اور یہیں حقیقت بھی اپنے بڑے بھائی کے توسط سے جرأت تک پہنچے اور اس کے شاگرد ہوئے۔ اس حادثہ محبت کے بعد پھر حقیقت نے زندگی میں کوئی دلچسپی نہ لی اور ان کی کل دنیا سمٹ سمٹا کر شعر و ادب کی دلچسپی کی حد تک رہ گئی۔ یہ بے نیازی اس قدر بڑھی کہ عمر کے آخری برسوں میں ترک دنیا کر کے فقیری اختیار کر لی تھی۔ اسی اثنا میں انھوں نے اپنی آپ بیتی بھی قلم بند کی۔ تذکرہ نگاروں کے مطابق شاہ حسن ضبط ۱۸۲۴ سنہ عیسوی تک بقید حیات تھے۔ قدرت اللہ قاسم نے اپنے تذکرے میں جو ۱۲۲۱ سنہ ہجری کی تصنیف ہے انھیں ایک "باحیا" اور "صاف طبیعت" کا انسان قرار دیا ہے۔ ضبط کے حالات زندگی کے بارے میں اس سے زیادہ معلومات حاصل نہیں ہو سکیں۔

نشتر "قصۂ حسن و دل" جس کا اردو نام اس کے مترجم منشی سجاد حسین انجم کسمنڈوی نے نشتر رکھا ہے، کا سال تصنیف بقول مترجم سال تصنیف ۱۲۰۵ ہجری اور تاریخ کتابت ۱۲۶۷ ہجری ہے۔"

منشی سجاد حسین انجم کی رائے اس سلسلے میں سب سے زیادہ وقیع اور معتبر قرار دی جا سکتی ہے۔ کیونکہ ادبی دنیا سب سے پہلے انہی کے ذریعے اس ناول سے متعارف ہوئی۔ اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ ان کے پاس تھا۔ جس سے انھوں نے اردو ترجمہ کیا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

" اصل کتاب سیدھی سادی فارسی ہندی آمیز زبان میں قلمی میرے

۱۔ نشتر بحوالہ سابق صہ۲

Marfat.com

پاس موجود ہے۔"

اقتدار عالم خان اپنے مضمون میں لکھتے ہیں[۱]۔ ضبط نے یہ واقعات تقریباً تیس برس کی عمر میں لکھے تھے۔ اور انھوں نے ضبط کو پیش آنے والے اس معرکہ محبت کا سنہ ۱۷۸۱ء قرار دیا ہے۔ اس طرح گویا اپنی محبت کی ناکامی کے بعد ضبط نے گویا پندرہ برس بعد اس داستان کو صفحہ قرطاس پر منتقل کیا تھا۔ اسی طرح اقتدار عالم لکھتے ہیں کہ ضبط نے ان واقعات کو ۹۱-۱۷۹۰ء میں قلم بند کیا۔

لیکن خود صاحب تصنیف نے لکھا ہے کہ اس پر یہ واقعات ۱۱۹۹ھ بمطابق ۸۵-۱۷۸۴ء میں گزرے تھے اور اس داستان کے قلمی نسخے مملوکہ منشی سجاد حسین میں اس کا سال تصنیف ۱۲۰۵ ہجری لکھا ہے اور سنہ کتابت ۱۲۶۵ ہجری۔ لہٰذا یہ بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ ضبط نے اس واقعے کو تقریباً چھ برس بعد ہی قلمبند کر دیا تھا۔ اور سال کتابت سے یہ مراد ہوگی کہ اصل قلمی نسخے کی یہ کوئی دوسری نقل ہوگی جو ۱۲۶۷ھ میں تیار کی گئی ہوگی۔

اقتدار عالم خان نے سال تصنیف اور پیش آمدہ واقعات کا جو سال دیا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ گویا ضبط گیارہ برس کی عمر میں محبت کے اس سانحے سے دوچار ہوئے تھے جبکہ مصنف خود لکھ رہا ہے کہ اس وقت اس کی عمر چودہ پندرہ برس تھی۔ لہٰذا اس سلسلے میں سب سے زیادہ معتبر تو مصنف کی رائے ہے۔ اس کے بعد منشی سجاد حسین کی رائے ہے جن کے پاس ناول کا قلمی نسخہ موجود تھا۔

نقد و نظر | نشتر اٹھارویں صدی کے اواخر کا لکھا ہوا ایک آسان فارسی ہندی آمیز زبان میں لکھا ہوا قصہ ہے۔ لیکن بعض ناقدین کے

۱۔ اردو میں ناول نگاری کی ابتدا ایک نیا زاویہ نظر مطبوعہ نقوش لاہور۔ شمارہ ۱۰۳، ستمبر ۱۹۶۵ء

Marfat.com

نزدیک اس کی قدامت اور اس کا کسی فارسی قصّے سے ترجمہ مشکوک ہے۔ اور ان کی اس رائے کی بنیاد یہ ہے کہ وہ اس میں ناول نگاری کی جدید تکنیک پاتے ہیں۔ اور اس قصّے کو بھی انہی ناولوں کے زیر اثر قرار دیتے ہیں جو انگریزی ناول نگاری اور ناول کے فن سے متاثر ہونے کے بعد لکھے گئے۔

چنانچہ پروفیسر اختر انصاری دہلوی اپنے مضمون میں لکھتے ہیں[1]۔

"آخر نشتر کے بارے میں اس قسم کی قیاس آرائی کا کیا سبب ہے۔ اور ایسی کون سی ضرورت آن پڑی کہ منشی صاحب کے بیان پر شک کیا جائے۔ اور جس چیز کو وہ ترجمہ بتا رہے ہیں۔ اسے طبعزاد تخلیق ثابت کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا جائے۔"

یہ سوال اٹھانے کے بعد وہ خود ہی آگے چل کر لکھتے ہیں۔

"ناول کے پلاٹ کی نوعیت، قصّے کا ارتقاء واقعات کا اتار چڑھاؤ، اور بہت سے ایسے ضمنی پہلو اور جزئی امور ایسے ہیں کہ ان کی بنا پر ترجمے والی بات مشکوک معلوم ہوتی ہے۔ بالفاظ دیگر ناول میں ایسی اندرونی شہادتیں موجود ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ سچا واقعہ نہیں بلکہ افسانہ ہے۔"

"ہم نشتر پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں کرداروں کے عمل اور واقعات کے بہاؤ میں افسانہ نگار کے ذہن کی کارفرمائی صاف طور پر جھلکتی نظر آتی ہے خصوصاً ناول کے آخری حصّے میں واقعات جو روش اختیار کرتے ہیں اور افراد جس انداز میں المناک انجام کی طرف بڑھتے ہیں (بلکہ یوں کہنا چاہیئے دھکیلے جاتے ہیں) وہ

---

[1] قیاس آرائیاں اشد ناول کا آغاز اور ابتدائی نشو و نما۔ مطبوعہ رسالہ نقوش لاہور، شمارہ ۱۰۴، ستمبر ۱۹۶۵ء

صریحی طور پر افسانوی آرٹ کا مظاہرہ ہے۔ کوئی پڑھنے والا یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ قصہ کی حرکت افسانہ نگار کی کوشش اور من مانی کارروائی کی مرہون منت ہے۔"

پروفیسر اختر انصاری صاحب کو اس ناول کی تکنیک کے علاوہ دو اور اہم اعتراض ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ قصہ سچا نہیں ہے۔ دوسرے اس کے مصنف کا وجود نہیں ہے۔ اور یہ اصل میں منشی سجاد حسین انجم کے قلم کے شاہکار ہے۔

اس تمام بحث کے بعد پروفیسر صاحب موصوف اس تذبذب کا شکار ہو جاتے ہیں کہ آیا اس کو اٹھارویں صدی کا ناول تسلیم کریں یا نہیں؟ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اردو کے بیشتر نقادوں نے یہ تسلیم کیا ہوا ہے اور ہمیشہ اردو ناول کے ارتقا کی بحث اسی بنیاد سے شروع کی جاتی ہے کہ اردو ناول ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزی ادبیات سے متاثر ہونے کے بعد لکھے گئے ہیں۔

یہ چونکہ ناول نگاری کا فن اردو ادب میں انگریزی سے آیا ہے۔ لہذا کسی ایسی تصنیف کا دستیاب ہونا جس میں ناول کے جملہ عناصر پائے جاتے ہوں لیکن اس کا زمانہ تصنیف اٹھارویں صدی کا ہو جب ابھی انگریزی ادبیات کا براہِ راست اثر اردو ادب پر پڑنا شروع نہیں ہوا تھا۔ یقیناً چونکا دیتا ہے اور ذہن طرح طرح کے معروضات قائم کرنے میں مصروف ہو جاتا ہے۔

نشتر کا فنی مطالعہ اگر ایک طرف اس بات کا ثبوت ہے کہ شاہ حسن ضبط میں قصہ بیان کرنے کی بے پناہ فطری صلاحیت تھی۔ اور گو شعوری طور پر وہ اس میں اپنی عاشقانہ آپ بیتی تحریر کر رہے تھے، جو اتفاق سے ایک ناول کی صورت اختیار کر گیا۔

Marfat.com

مزید برآں نشتر اس بات کا ثبوت بھی ہے کہ اردو میں صرف داستانیں ہی نہیں لکھی جاتی تھیں بلکہ " ناول " کی فنی اصطلاح استعمال کئے بغیر انگریزی ادبیات کے اثرات سے آزاد اردو میں کچھ ناول بھی وجود میں آچکے تھے۔

اس قسم کی غلط فہمیوں کے دھندلکوں میں یہ سوال اٹھایا جاسکتا ہے کہ کیا " شاہ حسن ضبط " کے وجود کو ثابت کیا جاسکتا ہے ؟ شاہ حسن ضبط کا ذکر اردو کے کم و بیش تمام تذکروں میں پایا جاتا ہے۔ وہ شاعر بھی تھے اور اس ناول کے علاوہ انھوں نے رمل و نجوم وغیرہ پر بھی بعض کتابیں لکھیں تھیں جن کا تذکرہ آگے آئے گا۔ لیکن صرف اس ناول کے داخلی شواہد ایسے ہیں کہ جن کی بنا پر اسے اٹھارویں صدی کے اواخر کی تصنیف تسلیم کرنا پڑتا ہے۔

محسن لکھنوی نے اپنے تذکرے " سراپا سخن " میں جو ۱۸۶۰ء کی تصنیف ہے۔ شاہ حسن ضبط کا نام، وطن اور شاعری کا نمونہ دیا ہے۔ اور انھیں اپنا " چچا " بتایا ہے۔ واضح رہے کہ نشتر میں خود ضبط نے اپنے جن بھائیوں کا ذکر کیا ہے ان میں سے ایک شاہ حسین حقیقت ہیں۔ جو خود ایک مشہور شاعر اور مصنف گزرے ہیں اور اپنے بھائی ضبط کے ایما پر ہی قلندر بخش جرأت کے شاگرد ہوئے تھے۔

اصل میں اس ناول کے مصنف کے وجود کو تسلیم کرنے کی راہ میں وہی رکاوٹ در پیش آتی ہے۔ جس کا تذکرہ اوپر آچکا ہے۔ اگر اس ناول کو اٹھارویں صدی میں لکھے جانے والا ناول تسلیم بھی کرلیں تو بھی اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں ہے کہ اردو ادب میں ناول کے خد و خال انگریزی ادبیات کے اثرات سے ہی ابھرنا شروع ہوتے تھے۔ یا یہ اثر ۱۸۵۷ء کے بعد بہت زیادہ نمایاں ہو کر سامنے آیا۔ لیکن اگر ۱۸۵۷ء سے قبل بھی اکا دکا ایسی

Marfat.com

تصنیفات مل جاتی ہیں جن کے فارم کو ہم ادبی ناول کا فارم قرار دے سکتے ہیں۔

نشتر کو ہم واقعی ایک ایسا قصہ کہہ سکتے ہیں جو مکمل ناول کے فارم میں ملتا ہے۔ اردو ناول کو داستان کی روایات سے مربوط قرار دیا جاتا ہے۔ داستانوں کی تخیلی فضا ان کا مافوق الفطرت ماحول، ان کی بے پناہ قوت بیانیہ، نے ناول نگاری کے فن پر یقیناً گہرا اثر ڈالا ہے۔ لیکن اگر ہم اردو ناول کے اولین نقوش کا جائزہ لیں تو ہمیں نشتر کے علاوہ اسی عہد میں چند اور ایسے قصے بھی نظر آتے ہیں۔ جن میں حقیقی زندگی کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ اور ان کو ہم طویل کہانیاں یا کسی حد تک ناول بھی قرار دے سکتے ہیں۔

ناول اور داستان میں بنیادی فرق واقعیت اور حقیقت کا ہے۔ اس اعتبار سے ایسے قصے داستانوں سے الگ اور اردو ناول کے نقوش اولین کہلائے جانے کے مستحق ہیں۔ اور اس طرح ہم اردو ناول کی روایت کو اٹھارویں صدی تک پھیلا سکتے ہیں۔ نشتر اردو ناول کی ان روایات میں ایک روشن ترین روایت ہے۔

اصل قصہ چونکہ فارسی میں لکھا گیا تھا۔ لہذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہم فارسی زبان میں لکھے ہوئے ایک ناول کو اردو ناول کی روایات کی کڑی نہیں کہہ سکتے۔ لیکن اصل میں یہ برائے نام فارسی زبان کا قصہ ہے۔ اور اس میں ہندوستانی یعنی اردو زبان اس قدر زیادہ مستعمل ہوئی تھی اور فارسی کی نثر بھی انتہائی سادہ تھی لہذا اسے اردو کا ہی ایک قصہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح بعض ایسے قصے بھی ہیں کہ جو اردو زبان میں لکھے گئے تھے اور ان کا ترجمہ فارسی زبان میں کیا گیا تھا۔ مزید برآں نشتر جس آسان فارسی میں لکھا گیا تھا وہ ہندوستان میں اجنبی زبان نہیں تھی۔ چنانچہ نشتر کا انداز بیان دوسرے قصوں پر اثر انداز ہوا ہوگا۔

Marfat.com

اقتدار عالم خاں نے بجا طور پر لکھا ہے کہ "اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اصلی کہانی فارسی میں تھی۔ اٹھارویں صدی میں اردو اور فارسی کا چولی دامن کا ساتھ تھا۔ اس زمانے کی "ہندوستانی فارسی" کے ادبی رجحانات اردو کی ادبی وراثت کا ایک اہم حصہ مانے جاتے ہیں۔"

بعض نقادوں نے اردو ناول میں واقعیت اور مقصدیت کے عناصر کی تلاش انیسویں صدی کے ادب میں کی ہے۔ گویا وہ اس سے قبل کسی ایسے ناول کے یا تو وجود سے آگاہ نہیں ہیں یا ان کو تسلیم کرتے سے انکار کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی لکھتے ہیں: "اردو کہانیوں میں واقفیت اور مقصدیت کے عناصر انیسویں صدی کے وسط میں نمودار ہونا شروع ہوئے۔"

اسی طرح ڈاکٹر محمود الٰہی نے اپنے مضمون "اردو کا پہلا ناول" میں مولوی کریم الدین کے لکھے ہوئے قصے "خط تقدیر" کو اردو کا پہلا ناول قرار دیا ہے لیکن درحقیقت یہ ناول نہیں بلکہ ایک تمثیلی قصہ ہے۔

گو ایسے مذکورہ بالا تمام قصوں میں واقعیت و حقیقت پائی جاتی ہے اور وہ انیسویں صدی کے نصف میں تحریر کئے جانے والے قصے ہیں۔ لیکن ان تمام قصوں سے تقریباً پچاس برس قبل ہی ۹۱-۱۷۹۰ء میں ہی ایک ایسا قصہ وجود میں آ چکا تھا۔ جس میں واقعیت تخیل اور حقیقت کا خوبصورت امتزاج بھی ہے۔ اور جو ناول کے فن کی کسوٹی پر بھی پورا اترتا ہے۔ اور وہ ہے شاہ حسن ضبط کا ناول "نشتر"۔

ہم ذیل میں نشتر کے علاوہ دوسرے قصوں کا سنہ طباعت اور نشتر کے علاوہ

۱۔ اردو ناول کی ابتدا ایک نیا زاویہ نظر مطبوعہ نقوش لاہور بحوالہ سابق ص ۱۴۔ ۲۔ مولوی نذیر احمد احوال و آثار ص ۲۱۸ مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور۔

Marfat.com

دوسرے قصّوں کے مرکزی خیال پیش کرتے ہیں۔

۱۸۵۱ء میں مطبع مصدر النوادر آگرہ سے "دھرم سنگھ کا قصّہ" شائع ہوا تھا۔ اس سے اگلے سال ۱۸۵۲ء میں اسی مطبع سے "سورج پور" کی کہانی شائع ہوئی۔ بعدازاں ان دونوں قصّوں کا آسان فارسی زبان میں ترجمہ بھی شائع کیا گیا تھا۔ چنانچہ "دھرم سنگھ کا قصّہ" کو قصہ صادق خاں اور سورج پور کی کہانی کو "قصّہ شمس آباد" کے نام سے مطبع اسد الاخبار آگرہ نے شائع کیا تھا۔

یہاں یہ سوال بھی اٹھتا ہے کہ آخر ان قصّوں کو ہندوستانی زبان میں شائع کرنے کے بعد آسان ہندوستانی فارسی میں ترجمہ کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندوستانی اور فارسی کی ادبی روایت باہم دگر ہم آمیز تھی۔ اور دونوں کے رجحانات مشترک تھے۔

۱۸۵۲ء میں ہی مطبع اسعد الاخبار آگرہ سے سودھی کبودھی نامی قصّہ بھی شائع ہوا تھا۔ جو ایک اخلاقی قصّہ ہے۔

۱۸۶۴ء میں مطبع آفتاب قدرت آگرہ سے شیخ محمد کریم اللہ عرف شیخ غوث محمد قریشی کا فسانۂ غوث شائع ہوا۔ اس میں محلاتی زندگی کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ اس میں بھی کرداروں کے نام تمثیلاتی ہیں اور قصّہ یا ناول کے بجائے اپنے فارم اور اندازِ بیان کی بنا پر داستان کہلانے کی زیادہ مستحق ہے۔ ڈاکٹر میل جاری اسی قصّے کو اردو ناول کا پیشرو قرار دیتے ہیں۔ "قدیم اردو افسانے کے اتنے بڑے سرمائے میں اگر کوئی افسانہ واقعی ایسا ہو سکتا ہے جسے صحیح معنوں میں اردو ناول کا پیشرو کہا جا سکے تو وہ شیخ غوث محمد قریشی بنارسی کا "فسانۂ غوث" ہے۔ جو ۱۸۶۴ء میں مطبع آفتاب قدرت لوہا منڈی آگرہ میں چھپا ہے۔ اس کا پلاٹ ایک

Marfat.com

بادشاہ کے مند وزیروں کی باہمی رقابت سے تیار ہوتا ہے اور مافوق الفطرت واقعات، غیر انسانی کردار، عجائب نگاری، اور سحر سے یکسر پاک ہے۔ فسانہ عزت ایک المیہ قصہ ہے۔ جس کا خاتمہ بھی وزیر محمود اور اس کی زوجہ کی خودکشی پر ہوتا ہے[۱]۔"

اپنے ایک اور مقالے میں ڈاکٹر سہیل بخاری فسانہ عزت کے سلسلے میں لکھتے ہیں۔

"اس وقت جب کہ عجائب نگاری تمام داستانوں کا ایک عام دستور تھا۔ یہ اپنی پہلی قسم کی کوشش ہے اسے ہم بہ آسانی اردو ناول کا پیشرو کہہ سکتے ہیں[۲]۔"

لیکن فسانۂ عزت کے کرداروں کے تمام نام تمثیلی ہیں۔ مثلاً وزیر نیک، وزیر شریر فتنہ نما، خرد کیش، وغیرہ گو کہ بنین کی پلگرمس پروگریس کی طرح جسے ناول کہا جاتا ہے۔ فسانہ عزت کو بھی ناول کہہ سکتے ہیں۔ لیکن اس سلسلے میں ہم ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی کی رائے سے اتفاق کریں گے جو لکھتے ہیں[۳]۔ "اس میں شک نہیں کہ فسانۂ عزت اور داستان جمیلہ خاتون (مصنفہ ایم کیمبس) کے مصنفین نے اپنے قصوں کو فوق الفطرت عناصر سے پاک کر کے قصہ گوئی کے میدان میں ایک قدم آگے بڑھایا لیکن ان قصوں کی داستانی فضا، جدید کہانیوں کی مانوس واقعاتی فضا سے مختلف اور زمان و مکان کی تخصیص و تحدید سے آزاد ہے۔"

اب ہم سورج پور کا قصہ اور دھرم سنگھ کا قصہ کی طرف آتے ہیں۔ دھرم سنگھ کا قصہ مطبوعہ ۱۸۵۱ء میں دیہاتی زندگی کے حقیقی مسائل بیان کئے گئے ہیں۔ یہ تمثیل داستانی

---

(۱) ناول نگاری ص ۴۹۔ مطبوعہ میری لائبریری لاہور (۲) اردو کی نثری داستانوں کا تنقیدی مطالعہ ص ۲۷۵ مطبوعہ اوراق لاہور۔ (۳) مولوی نذیر احمد احوال و آثار ص ۲۲۲

پر مشتمل ہے۔ پہلی داستان میں زمینداری کے معاملات میں قانون کو ہاتھ میں لینے کے بجائے، مہذب طریقے پر عدالتی چارہ جوئی کے طریقے کی تعلیم دی گئی ہے۔ قصے کا مرکزی کردار ایک صلح جو اور انصاف پسند زمیندار دھرم سنگھ ہے۔ جو گاؤں والوں کو راستی کی تعلیم دیتا ہے۔

سورج پور کا قصہ مطبوعہ ۱۸۵۲ء میں گاؤں کے زمینداروں اور پٹواریوں کی جعل سازی اور مقدمہ بازی سے متعلق کہانی بیان کی گئی ہے۔ یہ سب واقعات حقیقی اور دیہاتی زندگی کے مسائل کو پیش کرتے ہیں۔ ان قصوں میں چندر رام، سندر سنگھ، دھرم سنگھ، بلونت سنگھ، بدیادھر اور ظالم سنگھ وغیرہ زمیندار طبقے کے نمائندے ہیں۔ بدھ سنگھ اور موہن اہیر کسانوں کے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ علاوہ ازیں بھوانی اور شوبر نداس پٹواری کے کردار ہیں۔

ان میں سے بعض قصے مختصر ہیں۔ اور اپنے اختصار کے سبب ناولٹ یا ناول کی قلمرو میں نہیں آتے۔ لیکن ان کے بیان کرنے کا مقصد یہ تھا کہ ایک تو یہ انیسویں صدی کے نصف آخر میں تحریر کئے جانے والے قصے ہیں۔ دوسرے ان میں داستانیں نہیں بلکہ حقیقی زندگی کے مسائل پیش کئے گئے ہیں۔ اور ان میں واقعیت و حقیقت موجود ہے۔ یہ قصے بھی یقیناً اردو ناول اور اردو افسانے پر اثر انداز ہوئے ہوں گے۔

لیکن انہی قصوں کو اردو ناول کے اولین نقوش قرار دینا صحیح نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ تمام قصے ضبط کے ناول نشتر کے تحریر کئے جانے کے تقریباً ۶۰ برس بعد لکھے گئے۔ لہذا اردو ناول کا اولین نقش نشتر کو ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔ البتہ یہاں نشتر کے تقریباً پندرہ سولہ برس بعد تحریر کئے جانے والے بعض اور قصوں کا سرسری تذکرہ کرنا، مناسب ہوگا۔

گویا زمانی اعتبار سے ان قصوں کو بھی مذکورہ بالا ان قصوں سے اولیت حاصل

Marfat.com

ہے جن کا تذکرہ ہمارے مختلف نقاد اردو ناول کے اولین نقوش کے سلسلے میں کرتے آئے ہیں۔
میرا اشارہ اس قصے کی جانب ہے جو ۷-۱۸۰۶ء میں لکھا گیا۔ یعنی انیسویں صدی کی پہلی دہائی میں۔ اس قصے کا مصنف ڈیرہ غازی خاں کا رہنے والا تھا۔ یہ بھی آسان فارسی میں لکھا ہوا قصہ ہے۔ جس میں واقعیت و حقیقت پائی جاتی ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ، برٹش میوزیم لائبریری میں موجود ہے۔ اس قصے کا بنیادی موضوع عشق و محبت ہے۔ اس قصے کی ہیروئن کو بعض باثر افراد اغوا کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن ملتان کے صوبے دار مظفر خاں کی مدد سے دونوں دشمنوں سے محفوظ رہتے ہیں۔ اس کہانی کی زبان بھی نشتر کی طرح عام فہم اور سادہ ہے۔

تقریباً اسی زمانے کا لکھا ہوا، ایک اور قصہ میسور کے مشہور لیٹرے ڈھوروجی کے بارے میں فارسی زبان میں ملتا ہے۔ ایک اور قصہ "قصہ سلطان محمود" ہے۔ جس کا موضوع افلاطونی محبت ہے۔ یہ بھی ایک مکمل کہانی ہے اور اس میں سلطان محمود کا نام صرف علامتی طور پر استعمال ہوا ہے۔ اس کے نسخے بانکی پور پٹنہ اور پٹنہ یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہیں۔

یہ تمام قصے اردو ناول کی تکنیک کے کافی حد تک مماثل ہیں۔ اور نشتر کو پہلا مکمل ناول تسلیم کر لینے سے ان قصوں کی ادبی اہمیت و افادیت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ یہ اردو ناول کی روایت کی ایک کڑی ہیں جن کا سرا نشتر ہے۔ چنانچہ اگر مغرب کے ناول کے ساتھ ساتھ ان روایات سے بھی اردو ناول کا تعلق جوڑا جائے اور اردو ناول کے تنقیدی جائزے کے وقت انھیں نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ مغرب کے ناول اور ان قصوں کے اردو ناول پر مشترکہ اثرات کی تلاش احسن ہو گی۔ ڈاکٹر سہیل بخاری نے بہت صحیح لکھا ہے۔

" ناول کو اردو داستان کی اولاد ثابت کرنے یا دونوں کا کسی حد

کسی طرح جوڑ ملانے کے بجائے مغربی ناول اور اپنے ان قصہ کہانیوں میں قدر مشترک کی تلاش کرنا زیادہ مفید مطلب ہے۔[11]

نشتر کا قلمی نسخہ اور اس کا اردو ترجمہ قصہ حسن و عشق جواب اردو میں "نشتر" کے نام سے معروف ہے، کے قلمی نسخے نہیں ملتے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ اس کے فاضل مترجم منشی سجاد حسین انجم کسمنڈوی کے پاس تھا۔ جس کا انھوں نے اردو ترجمہ کیا تھا۔ لیکن اس کے مترجم نے مصنف کی طرف سے دیئے جانے والے بہت سے اشعار حذف کر دیئے ہیں۔ اور بہت سی دوسری ترامیم بھی کی ہیں۔ بعض مقامات پر مترجم نے اپنی طرف سے بھی موقع محل کی مناسبت سے اشعار کا اضافہ کیا ہے اور ایسا کرتے ہوئے صراحت کر دی ہے۔ غرض مترجم نے اپنے نقطۂ نظر سے ناول میں کچھ نہ کچھ اضافے ضرور کئے ہیں۔ اور حواشی میں اپنی بعض آرا بھی لکھی ہیں۔ لیکن اشعار کے ان اضافوں سے اصل ناول پر کوئی بنیادی اثر نہیں پڑتا ہے۔

ناول کی ابتدا میں ہی ایک جگہ، جہاں قصے کا راوی حسن شاہ ضبط، میرزائی اور خانم جان کی محفل میں موجود ہے اور بہت سے دوسری حسینائیں بھی جمع ہیں۔ اس موقع پر سوال و جواب کے سلسلے میں مصنف نے بہت سے اشعار لکھے تھے۔ جن کو مترجم نے قلمزد کر دیا ہے۔ چنانچہ منشی صاحب حاشیے میں لکھتے ہیں۔

"اسی طرح بہت سے شعر حضرت نے پڑھے جس کے تین حصے پانچ صفحوں پر ہیں، ایک عام عاشقانہ انداز کے دوسرے حسینوں کی تعریف میں تیسرے اپنے حسب حال میں نے وہ سب چھوڑ دیئے۔"[12]

۱۱۔ اردو ناول نگاری ص ۹۴ مکتبہ اردو لاہور
۱۲۔ ناول نشتر ص ۳۵

Marfat.com

اسی طرح نشتر میں جہاں ناول کا ہیرو (منبط) خانم جان سے پہلی ملاقات کے بعد گھر میں آکر بے قرار ہوتا ہے۔ اور بہت سے اشعار پڑھتا ہے، جو یقیناً ہیرو کے اضطراب اور بے چینی و بے قراری کو ظاہر کرتے ہوں گے۔ لیکن فاضل مترجم نے یہاں بھی بہت سے اشعار کو حذف کر دیا ہے۔ اور صرف ہیرو کے حال زار کے بیان کے بعد لکھتے ہیں۔

"یہاں بہت سے شعر کسی پرانی مثنوی کے لکھے ہیں جس میں کا ایک یہ ہے۔

پرنٹ گریہ کناں چھوڑ اس کے در کو
بہ ناچاری چلا میں اپنے گھر کو !"

اور حاشیے میں مزید وضاحت کرتے ہیں۔

"اس وقت کے اردو شاعر وہی ہوں گے جن کا ذکر پروفیسر آزاد نے "آب حیات" کے مقدمہ اوّل میں لکھا ہے۔ میں نے یہ سب شعر چھوڑ دیئے ہیں۔"

حسن شاہ اور خانم جان کے نکاح اور شب عروسی کے واقعات کے تمام بیان کو جو مصنف کے قلم سے تھا، مترجم نے بدل ڈالا، چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

"انداز بیان کو میں نے بہت سنبھالا ہے ورنہ مصنف نے تو اس میں زمانے کا کچھ خیال ہی نہ کیا تھا۔"

مذکورہ بالا چند بیانات میں ترمیم و اضافے کے باوجود یہ بات وثوق سے نہیں کہی جا سکتی کہ مترجم نے مزید کیا کیا تبدیلیاں کی ہیں۔ کیونکہ میرے پیش نظر اس کتاب کا کوئی قلمی نسخہ نہیں ہے۔ جس سے اصل اور ترجمے کا موازنہ کیا جا سکتا۔ اس مضمون کی تیاری میں میرے پیش نظر، ناول نشتر کے تین نسخے رہے ہیں۔ دو نسخے تو منشی سجاد حسین

۱۔ نشتر ص ۲۳ (۲) نشتر ص ۱۲

Marfat.com

نجم کمنڈری کی زندگی میں ہی شائع ہوئے تھے۔ اور تیسرا نسخہ مجلس ترقی ادب لاہور کا شائع کردہ ہے جس کے مرتب عشرت رحمانی ہیں۔ مجلس کے نسخے کی بنیاد بھی وہی دو نسخے ہیں جن کا تذکرہ آچکا ہے۔

اس سلسلے میں ہم اقتدار عالم کے مضمون کا ایک اقتباس پیش کریں گے۔ جن کی نظر سے ناول نشتر کا قلمی نسخہ گزرا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

" نشتر کا ایک فارسی نسخہ کتبہ ۱۲۶۹ھ (۴۹-۱۸۴۸) قاضی محمد سعید صاحب (پٹنہ) کی ملکیت ہے۔ قاضی صاحب موصوف نے مخطوطات کی ایک مطبوعہ فہرست میں اس کا ذکر کیا ہے۔ فارسی متن اور اردو ترجمہ کے تقابل سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مترجم نے اصل قصہ کو جوں کا توں پیش کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ یہاں تک کہ محاورہ کے استعمال اور اندازِ بیان میں بھی اصل تاثر برقرار رکھنے کا پورا اہتمام کیا گیا ہے۔

چند اختلافات جو نظر آتے ہیں وہ غیر اہم اور جزئی امور سے متعلق ہیں۔ مثلاً فارسی قصہ میں حسن شاہ کے جدی حالات سرے سے غائب ہیں جبکہ منشی سجاد حسین کے ترجمہ میں تمہید کے بعد اس موضوع پر ایک علیحدہ سرخی قائم کی گئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فارسی نسخہ کے کاتب نے جدی حالات کو غیر ضروری تصور کرتے ہوئے حذف کر دیا ہے۔ دوسری طرف فارسی قصہ کی تمہید میں خدا اور رسولؐ کی توصیف و تعریف میں دو دیا تین صفحات لکھے گئے ہیں۔ لیکن منشی سجاد حسین نے " بعد حمد و نعت۔" کہہ کر اس قصے کو چند الفاظ میں ہی نبٹا دیا ہے۔ ایک اور جگہ حسن شاہ اور خانم خان

Marfat.com

کے نکاح اور شب عروسی کے بیان کو خود منشی صاحب نے تھوڑا سا بدل دیا ہے۔ حاشیہ میں اس کی وجہ یوں بیان کی گئی ہے ..... انداز بیان کو میں نے بہت سنبھالا ہے ورنہ مصنف نے تو اس زمانے کا کچھ خیال ہی نہ کیا تھا..... فارسی متن ملاحظہ کیجئے تو اندازہ ہو گا کہ منشی سجاد حسین کا تذبذب جائز تھا[۱]۔"

اس کے بعد آگے چل کر اقتدار عالم اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:-

" بہر حال ان چند جزوی اختلافات کے علاوہ جہاں تک میں جائزہ لے سکا ہوں۔ دونوں قصوں کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے بلکہ اردو ترجمہ لفظ بہ لفظ فارسی کا چربہ معلوم ہوتا ہے[۲]۔"

اقتدار عالم خاں نے مذکورہ قلمی نسخہ دیکھنے کے بعد جس پر سنہ کتابت ۱۲۶۹ھ تحریر ہے۔ اپنے مضمون میں یہ سوال اٹھایا ہے کہ ۱۲۰۵ھ کو مذکورہ کتاب کا سنہ تصنیف کیسے تسلیم کر لیا جائے؟ اس کا جواب ناول میں پائی جانے والی داخلی شہادتیں ہیں جو اس بات کا ثبوت فراہم کرتی ہیں کہ نشتر یقیناً اٹھارویں صدی عیسوی کے آخری عشرے کی تصنیف ہے کیونکہ اس کے بیشتر کردار تاریخی شخصیات ہیں۔

اس ضمن میں مضمون نگار نے میجر پولیر کا تذکرہ کیا ہے۔ اقتدار عالم خاں کی اس تحقیق و تجسس کی داد نہ دینا ناانصافی ہو گی کہ انھوں نے نہایت کاوش و محنت سے نشتر میں بیان کی جانے والی بعض شخصیات کو اس کے ہم عصری ماخذات کے ثبوت سے

۱:- اردو میں ناول نگاری کی ابتدا ایک نیا زاویہ نظر ص ۳ مطبوعہ نقوش

۲:- " " " " "

Marfat.com

معتبر کیا ہے۔ مثلاً میجر پولیر کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:۔

" ایک اور تاریخی شخصیت جس کا ذکر نشتر میں ملتا ہے فرانسیسی نژاد افسر میجر پولیر تھا۔ جو ایک مدت تک ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے اودھ میں تعینات رہا۔ وہ اودھ کی تہذیب کا بڑا دلدادہ تھا۔ اس کا شمار اٹھارویں صدی کے ان یورپینوں میں کیا جاتا ہے۔ جو ہندوستان آکر خود بھی نوابوں کی سی زندگی گزارنے لگے تھے۔ پولیر کی میرزامنشی کا گواہ ایک ہم عصر نقش اب تک موجود ہے جس میں اسے شاہ شجاع الدولہ کی معیت میں مرغوں کی لڑائی کا تماشہ دیکھتے ہوئے پیش کیا گیا ہے۔ ایک مرغ خود اس کی بغل میں دبا ہوا ہے۔ نشتر میں اس نام کے بجائے " ہولیر " ہیں۔ یہ محض کتابت کی غلطی ہے۔ اس نام کے سلسلے میں بعض کتابوں میں بھی یہی غلطی ہوئی ہے۔

ولی اللہ فرخ آبادی کی کتاب تاریخ فرخ آباد کے بعض نسخوں میں بھی " پولیر " کے بجائے " ہولیر " درج ہے۔ مزید برآں محمد بخش آشوب کی کتاب تاریخ شہادت فرخ سیر و جلوس محمد شاہ اور پولیر کے خطوط سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۸۱-۱۷۸۰ء میں پہلے کانپور میں اور پھر چنار میں مقیم تھا جس سے ہولیر صاحب کی نقل و حرکت کی بابت نشتر کی فراہم کردہ اطلاعات کی تصدیق ہوتی ہے۔ اور ہمارا یہ خیال مزید محکم ہوتا ہے کہ نشتر میں جس ہولیر صاحب کا ذکر ہے۔ وہ دراصل میجر پولیر ہی تھا۔ یہ بات بھی غور طلب ہے۔ کہ نشتر میں ہولیر کے نام کے ساتھ اس کے فوجی عہدے کی نشاندہی نہیں کی گئی ہے جبکہ باقی دوسرے انگریز افسروں کے سلسلے میں اس چیز کا خاص اہتمام

Marfat.com

کیا گیا ہے۔ یہ واقعہ ایک لحاظ سے منفی شہادت کا درجہ رکھتا ہے۔ ہمیں تاریخی ماخذ کے ذریعے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بعض وجوہ کی بناء پر میجر پولیپر ۱۷۷۶ء میں اپنے فوجی عہدے سے دستبردار ہونا پڑا تھا۔ ۱۷۷۹ء میں جب وہ کانپور آیا تو اس وقت تک گورنر جنرل کی کونسل نے اس کو معاف تو ضرور کر دیا تھا۔ لیکن ابھی تک وہ اپنے پرانے عہدے پر بحال نہیں ہو پایا تھا۔ ظاہر ہے اس زمانہ میں اس کے نام کے ساتھ کوئی فوجی منصب نہیں لگایا جا سکتا تھا اس طرح پولیپر صاحب کو میجر پولیپر کی حیثیت سے شناخت اور اس امر کا ثبوت ملنا کہ وہ کانپور اور چنار گڑھ میں اسی دوران میں مقیم تھا جو کہ نشتر میں بیان کیا گیا ہے نہ صرف یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس کہانی کے اکثر کردار تاریخی شخصیتوں سے عبارت ہیں۔ بلکہ کہانی کے بنیادی ڈھانچے کا حقیقی واقعات پر مبنی ہونا بھی ثابت ہوتا ہے۔[۱]"

علاوہ ازیں ناول میں چند دوسرے کردار مثلاً حکیم شفائی اور حکیم میر محمد نواز بھی حقیقی شخصیات ہیں جن کا تذکرہ اس قدر کی اکثر کتابوں میں موجود ہے۔

چنانچہ نشتر میں موجود داخلی شہادتوں، اور تاریخی و ادبی ماخذ کی روشنی میں پرکھنے کے بعد بلا خوف تردید یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ یہ اٹھارویں صدی کا ہی ایک قصہ ہے۔ جس میں فسانہ محبت کے ساتھ ساتھ اس عہد کے ہندوستان کی حالت، ایسٹ انڈیا کمپنی اور بعض انگریز افسران کا تذکرہ ملتا ہے۔

اس ناول میں ہمیں انگریز افسران کی عیش کوشی و عیش پرستی، ان کی میرزا منشی

۱:۔ بحوالہ سابق ص

Marfat.com

عام انگریز سپاہیوں کے طوائف بازی کے شوق کے علاوہ اس زمانے کے ہندوستان کے سیاسی و سماجی حالات کی جھلکیاں جگہ جگہ ملتی ہیں۔ انگریز افسران کا تذکرہ، ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوجی چھاونیوں کے مقامات، انگریزی لشکروں کے پڑاؤ، اور نقل مکانی، اور ان کی ترتیب و تنظیم کے بارے میں بھی اشارے ملتے ہیں۔ حسن شاہ ضبط نے ایک جگہ اس بات کا تذکرہ بھی کیا ہے کہ انگریزی لشکر کے روزمرہ کے اخراجات اور سپاہیوں کی تنخواہوں وغیرہ کا خرچ مہاجنوں سے سود پر قرض لے کر پورا کیا جاتا تھا۔

مئی ۱۷۸۱ء میں انگریزی لشکر کے کانپور سے پورب جانے کے بارے میں کلکتہ کے احکامات کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ اسی زمانے میں خانم جان بھی کانپور سے پورب کی جانب روانہ ہوتی ہے۔ لشکر کی روانگی کی خبریں سن کر قرض خواہ جس صورت سے اپنا اپنا قرض وصول کرنے کی تگ و دو کرتے ہیں اس کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ یہی قرض خواہ، حسن شاہ ضبط کو اس امر پر مجبور کر دیتے ہیں کہ ان کا حساب بے باق کئے بغیر وہ نہیں جاسکتا۔ جس کا نتیجہ حسن شاہ، اور اس کی ہیروئن کے حق میں المناک نکلتا ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی مالی ساکھ، جس کا تذکرہ نشتر میں ملتا ہے، کی تصدیق گورنر جنرل با اجلاس کونسل کے ان الفاظ سے بھی ہوتی ہے جو اس نے ۸۲-۱۷۸۱ء میں کمپنی کی مالی حالت کا جائزہ لیتے ہوئے کہے تھے "کمپنی کی ساکھ اتنی گر چکی ہے کہ فوجوں کے روزانہ کے اخراجات کو پورا کرنے کے لئے مناسب رقموں کا قرض ملنا مشکل ہو گیا ہے۔"

ڈیرے دار طوائفوں کے اعلٰے درجے کے انگریزوں سے تعلقات، اور انگریزوں کو ان کے داشتہ رکھے جانے کے بارے میں بھی عام تاریخی ماخذوں سے تصدیق ہوتی ہے اس زمانے میں کمپنی کے لشکر کے ساتھ ساتھ نچلے درجے کی طوائفوں اور ڈیرے دار طوائفوں

کے گروہ بھی ہوا کرتے تھے۔ ہندوستان کے عیاش روسا امرا کی طرح انگریز افسران بھی، اس سلسلے میں مقامی لوگوں سے مسابقت کا جذبہ رکھتے تھے۔ اور اپنی دولت کو اندھا دھند عیاشیوں میں اڑاتے تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ان لشکروں کے درمیان میں ایک جگہ ان طوائفوں کے لئے مخصوص ہوتی تھی جسے اصطلاح میں "لول بازار" کہا جاتا تھا۔ "سیموئیل ہیکس نے جس نے ۱۷۷۷ء اور ۱۷۸۵ء میں ہندوستان کی سیر کی تھی اپنے سفرنامے میں جنرل گوڈرڈ کے ہمراہی میں پیش آنے والے واقعات لکھے ہیں۔ جس میں اس نے بتایا ہے کہ طوائفوں کے ڈیروں کے لئے علیحدہ طور پر ایک دائرہ بنا ہوا کرتا تھا۔ جس کو کیمپ کی اصطلاح میں لول بازار کہا جاتا تھا۔ بعض اوقات لول بازار کے مکینوں کے لئے حفظانِ صحت اور طبی امداد بھی لشکر کے ڈاکٹروں کی ذمے داری مانی جاتی تھی۔[1]"

نشتر میں موجود فنکارانہ تخیل کی بنا پر اختر انصاری صاحب نے اس خیال کا اظہار بھی کیا ہے کہ "قصہ کسی افسانہ نگار کے ذہن کی پیداوار معلوم ہوتا ہے۔" اس ناول میں یقیناً فنکارانہ تخیل پایا جاتا ہے۔ جو ہر صنفِ ادب کے شہ پارے کے لئے ناگزیر ہے۔ ہم اس فنکارانہ تخیل کی موجودگی کے باوجود ہم اس کو ایک سچی آپ بیتی ماننے پر مجبور ہیں۔ اور یہ کہیں گے کہ فنکارانہ تخیل کی موجودگی نے حقائق کے بیان کو صحافیانہ یا سطحی انداز عطا کرنے کی بجائے ایک خوبصورت فن پارے میں تبدیل کر دیا ہے۔ اور اس سے قصے کی سچائی متاثر ہونے کے بجائے اس میں اضافہ اور اثر آفرینی پیدا ہوئی ہے۔

صفحاتِ گزشتہ میں ہم ذکر کر آئے ہیں کہ ضبط پر یہ واقعات ۸۱-۱۷۸۰ء میں ہوئے تھے۔ جسے افضل نے ۹۱-۱۷۹۰ء میں دس برس گزر جانے کے بعد قلمبند کیا تھا یعنی

۱۔ بحوالہ مضمون آفتاب عالم خان۔ مطبوعہ نقوش۔

Marfat.com

صورت میں مکالمے، ضمنی واقعات، اور ان کی نسبت سے جو اشعار پڑھے گئے تھے۔ ان سب کا اسی ترتیب سے یاد رکھنا اور لکھنا اور ہیرو، ہیروئن کے درمیان جو خط و کتابت ہوئی تھی۔ ان کو بجنسہٖ نقل کرنا اور اسی صورت سے حافظے میں موجود رہنا ناممکن ہے۔ چنانچہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ واقعات میں کیف و کم پیدا کرنے اور ماضی کے بیتے ہوئے ان رنگین لمحات کو سپردِ قلم کرنے میں مصنف اپنے فنکارانہ تخیل کو بھی کام میں لایا ہوگا جس کی بنا پر یہ قصہ آپ بیتی ہونے کے ساتھ ساتھ کسی افسانہ نگار کی خلاقی بھی معلوم ہوتا ہے۔

ناول کا قصہ

ناول کا ہیرو شاہ حسن ضبط ایک انگریز افسر مسٹر منگ کا ملازم تھا۔ جو انگریز کیمپ کے قریب ہی اقامت پذیر تھا۔ اسی مقام پر چار کشمیری طائفے بھی قیام پذیر ہیں۔ ایک کشمیری طائفے کی مالک میرزائی خانم ہے۔ میرزائی کی ایک نواسی خانم جان ہے۔ اس طائفے میں دوسری خوبصورت طوائفیں گلبدن خانم اور بی جان بھی ہیں۔ اتفاق سے حسن شاہ ضبط کا تعارف اس طائفے کی مالکن سے ہو جاتا ہے۔ حسن شاہ ضبط اس طائفے میں آنا جانا شروع کر دیتا ہے اور خانم جان پر عاشق ہو جاتا ہے۔ خانم جان بھی محبت کا جواب محبت سے دیتی ہے۔ بعدازاں ہیرو اور ہیروئن میں خفیہ ملاقاتیں بھی ہوتی ہیں۔ خانم جان طوائف زادی ہونے کے باوجود، شاہ حسن ضبط سے وصل سے قبل خفیہ طور پر نکاح بھی کرتی ہے۔ لیکن اپنی مجبوریوں کے سبب ناول کا ہیرو کھلے عام خانم جان کو اپنا نہیں سکتا۔ ایک برس تک اسی طرح ملاقاتیں ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن ایک لشکر کے کوچ کا حکم ہوتا ہے۔ یہ طائفہ کلن نامی انگریز کا ملازم تھا لہٰذا کلن کے لشکر کے کوچ کرنے کے بعد خود بھی کوچ کرنا چاہتا ہے یا میرٹھ میں کسی اور انگریز کے ہاں ملازم ہو جانے کا خواہش مند ہو جاتا ہے۔ چنانچہ حسن شاہ ضبط کے مشورے سے

Marfat.com

اسی کی کوششوں سے مشہور نامی ایک دلال کی معرفت انگریز رنگ، ہیرو کا آقا، میرزائی کے طائفے کو اپنے یہاں ملازم رکھ لیتا ہے۔

اس اثنا میں کھیمن ایک اور انگریز کے ہمراہ فرار ہو جاتی ہے۔ تقریباً ایک برس کی یکجائی اور رنگین صحبتوں کے بعد رنگ کا تبادلہ کلکتہ ہو جاتا ہے اور میرزائی کے طائفے کو حساب کتاب اور بخشش کے بعد فارغ کر دیا جاتا ہے۔ اس موقع پر ناول کا ہیرو اور ہیروئن فرار کا منصوبہ بناتے ہیں۔ دونوں میں طے پاتا ہے کہ خانم جان پہلے کشتی میں میرزائی کے ہمراہ جائے گی بعد ازاں حسن محمد ضبط ایک تیز رفتار کشتی لے کر جاتے ہیں موقع پا کر خانم جان کو اپنی کشتی میں لے کر فرار ہو جائے گا۔ دونوں میں قول و قرار ہو جاتے ہیں۔ ہیروئن اپنے طائفے کے ہمراہ رخصت ہو جاتی ہے۔ لیکن ہیرو اپنے آقا کے احکامات کے سبب اور مہاجنوں کے حساب کتاب کو بے باق کرنے کے سبب سے روانگی میں تاخیر کر دیتا ہے۔ اس کے بعد کشتی کی تلاش میں نکلتا ہے۔ لیکن بے سود۔ کنارے کنارے ہیرو کو خانم جان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے شکوہ آمیز خطوط ملتے ہیں۔

میرزائی کا طائفہ چنار گڑھ سے ہوتا ہوا لکھنؤ پہنچتا ہے۔ خانم جان اپنے محبوب کی بے وفائی کے سبب بیمار ہو جاتی ہے۔ میرزائی علاج معالجے کی غرض سے ہیرو کے نانا حکیم میر محمد نواز کو آدمی بھیج کر بلاتی ہے۔ بوجوہ حکیم صاحب اور ہیرو کی روانگی میں تاخیر ہوتی چلی جاتی ہے۔ آخر کار رنگ کے مشورے اور اجازت سے قاصد کے آنے کے تقریباً پانچ دن بعد دونوں لکھنؤ روانہ ہوتے ہیں۔ لیکن خانم جان محبوب کا انتظار کرتے کرتے مر جاتی ہے۔ جس وقت ہیرو اپنے نانا کے ہمراہ لکھنؤ میں میرزائی کے ڈیرے پر پہنچتا ہے تو اس وقت وہاں خانم جان کی رسم قل ادا کی جا رہی تھی۔ ہیرو، خانم جان اور

Marfat.com

اپنے واقف محبت لڑکے کے ہمراہ خانم جان کی قبر پر جاتا ہے اور گریہ زاری کرتا ہے بالآخر رخصت ہو کر ناکام و نامراد لکھنؤ کو واپس آ جاتا ہے۔

نشتر ایک رومانی اور کرداری ناول ہے۔ اس کا پلاٹ ڈھیلا ڈھالا ہے۔ اور پلاٹ کی تعمیر نسبتاً معیاری انداز اس میں موجود ہے۔ تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اٹھارویں صدی میں کسی ایسی کہانی یا تخلیق کے سلسلے میں جس کا فارم ناول سے ملتا جلتا ہو، اس کے مصنف سے اس بات کی توقع بھی نہیں کی جا سکتی کہ وہ ناول کے مکمل فارم اور اس کو بیان کرنے اور اس کی تکنیک کو استعمال کرنے سے شعوری طور پر واقف ہوگا۔

اس کے باوجود اس میں ناول کے تمام لوازم موجود ہیں۔ اس میں پلاٹ ہے۔ قصہ ہے، کردار ہیں، مکالمات ہیں اور کہانی کو نہایت خوبصورتی اور تسلسل کے ساتھ بڑھاتے ہوئے اس کے حزنیہ انجام تک لے جایا گیا ہے۔ ناول کی ہیروئن خانم جان کا کردار اپنی خوبیوں کی بنا پر سب سے زیادہ جاندار اور نمایاں ہے۔ حتیٰ کہ ہیرو کی شخصیت اس کے کردار کے آگے ماند پڑ جاتی ہے۔

اس ناول کی سماجی، تہذیبی اور تاریخی قدر و قیمت کا تذکرہ ہم گزشتہ صفحات میں کر چکے ہیں۔ یہاں صرف اتنا اور کہنا ہے کہ اگر ناول کے مصنف کو اس تصنیف کی اہمیت کا اندازہ ہوتا اور وہ اپنی آپ بیتی کے ساتھ ساتھ انگریز افسران کی اس مخصوص طرز زندگی کو اور زیادہ ابھار سکتا تو بلاشبہ اس ناول کی ادبی اور تاریخی قدر و قیمت میں اور اضافہ ہو سکتا تھا۔

اس ناول کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ جس طرح دوسرے شعبہ ہائے زندگی کے افراد ہندوستان میں موجود سفید فام اقوام کے افراد اور حاکموں سے ربط و ضبط رکھتے اور اس پر فخر محسوس کرتے تھے اسی طرح چھوٹی بڑی ہر درجے کی طوائفوں نے بھی مقامی

Marfat.com

[ر]ئیسوں کے علاوہ انگریز حکام سے بھی تعلقات استوار کر رکھے تھے۔ ان کی داشتہ بنتی تھیں [ق]دردان کے ہاں گانے بجانے کے کام پر بھی بیش قرار تنخواہوں پر ملازم ہوتی تھیں۔ حالانکہ [ا]ن انگریز افسران اور ان طوائفوں پر یہ فارسی مصرع بھی صادق آتا تھا کہ زبان یار من ترکی و [م]ن ترکی نمی دانم۔ رنگین مزاج انگریز افسران اپنے منشیوں کی مدد سے ان طوائفوں سے گفتگو [ک]رتے اور ان کی گائی ہوئی اردو فارسی غزلیات کا مطلب سمجھ کر داد دیتے تھے۔

ان طوائفوں کی رفاقت ان انگریزوں سے دائمی نہیں ہوتی تھی۔ چنانچہ انگریزی لشکروں کے کوچ اور افسران کے تبادلوں کے ساتھ ہی بے روزگاری کا خوف ان طوائفوں کو گھیر لیتا تھا۔ اور وہ بھی اپنا بوریا بستر سمیت کر کسی نئے قدردان اور خاص طور پر کسی انگریز قدردان کی تلاش میں مختلف شہروں اور کمپنی کی چھاؤنیوں کی جانب سفر اختیار کرتی تھیں۔ ان طائفوں کے اراکین کی زندگیاں رقص و نغمہ اور عیش و نشاط کے باوجود خانہ بدوشوں کی زندگیوں سے مختلف نہ تھیں۔ اس زمانے کے ہندوستان کی عام سیاسی و سماجی ابتری کے سبب مقامی رؤسا و امرا ان طائفوں کو ملازم رکھنے کی سکت نہ رکھتے ہوں گے۔ دوسرے انگریز افسران چونکہ مشرقی تہذیب کے اس بدنما عنصر کو اپنا رہے تھے۔ اور اجنبی دیس میں بیویوں کی جدائی کے سبب انھیں اس قسم کی پیشہ ور عورتوں کی ضرورت بھی تھی علاوہ ازیں •• عیاش مشہور ہو جانے کو قابلِ فخر سمجھتے تھے۔ اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازمین چونکہ تنخواہوں کے علاوہ، نجی تجارت اور دوسرے ہتھکنڈوں سے ہندوستان میں بے پناہ دولت کماتے تھے۔ لہٰذا نو دولتیے رئیسوں کی طرح وہ ہر قسم کے عیوب میں خود کو ملوث کر لیتے تھے۔ چنانچہ منگ ایک ایسے ہی کردار کے طور پر ابھر کر سامنے آتا ہے۔

میرزائی کے طائفے کو ملازم رکھنے کی ترغیب دینے کے سلسلے میں جب مٹھو دلال

اس سے کہتا ہے کہ حضور کا نام تمام انگریزوں میں عیاشی میں معروف ہے۔ ہر چند کہ یہ انگریز فارسی، اردو کے بلند پایہ عاشقانہ اشعار سن کر سر دھنتے ہیں۔ لیکن ان کی بنیادی دلچسپی حسن میں ہے۔ اور ہندوستان کی عورت کی قربت کی خواہش انہیں کثیر رقومات کے خرچ کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ پرسی مل ہیر نے اپنی کتاب "نواب" میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازمین کی پست اخلاقی حالت، رنگین مزاجی اور کمپنی کی ملازمت کے ساتھ ساتھ ان کے نجی کاروبار کے سلسلے میں تاریخی حقائق بیان کئے ہیں۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا ہر ملازم اپنی استطاعت کے مطابق اور بسا اوقات بساط سے بڑھ کر لذت کوشی اور عیش پرستی میں مبتلا تھا۔ عام انگریز سپاہیوں کے لئے نچلے درجے کی بیسوائیں تھیں اور اعلیٰ مناصب پر فائز انگریز اپنے مناصب اور دولت کے مطابق ڈیرے دار طوائفوں کو ماہانہ مشاہرے پر ملازم رکھ کر داد عیش دیتے تھے۔

انگریزوں کی عیاشیوں کے بہت سے ضمنی قصے اس ناول میں بیان کئے جا سکتے تھے منگ کے علاوہ انگریزوں میں جو افسران عیاشی کے لئے بہت زیادہ مشہور ہیں۔ ان میں کیمپ کے بخشی کلن نامی انگریز کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ بالغرض اگر ہولیر اور کلن کے کرداروں کو اور زیادہ نمایاں کیا جاتا تو ضمنی کرداروں میں بعض اچھے کردار پیش کئے جا سکتے تھے۔ کیمپ کے بخشی کلن کے نام کے ساتھ اس کو انگریز بیان کرنے سے یہ تو پتہ چل جاتا ہے کہ وہ انگریز تھا۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس کا اصل نام کلن نہیں ہو سکتا جو ایک مقامی نام ہے۔ غالباً اس کا یہ نام عیاشیوں کے سبب ہندوستانیوں میں مشہور ہوا ہوگا۔ تاہم ناول میں اس زمانے کے انگریزوں کے کردار کی مکمل نمائندگی منگ کرتا ہے۔

Marfat.com

منگ کا کردار

منگ کا کردار اس زمانے کے عام انگریز افسران کے کردار کی نمائندگی کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی کچھ انفرادی خصوصیات بھی رکھتا ہے۔

وہ خود بھی نجیب الطرفین ہے اور شریف و نجیب ہندوستانیوں کا احترام کرتا ہے اس احترام کی سب سے بڑی مثال خود ناول کا ہیرو ہے۔ جو منگ کے نجی ملازم کی حیثیت رکھتا ہے اور ایک یتیم ہندوستانی ہے۔ لیکن منگ حسن شاہ کا بہت خیال رکھتا اور اس کا احترام کرتا ہے۔ معاشی اعتبار سے بھی تنخواہ کے علاوہ بھی اس سے سلوک کرتا رہتا ہے، اور اپنی فرخ آبادی پٹھان داشتہ کے بہکانے کے باوجود جو ناول کے ہیرو کو منگ کی ملازمت سے نکلوانا چاہتی ہے، خود اپنی داشتہ کو نکال دیتا ہے اور ہیرو کے بجائے بہکانے والے کو نکال دیتا ہے۔ حسن شاہ نے صرف اس کا ملازم ہونے کے سبب سے ہی اس کو شریف اور وضعدار انگریز بیان نہیں کیا ہے۔ حالانکہ سماجی حیثیت سے بھی منگ کا درجہ بلند ہے اور وہ جنرل کوٹ کا ہمشیرزادہ ہے۔ ناول میں بیان کیے جانے والے واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ واقعی ایک عالی ظرف انگریز ہے۔

اپنی عالی ظرفی اور خاندانی شرافت کے باوجود وہ عام انگریز افسران کی طرح رنگین مزاج واقع ہوا ہے۔ طوائفیں اس سے وابستہ رہتی ہیں۔ وہ کھلا کھیل فرخ آبادی کھیلنے کا عادی ہے۔ اور بغیر مرضی کے طوائف تک کو اپنی آغوش میں لینے کا قائل نہیں ہے چنانچہ جب میرزائی کا طائفہ اس کی سرکار میں ملازم ہو جاتا ہے۔ اور گلبدن بیگم کے فرار ہو جانے کے بعد وسیلہ معاش کو برقرار رکھنے کے لئے میرزائی، خانم جان کو زبردستی بناؤ سنگھار کے ذریعے منگ کے پاس بھیج دیتی ہے۔ اور وہ واویلا کرتی ہے تو منگ اس کو بغیر چھوئے واپس جانے دیتا ہے اور خانم جان باعصمت منگ کے خلوت کدہ سے واپس آتی ہے۔

Marfat.com

ہر چند کہ یہ بات قرین قیاس نہیں معلوم ہوتی لیکن منگ کے کردار کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہم یہ یقین کرنے پر مجبور ہیں کہ عیاش طبع ہونے کے باوجود وہ زبردستی کا قائل نہیں ہے۔

وہ ایسا شخص بھی نہیں ہے جو عیاشیوں میں بلا سوچے سمجھے تمام مال جائیداد لٹا بیٹھتے ہیں اور آخر میں کوڑی کوڑی کو محتاج ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ وہ عیاشی کے سلسلے میں باقاعدہ تنخواہ پر کسی کو ملازم نہیں رکھتا بلکہ اس کے اپنے الفاظ میں "کھڑا کھیل فرخ آبادی" کھیلنے کا قائل ہے۔ جب مٹھو دلال اپنی چکنی چپڑی باتوں سے اس کو آمادہ کر لیتا ہے۔ تو بھی وہ اپنے منشی سے مشورہ کئے بغیر کسی قسم کا وعدہ نہیں کرتا۔ اس تمام کارروائی میں ناول کے ہیرو کا درپردہ ہاتھ ہے۔ لیکن وہ بظاہر منگ کو ایسا کرنے سے روکتا ہے۔ اور ایسی باتیں کرتا ہے کہ جس سے خود منگ کا جذبہ غیرت بیدار ہو سکے۔ چنانچہ منشی کے بار بار سمجھانے پر کہ اس میں پیسہ برباد ہوگا وہ ناراض ہوتا ہے اور خود کو کنجوس کہلانا پسند نہیں کرتا ہے منگ کے دل میں رحم دلی کا مادہ بھی بہت ہے۔ جب خانم جان اس کی خلوت سے بچ کر آجاتی ہے اور صبح کو طائفے کے ڈیرے پر جا کر منگ خانم جان کو روتا ہوا پاتا ہے اور تمام طائفے کو خانم جان کو لعنت ملامت کرتے دیکھ کر وجہ پوچھتا ہے تو تمام معاملہ جان کر ہنستا ہے اور خانم جان کی میوہ خوری کے لئے بھی رقم مقرر کر دیتا ہے اور پھر خانم جان کی شوخی سے اس کی تنخواہ بھی بی جان کے برابر کر دیتا ہے۔

اس واقعہ کے بعد میرزائی کا طائفہ تقریباً ایک برس تک اس سے وابستہ رہتا ہے لیکن وہ دوبارہ کبھی خانم جان کے لئے فرمائش نہیں کرتا اور نہ ہی اس کی میوہ خوری کی رقم بند کرتا ہے۔ ملاقاتیں ہوتی ہیں۔ خانم جان سے گانا وغیرہ بھی سنتا ہے۔ لیکن کبھی اس کے جسم کی خواہش نہیں کرتا۔ اس سے منگ کے کردار کی خوبی اور اس کے ظرف کا اندازہ ہوتا ہے۔

Marfat.com

حالانکہ خود خانم جان کو اس بات کا احساس ہے کہ ان لوگوں کے درمیان ہمیشہ رہتے ہوئے کسی نہ کسی مرحلے پر اس کی عصمت داغدار ہو جائے گی اور ممکن ہے کہ اگر منگ اصرار کرتا تو میرزائی اور اعظم جی، خانم خان کو مجبور کر دیتے لیکن منگ جسم فروشی کے ایسے معاملوں میں بھی جس کی بنیاد پیسہ ہو۔ زبردستی کا قائل نہیں۔ حالانکہ اس طائفے کی معاشی مجبوریوں کے پیش نظر وہ اپنا مقصود بہ آسانی حاصل کر سکتا تھا۔ اس کی عیاشانہ زندگی کا یہ تضاد بھی خوب ہے۔ چنانچہ اس کا کردار ہمارے ذہن پر ایک یادگار نقش چھوڑ دیتا ہے۔

اعظم جی نشتر کا ایک اور کردار اعظم جی ہے۔ جو میرزائی کا دیرینہ آشنا ہے اور کبھی ایک صاحب حیثیت تاجر تھا۔ لیکن تجارت میں نقصان ہو جانے کے باعث، تباہ حال ہو کر خود کو میرزائی کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا ہے۔ اس کی سیرت کا کوئی نمایاں نقش ناول میں نہیں ابھرتا۔ اعظم جی کی مثال ان افراد کی ہے جو تماش بینی میں اپنا مال و متاع لٹا کر کسمپرسی کے عالم میں نقش عبرت بن جاتے ہیں یا اپنی آشنا کے ہاں معمولی خدمت پر یاد لالی پر اکتفا کر لیتے ہیں۔ لیکن اس کے اور میرزائی کے درمیان کچھ ایسا رشتہ محبت استوار ہے کہ تباہ ہو جانے کے بعد، میرزائی اسے بے یار و مددگار نہیں چھوڑتی، جو عام طوائفوں کا وطیرہ ہے بلکہ وہ اپنے تباہ حال آشنا سے آشنائی برقرار رکھتی ہے۔ اور اسے اپنے ساتھ اس طرح رکھتی ہے کہ اس کی عزت و تکریم میں کوئی فرق نہیں آنے دیتی۔

اعظم جی اس طائفے کا سربراہ ہے۔ میرزائی کوئی کام اس کے مشورے کے بغیر نہیں کرتی، طائفے کی طوائفوں کو انگریزی مل کے ہاں ملازمت کے سلسلے میں بھی اعظم جی کے مشورے کو میرزائی اولیت دیتی ہے۔ وہ میرزائی کے ہمراہ اپنے طائفے کے گاہکوں سے ملاقاتیں کرنے

Marfat.com

اور معاملات طے کرنے بھی جاتا ہے۔

ناول میں بیان کردہ واقعات کے مطابق اس کی تباہ حالی کے بعد میرزائی نے ہی اسے مشورہ دیا تھا کہ میں دو تین طوائفیں جمع کرتی ہوں اور تمہاری ہمراہی سے کسب سے روپیہ کماتی ہوں۔

اعظم جی، میرزائی کے اس مشورے کو قبول کر لیتا ہے۔ اعظم کبھی ایک عزت دار اور صاحب ثروت شخص رہ چکا تھا۔ ہمیں اس کے کردار میں کسی ایسی کش مکش کا پتہ نہیں چلتا۔ کہ کیوں غربت و افلاس کی زندگی گزارنے کے بجائے وہ دلال بننا پسند کرتا ہے۔ اگرچہ اس کی دلالی اس طرح کی نہیں ہے کہ وہ ان طوائفوں کے لئے گاہک تلاش کر کے لاتا ہو۔

ایک طرف تو اعظم جی اس پستی کا شکار ہو جاتا ہے۔ اور حالات سے سمجھوتہ کر لیتا ہے لیکن دوسری طرف ہم یہ دیکھتے ہیں کہ وہ خانم جان کے پیشہ کرنے کے حق میں نہیں ہے البتہ اس کے گانے بجانے کی حد تک معترض نہیں ہوتا۔ میرزائی بھی اس سلسلے میں اعظم جی سے متفق ہے۔ تاہم میرزائی کے کردار اور قول و فعل پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ وہ پکی نائکہ ہے۔ لیکن اعظم جی سے امید کی جا سکتی تھی کہ وہ خانم جان کو جسم فروشی کی بھٹی کا ایندھن بن جانے سے بچائے رکھے گا۔ گلبدن کے کسی انگریز کے ساتھ فرار ہو جانے کے بعد اس پورے طائفے پر سراسیمگی اور ہراس چھا جاتا ہے۔ اور انہیں اپنا مستقبل تاریک نظر آنے لگتا ہے۔ ایسی صورت میں میرزائی کا خیال فوراً خانم جان کی طرف جاتا ہے۔ اور وہ گلبدن کے بجائے خانم جان کی خلاف مرضی اس کو بنا سنوار کر منگ کے پاس بھیج دیتی ہے۔ گویا اس وقت رنڈی کی ذہنیت پر اتر آتی ہے۔ لیکن اعظم جی، جو خانم جان کی جسم فروشی کے خلاف تھا۔ اتنا پست ہمت ہے کہ فوراً اس خیال سے تائب ہو جاتا ہے۔

Marfat.com

اور میرزائی کو سمجھانے بجھانے کے بجائے خود بھی خانم جان کی جسم فروشی کے حق میں ہو جاتا ہے۔ اعظم جی ایک مرد ہونے کے باوجود اس موقع پر میرزائی سے زیادہ پریشان ہو جاتا ہے غرض ناول میں اعظم جی کا کردار ایک گھٹیا درجے کے دلال کا کردار ہے۔

میرزائی میرزائی، اعظم جی کی داشتہ اور اس طائفے کی منتظمہ ہے۔ وہ پیدائشی طوائف ہے۔ اس کی عمر تیس برس ہے۔ وہ خوبصورت بھی ہے۔ ابھی اس کے بہت سے عشاق پیدا ہو سکتے ہیں۔ لیکن وہ پیشہ نہیں کرتی۔ وہ ہوشیار اور چالاک عورت ہے۔ اعظم گویے کے بیان کے مطابق وہ ذات کی کسبی ہے۔ جو اعظم جی کے گھر پڑ گئی تھی۔ اب ترک جسم فروشی میں غالباً یہی چیز مانع ہے۔ کیونکہ طوائفوں میں یہ بات عام طور پر دیکھنے میں آئی ہے کہ اگر وہ ایک بار کسی کی ہو جائیں تو پھر دوبارہ کوئی ترغیب انہیں جسم فروشی پر آمادہ نہیں کر سکتی۔ شومئی قسمت سے اس کا آشنا اعظم جی تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں میرزائی اب پھر اپنے پرانے پیشے کی طرف مراجعت کرتی ہے۔ لیکن اب کے صورت دوسری ہے۔ اب وہ خود جسم فروشی نہیں کرنا چاہتی بلکہ ایک طائفہ تشکیل دے کر اس کو اپنا گزر بسر کا ذریعہ بنانا چاہتی ہے۔

چنانچہ گلبدن اور بی جان طوائفوں کو لے کر انگریز قدردانوں کی تلاش میں لاہور سے ہوتے ہوئے ان مقامات کی طرف آتی ہے جہاں ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوجوں کی چھاؤنیاں ہیں۔

میرزائی اپنے عاشق اعظم جی کو آسودہ رکھنے کی خاطر دوبارہ اسی دلدل کی طرف واپس لوٹتی ہے۔ یہ اس کی شخصیت کا تضاد ہے۔ کیونکہ طوائفوں کے کردار اس کے برعکس ہوتے ہیں۔ لیکن یہاں وہ ہمیں ایک ایسی عورت کے روپ میں بھی نظر آتی ہے جو

Marfat.com

لیے اچھے اور برُے ہر حال میں اپنے مرد کے ساتھ رہنا پسند کرتی ہے۔

میرزائی کی گفتگو، اس کا انداز نشست و برخاست، ادبی ذوق، قابل تعریف ہے وہ خوش اخلاق اور زندہ دل عورت ہے۔ میرزائی پرانی رفاقتوں کو نبھانا خوب جانتی ہے چنانچہ خانم جان اسے صرف اس لئے عزیز ہے کہ وہ چنبل جان نامی ایک طوائف کی بیٹی ہے جو مرچکی ہے۔ خانم جان کی پرورش میرزائی نے ہی کی ہے۔ لیکن وہ خانم جان کو اس گندگی سے دور رکھنا چاہتی ہے۔ بہت سے انگریزوں نے خانم جان کو اپنانے کی خواہش کا میرزائی سے اظہار کیا۔ لیکن میرزائی نے نہ مانا۔ اس کا گریز اس سبب سے نہیں تھا کہ خانم جان ابھی بچی ہے۔ وہ جوان ہے۔ اور عمر کی چودہ بہاریں دیکھ چکی ہے۔ اس کا قیامت خیز حسن اور ابھرتی جوانی لوگوں کی تجوریوں کو خالی کرا سکتی ہے۔ لیکن میرزائی اس بات پر آمادہ نہیں ہے یہاں اس کی طوائفانہ فطرت کا تضاد نمایاں ہوتا ہے۔ لیکن خانم جان کی رقص و موسیقی کی تربیت میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتی۔ البتہ اس قدر خواہش کے باوجود کہ خانم جان گندگی میں ملوث نہ ہو۔ وہ گلبدن کے بھاگ جانے کے بعد اس کو اپنا وسیلہ معاش بنا لینا چاہتی ہے

میرزائی کی انتظامی صلاحیتیں، اس کی نگہ انتخاب، طائفے پر اس کا رعب و داب اور اس کا مہذب و شائستہ انداز، ہمیں امراؤ جان ادا کے ناول میں چکلہ چلانے والی خانم جان کی یاد دلاتا ہے۔ میرزائی رحمدل بھی ہے اور اپنے تمام متعلقین کا بہت زیادہ خیال رکھتی ہے۔ لیکن اپنی خلاف مرضی کسی بات کو پسند بھی نہیں کرتی اور ایسے موقعوں پر فوراً سرزنش کرنا بھی خوب جانتی ہے۔

خانم جان ناول کی ہیروئن خانم جان ایک جاندار اور یادگار کردار ہے۔ وہ ایک چودہ سال کی شوخ و چنچل، فقرہ باز اور حاضر جواب خوبصورت

Marfat.com

رڈکی کے طور پر ناول میں ظاہر ہوتی ہے۔ اس آغاز کے بعد اس کی شخصیت اس صورت سے بار بار جلوہ گر ہوتی ہے کہ قاری سے کردار کے مختلف پہلوؤں کو متعارف کراتے ہوئے ناول میں موجود تمام کرداروں میں سب سے زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے۔ حتیٰ کہ خود ہیرو کا کردار بھی اس کے آگے پھیکا پڑ جاتا ہے۔ اور سوائے ایک دو مرحلوں کے جہاں ہیرو اپنی ذہانت کو کام میں لاتا ہے باقی ہر جگہ ہم خانم جان کے کردار کو ہی اس پر حادی دیکھتے ہیں۔

خانم جان جسم فروشی اور رقص و نغمہ کو پسند نہیں کرتی۔ اس کی پوری زندگی طوائفیت کے خلاف ایک خاموش جہاد ہے۔ وہ کوئی انقلابی کردار نہیں ہے۔ اور نہ ہی پناہ کی تلاش میں بار بار مردوں کے دام فریب میں آنا چاہتی ہے۔ بلکہ وہ کسی ایسے مرد کی منتظر ہے جو اس کا نجات دہندہ بن کر آئے اور جس کو ایک بار وہ اپنا جسم و جان سونپ دینے کے بعد ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس کے ساتھ شریفانہ اور باعزت زندگی گزار دے۔ یہی اس کی زندگی کی سب سے بڑی تمنا ہے۔

ہیرو سے محبت ہو جاتے، اور ہیرو کو اچھی طرح سے جانچ پرکھ لینے کے بعد خانم جان جو خطوط محبت ہیرو کو لکھتی ہے اور اس میں جس قسم کے خیالات کا اظہار کرتی ہے انھیں خانم جان کے فلسفۂ حیات کا نچوڑ کہنا چاہیئے۔ ان خطوط کے مطالعے کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ خانم جان ایک انتہائی ذہین اور حساس لڑکی ہے۔ ہر چند کہ اس کی عمر کم ہے۔ لیکن ہوشیار طوائفوں کے ساتھ رہنے اور اپنی طبعی ذہانت اور سوجھ بوجھ کے سبب اسے زمانے کے گرم و سرد کا خواب اندازہ ہے۔ اس کو مردوں کے جسمانی قرب کا کبھی تجربہ نہیں ہوا اور اکثر مرد اس کے طلب گار ہوتے ہیں۔ لیکن وہ مردوں کی نفسیات اور ان کی عادتوں سے خوب آگاہی رکھتی ہے۔

Marfat.com

خانم جان طوائفوں کے درمیان ہی پلی بڑھی اور پیدائشی اعتبار سے بھی وہ طوائف زادی ہے لیکن اس کے اندر نیکی اور عزت و حرمت کا تصور موجود ہے اور خود کو پاکیزہ اور باعصمت رکھنے کا احساس اس میں شدید ہے۔

بظاہر یہ خواہش اس پورے ماحول کو دیکھتے ہوئے عجیب اور انوکھی معلوم ہوتی ہے۔ خود خانم جان کو بھی اس بات کا احساس ہے کہ ان لوگوں کے درمیان رہتے ہوئے کسی بھی وقت اس کی پاکیزگی آلودہ ہو سکتی ہے۔ یہی احساس اور بلندی پیدا کر دی ہے اور اس سے بچنے کی شدید خواہش نے اس کے کردار میں عظمت ..... حقیقی

زندگی کا کردار ہے جس کو داستانوں کے اختتام کے زمانے میں تخلیق کیا گیا ہے۔ وہ کوئی داستانوی کردار نہیں ہے جو پہلی ہی ملاقات میں اپنے محبوب کو وصل کی دولت سے شاد کام کر دیتے ہیں۔ اپنے ماحول کے تقاضوں کے برعکس اس کا حصول آسان نہیں ہے۔

طائفے میں غیر اخلاقی زندگی کے وجود نے اس کو انتہائی مذہبی اور جذبات پر قابو رکھنے والی بنا دیا ہے۔ وہ اپنے محبوب سے وصل کی خواہش مند تو ضرور ہے اور جب خلوت میں ایسا موقع آتا ہے تو خود کو اس کے سپرد بھی کر دیتی ہے لیکن اس سے قبل وہ نکاح کرتی ہے۔ اپنے پسندیدہ محبوب کو خوب اچھی طرح پرکھنے کے باوجود بھی وہ خوفزدہ ہے کہ کہیں عاشق بے وفائی نہ اختیار کر لے۔ اور مجبوراً ایک طویل مزاحمت کرنے کے بعد اسے اپنے طائفے کے لوگوں کی مرضی کے مطابق خود کو ڈھالنا پڑتا ہے۔

ناول نشتر کا مطالعہ کرتے ہوئے خانم جان کا کردار بار بار مرزا ہادی رسوا کے ناول امراؤ جان ادا کے کردار امراؤ جان ادا کی یاد دلاتا ہے جو نشتر کے بعد کی تصنیف ہے۔

خانم جان، امراؤ جان کی طرح خود شاعرہ نہیں ہے لیکن اس کو اعلیٰ درجے کی غزلیں یاد ہیں۔ اس کا ادبی ذوق شائستہ اور بلند ہے۔ برمحل اور برجستہ اشعار پڑھنے میں وہ

Marfat.com

امراؤ جان ادا کی طرح ہی ماہر ہے۔ شعر فہمی کا ملکہ بھی اس میں خداداد ہے۔ امراؤ جان کی طرح وہ مردوں کو لبھانے، اپنی طرف توجہ دلانے اور انسان کی نفسیات سے بخوبی آگاہ ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ دونوں میں کچھ فرق بھی ہے۔ اور بعض مقامات پر خانم جان اپنی اپنی خوبیوں کی بنا پر امراؤ جان سے ممتاز نظر آنے لگتی ہے۔

مثلاً خانم جان ایک طوائف زادی ہے اور امراؤ جان ادا شریف زادی، امراؤ جان بچپن میں اغوا کر لی جاتی ہے۔ جبکہ خانم جان اسی طائفے میں پلی بڑھی۔ اس کو طوائفوں کے دستور کے مطابق راگ رنگ اور رقص و موسیقی کی اعلیٰ درجے کی تعلیم بھی دی گئی ہے۔ جو اس پیشے کے لئے ضروری ہے۔ لیکن اس تمام کے باوجود خانم جان میں ہمیں پاکیزہ اور با عصمت زندگی گزارنے کی ایک شدید خواہش نظر آتی ہے۔ اور اس کے سبب سے وہ خلوت میں منگ سے مزاحمت بھی کرتی ہے۔ اور اپنی عصمت محفوظ رکھنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔

دوسری طرف امراؤ جان ادا ایک شریف گھرانے کی لڑکی ہے جس کو اس کے بچپن میں غالباً دس برس کی عمر میں اغوا کر کے طوائف کے ہاتھ بیچ دیا جاتا ہے۔ اس کے کردار میں شروع میں ہی ہمیں کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی کہ جس کو اس کے شریف گھرانے کی چھاپ قرار دیا جا سکے۔ اور نہ ہی اس کے کردار میں ہمیں حالات کے دھارے کے خلاف جانے کا جذبہ ملتا ہے۔ بہت ابتدا میں بھی جب کہ ابھی امراؤ جان ادا کی مسی کی رسم بھی ادا نہیں ہوتی تو گوہر مرزا، ایک معمولی ملازم اس کا بچپن اول بن جاتا ہے۔ امراؤ جان ادا کے ہاں ہمیں بار بار یہ حسرت تو ملتی ہے کہ اسے دام مل گئے یا اور دوسری اغوا شدہ لڑکیوں کی طرح کسی گھر کی بیگم بن کر زندگی گزارنا نصیب ہو جاتی۔ لیکن ناول کے آغاز میں ہی ہم

Marfat.com

اس کو اس بیل بلا میں پھنس جانے کے بعد اس کے خلاف مزاحمت کرنے کے بجائے خود کو حالات کے سپرد کر دینے کے آثار نظر آتے ہیں۔ جبکہ خانم جان ایسے مواقع پر مزاحمت کرتی ہے۔ خانم جان، امراؤ جان کی طرح تجربہ کار، جہاں دیدہ اور پختہ عمر کی عورت نہیں ہے۔ لیکن اس کے اندازِ گفتگو سے کسی قسم کے تصنع یا بناوٹ کا پتہ نہیں چلتا۔ چونکہ اس کی تعلیم و تربیت اچھی ہوئی ہے۔ نیز جن لوگوں کے ساتھ وہ زندگی گزار رہی ہے۔ ان کے تجربات سے شناسائی نے اس کی ذہانت اور اندازِ فکر کو ایک جہاں دیدہ اور پختہ کار عورت کا سا انداز عطا کر دیا ہے۔

محبت کے معاملے میں خانم جان اس حد تک دور بین ہے کہ حسن و عشق میں پیدا ہو جانے والی بدگمانیوں کو اپنے اور محبوب سے دور رکھنے کے لئے چند شرائط ہیرو کو لکھ کر بھیجتی ہے۔ وہ دھیمے دھیمے سلگنے والی لکڑی ہے۔ آتش فشاں پہاڑ نہیں۔ وہ کوئی انقلابی کردار نہیں ہے جو ایکدم بغاوت کر دے۔ جسم فروشی تو بہت بڑی بات ہے اسے غیر مرد مل کے سامنے آنے جانے، ناچ رنگ اور غزلیں تک سنانا گوارا نہیں ہے۔ لیکن اس تمام کے باوجود وہ جبر و اختیار کی حدود کو پہنچاتی ہے۔ چنانچہ مصلحت وقت کے پیش نظر وہ منگ سے تھوڑی بہت راہ و رسم اور ہنسی مذاق کو برقرار رکھتی ہے۔ اپنے رازِ عشق کو پوشیدہ رکھنے کی خاطر وہ منگ کے سامنے اس کے منتی اور اپنے عاشق کا بھی مذاق اڑاتی اور اسے طرح طرح سے تنگ کرتی ہے۔ اس میں اندازِ دلربائی بھی ہے اور شوخی بھی۔ نیز عشق کے معاملات کو خفیہ رکھنے کا جذبہ بھی کارفرما ہے۔

خانم جان پرلے درجے کی خوددار بھی ہے۔ ایک موقع پر جب منگ کے سامنے خانم جان ناصل کے ہیرو کو طرح طرح سے تنگ کرتی ہے تو ہیرو کے منہ سے اتفاقاً خانم جان

Marfat.com

کے طبقے (طوائفوں) کے بارے میں یہ نکل جاتا ہے کہ یہ لوگ تو پیسے کے بندے ہوتے ہیں۔ خانم جان کو یہ بات ناگوار گزرتی ہے اور کئی روز تک ان دونوں کے درمیان ہر قسم کی گفتگو اور مراسلت بند رہتی ہے۔ آخر کار ہیرو کے معافی مانگنے پر خانم جان اسے معاف کرتی ہے۔ دوسری جانب خانم جان کا یہ رویہ بھی تعجب انگیز ہے۔ کہ جس وقت خلوت میں رونے کے سبب منگ اسے واپس ڈیرے بھیج دیتا ہے اور صبح کو طائفے کی قیام گاہ پر آتا ہے جہاں میرزائی خانم جان کو رات کے واقعہ پر سخت سُست کہہ رہی ہے۔ منگ صورت احوال سے واقف ہو کر خانم جان کی بلا خدمت تنخواہ مقرر کر دیتا ہے۔ لیکن یہ تنخواہ گلبدن سے کم ہے۔ چنانچہ اس موقع پر خانم جان گلبدن سے کم تنخواہ مقرر ہونے پر اعتراض کرتی ہے۔ اس کی اس گفتگو میں شوخی، برابری کا دعویٰ اور ناز سب ہی کچھ ہے۔ خانم جان یہ بھی جانتی ہے کہ میرزائی کی ناراضگی کا اصلی سبب، کم تنخواہ ہے جو اس پورے طائفے کے لئے ناکافی ہوگی۔ اس موقع پر خانم جان نہایت کامیابی سے عفیفہ رہتے ہوئے اپنی تنخواہ بندھوانے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو ملاحظہ ہو:۔

" صاحب نے کہا کہ اچھا خانم جان اگر روئے نہیں ہم اس کی بھی تنخواہ مقرر کر دیں گے۔"

یہ سنتے ہی آپ (خانم جان) جھٹ پٹ آنسو وانسو پونچھ صاحب کے پاس جا بیٹھیں اور کہا کہ میں صرف دو باتوں کے واسطے روتی تھی۔ ایک یہ کہ چند روز اور مجھے یہ بات منظور نہیں ہے۔ ورنہ یہ تو جانتی ہی ہوں کہ ہر گاہ ان لوگوں میں رہتی ہوں کب تک بچوں گی۔ دوسرے یہ کہ سَو روپے میں ان کی بسر اوقات کیسے ہوگی جس کا باعث میں ہی کم بخت ہوں۔"

صاحب نے کہا " اچھا پچاس روپے تم کو بھی میوہ خوری کو دیں گے۔"

خانم جان نے کہا " میری حمیت اس بات کی متقاضی کا ہے کہ ہو گی کوبی جان کے نو روپے

Marfat.com

ہوں اور مجھے پچاس روپے ملیں۔"

صاحب نے کہا "وہ مجھ سے راضی ہو گئی اگر تم راضی ہوتیں تو تم کو ڈھائی سو روپے ماہوار دیتا تھا۔"

اس نے کہا "پھر پچاس روپے بھی کس لئے آپ دیتے ہیں؟"

صاحب نے کہا "جس میں تم روٹھ نہیں اور آزردہ نہ ہو۔ اور دوسرے یہ کہ بی جان کی باتوں سے جی نہیں بہلتا تمھاری پیاری پیاری باتیں اچھی معلوم ہوتی ہیں۔"

اس عیار نے جواب دیا "جب یہ بات ہے تو تنخواہ میری کم کیوں کرتے ہو۔ جو لوگ سیرت اور خوش بیانی کے قدرداں ہوتے ہیں وہ دوسری باتوں پر اس کو فوق دیا کرتے ہیں۔"

صاحب نے ہنس کر کہا "معلوم ہوتا ہے کہ ہم سنی کی غیرت سے تم کو بی جان سے کم تر رہنا گوارا نہیں خیر تو تم کو بھی سو روپے ماہوار دیں گے۔۔۔ مگر خبردار اب رونا نہیں۔"

"اپ (خانم جان) نے اٹھ کر بندگی کی اور کہا اب رونے دھونے کی کیا ضرورت ہے خدا آپ جیسے قدرداں کو سلامت رکھے۔"[1]

تمام قصّے میں خانم جان کا کردار اپنی حاضر جوابی، شگفتہ گفتگو، ادبی ذوق اور دوسری خوبیوں کی بنا پر ممتاز ہوتا چلا جاتا ہے۔ وہ کم عمر ہے لیکن اس کی باتوں سے اس کی ذہنی بلوغت اور پختہ کاری اور اپنی ذات پر کامل اعتماد کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کی زندگی کا انجام حزنیہ ہے وہ اپنے محبوب کو بے وفا سمجھتی ہے اور اس کے فراق میں گھل گھل کر جان دے دیتی ہے۔

ہیرو کا کردار

اس ناول کا تمام قصّہ، ناول کا ہیرو واحد متکلم کے صیغے میں بیان کرتا ہے۔ قصّے کا ہیرو ایک سیدھا سادا نوجوان ہے جو

۱۔ نشتر ص ۶۳-۶۲

خوبصورت ہے۔ اور میر زایانہ مزاج رکھتا ہے۔ پہلی ہی ملاقات میں وہ خانم جان پر دل و جان سے فدا ہو جاتا ہے۔ ہیرو ابھی کم سن ہے۔ اور اس کم سنی میں ڈیرے دار طوائفوں میں اٹھنے بیٹھنے کا یہ اس کا پہلا موقع ہے۔ اولین ملاقاتوں میں ہی وہ ان لوگوں سے بہت زیادہ ربط و ضبط بڑھا لیتا ہے۔ اس زمانے کی عام مجلسی زندگی کے پیشِ نظر، ہیرو کا یہ بے تکلف اختلاط کچھ زیادہ تعجب خیز نہیں آتا۔ ہیرو خوبصورت اور طرحدار ہے اور ابھی اس کا بھی آغاز شباب کا ہی زمانہ ہے۔ اوّل اوّل اس کا ادبی مذاق اس طائفے سے ربط و ضبط بڑھانے کا سبب بنتا ہے۔

قصّے کے دوران ناول کا ہیرو بہت کم اپنی مرضی سے کوئی فیصلہ کرتا ہوا ملتا ہے۔ اور بہت کم اپنے عقل و تدبر سے کام لیتا ہے۔ ہر جگہ وہ ہیروئن کے بتائے ہوئے راستے پر چلتا نظر آتا ہے۔ اس میں قوت فیصلہ کی بھی کمی ہے اس کی چالاکی اور منصوبہ سازی ایک تو اس وقت ظاہر ہوتی ہے۔ جب وہ نہایت ہوشیاری سے ایک دلال کے ذریعے اپنے آقا منگ کو اس بات پر اکساتا ہے کہ وہ خانم جان کے طائفے کو اپنے ہاں ملازم رکھ لے۔ اور خود منگ کو اس طائفے کے ملازم رکھنے کے خلاف دلائل دے کر منگ کے آتش شوق کو بھڑکاتا ہے۔ ایسی صورت میں عموماً عیاش طبع لوگوں کو اخراجات وغیرہ کا خوف دلایا جاتا ہے۔ ہیرو بھی نہایت چالاکی اور ہوشیاری سے منگ کی توجہ اس جانب مبذول کراتا ہے۔ جس کی بنا پر منگ کو اور زیادہ غصہ آ جاتا ہے۔ جوں جوں ہیرو اس طائفے کو ملازم نہ رکھنے کے سلسلے میں اظہار رائے کرتا ہے۔ ویسے ویسے منگ کا ارادہ طائفے کو ملازم رکھنے کے سلسلے میں پختہ ہوتا جاتا ہے۔ روپے پیسے کے ذکر کو وہ اپنی توہین سمجھتا ہے اور ہیرو پر ناراض ہوتا ہے۔ لیل دوہری چال چل کر ہیرو اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اور منگ اس طائفے کو ملازم رکھ لیتا ہے۔

Marfat.com

ناول کا ہیرو ضعیف الاعتقاد بھی ہے۔ وہ تعویز گنڈوں اور فال نکالنے کا عادی ہے بات بات میں فال کا سہارا لینا اس کی ضعیف الاعتقادی کو ظاہر کرتا ہے۔ ہمارے خیال میں اس زمانے کے معاشرے میں ضعیف الاعتقادی اور مذہب کا اس صورت سے استعمال عام لوگوں کا وطیرہ تھا۔

اصول ضابطے اور دفتری امور کی پابندی کے سلسلے میں ہیرو بہت زیادہ محتاط ہے حتیٰ کہ سرکاری امور کی انجام دہی میں مصروف رہ کر وہ اپنے عشق کو بھی بالائے طاق رکھ دیتا ہے۔ اور محبوبہ کے تعاقب میں جانے اور اس کو حاصل کرنے کی نازک گھڑی میں بھی جب اس سے کسی باغیانہ اقدام کی توقع کی جاسکتی تھی وہ حساب کتاب کے معاملات میں ہی الجھا رہتا ہے۔ اور بعد از مرگ واویلا کرتا ہے۔ اپنی محبوبہ کے تعاقب میں ناکام ہو جانے کے بعد جو قیاس آرائیاں اور منصوبہ بازیاں وہ بعد میں سوچتا ہے۔ ان پر اگر پہلے ہی عمل کر لیتا تو بہتر ہوتا۔

ناول کے ہیرو شاہ حسن میں ارادے کی پختگی مفقود ہے۔ وہ سادہ لوح عاشق ہے اس کی اس سادگی، نوجوانی اور معصومیت پر خانم جان کے علاوہ بھی اس طائفے کی ساری طوائفیں فریفتہ ہیں۔ بہر حال عشق میں بے لوثی، جذبے کی شدت اور محبت کی بے قراری اس کی ذات کے خاص جوہر ہیں۔ ایک طرف اپنی محبوبہ کو قریب رکھنے کے لئے وہ کوشش کر کے اس کے طائفے کو منگ کے ہاں ملازم کراتا ہے۔ اور پھر خود ہی اس سلسلے میں پریشان ہو جاتا ہے کہ ایسا کرنے سے اس کی محبوبہ کی پاکدامنی متاثر ہو جانے کا ڈر ہے۔ یہ سوچ کر وہ جس کرب اور بے چینی سے گزرتا ہے۔ وہ دیدنی ہے اور پھر خود ہی اپنی محبوبہ کی حفاظت اور اس کی عصمت و عفت کی حفاظت کے لئے رات بھر وظیفہ کرتا ہے اور کامیاب ہوتا ہے۔ وہ دیانت دار ہے۔ منگ کو اس پر کامل اعتماد ہے۔ اسے سرکاری کاموں کی بجا آوری اور زندگی گزارنے کے طریقوں سے بھی کما حقہ واقفیت ہے لیکن معاملات عشق میں اناڑی ہے۔

Marfat.com

خانم جان میں اپنی دلچسپی کو پوشیدہ رکھنے کے لئے وہ نہایت احتیاط کرتا ہے۔ خانم جان کی طرح اس کو بھی انگریزوں اور دوسرے عیاش طبع لوگوں کے سامنے خانم جان کا آنا جانا پسند نہیں ہے۔ غیرت مند ہونے کے ساتھ ساتھ وہ اپنی مجبوری کو سمجھتا ہے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ بہر حال خانم جان کا تعلق طوائفوں سے ہی ہے۔ اور اس کی کچھ ایسی مجبوریاں بھی ہیں جو اس کے ماحول کے جبر نے اسے عطا کی ہوئی ہیں۔ البتہ جہاں ہیرو بعض مجبوریوں کے موقع پر بے دست و پا رہ جاتا ہے۔ وہاں خانم جان ہر آزمائش سے کامیاب ہو کر نکلتی ہے اس ناول کے ہیرو اور ہیروئن کسی قسم کی پاک محبت یا افلاطونی محبت کے قائل نہیں ہیں۔ وہ عشق میں جسم و جان کے تمام مرحلوں سے گزر جانا چاہتے ہیں۔ جنسی جذبہ دونوں میں موجود ہے۔ البتہ خانم جان کو محبت میں پاکدامنی مطلوب ہے۔ اور وہ اپنے جسم کو محبوب کو پیش کرنے سے قبل خفیہ طریقے پر اس سے نکاح پڑھوا لیتی ہے۔ دونوں کردار جنس کی بے پناہ کشش کے قائل نظر آتے ہیں۔ خانم جان اس لئے بھی جلد از جلد یہ رشتہ قائم کرنا چاہتی ہے کہ اسے یہ سکون و طمانیت حاصل ہو جائے کہ اس کی روح کے مالک نے ہی سب سے پہلے اس کے جسم کے لمس کو محسوس کیا تھا۔

رحم اللہ کا کردار

اس ناول میں رحم اللہ ننھے قاصد کے روپ میں نظر آتا ہے۔ ہمارے قصوں کہانیوں میں اس قسم کے کردار کوئی نئے اور اجنبی نہیں ہیں۔ لیکن نشتر پر بحث کرتے ہوئے اکثر ناقدین نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ مصنف نے جس طور پر رحم اللہ کے کردار کو متعارف کرایا ہے اس کی ضرورت تھی بھی یا نہیں؟ اور کیا ناول کے فارم میں وہ موزوں کردار کی حیثیت سے نظر بھی آتا ہے یا نہیں؟

میرے خیال میں ناول نگار کے لئے کسی ایسے کردار کی ضرورت تو تھی کہ جس سے

Marfat.com

ہیرو اور ہیروئن کے درمیان خطوط اور پیغامات کا تبادلہ ہو سکتا۔ غالباً ایسی صورت میں کسی بڑی عمر کی عورت یا مرد کو درمیان میں لانے سے کئی طرح کے خدشات پیدا ہو سکتے تھے۔ خانقے کے ملازمین یقینی طور پر ہیرو سے زیادہ اپنے مالکان کے وفادار ہو سکتے تھے۔ یہ پیغام رسانی کی قیمت زیادہ ادا کرنا پڑتی۔ رحم اللہ ایک ماما کا جو طائفے میں ملازم تھی، کم عمر لڑکا ہے۔ جو چند پیسوں میں خوش ہو جاتا ہے لیکن اصل میں اس کردار پر اعتراضات کی میرے نزدیک چند دوسری بنیادی وجوہ ہیں۔ اپنی کم عمری کے باوجود وہ اولین ملاقات میں ہیرو کے دلی جذبات کا اندازہ لگانے کے لئے جس طور پر گفتگو کرتا ہے۔ وہ ناقابلِ یقین ہے۔ اتنی چھوٹی سی عمر میں پختہ کار لوگوں جیسی باتیں کہنا یقیناً حیرت ناک ہے۔ اقتدار عالم نے بجا طور پر رحم اللہ کے کردار پر بحث کرتے ہوئے اپنے مضمون[۱] میں لکھا ہے کہ اس عمر میں ایسی باتیں کرنے والے کو تو جن ہی سمجھ کر خوفزدہ ہوا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اس کی باتیں کٹنیوں کو بھی مات کرتی ہیں۔

ہمارے خیال میں یہ ناول کا کوئی فالتو کردار نہیں ہے۔ کہانی کے سلسلے کو مربوط رکھنے اور اسے آگے بڑھانے میں یہ کردار معاون ثابت ہوتا ہے۔ البتہ بنیادی اعتراض اس کردار پر ایسے مکالمات کی ادائیگی ہے جو اس کی عمر کے بچے کے لئے قرینِ قیاس معلوم نہیں ہوتیں۔ اس کردار کی حد تک ہم ناول کے مصنف میں اس شعور کی کمی پاتے ہیں جس کو جدید تنقید کی روشنی میں، ہر کردار کے حسبِ حال اس سے مکالمہ ادا کرانا ہے۔ مصنف نے طوائفوں کی زندگی، ان کے مکالمات وغیرہ کو نہایت موزوں اور فطری انداز میں پیش کیا ہے۔ اور اس کا مشاہدہ بھی غضب کا ہے۔ لیکن رحم اللہ کے کردار کو اس کے فطری انداز میں پیش کرنے میں مصنف ناکام رہا ہے۔ رحم اللہ کی زبان سے جو گفتگو جن مواقع پر بھی اس ناول میں پیش کی گئی ہے۔

۱۔ اردو میں ناول نگاری کی ابتدا ایک نیا زاویۂ نظر مطبوعہ نقوش۔

Marfat.com

اس میں مصنف کے زورِ بیان عبارت آرائی اور مبالغے کو زیادہ دخل ہے۔

ناول پر عمومی بحث

ناول میں پلاٹ کی تعمیر کا اچھا انداز ملتا ہے۔ واقعات تناسب و ترتیب کے ساتھ ہمارے سامنے لائے جاتے ہیں۔ پہلا باب ناول کے ہیرو کی اعظم جی گوپے سے ملاقات پر شروع ہوتا ہے اور ابتدائی باب میں ہی تمام کردار ہمارے سامنے لاکر نہایت مختصر اور مکمل طور پر متعارف کرا دیئے جاتے ہیں۔

ابتدائی باب سے ہی ناول کی ہیروئن خانم جان کے بارے میں جو رائے قائم ہو جاتی ہے۔ وہ ناول کے اختتام تک باقی رہتی ہے۔ اور تمام واقعات اس کی توثیق کرتے چلے جاتے ہیں۔

ناول میں غیر ضروری طوالت سے گریز کرتے ہوئے ہر واقع کو اس کی ضرورت کے مطابق بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً کمن نامی انگریز کا ذکر چونکہ اس قصے سے براہِ راست اس کا کوئی تعلق نہیں تھا لہٰذا ایک ہی فقرے میں اس کے عیاشانہ مزاج کا تذکرہ کرتے ہوئے کہانی کو آگے بیان کر دیا گیا ہے۔

اسی طرح خانم جان کے کردار کے سلسلے میں اس کے حالاتِ زندگی جہاں بیان ہوئے ہیں۔ وہاں اس بات کی زیادہ تفصیل کی ضرورت نہ تھی کہ اس کی ماں کن پٹھانوں کے درمیان بیاہی گئی تھی۔ اور کہاں رہی تھی۔ صرف سرسری سا تذکرہ کرنے کے بعد ناول نگار آگے بڑھ جاتا ہے منگ کے کردار کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ چونکہ ناول میں صرف اس کی زندگی کے ایک اہم رخ یعنی عیاشانہ زندگی کو پیش کرنا مقصود تھا۔ لہٰذا صرف ایسے ہی واقعات کو چنا گیا ہے خانم جان اور اس طائفے کی دوسری طوائفوں کے ساتھ ربط و ضبط کی وجہ سے اس کا کردار آخر تک قصے کے ساتھ ساتھ چلتا ہے اور ہیرو ہیروئن کے علاوہ ناول کا سب سے زیادہ جاندار کردار نظر آتا ہے۔ منگ کا کردار اس عہد کے تمام انگریز افسران کے کردار، بالخصوص ان

Marfat.com

کی جنسی زندگیوں کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ البتہ ناول میں اس کی اپنی انفرادی خوبیاں بھی اجاگر ہیں۔ جو لازماً ہر انگریز اور خاص طور پر ایسٹ انڈیا کمپنی کے ابتدائی دور میں پیدا ہونے والے نودولیتے انگریز طبقے میں موجود نہیں تھیں۔ اس کی وجہ منگ کا خاندانی پس منظر ہے۔

اپنے اردگرد کے لوگوں کے ساتھ فیاضی، حسن سلوک، اور طبقہ شرفا کے وہ لوگ جو اس کی ملازمت میں ہوں ان سے اس کا سلوک قابلِ تعریف ہے۔

یہ کرداری ناول ہے جس کو واحد متکلم کے صیغے میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کا قصہ سیدھا سادا ہے نہ تو زیادہ پیچیدگی ہے نہ ہی سنسنی خیزی یا بے پناہ دشواریاں اور مہمات ہیں۔ عاشق و معشوق کے درمیان رکاوٹ موجود ہے لیکن قصہ کے ساتھ ساتھ یوں معلوم ہوتا ہے کہ عاشق و معشوق اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں گے۔ آخر میں ہیرو کی چند معمولی کوتاہیوں کی بنا پر محبت کا ایک المیہ جنم لیتا ہے۔

عاشق و محبوب کے شدید جذبات و احساسات اور لگاؤ کو دیکھتے ہوئے اور پھر ان موانعات کو دیکھتے ہوئے جن سے برد آزما ہونا ہیرو کے لئے کوئی زیادہ مشکل نہ تھا۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ خانم جان کی تقدیر میں یوں ہی لکھا تھا۔

زبان و بیان کے لحاظ سے بھی ناول بہت خوب ہے۔ مصنف نے ہر موقع پر حسبِ حال اشعار بیان کئے ہیں جن سے شدت تاثر میں اضافہ ہوتا ہے۔

Marfat.com

میر محسن لکھنوی

محسن لکھنوی کا نام اور خاص طور پر ان کا تذکرہ سراپا سخن جس قدر مشہور ہے۔ اسی قدر ان کے حالاتِ زندگی پردہ گمنامی میں ہیں۔ تذکرہ سراپا سخن تو کئی بار شائع بھی ہو چکا ہے۔ لیکن ان کے کلام کی اشاعت عمل میں نہیں آئی۔ اور نہ کسی ایسے قلمی نسخے کی ابھی تک دریافت ہوئی ہے کہ جس میں ان کا پورا شعری سرمایہ محفوظ ہو۔ ان کا مختصر سا کلام تذکرہ سراپا سخن سے ملتا ہے۔ یہ وہ غزلیں ہیں جنھیں محسن لکھنوی نے سراپا سخن میں تذکرے کی تقسیم کے متعلق موضوعات کے اعتبار سے پیش کرنے کی. خاطر لکھا ہوگا۔ تادم تحریر ان کا مطبوعہ کلام کا ماخذ بس سراپا سخن ہی ہے۔ چند متفرق اشعار جو مختلف تذکروں میں ملتے ہیں۔

محسن کے حالاتِ زندگی بھی مختصراً سراپا سخن میں ہی ملتے ہیں۔ محسن لکھنوی، شاہ حسین حقیقت کے لڑکے تھے۔ شاہ حسین کی اولاد کے بارے میں کوئی تفصیل نہیں ملتی۔ لہٰذا نہیں کہا جا سکتا کہ محسن کے کتنے بھائی اور بہن تھے۔

اپنے مولد و مسکن کا ذکر کرتے ہوئے محسن لکھتے ہیں "والد ماجد (شاہ حسین حقیقت) اپنے نانا حکیم میر محمد نواز صاحب مرحوم کے ساتھ اودھ کے دارالسلطنت لکھنؤ میں آکر مقیم ہوئے۔ اس سبب سے اس خادم کا مولد و مسکن یہاں ہے[1]۔"

۱:۔ تذکرہ سراپا سخن ص۱۔ مطبوعہ مطبع مصطفائی لکھنؤ۔

Marfat.com

محسن لکھنوی کا صحیح سنہ پیدائش معلوم نہیں ہے۔ البتہ انھوں نے اپنا مولد لکھنؤ بتایا ہے۔ اس بنا پر یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ان کی پیدائش ۱۷۸۶ء کے بعد کی ہے۔ کیونکہ اسی سال یا اس سے کچھ عرصہ بعد حقیقت لکھنؤ آئے تھے۔ اس سے پہلے وہ اپنے اپنے برادر بزرگ سید حسن شاہ ضبط کے ساتھ کانپور میں مقیم تھے۔ جہاں ضبط، ایک انگریز افسر منگ کے منشی کے فرائض سرانجام دیتے تھے۔ ہم حقیقت کے حالات زندگی میں یہ بات کہہ آئے ہیں کہ جس وقت شاہ حسن ضبط اپنا سلسلۂ ملازمت منقطع کر کے قصبہ جاج مئو (کانپور) سے لکھنؤ آئے۔ تھا اس وقت ان کی عمر پندرہ سولہ برس اور ان کے چھوٹے بھائی حقیقت کی عمر تیرہ چودہ برس تھی۔

حقیقت کے سنہ پیدائش کے سلسلے میں ہم مختلف شواہد کی بنا پر گزشتہ باب میں یہ طے کر چکے ہیں کہ وہ ۱۷۷۱ سنہ عیسوی (۱۱۸۶ سنہ ہجری) میں پیدا ہوئے تھے۔ گویا ۱۷۸۶ء لکھنؤ میں حقیقت کی آمد کا سال ہے۔ اس وقت حقیقت کی عمر چودہ برس کے لگ بھگ تھی۔ اگر اس زمانے کے رسم و رواج کے مطابق ان کی شادی کی عمر اٹھارہ برس قیاس کی جائے تو گویا ۱۷۹۰ سنہ عیسوی کے لگ بھگ حقیقت کی شادی ہوئی ہوگی۔ اس حساب سے ہم ۹۲-۱۷۹۱ء کو محسن لکھنوی کا سنہ پیدائش قرار دے سکتے ہیں۔

محسن لکھنوی کے حالات زندگی کے بارے میں ان کے خاندان کے ایک نامور فرزند میجر جنرل سید شاہد حامد صاحب نے جو معلومات فراہم کی ہیں ان کے مطابق محسن لکھنوی، لکھنؤ کے اٹکی محلے میں پیدا ہوئے تھے۔ مروجہ تعلیم و تربیت پائی تھی۔ شعر و ادب کا ذوق فطری تھا۔

گو شاعری ان کا فن خاندانی تھا۔ لیکن اس زمانے کی عام لکھنوی فضا ہر شخص میں

Marfat.com

شعر گوئی اور شعر فہمی کی صلاحیتیں بیدار کر دیتی تھی۔ چنانچہ عنفوان شباب میں، محسن لکھنوی بھی شعر گوئی اور تذکرہ نگاری کی طرف مائل ہوئے۔ وہ اعلیٰ درجے کا علمی ذوق رکھتے تھے۔ چنانچہ بہت سی قدیم علمی کتابیں۔ ان کے ایما یا تحریک پر ناشرین، خاص طور پر مطبع مصطفائی نے شائع کیں۔ ایسی کتب میں خود محسن کے والد، شاہ حسین حقیقت کی بھی بعض کتابیں تھیں۔ خزنیتہ الامثال کا دوسرا ایڈیشن انہی کی کوششوں اور ایما سے مطبع مصطفائی سے شائع ہوا تھا۔

محسن لکھنوی نے جب شاعری کی طرف توجہ کی تو رواج کے مطابق، کسی استاد کی تلاش ہوئی۔ سلسلہ ناسخ کے مشہور شاعر وزیر اس زمانے کے ممتاز شعرا میں سے تھے۔ محسن نے ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ گو کچھ عرصہ کے لئے محسن نے رشک سے بھی استفادہ کیا تھا اسے بھی ایک طرح سے استادی شاگردی کا تعلق ہی کہا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اسی سبب سے بیشتر تذکرہ نگاروں نے محسن کو خواجہ وزیر اور رشک دونوں کا شاگرد لکھا ہے۔ البتہ اتنا ثابت ہے کہ محسن نے قیام کانپور کے زمانے میں، اپنا کلام رشک کو دکھایا تھا۔ یہ بات وثوق سے نہیں کہی جا سکتی کہ آیا اپنے استاد خواجہ وزیر کے بعد انھوں نے رشک سے مشورہ سخن کیا تھا۔ یا عارضی طور پر صرف کانپور کے زمانۂ قیام میں انھیں اپنا کلام دکھاتے اور ان کے مشوروں سے مستفید ہوتے رہے تھے۔

اردو کے تمام تذکروں میں انھیں رشک اور وزیر کا شاگرد لکھا گیا ہے۔ البتہ مشہور فرانسیسی مستشرق گارساں دتاسی اس سلسلے میں غلط فہمی کا شکار ہو گئے اور انھوں نے رشک و وزیر کو محسن لکھنوی کا رشتے دار بتایا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

" اس تذکرے (سراپا سخن) کے مصنف کا نام محسن ہے۔ یہ حقیقت کے بیٹے اور وزیر کے پوتے ہیں۔ محسن کے باپ اور دادا دونوں اردو کے

Marfat.com

مشہور شاعروں میں سے ہوئے ہیں۔ محسن کے خاندان کے دو بزرگوں رشک اور عشق نے ان کی پرورش کی تھی۔ رشک بھی شعر کہتے تھے اور عشق نے شعرائے اردو کا ایک تذکرہ لکھا ہے[۱]۔"

گارساں دتاسی کو اس سلسلے میں غلط فہمی ہوئی۔ خطبات گارساں دتاسی کے اردو ترجمے مطبوعہ انجمن ترقی اردو میں بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے ایک نوٹ میں اس غلطی کی تردید کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"مصنف کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ محسن وزیر کے پوتے نہیں تھے۔ بلکہ ان سے کسی قسم کا رشتہ بھی نہ تھا۔ البتہ وہ وزیر کے شاگرد تھے۔ اور اس کا ذکر خود انھوں نے اپنے تذکرے میں کیا ہے۔ ان کے دادا کا نام عرب شاہ تھا۔ رشک اور عشق ان کے خاندان کے بزرگ نہ تھے۔ عشق ان کے دوست تھے اور رشک سے ان کو تلمذ تھا۔ ان کو رشک اور وزیر کی شاگردی کا فخر حاصل تھا مؤلف خطبات کو ان صاحبوں کے تعلقات کے سمجھنے میں مغالطہ ہوا ہے۔"

خوش معرکۂ زیبا کا مؤلف لکھتا ہے:۔

" سید خجستہ خصال شیریں مقال عیر ممکن اس سے ممکن، میر محسن علی، تخلص محسن صاحب منش و لیاقت خلف الصدق منشی شاہ حسین حقیقت، سید موصوف نے ایک تذکرہ اشعار تعریف سراپا میں لکھنا شروع کیا ہے۔ الٰہی انجام اس کا بخیر ہو، پہلے وہ شاگرد خواجہ وزیر کے تھے بہ سبب سکونت کانپور کے میر علی اوسط رشک سے تلمذ حاصل ہوا[۲]۔"

۱:۔ گارساں دتاسی ص (۲) تذکرہ خوش معرکۂ زیبا از سعادت خاں ناصر مرتبہ مشفق خواجہ مطبوعہ مجلس ترقی اردو ادب لاہور ص

سلسلۂ معاش

محسن لکھنوی کی ساری زندگی لکھنؤ میں بسر ہوئی۔ لکھنؤ میں ان کا ذریعہ معاش کیا تھا؟ اس سلسلے میں کچھ معلوم نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ لکھنؤ میں ان کی گزر بسر کا ذریعہ صرف وہ وظیفہ تھا جو ان کے والد اور چچا کی خدمات کے صلے میں ان کی اولاد کو ملتا تھا۔ محسن لکھنوی چونکہ قناعت پسند واقع ہوئے تھے۔ لہذا معاش کے سلسلے میں کسی قسم کی بھاگ دوڑ ان کی افتادِ طبع کے خلاف تھی خوش معرکہ زیبا سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۶۱ ہجری میں محسن لکھنوی کانپور میں بہ سلسلۂ تجارت مقیم تھے۔ اس زمانے میں سعادت خاں ناصر لکھنوی تذکرہ خوش معرکہ زیبا لکھنے میں مصروف تھے۔ محسن لکھنوی اپنا اور دوستوں کا کلام اس تذکرے کے لئے انھیں بھیجتے تھے۔

البتہ کانپور میں انھوں نے اپنے زمانۂ قیام میں تجارت شروع کی تھی۔ یہاں انھوں نے ایک مطبع اور ایک اشاعت گھر قائم کیا تھا۔ تاہم ان کی سادہ لوحی اور شاعرانہ مزاج کی بنا پر یہ تجارت ناکام ہو گئی اور نقصان اٹھانے کے بعد انھوں نے اس کو بند کر دیا۔ اس وقت بعض دوستوں کی بے رخی نے بھی انھیں رنج پہنچایا۔

خراب معاشی حالات اور دوستوں کی بے رخی کے زمانے میں ان کے گہرے دوست شیخ الٰہی بخش عشقی نے ان کی دلجوئی اور دلداری کی۔ شیخ الٰہی بخش عشقی خود بھی اچھے شاعر تھے۔ ان کا کلام محسن کے مرتبہ تذکرہ سراپا سخن کے علاوہ اس زمانے میں لکھے جانے والے دوسرے تذکروں میں بھی ملتا ہے۔ محسن نے انھیں محبِ صادق اور شفیقِ دلی کے القاب سے یاد کیا ہے۔

محسن لکھنوی نے اپنے قائم کردہ اس مطبع سے کونسی کتب شائع کی تھیں۔ ان کے بارے میں بھی کچھ معلوم نہیں ہے۔

Marfat.com

شخصی محاسن محسن لکھنوی پسندیدہ عادات کے مالک تھے۔ اپنے اوصاف حمیدہ، وضعداری و شرافت کے سبب لوگوں میں بہت مقبول تھے۔ اسی سبب سے ان کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا۔ اپنے زمانے میں لکھنؤ کی ادبی محفلوں اور مشاعروں کی زندگی تھے۔ مزاج شاعرانہ اور روش قلندرانہ تھی۔ گو خود بھی مالی طور پر بہت زیادہ خوشحال نہ تھے۔ لیکن اپنی استطاعت سے زیادہ غریبوں اور حاجت مندوں کی مدد کیا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ بعض اوقات ضرورت مندوں کو سردیوں کے موسم میں اپنا لحاف اور بستر تک دے دیا کرتے تھے۔

محسن لکھنوی آخری عمر میں تارک الدنیا ہو گئے تھے اور درویشی اختیار کر لی تھی۔

محسن کی اہلیہ کم سنی میں ہی محسن لکھنوی کی شادی ہو گئی تھی۔ دونوں میاں بیوی میں بہت زیادہ محبت تھی۔ تنگدستی و مفلسی کے باوجود ان کی ازدواجی زندگی خوشگوار تھی۔ ان کی اہلیہ بھی اس زمانے کے معیار کے لحاظ سے تعلیم یافتہ تھی۔ وہ حافظ قرآن بھی تھیں۔ آخری عمر میں کچھ سنک دماغ میں پیدا ہو گئی تھی۔ چنانچہ اوراد و وظائف کثرت سے پڑھا کرتی تھیں۔ اور ساری ساری رات کھڑے ہو کر قرآن شریف کی تلاوت کیا کرتی تھیں۔

اولاد محسن لکھنوی کے چار لڑکے اور ایک لڑکی تھی۔ سب سے بڑے لڑکے کا نام سید محمد حسین تھا۔ ان سے چھوٹے سید احمد حسین، سید علی حسین، اور سید جعفر حسین تھے۔ لڑکی کا نام کنیزہ فاطمہ تھا۔ ان کی اولاد میں سے دو لڑکے نامور ہوئے۔ ایک سید محمد حسین جو بعد میں سید محمد حسین لندنی کے نام سے معروف ہوئے۔ یہ زراعت کی اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان بھی گئے تھے۔ جہاں ایک

Marfat.com

حادثے میں ان کی ایک ٹانگ ٹوٹ گئی تھی۔ ملکہ وکٹوریہ نے، جن کی رحم دلی مشہور ہے انھیں اپنا منہ بولا بیٹا بنایا تھا۔ اور انہی کے اخراجات پر محمد حسین لندنی نے تعلیم حاصل کی۔ سید محمد حسین نے زراعت کے موضوع پر کئی کتابیں بھی لکھی تھیں۔

محسن کے دوسرے نامور فرزند خان بہادر سید جعفر حسین لکھنوی تھے۔ انھوں نے بھی اپنی محنت اور جدوجہد سے معاشرے میں قابلِ رشک مقام بنایا۔ اور صوبجات متحدہ کے نامور انجینئر ہوئے۔ سید جعفر حسین کی زندگی کو مرزا رسوا نے اپنے ناول شریف زادہ کا موضوع بنایا تھا۔ سید جعفر حسین کو آج کل کی اصطلاح میں (SELF - MADE) کہنا چاہیئے۔ ان کے تفصیلی حالات ہم آئندہ پیش کریں گے۔ محسن کے باقی لڑکوں کے بارے میں تفصیلی حالات نہیں ملتے۔

وفات محسن کے سالِ وفات کا صحیح تعین نہیں کیا جا سکتا۔ ۱۸۷۱ء کے لگ بھگ ان کا انتقال ہوا۔ تذکرہ شمیم سخن کے مولف مولوی عبدالحئی صفا بدایونی نے ان کا ذکر ان شعراء میں کیا ہے جو ۱۲۸۸ھ (۱۸۷۱ء) تک انتقال کر چکے تھے[1]۔

۱۔ تذکرہ شمیم سخن صـ ۱۹۲

Marfat.com

تذکرہ سراپا سخن

تذکرہ نگاری اردو تنقید کی ابتدا ہے۔ قدیم تذکروں میں زیادہ تر تاثراتی تنقید ملتی ہے۔ اور یہ تنقید بھی چند فقروں تک ہی محدود ہوتی ہے۔ تاہم اردو میں لکھے جانے والے تمام تذکروں کی سب سے بڑی افادیت یہ ہے کہ اس میں درجہ اوّل کے شعرائے سے لے کر درجہ سوم تک کے شعرائے کے مختصر حالاتِ زندگی، اور ان کے نمونہ ہائے کلام دستیاب ہو جاتے ہیں۔

بڑے شاعروں کے کلام کو تاریخِ ادب خود محفوظ رکھتی ہے۔ چھوٹے درجے کے بے شمار شاعر ان تذکروں کی وجہ سے زندہ ہیں۔

تذکرہ نگاری بھی ایک فن تھا۔ اور اس کی ترتیب کے بھی کچھ اصول و قواعد ہوتے تھے اردو کے زیادہ تر تذکرے دہلی میں ہی لکھے گئے۔

دہلی میں لکھے جانے والے تذکروں میں بالعموم ترتیب کے دو انداز ہمیں نظر آتے ہیں۔

(۱) حروفِ تہجی کے اعتبار سے ترتیب دیئے ہوئے تذکرے۔ ان تذکروں میں تذکرہ ریختہ گویاں، عمدہ منتخبہ، گلشنِ بے خار وغیرہ شامل ہیں۔

(۲) بااعتبار زمانہ ترتیب دیئے جانے والے تذکروں میں مخزنِ نکات، تذکرہ شعرائے اردو اور طبقات الشعرائے ہند وغیرہ کو پیش کیا جا سکتا ہے۔

جس طرح لکھنوی شاعری کا مزاج، دہلوی شاعری سے مختلف ہے۔ اسی صورت میں

Marfat.com

لکھنؤ میں لکھے جانے والے تذکروں کا انداز ترتیب بھی مختلف ہے، اس فرق کو بیان کرتے ہوئے قطعۂ منتخب کے دیباچے میں محمد انصار اللہ لکھتے ہیں " لکھنؤ میں تذکرہ نویسی کے، مختلف انداز ملتے ہیں۔ اس میں وہاں کے مخصوص حالات میں پروان چڑھتے ہوئے مسابقت کے جذبہ کو بھی دخل ہو سکتا ہے۔ کسی نے استادی اور شاگردی کے تعلق کو بنیاد بنا کر تذکرہ منتخب کیا ہے (خوش معرکۂ زیبا) کسی نے ایک موضوع (انسانی کے جسم کے مختلف اعضا) سے متعلق اشعار جمع کر کے شعراء کے حالات لکھے ہیں۔ (سراپا سخن) اور کسی نے اصناف سخن میں سے کسی ایک کے مختلف نمونے فراہم کئے ہیں" (قطعۂ منتخب)

تذکرہ سراپا سخن اپنی نوعیت کا واحد تذکرہ ہے۔ اس میں تذکرہ نگاری کی عام روش کہ مختلف شعراء کا نام مولد و مسکن، سلسلہ تلمذ اور انتخاب اشعار دے دیا جائے، نہیں اختیار کی گئی۔

جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے۔ اس میں محبوب کے سراپا یعنی جسم کے مختلف اعضاء کے بارے میں مشاہیر شعراء اور متوسط درجے کے شعراء کا انتخاب نہایت کاوش کے ساتھ مدیف وار جمع کر دیا گیا ہے۔ اس اعتبار سے اس تذکرے کو لکھنوی مزاج کی جدت طرازی کا ایک نمونہ کہنا کچھ بے جا نہ ہوگا۔

اس تذکرے میں زمانے کی کوئی قید نہیں ہے۔ متقدمین شعراء کے اشعار بھی اس میں پیش کئے گئے ہیں اور معاصر شعراء کے بھی۔ جب اس منفرد انداز کے تذکرے کی ترتیب و تالیف کا ارادہ محسن نے کیا تو اپنے زمانے کے شعراء کو ان موضوعات پر خامہ فرسائی کی دعوت دی تھی۔

محسن نے سراپا سخن کی تالیف کا کام ۱۸۴۸ء میں شروع کیا تھا۔ دس برس کی محنت

قطعۂ منتخب:۔ مرتبہ انصار اللہ نظر مطبوعہ انجمن ترقی اردو پاکستان۔ ص۱

Marfat.com

کے بعد ۱۸۵۸ء میں یہ تذکرہ پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ اس عرصے میں ۱۸۵۷ء کا انقلاب بھی اپنی پوری قہر سامانیوں کے ساتھ اہل ہندوستان کے سروں پر سے گزر چکا تھا۔

اس تذکرے کی تکمیل کے وقت شیخ امام بخش ناسخ زندہ تھے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ شیخ امام بخش ناسخ نے ہی محسن لکھنوی کو اس نوع کا تذکرہ مرتب کرنے کا مشورہ دیا تھا لیکن ایسا کہنا صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ خود محسن کے بیان سے اس دعوے کی تردید ہوتی ہے۔ محسن نے امام بخش ناسخ کو یہ مشورہ دیا تھا کہ ان کے کلام سے ایسے اشعار اور غزلیں منتخب کی جائیں جن میں محبوب کا سراپا بیان ہوا ہو۔ اس پر شیخ امام بخش ناسخ نے انھیں مشورہ دیا کہ صرف ان کے کلام کا ایسا انتخاب چنداں فائدہ مند نہ ہوگا بلکہ اگر وہ ماضی و حال کے تمام شعرا کے ایسے اشعار منتخب کر کے یکجا کر دیں تو بہتر ہوگا۔ چنانچہ ہم محسن لکھنوی کا بیان نقل کرتے ہیں۔

"اسی زمانے میں جناب استاد شیخ امام بخش ناسخ مرحوم کانپور تشریف لائے ہوئے تھے۔ انھوں نے یہ غزل ارشاد فرمائی۔ ؎

جب کبھی پہنا جڑاؤ اس نے زیور کان میں

تو میں نے عرض کیا کہ اکثر غزلیں آپ نے اسی طور کی فرمائی ہیں۔ اگر سب اعضا میں غزلیں ہو جائیں تو ایک دیوان بطور سراپا ترتیب دیا جائے۔ لیکن اس وقت کوئی جواب ارشاد نہ ہوا۔ لیکن دوسرے دن اس غزل سے محفوظ فرمایا ؎

کیا نسیم صبح لائی ہے مرا دم ناک میں

اور اسی قسم کی اکثر غزلیں اور بھی فرمائیں مگر افسوس کہ ان کی زندگی نے وفا نہ کی۔ اس مہربان نے فرمایا کہ انسان کو فنا ہر حال میں ہے لہذا اس

فرصت کو غنیمت سمجھنا چاہیئے اگر تو کمر ہمت باندھے، اشعار شیریں ماضی و حال جمع کر کے تذکرہ "بطور سراپا" لکھے تو غالب ہے کہ یہ نئے رنگ ڈھنگ کا تذکرہ نادر الوجود و نایاب ہوگا امید ہے کہ ذوق ادب رکھنے والے احباب کے لئے باعث سرور بلکہ موجب بقائے نام ہوگا۔"

(دیباچہ تذکرہ سراپا سخن)

محسن نے اس تذکرے کی ترتیب میں پندرہ تذکروں سے مدد لی ہے۔ ان کے علاوہ صدہا دواوین اور ہزارہا بیاضوں کا مطالعہ کر کے نہایت محنت اور عرق ریزی سے ۷۲۱ شعرا کا کلام منتخب کیا۔ جو "سراپا" پر محیط تھا۔

اردو میں کم تذکرے ایسے لکھے گئے ہیں جن میں اتنی تعداد میں شعرا کو شامل کیا گیا ہو۔ شعرا کی اس کثرت تعداد کے اعتبار سے بھی یہ تذکرہ اہم اور قابل قدر ہے۔

اردو کا کوئی تذکرہ نگار جانبداری کے الزام سے بری الذمہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ لیکن محسن لکھنوی کا تذکرہ اس اعتبار سے بھی ممتاز ہے کہ اس میں کسی قسم کی جانبداری یا تعصب کا خیال نہیں رکھا گیا۔ محسن نے مہذب اور عالمانہ انداز میں اس تذکرے میں شامل شعرا کے ادبی اور ذاتی اوصاف کو بیان کیا ہے۔ گو فن کے بارے میں اظہار خیال مختصر ہے۔ لیکن جامع ہے۔ اور ان سے محسن کے تنقیدی شعور اور بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔

محسن نے یہ کوشش کی تھی کہ ماضی کے شعرائیں سے کوئی شاعر اس تذکرے میں شامل ہونے سے نہ رہ جائے اور نہ ہی معاصر شعرائیں سے کسی کو اس بزم میں آنے سے روکا جائے۔ چنانچہ معاصر شعرائیں اگر کوئی شاعر شامل ہونے سے رہ گیا۔ تو اس کی ذمے داری محسن پر عائد نہیں ہوتی۔ کیونکہ ممکن ہے ایسے شاعر کے دستیاب شدہ کلام میں تذکرے کے موضوع کے مطابق

Marfat.com

کوئی شعر دستیاب نہ ہوا ہو۔ یا پھر کسی نے محسن کی بار بار کی درخواست کو درخور اعتناء نہ سمجھتے ہوئے اس موضوع پر اشعار کہہ کر دیے ہوں۔

دواوین سے ایسے اشعار کے انتخاب اور ہم عصر شعرا سے حصول کلام کے لئے محسن کو کس قدر محنت اور صبر آزما حالات سے گزرنا پڑا، قاری کو اس کا اندازہ محسن کے اس بیان سے ہوگا۔

" پندرہ تذکرے اور صدہا دواوین اور بیاضیں بڑی تلاش و جستجو سے بہم پہنچائیں۔ جب جا کر شعرائے ماضی کا کلام دستیاب ہوا۔ میں نے اور احباب نے دور کے شہروں کے ناظموں کی خدمت میں خطوط لکھوا کے بھیجے۔ حتیٰ کہ چار مطابع اخبار میں بھی یہ خبر چھپوائی۔ جب جا کر اشعار ان حضرات کے میسّر ہوئے۔ اور شعرائے معاصرین کی خدمت میں دوبارہ حاضر ہو کر غزلیں لایا۔ جن کی کوئی غزل اس قسم کی نہیں تھی ان سے کہلوائی اور مشاعروں میں اس طرح کی طرحیں کیں۔ غرضیکہ اس تلاش و جستجو سے ۷۰۰ سو شعراؑ کا کلام فراہم کیا۔ پھر بھی بعض شعراؑ ہم عصر کا کلام اس وجہ سے باقی رہ گیا کہ کوئی غزل اس قسم کی ان کے کلام سابق میں نہ تھی۔ اور بعض نے بددماغی سے، عذر لنگ کیا۔ میری طرف سے کوشش میں ہرگز کمی نہیں ہوئی۔ "

(دیباچہ سراپا سخن)

سراپا سخن پر بعض اعتراضات بھی کئے جاتے ہیں۔ ایک تو محسن لکھنوی نے ان پندرہ تذکروں کے نام نہیں بیان کئے کہ جن سے اس تذکرے کی ترتیب میں مدد لی گئی تھی۔ اس طرح تذکرے کی افادیت میں اضافہ ہو جاتا۔

۱:۔ دیباچے میں محسن نے شعرا کی تعداد سات سو بیان کی ہے جبکہ اصل تعداد ۷۲۱ ہے جو غالباً کتابت کی غلطی ہے۔

Marfat.com

اس تذکرے میں موضوعات کے علاوہ اور کسی قسم کی ترتیب نہیں پائی جاتی۔ حروف تہجی کے اعتبار سے جدید انداز میں اس کی ترتیب ڈاکٹر سید سلیمان اور پروفیسر آفتاب احسن نے کی ہے۔ بین الفضل نے صرف شعرا کے حالاتِ زندگی کو حروفِ تہجی کے اعتبار سے ترتیب دے دیا ہے۔ اور اس اعتبار سے ان کے اشعار نہیں دیئے ہیں۔

راقم الحروف کے سامنے اس تعارف کے لکھتے وقت وہ نسخہ ہے جو نولکشور پریس شائع ہوا تھا۔ یہی اس کی اولین طباعت ہے۔

سراپا سخن کی تقلید محسن نے تذکرہ نگاری میں جو جدت کی تھی اس نے اس زمانے اور بعد میں آنے والے بہت سے تذکرہ نگاروں کو متاثر کیا۔ مثال کے طور پر کلکتہ کے منشی عبدالغفور خاں نسّاخ کا تذکرہ قطعۂ منتخب پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس تذکرے میں شعرا کے قطعات پیش کئے گئے ہیں۔ شعرا کے حالاتِ زندگی کی حد تک نسّاخ کے تذکرے کا ماخذ، محسن کا تذکرہ سراپا سخن ہے۔ اس سلسلے میں ذیل میں صرف ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔

سراپا سخن "آشفتہ، عظیم الدین خاں عرف بھورے خاں مرحوم۔ آشفتہ عزیز دل میں سعادت خاں بن مکرّم خان کے، باشندہ دہلی، صاحب دیوان اعلیٰ شاگرد میر محمدی مائل کے، بعدہٗ اصلاح شعر میں فرزند علی مضمون سے لی۔ ان کے ہر قطعہ میں مضمون زلف ہوتا ہے۔

قطعۂ منتخب آشفتہ تخلص، عظیم الدین خاں عرف بھورے خاں دہلوی، عزیز سعادت خاں بن مکرّم خان، شاگرد میر محمدی مائل فرزند علی مضمون ان کے بیشتر قطعے میں "زلف" کا مضمون ہوتا ہے۔ صاحب دیوان گزرے ہیں۔"

Marfat.com

گویا نساخ نے حرف بہ حرف سراپا سخن سے استفادہ کیا ہے۔ اور کسی قسم کی تحقیق بھی نہیں کی۔ سراپا سخن میں بعض شاعروں کے تخلص غلط دیئے گئے تھے۔ نساخ نے اسی تخلص کو بیان کر دیا ہے۔ اوپر دی گئی مثال میں تذکرہ سراپا سخن میں فرزند علی کا تخلص مضمون بیان کیا گیا ہے جبکہ ان کا تخلص موزوں تھا۔ نساخ نے بھی ان کا تخلص مضمون ہی لکھ دیا۔

سراپا سخن میں نازنین کا تعارف اس صورت سے تھا۔ "نازنین مرزا علی بیگ نازنین تخلص، ریختی گو دہلوی۔۔۔ قطعۂ منتخب میں اسی طرح بیان ہوا ہے۔" نازنین تخلص مرزا علی بیگ ریختی گوئے دہلی۔

نساخ نے سخن شعرا میں بھی محسن کے سراپا سخن سے استفادہ کیا ہے۔ اسی طرح ارمغان گوکل پرشاد بھی سراپا سخن کی تقلید میں لکھا گیا ہے۔ ارمغان گوکل پرشاد کے مرتب ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں۔ "ارمغان گوکل پرشاد" دو شعرا[1] کا ایک اہم اور نادر و نایاب قدیم تذکرہ ہے۔ اپنے مخصوص موضوع، منہج اور ترتیب کے لحاظ سے اسے اردو شعرا کے سارے تذکروں میں منفرد حیثیت حاصل ہے۔ صرف "سراپا سخن"، مولفہ سید محسن علی محسن ایک ایسا تذکرہ ہے جو "ارمغان گوکل پرشاد" کے رنگ روپ اور موضوع سے ملتا جلتا ہے لیکن جامعیت اور بعض دوسری خصوصیات کے لحاظ سے وہ بھی ارمغان کے مرتبے کو نہیں پہنچتا[1]۔"

ڈاکٹر صاحب موصوف نے اپنے دیباچے میں کئی جگہ ارمغان گوکل پرشاد کا موازنہ سراپا سخن سے کیا ہے۔ اور ارمغان کی تعریف میں مبالغہ آرائی سے کام لیتے ہوئے سراپا سخن کے مولف کی کاوشوں کو کم کرنے کی کوشش کی ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ سراپا سخن کو نہ صرف

---

[1]۔ تذکرہ ارمغان گوکل پرشاد مرتبہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری۔ ص ج مطبوعہ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی۔

Marfat.com

اس نوع کے تذکروں میں اولیت کا درجہ حاصل ہے بلکہ سراپا سخن ہر لحاظ سے جامع بھی ہے۔ سراپا سخن میں بس ایک ہی بات کھٹکتی ہے کہ تمام شاعروں کے نام اور حالاتِ زندگی کی تکرار پائی جاتی ہے۔ اس حد تک ڈاکٹر صاحب موصوف کا اعتراض بجا ہے۔ ورنہ ارمغانِ گوکل پرشاد کے مقابلے میں سراپا سخن میں تراجم کا معیار بھی بلند ہے۔

Marfat.com

مخزن نکات اور اس کا ترجمہ

ترجمۂ مخزن نکات

مخزن نکات فارسی زبان میں لکھا ہوا اردو شاعروں کا تذکرہ ہے۔ اس کے مصنف قائم چاندپوری ہیں۔ قائم چاندپوری کا شمار اردو کے ممتاز شعرائیں ہوتا ہے۔ مخزن نکات تاریخی نام ہے جس سے اس کا سنہ تصنیف ۱۱۶۸ھ ۱۷۵۵ء برآمد ہوتا ہے۔

قائم چاندپوری نے اسے شمالی ہند کا پہلا تذکرہ کہا ہے۔ لیکن میر اور گردیزی کے تذکروں کی موجودگی میں یہ مسئلہ بحث طلب ہے۔ بہرحال تذکرے کی افادیت اور اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔

اس تذکرے میں سوا سو کے قریب شعرا کے حالات زندگی اور نمونہ ہائے کلام دیئے گئے ہیں۔ قائم نے تذکرے کو تین حصوں میں تقسیم کیا تھا۔ طبقہ اول میں شعرائے متقدمین طبقہ دوم میں متوسطین، اور طبقہ سوم میں شعرائے متاخرین کے حالات زندگی اور نمونہ ہائے کلام دیئے گئے تھے۔ یہ تذکرہ اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ اس میں دکن کے شعرا کو بھی جگہ دی گئی ہے۔ گو میر کے تذکرے نکات الشعرا میں بھی دکنی شاعروں کے حالات دیئے گئے ہیں، لیکن ان کی تعداد مخزن نکات کے مقابلے میں بہت کم ہے۔

محسن لکھنوی نے قائم چاندپوری کے اس تذکرے کا اردو ترجمہ کیا تھا۔ یہ ترجمہ کتابی

Marfat.com

صورت میں شائع نہ ہو سکا۔ اس کے کسی دوسرے نسخے کے بارے میں بھی کچھ معلوم نہیں ہے۔ اس ترجمے کا ایک قلمی نسخہ رامپور لائبریری میں موجود ہے۔ اس ترجمے کی دریافت کا سہرا، مشہور محقق جناب امتیاز علی عرشی کے سر ہے۔ انھوں نے ہی سب سے پہلے رسالہ اردو میں اس ترجمے پر ایک تعارفی مضمون لکھا تھا۔

اس قلمی نسخہ کی ایک مصدقہ نقل جناب مشفق خواجہ کے ذاتی کتب خانے میں موجود ہے۔ اور زیرِ نظر مضمون لکھتے وقت وہی نسخہ مصنف کے پیشِ نظر ہے۔

اس ترجمے میں کہیں بھی مترجم نے اپنا نام نہیں لکھا ہے۔ ممکن ہے مخطوطے کا پہلا ورق ضائع ہو گیا ہو۔ تاہم بعض شاعروں کے حالات بیان کرتے ہوئے مترجم نے تذکرۂ احباب کے مولف کو اپنا والد بتایا ہے جو شاہ حسین حقیقت کا لکھا ہوا ہے۔ لہٰذا اس بات کے تسلیم کرنے میں کسی قسم کا تامل باقی نہیں رہتا کہ اس کے مترجم محسن لکھنوی ہیں۔ ایک اور جگہ محسن نے اپنے چچا شاہ حسن ضبط کا ذکر کیا ہے اور ان کا کلام دیا ہے۔

محسن لکھنوی کو اس کا مترجم قرار دیتے ہوئے مولانا عرشی لکھتے ہیں۔

"کتاب میں مترجم کا نام نہیں ہے۔ لیکن خاتمے میں مقام لکھنؤ لکھا ہے جس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ وہ لکھنؤ کا باشندہ تھا۔ نیز اس نے ورق ۹ ب پر تذکرۂ احباب کے مولف کو اپنا والد بتایا ہے اور ورق ۲۸ ب پر اپنے عمو صاحب کا ذکر شعر فہم اور شعر سے واقف شخص کی طرح کیا ہے۔ نیز شیخ ناسخ کو ورق ۱۸ ب پر "امام الکلام فخر الاساتذہ، شیخ امام بخش ناسخ مغفور" لکھا ہے۔ اور انھیں قواعد زبان اردو کا موجد قرار دیا ہے۔ میں نے تذکرہ دستور الفصاحت کے دیباچے میں مخزن نکات پر بحث کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "کتاب خانے

میں اس کے پہلے دو طبقوں کا اردو ترجمہ قلمی شکل میں موجود ہے۔ میرا خیال یہ ہے۔ کہ محسن علی مصنف سراپا سخن اس کے مترجم ہیں" اس خیال کی بنیاد اوپر ذکر کی ہوئی باتوں پر تھی۔ اس لئے کہ مصحفی نے تذکرہ ہندی (ص ۸۷، ۸۶) میں شاہ حسین حقیقت کو جو محسن کے والد ہیں۔ ایک تذکرے کا مؤلف بتایا ہے اور اپنے عمو صاحب سید حسن شاہ ضبط مؤلف مراۃ الحیدری وغیرہ کا ذکر خود محسن نے سراپا سخن (ص ۱۷۱) میں کیا ہے۔ نیز اپنے آپ کو میر علی اوسط رشک کا شاگرد بتایا ہے جو ناسخ کے ارشد تلامذہ میں شمار ہوتے ہیں[۱]۔"

ترجمہ مخزن نکات کے مخطوطے کا سائز عرشی صاحب کے بقول یہ ہے۔

" خطِ نستعلیق معمولی روشنائی سیاہ و شنجرفی اور کاغذ باریک ولایتی ہے اوراق قدرے کرم خوردہ ہیں جلد نئی ہے کتاب ناقص ہے اور یہ نقصان خود کاتب کی طرف سے ہے کہ اس نے نقل کرتے کرتے چھوڑ دیا ہے۔ نیز ہر صفحہ دو کالما ہے۔ اوراق ۲۹، سطور ۲۴ اور ناپ ۲۲ × ۱۲/۱ سینٹی میٹر ہے۔"

یہ ترجمہ نامکمل صورت میں ہے۔ قائم چاندپوری نے مخزن نکات کو تین طبقات میں تقسیم کیا تھا۔ لیکن زیر نظر ترجمے میں قائم کے تذکرہ کے دو طبقات تو شامل ہیں۔ البتہ طبقہ سوم میں صرف شاہ عالم ثانی تخلص آفتاب کا تذکرہ ہے جبکہ اصل میں شاہ عالم ثانی آفتاب کا نام شامل نہیں ہے۔ غالباً اس نام کو بھی مترجم شامل کرنا چاہتا تھا۔ محسن یا تو طبقہ سوم کے پورے حصے کا ترجمہ نہ کر سکے یا ترجمہ کئے جانے کے بعد باقی صفحات مخطوطے سے علیحدہ ہو گئے ہیں۔ اس ترجمے کے قلمی نسخے میں املا کی بے شمار غلطیاں پائی جاتی ہیں۔ جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ

۱: ۔ رسالہ اردو جلد ۴۳ شمارہ ۲، اپریل ۱۹۶۷ء

Marfat.com

مصنف کا لکھا ہوا نہیں ہے۔ اور نہ ہی کتابت ہونے کے بعد مصنف نے اس کی نظر ثانی کی تھی قلمی نسخے میں مترجم نے کسی جگہ بھی سنہ نہیں دیئے ہیں۔ اکثر سنہ کی جگہ خالی چھوڑ دی گئی ہے۔

طبقہ اوّل کے بارے میں حمد و صلوٰۃ کے بعد محسن لکھتا ہے۔

"ترجمہ طبقۂ اوّل تذکرہ محمد قائم، قائم چاندپوری مسمّٰی بہ مخزن نکات کہ نام تذکرے کا تاریخی ہے (ورق ۱ الف)

طبقہ دوم کے آغاز میں مترجم لکھتا ہے۔

"ترجمہ طبقہ دوم تذکرہ محمد قائم قائم اس طبقے میں اشعار اور احوال ان شعرا کا ہے جو بعد ولی کے آخر زمانہ اورنگ زیب عالمگیر بہادر سے تا ابتدائے عہد دولت محمد شاہ بادشاہ کے دار الخلافت شاہ جہاں آباد اور سائر بلاد ہندوستان میں ہوئے اور راقم نے ہر تذکرے سے مقابلہ کر کے زیادہ اور بھی لکھ دیئے ہیں۔" (ورق ۱۶ الف)

طبقہ سوم میں محسن نے ابتدا میں لکھا ہے۔

"مخفی نہ رہے کہ زمانہ مرزا رفیع سودا مغفور اور میر تقی میر اور خواجہ میر درد میں طرز کلام میں تغیر آیا اور بہت الفاظ متردد (متروک) ہو گئے اور ریختہ میں اورنگ کی پختگی آئی۔ اس واسطے اوس زمانے کے شعرا کو اس طبقہ سوم میں ترجمہ تذکرۂ احیا سے راقم لکھتا ہے کہ اہل تمیز فرق کلام کو دریافت کریں اور حال اور اشعار ہر شاعر کا زیادہ کر دیا ہے۔ کہ ناظرین کا موجب مسرت ہو۔" (ورق ۳۹ ب)

Marfat.com

تراميم و اضافے دونوں تذکروں کا موازنہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مترجم نے اس کا لفظی ترجمہ نہیں کیا بلکہ اصل کتاب کے مطالب کو اپنے الفاظ میں ادا کیا ہے ۔

مترجم نے ترتیب میں فرق کر دیا ہے۔ بعض شعراؔ کو ایک طبقے سے نکال کر دوسرے طبقے میں جگہ دی ہے۔ اور شعراؔ کے ناموں کو حروفِ تہجی کے اعتبار سے پیش کیا ہے۔ مترجم نے بعض تذکرہ نگاروں پر تنقید بھی کی ہے۔ مثال کے طور پر آبرو کے ذکر میں سعادت خان ناصر لکھنوی نے ایک روایت اپنے تذکرے میں نقل کی تھی۔ جس کے بارے میں مترجم نے تنقید کی ہے۔

ماخذ مخزنِ نکات کے ترجمے میں محسن لکھنوی نے جن کتابوں اور تذکروں کی مدد سے شعراؔ کے حالاتِ زندگی میں اضافے کئے ہیں۔ اور کثیر تعداد میں نئے شاعروں کو شامل کیا ہے۔ ان کے حالات کے سلسلے میں محسن نے مندرجہ ذیل پندرہ تذکروں سے مدد لی تھی۔

(۱) گلشنِ بے خار از نواب مصطفیٰ خان شیفتہ ۔

(۲) نکات الشعراؔ از میر تقی میرؔ ۔

(۳) تذکرۂ احبا از شاہ حسین حقیقت ۔

(۴) تذکرہ میر حسن دہلوی ۔

(۵) تاریخ الافکار از مولوی قدرت علیخاں گوپاموی ۔

(۶) خزانۃ الشعراؔ (مخزن) از شاہ میرن جان الٰہ آبادی ۔

(۷) آتش کدۂ لطف از علی آذر ۔

(۸) تذکرہ دولت شاہ سمرقندی ۔

Marfat.com

(۹) حدیقۃ الاقالیم از مرتضےٰ حسین بلگرامی۔

(۱۰) مجمع الواصلین از محمد فاضل اکبر آبادی۔

(۱۱) نفحات الانس از مولانا جامی۔

(۱۲) ریاض الشعراء از علی قلی خاں والہ داغستانی۔

(۱۳) گلشن سخن از مردان علی خان مبتلا دہلوی۔

(۱۴) مجمع النفائس از خان آرزو اکبر آبادی۔

(۱۵) تذکرہ مصحفی (تذکرہ فارسی) و تذکرہ ہندی۔

(۱۶) تذکرہ خوش معرکہ زیبا از سعادت علی خاں ناصر۔

(۱۷) تذکرہ بے نظیر از میر عبدالوہاب۔

(۱۸) تذکرہ اعظم الدولہ سرور۔

(۱۹) مجموعہ اشعار طبع بمبئی۔

(۲۰) سبعہ سنابل از شاہ عبدالواحد بلگرامی۔

(۲۱) سرو آزاد از میر غلام علی آزاد بلگرامی۔

اضافے

اب ہم ذیل میں بعض شاعروں کے حالات زندگی اصل اور ترجمہ دونوں سے پیش کریں گے۔ تاکہ اندازہ ہو سکے کہ مترجم نے کس قدر اضافے کئے ہیں۔ اور اگر ان اضافوں کو پیش نظر رکھا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ محسن ان اضافوں کے سبب خود ایک نئے تذکرے کے مؤلف کہلائے جانے کے حقدار ہیں۔

Marfat.com

آبرو و آرزو

شاہ مبارک آبرو مردی بود درویش منش قلندر مشرب متوطن گوالیار از فرزندان حضرت محمد غوث۔ بہ عالم حسن پرستی اشتہار تمام داشت۔ چنانچہ مثنوی قریب صد و پنجاہ بیت درباب تعلیم آرائش خوبان روزگار بسیار بہ شلاست موزوں کردن است۔ بالجملہ شعر ریختہ بوضع خود بسیار مربوط می گفت و مشق سخن بخدمت سراج الدین علی خاں آرزو می کرد کہ بالفضل در فضل و کمال عدیلش از جنس محال است۔ حق تعالیٰ سلامتش دارد! و زیادہ برین از کمالات آں بزرگوار من، ہیچمدان چہ نویسد کہ شمار قطرات باران نمودن و ساحت افلاک بہ وجب پیمودن است ہر چند دماغ، ہیچو شخصی بہ ریختہ سنجی وفا نمی کند لیکن وسعت اخلاقش تا بحدیست کہ شعر ہای آبرو را بہ نظر اصلاح ملاحظہ می نمودہ بلکہ بہ پاس خاطر او خودش دو سہ بیت ازین قبیل می فرمودہ۔ این چند بیت از آرزو است۔

اس کے بعد آرزو کے آٹھ اشعار دیئے گئے ہیں۔

ان آٹھ اشعار کے بعد یہ فقرہ، لکھ کر " و شعری کہ بعد ازیں قلمی میگردد از شاہ مبارک آبرو ست"، اکیاون شعر آبرو کے دیئے ہیں۔

محسن نے اول تو دونوں شاعروں کا تذکرہ علیحدہ علیحدہ اور تفصیل سے کیا ہے۔ نیز تذکرہ احبا اور دیگر تذکروں سے اضافہ بھی کیا ہے۔ محسن نے آبرو کے ذکر میں جو کچھ لکھا ہے۔

Marfat.com

وہ قائم کے اصل تذکرے سے زائد ہے۔ چنانچہ ملاحظہ ہو:۔

"آبرو تخلص، شیخ نجم الدین عرف شاہ مبارک شطاری درویش منش قلندر مشرب متوطن گوالیار نواسے محمد غوث گوالیاری کے اور عالم میں حسن پرستی اس کی مشہور ہے۔ چنانچہ ایک مثنوی قریب ایک سو پچاس بیت کی واسطے تعلیم آرائش خوبان کے اور دیوان ضخیم (ضخیم) اون کا ہے۔ اور مشق سخن سراج الدین علی خاں آرزو سے رکھتے تھے۔ بلکہ سراج الدین علیخاں آرزو (ان کی خاطر سے گاہ گاہ فکر ریختہ فرماتے تھے (یہ حصہ حاشیے پر درج ہے) اور سعادت خاں ناصر اپنے تذکرے "خوش معرکہ زیبا" میں لکھتے ہیں کہ چشم راست اون کی بہ سبب گل کے نور بصارت سے عاری تھی۔ مرزا مظہر جان جاناں سے مکابرہ ہوا۔ چنانچہ طرفین کے شعر پوچ لکھنے ہیں۔ لکھنا اون کا ترک آداب تھا۔ اس واسطے درج نہیں کرتا۔ اور ادب بزرگوں کا ایک طرف عقل سلیم کسی عاقل کی باور نہ کرے گی۔ کہ مرزا مظہر ایسے باوضع اور عالی دماغ نکتہ دان صاحب علم و فضل عارف باللہ برگزیدہ خدا تارک الدنیا رہبر اہل صفا یہ سخن پوچ زبان پر لائیں۔ ضرب شیر بچہ کہ باعث شہادت کا ہوا کہ یہ قصہ اپنے مقام پر تحریر ہے۔ اوس وقت نواب نجف خاں نے کہلا بھیجا کہ بعد تحقیق کے قصاص قاتل سے لیا جائے گا۔ اوس کے جواب میں فرمایا کہ میں نے معاف کیا تم بھی معاف کرو۔ جائے انصاف ہے کہ جو شخص خیوص ایسے امور عمدہ کا نہ چاہے۔ وہ سخن پوچ زبان پر لائے یا ایسے شخص کے حق میں جو کوئی اہل وضع کچھ کہے۔ اگر کوئی بد وضع کی نسبت میں یہ سخن ہوتا تو شاید کوئی باور کرتا ایسی بات کے لکھنے سے مشقت تالیف غارت اور برباد ہوتی ہے۔ چنانچہ ظاہر ہے کہ تذکرہ خان صاحب کا کسی اہلِ انصاف کے منظورِ نظر نہیں ہوا۔ شعر سعدی علیہ الرحمتہ اس جا پہ خوب مناسب ہے۔" (ورق ۱۶: الف) مخطوطہ۔ اس کے بعد سعدی

Marfat.com

کا جو شعر لکھا ہے۔ اس کا مصرعہ ثانی نامکمل ہے۔

"بدی را بدی سہل باشد جزا اگر مرد......"

اس تفصیل کے بعد محسن نے آبرو کے ۹۰ اشعار بطور نمونہ کلام لکھے ہیں۔ جبکہ قائم کے تذکرے میں شاہ آبرو کے صرف تین اشعار دیئے گئے ہیں۔

قائم:-
زندگی ہے سراب کی سی طرح !
باڈ بندی حباب کی سی طرح
تجھ اُپر خون بے گناہوں کا !
چڑھ رہا ہے شراب کی سی طرح
کون چاہے گا گھر بسے تجھ کو !
مجھ سے خانہ خراب کی سی طرح

مترجمہ مخزن نکات:-
زندگی ہے سراب کی سی طرح
باڈ بندی حباب کی سی طرح
کون چاہے گا گھر بسے تجھ کو !
مجھ سے خراب خانہ کی سی طرح
تجھ اُپر خون بے گناہوں کا
چڑھ رہا ہے شراب کی سی طرح

اشعار کی ترتیب میں بھی فرق ہے:-

قائم کے تذکرے میں مندرجہ ذیل تین اشعار جن کے مصرع ہائے اولین نیچے درج کئے جاتے ہیں دیئے گئے ہیں۔ لیکن ترجمے میں یہ اشعار موجود نہیں ہیں۔

Marfat.com

آج پھر ہم سے کر دیا ہے اماسں   ص ۳۸

بیچ تیرے کے شوق میں چھوڑا   ص ۲۸

غیر محبّت میں اب لگا جانے ص ۳۸ ترجمے میں فقر یہ شعر موجود ہے۔ ص ۶۷

سے معیلوں سے یہ روز ملنا ہے   ص ۲۸

یار و ڈرو کمر سے مر دو دو نہ بھوکے انگ   ص ۳۸

گلی اکیلی ہے اور سو طرح کی باتیں ہیں   ص ۲۹

بیل سینگوں پہ لٹو ہیں مصر مردگی کی راہ   ص ۲۹

قائم کے تذکرے میں بعض مقامات پر اشعار بے ترتیبی سے دیئے گئے ہیں۔ محسن نے بھی ان اشعار کو اسی بے ترتیبی کے ساتھ لکھ دیا ہے۔

رستم اس مرد کی کھاتے ہیں قسم ندر دل کی

مصرع بالا کی غزل میں تین اشعار ہیں۔ لیکن دو اشعار کے بعد مترجم نے دوسری غزل کا مندرجہ ذیل شعر لکھ دیا ہے۔

زلف کی شان مکھ اپر آ دیکھو
کہ گویا عرش میں لٹکتی ہے!

شعر کے بعد پھر دوسری غزل کا ایک شعر دے دیا ہے اور اس کے بعد زلف کے مصرعے والا شعر لکھا ہے۔ ؎

کیا بُری طرح بھول مٹکتی ہے
کہ میرے دل میں آکھٹکتی ہے!

قائم کے تذکرے میں مندرجہ ذیل تین شعر ہیں۔

Marfat.com

دشمن جان ہے تشنۂ خوں ہے
شوخ بانکا ہے نکہت بھوں ہے
دل کے چھلنے کو یہ ٹک چلنا
سحر ہے ٹوٹکا ہے افسوں ہے
شیخ خرقے میں جب مراقب ہو
گریہ مسکیں ہے، موئی جوں ہے

ترجمے میں مندرجہ بالا دو اشعار موجود ہیں لیکن یہ شعر موجود نہیں ہے۔

دشمن جان ہے تشنۂ خوں ہے
شوخ بانکا ہے نکہت بھوں ہے   صلا-۶۸ (مخطوطہ)

یہ شعر ترجمے میں موجود نہیں ہے :-

یوں آبرو بناوے دل میں ہزار باتیں
جب روبرو ہو تیرے گفتار بھول جاوے

ترجمے میں مندرجہ ذیل شعر بھی موجود نہیں ہیں۔

جینا مثل حباب اس جگ میں دم کا پیچ ہے
یہ گرہ کھل جا تو دیکھے زندگانی ہیچ ہے!
معشوق ہے وہی کہ جو اپنی کہی کرے
فوجیں منع کریں تو نہ ملنے وہی کرے
تبسم سے مجھے، اس کو نظر سے
کیا تیں دو کو راضی کس ہنر سے

Marfat.com

علاوہ ازیں قائم کے تذکرے میں آبرو کے دو فحش اشعار بھی موجود ہیں۔ ان اشعار کو مترجم نے حذف کر دیا ہے۔ اب ان اشعار کے مصرع ہائے اولین دیئے جاتے ہیں۔ جن کا اضافہ آبرو کے ذکر میں مترجم نے کیا ہے:۔

ع مجھ ناتواں کی حالت وہاں جا کہے ہے اکثر

ع مشتاق عذر خواہی نہیں آبرو تو کیا

ع ان لبوں کو یقین مصری جان

ع دھمکاتی ہیں ہم کو کمر باندھ باندھ کر

ع تب ہو آرام میرے جی کے تئیں

ع نکلے ہم آ صبا کی طرح جب چمن میں پھول

ع دل کب آوارگی کو بھولا ہے

ع نالے یہ میرے دل کے غم سا گواہ بس ہے

ع زلف کے عقدے کھلے اب ادھر ہی مشکل ہوئی

ع عاشق زیادہ تجھ ستی کیا آرزو کرے

ع صنم بتاں میں تمھارا بڑا ہی کافر تھا

ع شجاعت مال سے نامرد کو حاصل نہیں ہوتی

ع دہقاں پسر نے کھیت رکھا آنسوؤں کو دیکھ

ع کریں جو بندگی آ دیں گنہ گار

ع شوق سے جس گھر میں ہو تو جلوہ گر

ع دور خاموش بیٹھ رہتا ہوں!

Marfat.com

ع سر سے لگا کے پاؤں تلک دل ہوا ہوں میں

ع نہ دیوے ٹپکے دل وہ جو مشکیں

ع شور ہے اس کی اشک باری کا

قائم نے آرزو اور آبرو دونوں کا بیان نہایت اختصار کے ساتھ ایک ہی مقام پر کیا ہے۔ جس کا اقتباس ہم گزشتہ صفحات میں آبرو کے ذکر کے ساتھ دے آئے ہیں۔ اب مترجم نے آرزو کے بارے میں جو کچھ اضافہ کیا ہے۔ وہ " ملاحظہ ہو:۔

آرزو

آرزو تخلص:۔ نام نامی سراج الدین علی خاں محمد قائم قائم نے جس سنہ میں اپنا تذکرہ تالیف کیا۔ خاں موصوف زندہ تھے۔ حال مفصل تحریر نہیں کیا۔ فقط اس قدر لکھا ہے۔ فضل و کمالات میں ماقوف اس کے متصور نہیں۔ حق تعالیٰ اس کو سلامت رکھے۔ اور زیادہ ان سے میں ہیچ مداں کیا لکھوں کہ شمار قطرہ باراں اور سیاحت افلاک کمال ہے دماغ ایسے عالی دماغ کا کب وفا کرتا ہے کہ ریختہ گوئی پر مائل ہو مگر یہ وہ مست اخلاق ہے کہ شعر شیخ نجم الدین آبرو بنظر اصلاح ملاحظہ کرتے ہیں بلکہ بپاس خاطر میاں مذکور خود بھی دو چار بیت گاہ ہے۔ ریختہ میں موزوں فرماتے ہیں۔ راقم الحروف (یعنی محسن لکھنوی) تذکرہ احبا اور تذکرہ خازن الشعرا تالیف فرمودہ شاہ میر نجان صاحب اور نتائج افکار سے مفصل تحریر کرتا ہے۔ اکثر خان آرزو کو اکبرآبادی و بعض گوالیاری لکھتے ہیں۔ مگر غلام ہمدانی مصحفی مرحوم نے ان کے بزرگوں کو متوطن اور (کذا) لکھا ہے۔ ع

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

واللہ اعلم سلسلہ ان کے اجداد کے نسب کا حضرت شیخ کمال الدین علیہ الرحمتہ

Marfat.com

خواہر زادہ خواجہ نصیرالدین محمود چراغ دہلوی قدس سرہ سے ملتا ہے۔ اور نانہالی نسب شیخ محمد غوث گوالیاری شطاری عطاری روح اللہ سے آمیزش رکھتا ہے۔ چونکہ نسب شیخ محمد غوث کا شیخ فریدالدین عطار نیشاپوری عطر اللہ مرقدہ سے ملتا ہے۔ اس جہت سے ان کو عطاری کہتے ہیں۔ اور محمد غوث ممدوح اولیا کامل صاحب اشتغال افکار اور علم یکسر میں یکتا تھے۔ یہ گویا ان کو ورثہ اپنے جد عطار ممدوح کا ملا تھا۔ ولادت خان آرزو کی اواخر سنہ (۱) ہجریہ میں واقع ہوئی۔ نشو و نما گوالیار میں پایا۔ علم وہیں تحصیل کیا بلکہ اوائل سلطنت بادشاہ دین پناہ فرخ سیر شہید میں بعض خدمت گوالیار ان سے متعلق ہوئی۔ سنہ ہجری میں وارد دارالخلافہ شاہ جہاں آباد ہوئے۔ ازبسکہ ان سے اردانددو مرام مخلص وکیل اعتمادالدولہ نواب قمرالدین خاں سے نہایت دوستی اور اتحاد تھا۔ اس کے وسیلے سے جاگیردار بادشاہی اور خطاب ملک الشعرائی سے سرفراز ہوئے تا مدت دراز بہ عزت و آبرو وہاں (کذا) بسر کئے مقبول وضیع و شریف رہے اور تمام اراکین شاہی اُن کا اعزاز و اکرام کرتے تھے بعد وفات موتمن الدولہ محمد اسحاق خاں شوستری اور نجم الدولہ کہ قدردان اہلِ زبان تھے ہمراہ سالار جنگ برادر نجم الدولہ مرحوم کے دہلی سے صوبہ اودھ شہر فیض آباد میں اپنی سعی سے سالار جنگ کے تین سو روپے مشاہرہ سرکار کے نواب شجاع الدولہ بہادر کے نوکر ہوئے۔ اور صاحب تذکرہ بے نظیر میر عبدالوہاب یہ لکھتے ہیں کہ وفات نواب صفدر جنگ بہادر اختر ۱۱۶۷ھ میں تیرویں (کذا) ذی الحج میں ہوئی۔ آرزو بعد ان کے حضور میں نواب شجاع الدولہ بہادر دو برس کذا کم یا زیادہ رہے اور جمادی الآخرہ ۱۱۶۹ھ میں وفات پائی اور صاحب تذکرہ خازن الشعرا وفات خان آرزو سوم شہر ربیع الثانی لکھنؤ لکھتے ہیں۔ بہرحال لاش ان کی زمین میں سپرد کی بعد ایام معہود

۱: مخطوطے میں ہر جگہ سنہ غائب ہے۔

۲: " " " "

Marfat.com

شاہجہاں آباد کو لے گئے اور وہاں دفن کیا۔ ہر چند اقوال مختلف اس میں ہیں لیکن صحیح یہی ہے میر غلام علی آزاد بلگرامی نے تاریخ ان کی وفات کی جو لکھی ہے۔ وہ یہ ہے۔

خان والا شان سراج الدین علی — شمع رونق بخش بزم گفتگو
زد رقم آزاد سال رحلتش — رحمت کامل بروح آرزو

سراج الدین علی خاں نادر عصر — زمرگ او سخن را آبرو رفت
اگر جوید کسے سال وفاتش — بگو آں جان معنی آرزو بود!

عمر آرزو کی طویل ہوئی تھی۔ طبیعت میں ظرافت بلکہ (کذا) ہزل نہایت تھا۔ کہ وقت احتضار قریب مرگ ایک شخص مشتاق ملاقات کے لیے آئے۔ اور کہا کہ مجھ کو مدت سے آرزو سے ملاقات تھی۔ خان آرزو نے کہا کہ آج آرزو آپ کی آخر ہوتی ہے تصانیف اور تالیف ان کی نہایت کثرت سے ہیں کہ ہر ایک سے ان کا مایۂ علم و فضل ظاہر ہوتا ہے۔ من جملہ ان (کے) سوال اللغات مع مصطلحات سند اشعار اساتذہ سے ہر علم میں ایک دو کتاب ان کی ہے۔ اور ہر ایک ان کے فضل و کمال پہ دال ہے اور ایک رسالہ ابتذال اشعار شیخ علی حزیں مسمی بہ تنبیہ الغافلین کہ پانچ سو شیخ کے شعر متبذل (کذا) نکالے تھے۔ اور وہ شیخ کی نظر سے بھی گزرا تھا۔ شیخ نے بھی جواب اس کا (خوب لکھا) میاں مصحفی نے (اپنے تذکرہ میں) میں لکھا ہے کہ یہ شورش آرزو کی بظاہر تھی ورنہ وہ مرتبۂ شیخ سے خوب آگاہی رکھتے تھے۔ طرفہ یہ ہے کہ اس فضل و کمال پر ایسے شراب خوار اور عیاش تھے کہ حضرت مرزا مظہر جان جاناں علیہ الرحمۃ فرماتے

---

(۱) قلمی نسخہ ورق ۷، الف مملوکہ جناب مشفق خواجہ

تھے کہ خان آرزو کو شب و روز عیاشی سے تو فرصت نہیں ملتی حیرت ہے کہ یہ تصانیف کثیر کون سے وقت کرتا ہے۔

آخری عمر میں خان آرزو نے شراب خواری سے توبہ کی اور آرزو کا مذہب اثنا عشریہ تھا اور غلوئے مذہب ان کی تصانیف سے ظاہر ہے شاہ میر نجات صاحب تذکرہ مخزن الشعراء" میں لکھتے ہیں۔ خان آرزو کے والدین اور تمام بزرگ طریقہ اہل سنت والجماعت رکھتے تھے۔ معلوم نہیں انھوں نے کیونکر مذہب تشیع (تشیعہ اصل) اختیار کیا۔ اور نظم و نثر خان آرزو کہ معدن فصاحت و بہت ہے شمار میں نہیں آسکتی۔ دیوان شفیعاں اثر اور دیوان فغانی کا قافیہ بقافیہ جواب کہا ہے۔ میر حسن حسن صاحب مثنوی بدر منیر اپنے تذکرے میں لکھتے ہیں کہ سات (ساتھ اصل) دیوان فارسی کے ان سے یادگار ہیں اور مشق شعر میر عبدالصمد سخن سے رکھتے تھے اور کبھی کبھی واسطے تفنن طبع کے خاطر سے میاں آرزو کے فکر ریختہ بھی فرماتے تھے۔ چنانچہ سعادت خاں صاحب ناصر نے اپنے تذکرے میں یہ لکھا ہے۔ ؎

رکھے سیپارۂ دل کھول آگے عندلیبوں کے ۔۔۔ چمن میں آج شاید پھول ہیں تیرے شہیدوں کے

بعد یہ لکھتے ہیں کہ اگرچہ قافیہ عندلیب کا غریب ہو سکتا ہے مگر چند نسخے میں یہی دیکھا ہے۔ اللہ اللہ خاں آرزو کہ تمام عالم پر دست تصرف اس کا دراز اور اس مطلع میں کہ ایطائے جلی ہے اس سے بے نیاز، راقم الحروف عرض کرتا ہے۔ ہر چند خوردہ گیری خاں صاحب کی بجا ہے۔ مگر خطائے بزرگاں گرفتن خطاست۔

ظاہر ہے کہ خان آرزو بہر حال علم و فضل میں خان صاحب سے افضل ہیں خصوصاً علم شعر میں ان کو ان سے کیا مقابلہ ان کے نزدیک اس وقت میں فکر ریختہ بد تر ہزل سے تھا۔

Marfat.com

اس کے عیوب پر ان کو کیا توجہ ہوتی۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ زبان اردو میں بیشتر ازیں کوئی عیب، عیوب شاعری میں سے رائج نہ تھا۔ اور دلیل اس توجیہہ پر یہ ہے کہ جس کا جی چاہے کلام شعرائے ماسبق کو نظر تعمق سے دیکھے یقین ہے کہ سب طرح کے عیب موافق قواعد مروجہ فی زمانہ کے اب نکل آئیں گے۔ ایطاً تو ایک طرف مرزا رفیع سوداکہ استاد الاستاد خاں صاحب کے ہیں۔ باوصف ادائے شاعری اور ملک الشعرائی کے الفاظ صحیحہ میں اپنا تصرّف کر کے اور اس کو غلط بنا کے موزوں کیا ہے جیسا کہ اس بند میں مرثیہ کے موجود ہے۔ (مرتی ۷، پ)

وہ ناز کی روح نبی کو ہوا تھا خلق ۔۔۔ یا اس لئے کہ ذبح کرے اسکو تشنہ حلق
جس سینہ پہ مگس ہو تو زہرا کو ہوے قلق ۔۔۔ واں بیٹھے شمر کاٹنے کو سر کے واسطے

اور یہ قواعد جو اردو میں فی زمانا رائج ہیں ان کے موجد امام اکملا فخر الاساتذہ شیخ امام بخش ناسخ مغفور ہوئے ہیں انہی کے صدقے سے خاندان کے اور لوگ بھی واقف ہو گئے اور تتبع انھیں کا کرنے لگے۔ اور ایسے حد سے بڑھے کہ فخریہ کملائے ماسبق کو بُرا کہنے لگے ورنہ یہ لوگ اور ان کے استاد ایسی باتوں سے کیا واقف تھے۔ نہ سابق میں ایسی فصاحت بلاغت بیان میں تھی نہ کوئی عیوب شاعری پر نگاہ کرتا تھا اور نظیریں ایطائے جلی کی اور بھی لکھی جاتی ہیں۔ (یہاں نظیریں درج نہیں کی ہیں)

الحاصل جب میر اور مرزا کہ طبقہ سوم میں ہیں ان کو خیال نہ ہو تو صاف معلوم ہوا کہ یہ باتیں قواعد ضروریہ میں نہ تھیں اگر خان آرزو کہ طبقہ دوم میں ہیں انھوں نے نہ خیال کیا۔ تو نہ خیال کیا کیا مضائقہ ہے راقم کو نیچے من الوجوہ خان آرزو سے علاقہ نہیں کلمہ حق بلا جانبداری زبانِ قلم سے نکل گیا۔ زیادہ، زیادہ۔"

Marfat.com

آرزو کے یہ اشعار جن کے مصرعے درج ذیل ہیں۔ ترجمے میں بھی موجود ہیں۔

ع مے خانے بیچ جاکر شیشے تمام توڑے

ع ہرگز نظر نہ آیا ہم کو سجن ہمارا

ع تیرے دہن کے آگے دم مارنا غلط ہے

یہ شعر بھی اصل میں موجود نہیں ہے۔

جان تم پر کچھ اعتماد نہیں
زندگانی کا کیا بھروسہ ہے!

مخزن نکات کے بعض وہ شعر جنھیں ترجمے میں نقل نہیں کیا گیا ہے ان کے مصرعے مندرجہ ذیل ہیں۔

ع اعدے تھے سب خلاف جو اس اب سے ہم ہنے

ع مرے شوخ خراباتی کی کیفیت نہ کچھ پوچھو!

ع رکھے سیپارہ دل کھول آگے عندلیبوں کے

ع دریا عرق میں ڈوبا تجھ سیم تن کے آگے

مخزن میں قائم نے اس شعر کو یوں لکھا ہے:۔

آتا ہے ہر سحر کو تیری برابری کو — کیا دن لگے ہیں یارو خورشید خاوری کو

ترجمے میں یہ شعر اس طرح لکھا ہوا ہے:۔

ہر صبح آتا ہے تیری برابری کون — کیا دن لگے ہیں دیکھو خورشید خاوری کون۔

اسی طرح ولی دکنی کے حالات میں مخزن کے علاوہ محسن لکھنوی نے تذکرہ احیا اور تذکرہ میر حسن سے بعض اشعار کا اضافہ کیا ہے اور اس اضافے کی صراحت کی ہے۔

Marfat.com

تذکرہ احبا

دیکھیں یہ جیسے وہ مبتلا ہے
خوباں کی نگاہ میں بلا ہے

طالب نہیں مہر و مشتری کا
دیوانہ ہوا جو تجھ پری کا

دیکھ لینا صبح تجھ رخسار کا!
ہے مطالعہ مطلع انوار کا!

دل کو دیتا ہے تمہارے پیچ و تاب
پیچ مرے طرّہ طرّار کا!

صحن گلشن میں جب خرام کیا
سرو آزاد کو غلام کیا

اے سرو خراماں تو نہ جا باغ میں چل کر
مت قمری و شمشاد کے سودے میں خلل کر

ترا مکھ مشرقی حسن انوری جلوہ جمالی ہے
جامی نہیں فردوسی وہ ابرو ہلالی ہے

تذکرہ میر حسنؔ

جب آیا مست ساقی جام لیکر
گیا یکبارگی آرام لے کر!

نجانوں خط ترا کس بے خطا پر
چلا ہے آج فوج شام لے کر

میں اوسکو جوں نگیں کرتا ہوں سجدہ
جو کوئی آتا ہے تیرا نام لے کر

جوں گل شگفتہ رو ہیں سجن کے چمن میں ہم
جوں شمع سر بلند ہیں تری انجمن میں ہم

اک بار ہنس کے بول سمن ورنہ حشر تک
جوں برق بے قرار رہیں گے کفن میں ہم

سن کے احوال مرا مصحفؔ نے دلی
ہاتھ سے ہاتھ ملا درد سے سناکوٹا

اصل نسخہ میں یہ جگہ سادہ ہے . . .
پھر گویا ان تلوں میں تیل نہیں

عجب کچھ لطف رکھتا ہے شب خلوت میں مہرو سے
سوال آہستہ آہستہ جواب آہستہ آہستہ

اک بار مری بات اگر گوش کرے تو
جلنے کو رقیبوں کے فراموش کرے تو

دل چھوڑ کے یار کیوں کر جاوے
زخمی ہے شکار کیوں کر جاوے

Marfat.com

ہے حسن ترا ہمیشہ یکساں — جنت سے بہار کیوں کہ جاوے

غنیمت بوجھ ملنے کو ولی کے — نگاہ پاک باز اے کیمیا ہے!

باغ ارم سے بہتر موہن تسی گلی ہے — ساکن تری گلی کا ہر آن میں ولی ہے

امیر خسرو نہایت اہم شاعر ہیں۔ لیکن قائم چاندپوری نے نہایت اختصار کے ساتھ ان کے حالات زندگی لکھے ہیں۔ اور سعدی اور امیر خسرو کا تذکرہ ایک ساتھ کیا۔ اور بطور تبرک ان دونوں کے دو دو اشعار لکھے ہیں۔ خسرو کے حالات زندگی بالکل نہیں لکھے صرف ان کے درج ذیل تین اشعار دیئے ہیں۔

ز حال مسکیں مکن تغافل درائے نیناں بنائے بتیاں!!

چو تاب ہجراں نہ دارم اے جاں نلیو کاہے لگائے چھتیاں

زر گرد پسرے چوماہ پارا — کچھ گھڑیے سنواریے پکارا

نقد دل من ربود و بشکست — آخر نہ گھڑا نہ کچھ سنوارا!

اب محسن کے ترجمے سے خسرو کے حالات نقل کئے جاتے ہیں۔ قارئین خود فیصلہ کر لیں کہ آیا اسے ہم ترجمہ کہیں یا اسے محسن کا طبعزاد تذکرہ قرار دیں۔

خسرو دہلوی "محمد قائم نے اپنے تذکرے میں یہ سبب ان کی شہرت کے ان کا حال کچھ بھی تحریر نہیں کیا۔ مگر راقم الحروف اور تذکروں سے لکھتا ہے۔ مولوی قدرت علیخاں گوپاموی اپنے تذکرے "نتائج الافکار" میں لکھتے ہیں۔ ابوالحسن یمین الدین نام ولد امیر سیف الدین اصل ان کی ہزارہ بلخ قبیلہ لاچین سے ہے۔ جب وقت شور انگیز چنگیز خاں کا ہوا ان کے بزرگ اپنا وطن چھوڑ کر ہند میں آئے اور قصبہ پٹیالی کہ توابع دہلی ہے سکونت اختیار کی والد ان کے در سلک امرائے بارگاہ سلطان شمس الدین التمش

Marfat.com

یں منسلک تھے اور دختر نواب عمادالملک کہ امرائے نامدار تھے ان کے نکاح میں آئی۔ چنانچہ حضرت امیر خسرو ان کے بطن سے سنہ ہجری یں پیدا ہوئے اسی وقت ان کے والد خدمت میں ایک مجذوب یا خدا کے قریب مکان کے رہتے تھے ان کو لے گئے مجذوب ملاحظہ کے فرمایا کہ تو ایسے شخص کو گود میں لایا ہے کہ دو قدم آگے خاقانی سے بڑھ جائے گا۔ آٹھ برس کا سن تھا مع بھائی اور یہ ہمراہ اپنے والد کے دہلی میں آئے اور خدمت میں سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیا بداوتی قدس سرہ کہ آغاز اون کے ظہور کا تھا ملازمت حاصل کی اور نو برس کے سن میں ان کے والد بزرگوار نے کہ ہفتاد سالہ ان کا سن تھا معرکہ (اصل میں مارکہ) کفار میں شہادت کو پہنچے۔ امیر خسرو نے ان کے مرثیہ میں کہا ہے۔ ؎

حیف از کرم گزشت دل من دو یتیم ماند

دریائے غل رواں شد و در یتیم ماند!

بعد ان کے عمادالملک ان کے نانا نے ان کو پرورش کیا۔ تھوڑے عرصے میں خداوند عالم نے جمیع علوم میں ان کو کمال دیا ایسا کہ شہرہ ان کی فصاحت کا اور بلاغت کا عالمگیر ہوا۔ ملتان میں ملازم شہزادہ سلطان محمد خلف سلطان غیاث الدین بلبن کے جاکر ہوئے اور مرتبہ عالی کو پہنچے کہ سب امرائے عصر سے عزت اور رتبہ ان کا زیادہ ہوا مگر جو کچھ صلہ قصیدہ وغیرہ میں انھیں حضور شاہزادہ سے مرحمت ہوتا تھا۔ واسطے خرچ فقرائے خانقاہ سلطان المشائخ کے بھیج دیا کرتے تھے۔ کبھی اس کو آپ صرف نہیں کیا۔

ایک روز ابھی آغاز مشق شعر تھا کہ خدمت میں حضرت شیخ کی قصیدہ کہہ کر لائے آکر پڑھا۔ حضرت شیخ نے ارشاد فرمایا کہ خسرو کیا صلہ چاہتا ہے؟ عرض کیا کہ شیرینی کلام

Marfat.com

فرمایا کہ طباق شکر کا پلنگ کے نیچے رکھا ہے سلے کر اپنے سر پر ڈال لے اور تھوڑی سی کھا لے حسب الحکم ایسا ہی کیا عذوبت کلام خسرو اسی ارشاد کے سبب سے ہے۔ حضرت امیر خسرو کو تمام عمر تاسف رہا کہ شیخ سے شیرینی کلام کے عیوض اور کچھ میں نے طلب کیوں نہ کیا۔ علم اور فضل ان علامہ کا ان کی تصانیف سے ظاہر ہے۔ حاجت بیان کی نہیں حسب اتفاق ایک روز دہلی میں شیخ سعدی شیرازی سے ملاقات ہوئی چنانچہ خود امیر خسرو فرماتے ہیں۔

خسرو بپیر مست اندر ساغر معنی بر بخت
شیوہ از خم خانہ سعدی کہ در شیراز بود

باایں ہمہ اشغال شعر و سخن اور مصاحبت سلاطین زمن صاحب ذوق اور بمست بادۂ شوق یاد الٰہی رہے مدام شورش عشق حقیقی سر میں اور سوز و گداز محبت دل و جگر میں رکھتے تھے۔ چالیس برس صائم الدہر رہے اور کئی حج ہمراہ اپنے پیر و مرشد کے ادا کئے اور بہت ریاضت اور مجاہدے موافق شریعت اور طریقت کے تمام عمر کیا کئے اور خدمت گزاری اور بجا آوری احکام پیر و مرشد کی اس درجہ کی کہ کمتر کسی مرید نے کی ہوگی کہ ضرب المثل خلائق ہے اور حضرت سلطان المشائخ کو جو محبت اور توجہ امیر خسرو سے تھی کسی مرید سے نہ تھی۔ اور ان کے حضور میں خصوصیت خسرو کی ان کے ارشاد سے ظاہر ہے چنانچہ فرماتے ہیں۔ رباعی ارشاد فرمودہ شیخ المشائخ:۔

خسرو کہ بشاعری نظیرش کم خواست
در ملک سخنوری شہی خسرو راست

ایں خسرو ماست ناصر خسرو نیست
زیرا کہ خدائے ناصر خسرو ماست!

گر برائے ترک ترکم ارہ بر تارک ہنند
ترک تارک گیرم و ہرگز نگیرم ترک ترک

اور بارہا فرمایا کہ خداوند عالم مجھ کو بطفیل سوز سینہ اس ترک کے بخش دینا اور ایسے

Marfat.com

کلمے شفقت آمیز اکثر فرماتے الحق کہ ان سے خصوصیت اور زیادہ کیا ہوگی جب حضرت سلطان المشائخ نے اس عالم سے رحلت فرمائی امیر خسرو لکھنوتی میں ہمراہ تغلق شاہ کے گئے ہوئے تھے۔ جب مراجعت کی اور حال معلوم ہوا ترک لباس ظاہری کر کے کمال بے حلاوتی سے زندگی بسر کی حتیٰ کہ بعد چھ مہینے کے سنہ ہجری (اعداد ندارد) میں جوار رحمت الہٰی میں جاگزیں ہوئے اور پائیں مزار مبارک شیخ کے ان کو مدفون کیا۔ مزید یہ حکایت (بر حاشیہ) کتاب "سبعہ سنابل" میں لکھی ہے۔ امیر خسرو کی خبر وفات سن کر حضرت شیخ رکن الدین ابو الفتح سہروردی نے اپنے یاروں سے فرمایا کہ ہم وارد دہلی میں چل کر تجہیز و تکفین میں خسرو کے شریک ہوں اور اس کے واسطے دعائے مغفرت کریں کہ وہ مداح سلاطین تھا۔ جب ان کے جنازہ پر آئے امیر خسرو اٹھ بیٹھے اور کہا کہ خداوند عالم نے اپنے فضل سے اور میرے پیر کے طفیل مجھ کو بخش دیا۔ اب حاجت سفارش نہیں اور "تذکرہ احبا" والد ماجد راقم کے لکھتے ہیں کہ عین شباب میں امیر خسرو نے لکھو کھا روپیہ راہ خدا میں لٹا کے دنیا کو ترک کیا۔ اور مرید سلطان المشائخ کے ہوئے۔ علم ظاہری سب طرح کا حاصل تھا۔ علم باطنی میں بھی کمال حاصل کیا۔ اور تصانیف متعدد ہر علم اور ہر فن میں ان سے یادگار ہیں۔ چنانچہ ایک روز ان کے پیر نے فرمایا کہ خسرو تیری تالیف اور تصنیف کس قدر ہیں عرض کیا کہ ہزار جلد فرمایا کہ ایک کم کر دے کہ خسرو لفظ ہزار بظاہر سبک ہے تاکہ نو سو تو سے تو گنتی میں آئیں۔ اور ہر علم و فن میں ایجاد و اختراع ایسا کیا ہے کہ آج تک ان کی تقلید ہزار دستار کرتا آیا ہے۔ اعجاز خسروی اس پر دلیل باہر ہے۔ اور علم موسیقی میں قول اور دو بولہ چو بولہ وغیرہ ان کا ایجاد کیا ہوا ہے۔ نقل ہے کہ دہلی میں دکن سے ایک استاد گانے والا آیا حضور میں بادشاہ کی اس نے عرض کی کہ جس کو اس

Marfat.com

فن میں دعویٰ ہو میرے مقابلے کے واسطے اس کو بلوایئے۔ کسی نے اس کے مقابلے کا اقرار نہ کیا۔ بادشاہ کو ملال ہوا کہ ہمارے شہر کی ہتک ہوتی ہے۔ حضرت امیر خسرو نے فرمایا کہ میں اس کا مقابلہ کروں گا۔ یہ پہلے کچھ گاتے جو اس نے گایا اس کا پیرایہ بدل کر انھوں نے اسے گایا اس نے کہا کہ چیز تو ہماری ہے مگر ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ ہماری ہے۔ ایسی صورت اس کی بدل گئی ہے۔ جب امیر خسرو نے قول اپنا ایجاد کیا ہوا گایا وہ حیران ہو گیا اور بادشاہ سے عرض کیا کہ یہ اوتار ہیں ہم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اور تقال اور الفاظ بے معنی طیلوا لفیں کا ایجاد ہے پہیلی اور چیستان اور معما اور دیوانِ فارسی مع قصائد ان سے یادگار ہے۔ چوں کہ ابتدا ریختہ گوئی کی تھی۔ گاہے ریختہ بھی کہا ہے۔ تاریخ وفات امیر خسرو کہی ہوئی محمد فاضل اکبر آبادی:-

خسرو مہلی بحکم خدا ! بشب جمع شد زدار فنا

عمر ہفت و دو پنجاہش بود کانزمان شد بدرگہ معبود

آخر وہم بود از مہ شوال ! کہ گزشتند ازیں جہاں ملال

سال ترحیل افصح الشعرا گفت ہاتف بہشتی ابدا

ایک روز امیر خسرو حضرت شیخ کے حضور میں حاضر ہوئے۔ کلاہ شیخ کے سر پر کج رکھی ہوئی دیکھی یہ شعر فرمایا۔

ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے

من قبلہ راست کردم بر سمت کج کلاہے

Marfat.com

زر گر چہ سر چو ماہ پارا ! کچھ گھڑیے سنوارئے پکارا
نقد دل من زبود و شکست آخر نہ گھڑا نہ کچھ سنوارا !

زحال مسکین مکن تغافل تورائے نیناں بنائے بتیاں !
کہ تاب ہجراں نہ دادم ایجان نہ لیہو کاہے لگاہے چھتیاں
چوں شمع سوزاں چو ذرہ حیران ہمیشہ گریاں بعشق آں
نہ نیند نیناں نہ انگ چینا نہ آپ آویں نہ بھیجیں پتیاں
شبان ہجراں دراز چوں زلف و روز وصلش چو عمر کوتاہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں
یکایک از دل بصد فریبم بروچشمش قرار و تسکین
کسے پڑی ہے جو جا سناوے پیارے پی کو ہماری بتیاں

مرثیہ میں شیخ کے خسرو نے ہر زبان میں بہت شعر کہے ہیں ازاں جملہ یہ دو دھری بہت لطیف تھی راقم کو پسند آئی لکھ دی۔

وہ گئے بالم وہ گئے بالم ندیا کنار اپنی پار اتر گئے ہم چھاندی درد وار
گوری سوئے سیج پر مکھ پر ڈالے کیس چل خسرو گھر اپنے کہ شائع بھی چو دیس

نقل ہے کہ خسرو نے دیکھا اپنے پیر کو کہ گلستان اور بوستان سعدی شیرازی کی سیر بہت کیا کرتے ہیں۔ ایک کتاب تصنیف کی نام اس کا بہارستان رکھا اور اس کو لاکر سب کتابوں کے اوپر رکھ گئے۔ شیخ نے اس کو سرسری ایک بار ملاحظہ فرمایا۔ دوسری بار توجہ نہ فرمائی۔ خسرو نے، اور ایک کتاب تصنیف کی اس کا نام نگارستان

۶۳۔ مخطوطے میں اسی صورت سے ہے۔

Marfat.com

رکھا اس کو لا کے اسی طرح رکھ گئے۔ شیخ نے ایک بار دیکھ کے پھر نہ دیکھا۔ غرض کہ چند بار خسرو نے یہی کہا۔ شیخ کو معلوم ہوا کہ خسرو کو میرے ہر روز کے دیکھنے سے سعدی گلستان پر رشک آیا ہے۔ فرمایا خسرو آنکھیں بند کر جب خسرو نے مراقبہ کیا۔ دیکھا کہ حضور سرورِ عالم صلی اللہ و علیہ وسلم تشریف فرما ہیں۔ اور سعدی بھی حاضر ہیں۔ حکم ہوا کہ سعدی پڑھ، سعدی نے یہ شعر نعت پڑھا۔

بلغ العلےٰ بکمالہ ! ! ! کشف الدجیٰ بجمالہ !

حسنت جمیع خصالہ صلوا علیہ و آلہ !

ارشاد ہوا پھر پڑھ، پھر پڑھ۔ چند بار تواتر ارشاد ہوا بعد مراقبہ کے حضرت شیخ نے فرمایا کہ خسرو مقبول ہو جانے میں کسے اجارہ نہیں۔"

ترتیب میں تبدیلی محسن نے شاعروں کے عہد کو تذکروں کی روایت کو ملحوظ رکھنے کے علاوہ، ان شاعروں کے طرزِ کلام کی بنا پر بھی انھیں مختلف طبقات میں جگہ دی ہے۔ لیکن جہاں جہاں انھیں دیگر تذکرہ نگاروں کی رائے سے اختلاف تھا۔ اس کا اظہار بھی کر دیا ہے۔ مثلاً ورق ۱۲ الف پر شوری نام کے شاعر کے حالات کو متقدمین شعراء کے باب میں لکھا ہے۔ کیونکہ میر حسن کے تذکرے میں بھی ایسا ہی تھا۔ لیکن اس کی شاعری کے مطالعے کے بعد انھیں یہ شک ہے کہ یہ شاعر متقدمین میں سے نہیں ہے چنانچہ لکھتے ہیں:۔

"شوری تخلص ۔۔۔۔ میر حسن حسن نے متقدمین لکھا ہے۔ ہر چند کلام ان کا متقدمین میں نہیں ملتا مگر بموجب لکھنے میر موصوف طبقہ الف میں ان کو لکھا۔" (ورق ۱۲۔ الف)

Marfat.com

طبقۂ اوّل کی طرح طبقۂ دوم میں بھی مترجم نے اپنی طرف سے نئے شاعروں کے اضافے کئے ہیں اور ان شعرائ کے حالاتِ زندگی اور انتخاب کلام میں بھی اضافہ کیا ہے جو اصل میں موجود ہیں۔

بیدل عظیم آبادی بیدل عظیم آبادی جو طبقۂ متقدمین کے شاعر ہیں اپنی شاعرانہ خوبیوں کی بنا پر اس بات کے مستحق تھے کہ ان کے حالاتِ زندگی زیادہ تفصیل سے بیان کئے جاتے۔ قائم کے تذکرے میں ہم عام تذکروں کی روایت کے مطابق بعض اہم شعرائ کے حالاتِ زندگی کو اختصار سے پاتے ہیں۔ جب کہ محسن کی یہ خصوصیت ہے کہ اس نے ان نامور شعرائ کے حالاتِ زندگی کو نہایت تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اور اس سلسلے میں تذکروں کی عام روایت یعنی اختصار پسندی کو ملحوظ نہیں رکھا۔

چنانچہ بیدل عظیم آبادی کے احوال میں مترجم نے تذکرۂ احبا مصنفہ شاہ حسین حقیقت اور تذکرہ نتائج الافکار مصنفہ مولوی قدرت علیخاں گوپاموی سے استفادہ کیا ہے۔ قائم نے بیدل جیسے اہم شاعر کا تذکرہ، دلی کے ساتھ ایک ہی مقام پر کر دیا ہے۔ چنانچہ ملاحظہ ہو۔

بیدلؔ:۔ چنانچہ قدوۃ السالکین زبدۃ الواصلین میرزا عبدالقادر بیدل رحمۃ اللہ علیہ نیز دریں زبان غزلی گفتہ کہ مطلع و مقطع اش اینست:۔

مت پوچھ دل کی باتیں وہ دل کہاں ہے ہم میں ۔۔۔ اس جنس بے نشاں کا حاصل کہاں ہے ہم میں
جب دل کے آستاں پر عشق آن کر پکارا ! ۔۔۔ پردے سے یار بولا بیدل کہاں ہے ہم میں

بیدل کا یہ تذکرہ بھی، دلی کے تذکرے کے ذیل میں آیا ہے۔

ترجمے میں محسن لکھنوی نے بیدل کو علیٰحدہ عنوان کے تحت بیان کیا ہے اور بیدل

Marfat.com

اہمیت کے پیش نظر اس میں اضافے کئے ہیں۔ ان کا ماخذ تذکرۂ احیا، اور نتائج الافکار ہیں۔

بیدل :۔ مرزا عبدالقادر فارسی گو شہو(کذا) ان کا آخر عہد حضرت عالمگیر بادشاہ غازی کے ہوا تھا۔ اور زمانہ ان کا آخر شروع عہد محمد شاہ بادشاہ میں ہے۔ اس واسطے صاحب تذکرہ نے ان کو طبقہ اول میں لکھا ہے۔ اس تذکرہ میں ان کا کچھ حال تحریر نہ تھا تذکرے (کذا) احیا اور تذکرے تاریخ انکار (کذا) مولوی قدرت اللہ خاں گوپاموی سے لکھا جاتا ہے اصل ان کی قوم ارلاس (کذا) جغتائی ہے اور ولادت ان کی عظیم آباد، اکثر اوقات دیار بنگالہ میں بسر ہوئی۔ اوائل حال میں ملازم شہزادہ محمد اعظم بن عالمگیر بادشاہ غازی اور منصبدار ہوئے۔ اور بہت عزت، امتیاز اور مرتبہ قرب حاصل ہوا۔ باوجود تعلق تجرد منش اور وارفتہ مزاج تھے۔ چنانچہ ایک روز حضور شہزادہ میں کسی مصاحب خاص نے بہت تعریف مرزا صاحب کی بیان کی۔ حکم ہوا کہ قصیدہ مدح یا بدولت ملاحظہ میں گزرانو (کذا) بعد دریافت مائیہ علم اور رنگ طبع منصب زیادہ کیا جائے گا۔ چونکہ وارفتہ مزاج تحمل اور دماغ فرمائش کمتر رکھتے ہیں۔ یہ سخن گراں گزرا ترک روزگار کیا۔ دارالخلافہ شاہجہان آباد میں آکر گوشہ نشین ہوئے اور ترک تعلق کیا بقیہ حیات مستعار کمال توکل اور استغنا سے بسر کی حق سبحانہ جل شانہ نے امرا اور ارکان سلطنت کو ان کا مسخر کردیا۔ نواب شکر اللہ خاں اور تمام عزیز و اقربا ان کے آشفتہ محبت تھے۔ اور کمال معتقد تھے اور نظام الملک آصف جاہ بہ سبب تلمذ مرزا ممدوح کے یہ قدردانی کرتے تھے۔ اگر کبھی مرزا صاحب ان کے دولت خانے پر جاتے تھے۔ یہ پر بیٹھتے تھے اور وہ پائیں مسند۔ آخر الامر معلوم شہر صفر ۱۱۳۳ھ

Marfat.com

میں راہی ملک بقا ہوئے۔ صحن خانہ خود واقع شاہجہان آباد مدفون ہوئے۔

حکایت:۔ میر عبد الولی عزلت بیان کرتے ہیں کہ میں مرزا صاحب کے عرس میں شریک محفل ہوا کہ کلیات ان کا موافق دستور کے باہر نکالا گیا۔ میں نے اس کو اس نیت سے کھولا کہ آیا۔ مرزا صاحب ہمارے آنے سے خبردار ہوئے یا نہیں۔ یہ شعر صفحے کے سرے پر نکلا۔

چہ مقدار خون در عدم خوردہ باشم

کہ بر خاکم آئی و من مردہ باشم!

حاضرین معترف کرامات ہوئے۔ نثر طویل اور دیوان اور قصائد اور مثنوی وغیرہ قریب لاکھ شعر کے ان سے یادگار ہے۔ ریختہ گوئی دون مرتبہ ان کا ہے۔ لیکن بطریق تفنن طبع فرمائی ہے۔

مت پوچھ دل کی باتیں یہ دل کہاں ہیں ہم ہیں!

اس جنس بے نشان کا حاصل کہاں ہے ہم ہیں!

جب دل کے آستان پر عشق آن کر پکارا

پردے سے یار بولا بیدل کہاں ہے ہم ہیں۔"

اسی طرح شاہ حاتم کے تذکرے میں، قائم چاندپوری نے اختصار سے کام لیا ہے۔

حاتم:۔" محمد حاتم، حاتم تخلص، ہم صحبت میاں مضمون و آبرو است۔ اصل دی شاہ جہاں آباد است۔ در روزگار سلطنت۔ محمد شاہ بہ منصب ندیمی و خدمت بکاولی نواب عمدۃ الملک مغفور پایۂ امتیاز داشت، بعد

Marfat.com

فوت او ترک روزگار نمودہ باکمال آزادگی می گزرانید، کلیاتش ضخیم است و قریب چہار ہزار بیت کہ ازاں بر سبیل انتخاب برآوردہ، وآں را بہ "دیوان زادہ" موسوم ساختہ است۔ چندی پیشتر از نظر گزشتہ، شعر خوب جستہ جستہ می برآید، بافقیر آشنا است، حق تعالٰی سلامت دارد۔" (ص ۵۹۔۶۰۔ مخزن)

دلوں کی راہ میں خطرے پڑے ہیں کیا یارو
کہ چند روز سے موقوف ہے سلام و پیام
مت عاشقوں پہ جور و ستم اس قدر کرو
عالم کا ڈر نہیں تو خدا کا تو ڈر کرو! (ص ۶)

محسن نے حاتم کے بیان میں بالکل ہی اختصار سے کام لیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

"حاتم تخلص..... سید حاتم علیخاں..... (۱) مولدان کا جونپور وارد دہلی شاگرد شرف الدین مضمون معاصر شاہ مبارک آبرو۔ من کلام...

شاید محبت اب کے زمانے سے اٹھ گئی
آتی نظر نہیں جو کسی آشنا کے بیچ!"

قائم چاندپوری نے میر جعفر زٹلی کے حالاتِ زندگی نہایت اختصار کے ساتھ پیش کیے ہیں ص ۳۰ پر صرف چار سطریں ہیں۔ اور ص ۳۱ پر بھی آدھا صفحہ ہے جس میں چھ شعر بھی درج ہیں) جبکہ اس کے برخلاف محسن لکھنوی نے نہایت تفصیل سے میر جعفر زٹلی کے حالات زندگی اور نمونہ کلام دیا ہے۔

جعفر زٹلی کا تذکرہ اصل مخطوطے کے ورق ۳ الف / (ورق ۳ ب سادہ ہے) سے شروع ہو کر ورق ۴ الف سے ورق، ب تک چلا گیا ہے۔ اس مخطوط کی جو نایاب شدہ نقل

Marfat.com

ہے اس کے مطابق میر جعفر زٹلی کا بیان ص ۱۱ سے ص ۳۲ تک پھیلا ہوا ہے۔ اس تمام صفحے کو نقل کرنا تو مناسب نہیں ہے۔ البتہ صرف ان عنوانات کو رقم کر دیا جاتا ہے۔ قائم نے جعفر زٹلی کے بیان میں حالاتِ زندگی پر مشتمل جو عبارت لکھی ہے۔ محسن نے اس کا ترجمہ کرنے کے بعد اس پر اضافہ بھی کیا ہے۔ ملاحظہ ہو صفحہ ۳۲۷

اس کے بعد تمام تر اضافہ محسن لکھنوی نے کیا ہے۔ قائم نے میر جعفر زٹلی کی نثر کا بھی ایک اقتباس پیش کیا ہے۔

"خان صاحب مہربان سلامت! دختر حمید الدین چٹاخہ، بارہ بالی و پٹاخہ، شادمانی است گوہران بید جو ہر بے چھید، آٹھوں گانٹھ امیل جوبن بے تمثیل، پاہو ہالہ سیزدہ سالہ، پراگ لوچن و دل دبوچن، سایدہ دربار آراست پذیرفتن (کذا) مبارک و برخاست" ص ۲۲ مخزن نکات)

محسن لکھنوی نے میر جعفر زٹلی کی نثر نگاری کے جو اقتباسات مختلف عنوانات کے تحت پیش کئے ہیں۔ وہ خاصے طویل ہیں۔ لہذا یہاں صرف ان عنوانات کو لکھا جاتا ہے۔ جس سے محسن کی جانب سے کئے جانے والے اضافے ظاہر کرنا مقصود ہیں۔

(۱) نثر در شکایت نفر (ص ۳ ب)

قولہ تعالیٰ..... کچھ مثلیں درج ہیں (ورق ۲ ب)

(۲) عرض در شکایت بدشکلی (ص ۳ ب)

(۳) (ایضاً (عرضی) در شکایت سرما (ورق ۲ ب، ۴ الف)

(۴) در ملازمہ ترکاری (ورق ۴ الف)

(۵) عرض داشت در ملازمہ میوہ (ورق ۴ الف، ۴ ب)

Marfat.com

(۶) فرمان در تلازمہ ترکاری (ورق ۴ الف، ۴ ب)

(۷) مچلکہ (ورق ۴ ب، ورق ۵ الف)

(۸) رقعہ تقرر نسبت بہ جلال الدین خان ورق ۵ الف)

(۹) اخبار دربار شرارت (ورق ۵ الف، ۶ الف)

(۱۰) نسخہ چوسن یا ضمہ طعام واساک (ورق ۶ الف، ورق ۶ ب)

(۱۱) تمسک۔ ورق (۶ ب) اس میں دو صفحات پر فارسی واردو کے اشعار دربارہ تمسک بھی درج ہیں (ورق ۶ ب)

بعدازاں ورق ۶ ب کے کچھ حصے سے لے کر ورق ۷ ب تک میر جعفر زٹلی کے اشعار کافی تعداد میں دیئے گئے ہیں۔

محسن لکھنوی نے بعض جگہ زٹلی کے غیر مہذب۔ ناشستہ اور فحش اشعار بھی کثرت سے دیئے ہیں۔ اسی طرح نثر میں بھی ایسے اقتباسات موجود ہیں جن میں فحش الفاظ کی بھرمار ہے۔

اب ان اختلافات کا ذکر کیا جائے گا جو ہر دو متن میں پایا جاتا ہے۔

طبقہ اوّل :- اعظم شاہ محمد :- اس شاعر کا تذکرہ مخزن نکات ص ۲۹ پر موجود ہے۔ جبکہ ترجمے میں یہ شاعر موجود نہیں ہے۔

تجرد :- اصل میں طبقہ سوم (شعرائے متاخرین) میں بیان ہوا ہے محسن نے طبقہ اوّل میں اس شاعر کو رکھا ہے۔

تمکین صلاح الدین :- قائم نے اس شاعر کو طبقہ سوم (ص ۱۴۲) میں رکھا تھا محسن نے اس کو طبقہ دوم (ص ۹۶) میں رکھا ہے۔

Marfat.com

تقی میر گکانی :۔ مخزن نکات میں طبقہ سوم (ص۱۶۷) میں اور ترجمے میں طبقہ دوم میں ص ۹۶-۹۵ رکھا گیا ہے۔

کرم اللہ خاں درد :۔ مخزن نکات میں طبقہ سوم (۱۱۶) میں اور ترجمے میں طبقہ دوم (۱۱۶) میں تذکرہ ہے۔

رسوا آفتاب رائے :۔ اصل میں طبقہ سوم (ص۱۶۸) پر رکھا گیا ہے۔ اور ترجمے میں طبقہ دوم میں رکھا ہے۔ (ص ۲۳-۱۲۱)

زار (فنکی) فضل بیگ :۔ اصل میں طبقہ سوم (ص۱۶۸) اور ترجمے میں طبقہ دوم ص ۲۵-۱۲۴)

سلام نجم الدین :۔ اصل میں طبقہ سوم (ص ۱۶۴) اور ترجمے میں طبقہ دوم (ص۱۳۲)

شاغل شاگرد بسمل :۔ اصل میں طبقہ سوم (ص۱۶۶) اور ترجمے میں طبقہ دوم (ص۱۳۴)

شاکر محمد :۔ اصل میں طبقہ سوم (ص۱۹۹) ترجمے میں طبقہ دوم (ص ۱۳۲)

شوق میر حسن علی :۔ اصل میں طبقہ سوم (ص۱۲۵-۱۲۴) ترجمے میں طبقہ دوم (ص۱۳۵-۱۳۴)

عارف محمد عارف :۔ اصل میں طبقہ سوم (ص۱۶۵) ترجمے میں طبقہ دوم ص۱۴۲)

عاقل رائے سنگھ :۔ اصل میں طبقہ سوم (ص۱۷۱) ترجمے میں طبقہ دوم (ص۴۴-۱۴۳)

فراق مرزا مرتضیٰ قلی بیگ :۔ اصل میں طبقہ سوم (ص۱۲۱) ترجمے میں طبقہ دوم (ص۱۴۷)

کمترین :۔ اصل میں طبقہ سوم (ص۹) ترجمے میں طبقہ دوم (ص۱۵۳)

گرامی میرزا گرامی :۔ اصل میں طبقہ سوم (ص۷) ترجمے میں طبقہ دوم (ص۵۳-۱۵۲)

ہادی دہلوی :۔ اصل میں طبقہ سوم (ص۱۷) ترجمے میں طبقہ دوم (ص۱۶۹)

اب ان شعرا کے نام لکھے جاتے ہیں جن کا تذکرہ، اصل میں موجود نہیں ہے۔ لیکن ترجمے میں موجود ہیں۔ گویا محسن نے ان شاعروں کا اضافہ کیا ہے۔

Marfat.com

بے چارہ، طبقہ اوّل (ص۲) بے قید، نضائل علی خاں طبقہ اوّل (ص۶)

بے کل عبدالوہاب، طبقہ اوّل (ص۵) حیا، طبقہ..... (ص.....)

خاکی.....(ص.....) عاقل، عاقل شاہ (طبقہ دوم۔ ص ۱۴۵-۱۴۴) غوّاص (شاعر

دکنی۔ طبقہ دوم) (ص ۱۴۶-۱۴۵)

اب ان شعرا کے نام بیان کئے جاتے ہیں کہ جن کا ذکر قائم چاندپوری کے تذکرے میں تو موجود ہے لیکن محسن لکھنوی کے ترجمے میں یہ شعرا موجود نہیں ہیں۔ یہ بات حیرت ناک ہے کہ آخر کیوں ان شعرا کو محسن نے ترجمے میں شامل نہیں کیا ہے؟ ایسے شعرا میں سودا جیسے اہم شاعر تک کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ حذف شدہ شعرا کے ناموں کا یہ مسئلہ اور زیادہ حیرت میں ڈالتا ہے کہ جب ہم دیکھتے ہیں کہ محسن نے کم و بیش ۲۹ شعرا کا اضافہ کیا ہے۔ نیز قائم کے بیان کردہ بہت سے شعرا کے واقعات، اشعار وغیرہ میں دوسرے تذکروں سے اضافے کئے ہیں۔

وہ شعرا جو ترجمے میں موجود نہیں ہیں۔

اعظم شاہ محمد طبقہ اوّل ص۲۹، اکرام خواجہ ص۱۷۶ (طبقہ سوم)

آرام طبقہ سوم (ص۱۸۳) آشنا۔ طبقہ سوم (ص۱۸۴) خاکسار طبقہ سوم (ص ۱۴۲)

درد خواجہ میر (طبقہ سوم (ص۱۰۲) درد مند محمد فقیہ طبقہ سوم (ص۱۳۳)

تاباں میر عبدالحئی طبقہ سوم (ص۱۲۵) خاکسار میر محمد یار طبقہ سوم (ص.....)

راقم لالہ بندرابن ص۱۲۹ طبقہ سوم۔ رند مہربان خان طبقہ سوم (ص۲۰۰)

سلیمان ص۱۷۰ (طبقہ سوم) سودا مرزا رفیع طبقہ سوم ص۸۶، سوز میر محمد (سوم) ص۱۲۱

سید میر یادگار علی طبقہ سوم (ص۱۸۵) شاداب، طبقہ سوم (ص۱۸۱) ضیا میر ضیا ص۱۲۱ (طبقہ سوم)

Marfat.com

علیم ص ۱۲ طبقہ اول۔ فرحت، فرحت اللہ ص ۱۶۹ (سوم) فرخ، میر فرخ علی ص ۱۱۷ (طبقہ سوم)
فغانی اشرف علیخاں فغان طبقہ سوم (ص ۱۵۰) فقیر محمد شمس الدین طبقہ سوم ص ۸۲
قائم، قیام الدین علی ص ۲ طبقہ سوم، قدرت شاہ قدرت اللہ ص ۱۶۱ طبقہ سوم
قلندر بدھ سنگھ (طبقہ سوم) ص ۱۲۵، کاشی للہ کاشی ناتھ (طبقہ سوم) ص ۱۶۴،
کافر جنوں میر علی تقی طبقہ سوم (ص ۱۸۶) حکیم محمد حسین طبقہ سوم (ص ۱۱۳)
مائل میاں محمدی (طبقہ سوم) ص ۱۷۸، مجذوب غلام حیدر (طبقہ سوم) ص ۱۸۶
محسن، محمد محسن (طبقہ سوم) ص ۱۵۴، مخلص میرزا محمد حسین (طبقہ دوم) ص ۵۵
مظہر مرزا جان جاناں طبقہ سوم (ص ۸۲) ممتاز حافظ فضل علی طبقہ سوم (ص ۱۸۲)
منت قمر الدین طبقہ سوم (ص ۱۹۸) منعم، طبقہ دوم (ص ۴۶) میر محمد تقی (سوم) ص ۱۲۱
نثار میر عبدالرسول طبقہ سوم ص ۱۷۵، نظام، طبقہ سوم ص ۱۴۸، وحشت میر ابوالحسن
طبقہ سوم (ص ۱۶۲) وفا لالہ توتی رائے (طبقہ سوم) ص ۱۸۸
ہدایت میاں ہدایت اللہ طبقہ سوم ص ۱۱۸، ہم رنگ دلاور خاں طبقہ سوم (ص ۱۶۶)
یقین، انعام اللہ خاں (طبقہ سوم) ص ۱۲۴۔

ترجمے کی ایک خصوصیت

محسن کے ترجمے کی ایک خاص خوبی یہ ہے کہ قائم اور ان کے پیشرو بعض تذکرہ نویسوں نے، دکنی شاعروں کا ذکر کم کیا ہے۔ محسن کے ہاں بطورِ خاص ایسے شعراء کی تعداد کافی ہے کہ جن کا تعلق دکن سے تھا۔ مترجم نے کن شعراء کے اضافے، اصل سے زیادہ کئے ہیں ان کے نام لکھے جاتے ہیں۔

طبقہ اول:۔ احمد (شاعر قدیم) ص ۲، امجد شاعر قدیم (ص ۲) بے چارہ دکھنی (ص ۳) بے قید (فضائل علیخاں) ص ۶، بے کل عبدالوہاب (ص ۵)، جلیل میر عبدالجلیل (ص ۸) حبیب (شاعر

Marfat.com

حیدرآباد دکن (ص ۴۲) ، خاکی (عہد جہانگیر (ص ۴۸) خوشنود دکنی (ص ۴۸) شوری (ص ۵۰)
صبائی (متوطن حیدرآباد) ص ۵۱ ، عبداللہ قطب شاہ (ص ۵۲) عزیز اللہ (ص ۵۳) عوامی ص ۵۴
مرزا محمد ص ۵۸ ، ملک دکنی ص ۵۸ ، نامی (شاعر دکن) ص ۶۰ ، یونس حکیم یونس ص ۶۴

طبقہ دوم :- آزاد ، خواجہ زین العابدین (ص ۸۶ ، احسن علی احسان خاں ص ۸۶ ، اشرف
محمد اشرف ص ۹۰ ، افغان الف خاں ۸۷ - ۸۶ ، افغان بیگن خاں ص ۸۷ ، افکار (باشندہ
دہلی) ص ۸۶ ، افکار میر جیون (۹۰ - ۸۹) اکبر مرزا اکبر قلی ص ۸۶ ، جرات قلندر بخش
۹۸ - ۹۷ ، جنون ص ۹۷ ، جوہر مرزا احمد علی ص ۹۷ ، حیا ص ۹۹ ، داؤد مرزا داؤد بیگ
ص ۱۲۰ ، دار کریم اللہ خاں ص ۲۱ - ۱۲۰ ، ذہین میر مستعد ص ۱۲۱ سعادت ، سعادت اللہ
ص ۱۳۲ - سید میر امام الدین ص ۱۳۳ - شوقی (سقا) ص ۱۳۶ ، شہید شاہ غلام حسین ص ۳۶ - ۱۲۵
صابر ، صابر شاہ ص ۳۹ - ۱۳۸ - صادق میر جعفر علیخاں (ص ۱۳۹) صادق ہیبت رام ص ۱۳۷
صفدری حیدرآبادی ص ۱۳۸ - صمصام نواب صمصام الدولہ ص ۱۳۷ - صفت مغل علیخاں ص ۱۳۸ -
صواب شیخ محمد اشرف ص ۳۷ - ۱۳۶ - ضیاء ضیاء الدین ص ۴۰ - ۱۳۹ - ضیا مرزا ضیا بیگ
طالع شمس الدین ص ۱۴۰ - ظہور باشندہ دہلی ص ۱۴۱ - عاجز عارف الدین ص ۴۳ - ۱۴۲
عاشق معلی جلال الدین ص ۴۵ - عاقل ، عاقل شاہ ص ۴۵ - ۱۴۴ - عمدہ جعفر علیخاں ص ۱۴۱

محسن لکھنوی کی شاعری | محسن لکھنوی اپنے زمانے کے نامور شاعر تھے ۔ ان کا شمار سلسلۂ ناسخ کے مشہور شاعروں میں ہوتا تھا ۔ لیکن افسوس ان کا دیوان شائع نہ ہو سکا ۔ اور نہ ہی قلمی صورت میں کہیں موجود ہے ۔

محسن لکھنوی نے ایک ایسے گھرانے میں آنکھ کھولی تھی جہاں شعر و ادب کا بہت چرچا تھا ۔ پھر لکھنؤ جیسے شہر میں پرورش پائی ۔ ان کے زمانے کے لکھنؤ میں

Marfat.com

ابھی مصحفی و انشاء کی شاعرانہ چشمکوں کی داستانیں زندہ تھیں۔ اور جرأت کی معاملہ بندی لوگوں کو مرغوب تھی۔ شیخ ناسخ کی استادی نے الگ اپنا رنگ جما رکھا تھا جس کی تقلید میں لکھنؤ کے تمام شعراء اسی انداز کی شاعری کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ محسن لکھنوی اس ادبی صورت حال سے متاثر ہوئے۔

محسن لکھنوی نے اپنے والد شاہ حسین حقیقت کی مختلف تصانیف کو تو از سرِ نو بعض مطبعوں سے شائع کرایا تھا۔ لیکن خود اپنے دیوان کی اشاعت کی طرف کبھی متوجہ نہیں ہوئے۔ ان کی زندگی میں صرف ان کا ترتیب دیا ہوا ایک تذکرہ "سراپا سخن" کے نام سے مطبع مصطفائی سے شائع ہوا تھا۔ اس تذکرے میں محبوب کے مختلف اعضا کے بارے میں کہی ہوئی ان کی غزلیں بھی موجود ہیں" فی الوقت اسی کو ان کا کل شعری سرمایہ سمجھنا چاہیے۔

ویسے قیاس ہے کہ ۱۸۵۷ء میں ان کا اصل شعری سرمایہ ضائع ہو گیا۔ گردش روزگار کے سبب رفتہ رفتہ محسن کی طبیعت شعر و سخن اور دنیاوی دل چسپیوں سے ہٹتی چلی گئی۔ اور انھوں نے قلندری اختیار کر لی۔ لہٰذا یہ بھی ممکن ہے کہ انھوں نے خود شعری مجموعے کی اشاعت کی طرف توجہ نہ دی ہو اور اسے محفوظ نہ رکھا ہو۔

محسن کے کلام کے محفوظ نہ رہنے کے سلسلے میں ایک اور پہلو سے بھی سوچا جا سکتا ہے۔ مرزا رسوا نے اپنے ناول "شریف زادہ" میں مرزا عابد حسین کے کردار کو پیش کیا ہے۔ یہ کردار لکھنؤ کی اس پر تعیش اور شاعرانہ زندگی کی ضد معلوم ہوتا ہے اور بالکل ایک ایسا مشینی کردار ہے جو خود کو بدلتے ہوئے حالات کے سانچے میں ڈھالنا چاہتا ہے۔ اور گزشتہ لکھنؤ کی تہذیبی زندگی کے ایسے عناصر کو

Marfat.com

ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا ہے جو قوم کی تباہی کا باعث ہوئے۔ شعر و شاعری کو بھی وہ انھیں عناصر میں شمار کرتا ہے۔ یہ کردار دراصل، سید جعفر حسین کا نمائندہ ہے۔ جو محسن لکھنوی کے بڑے صاحبزادے تھے۔ انھوں نے اپنی جد و جہد اور کاوش سے اپنی زندگی بنائی تھی۔ مرزا رسوا اسی زندگی کو ایک آئیڈیل زندگی سمجھتے تھے۔ یہ دراصل لکھنؤ کی پر تصنع اور کاہلی میں ڈوبی ہوئی زندگی کا فطری ردعمل تھا۔ ہو سکتا ہے اسی بنا پر ان کے صاحب زادے نے والد کے کلام کو شائع کرنا پسند نہ کیا ہو۔

محسن کے کلام کے نہایت مختصر نمونے ایک دو اشعار کی صورت میں بعض تذکروں میں ملتے ہیں۔ ان کا کہا ہوا ایک قطعہ مولوی عبدالغفور خاں نساخ کے مرتب کردہ قطعۂ منتخب میں بھی ملتا ہے۔

صاف ہے ہر شجر گل پہ عروسانہ بہار
ہر چمن باغ میں عشرت کا بنا کاشانہ
دولھا گل چیں ہے بنات آج چنی جاتی ہے
پھول مصری ہے ہر شاخ دلہن کا شانہ

محسن لکھنوی نے درج ذیل اعضا پر غزلیں کہی ہیں:-

(۱) سر (۲) بال (۳) زلف (۴) جبیں (۵) ابرو (۶) آنکھ (۷) پلکیں (۸) مژہ (۹) ناک (۱۰) گال (۱۱) ہونٹ (۱۲) لب (۱۳) دانت (۱۴) زبان (۱۵) دہن (۱۶) کان (۱۷) لو (۱۸) منھ (۱۹) گلا (۲۰) گردن (۲۱) دوش (۲۲) شانہ (۲۳) بازو (۲۴) کلائیاں (۲۵) ہاتھ (۲۶) پہونچا (۲۷) ہتھیلیاں (۲۸) انگلیاں

Marfat.com

(۲۹) ناخن (۳۰) چھاتیاں (۳۱) بغل (۳۲) دل (۳۳) روح (۳۴) ناف (۳۵) پشت (۳۶) کمر (۳۷) پاؤں (۳۸) پا (۳۹) ایڑیاں (۴۰) تلوے ۔

محسن لکھنوی کا سلسلہ شاعری جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے۔ شیخ امام بخش ناسخ سے ملتا ہے۔ وہ شیخ ناسخ کے شاگرد خواجہ وزیر وزیر کے شاگرد تھے۔ ناسخ نے اردو شاعری کو ایک نیا رنگ و آہنگ اور اردو شعر و زبان کو ایک نیا قالب عطا کیا۔ اُن کی شاعری کا تعلق دل سے زیادہ دماغ سے تھا۔ اُن کا شاعرانہ مزاج باطن سے زیادہ ظاہر سے منسلک تھا۔ جسے عام طور پر "خارجی کیفیت" سے منسوب کیا جاتا ہے۔

لکھنوی شاعری اسی خارجی کیفیت کی شاعری ہے۔ ایک پر تصنع تہذیب میں جو جو خرابیاں در آئیں پیدا ہو سکتی ہیں ان سب کا عکس لکھنوی شاعری میں نظر آتا ہے۔ دربار داری اور عام لکھنوی مذاق سخن نے ان شاعروں کو بھی متاثر کیا جو دہلی سے لکھنؤ آ بسے تھے۔ میر تقی میر بڑھاپے میں دہلی سے لکھنؤ آئے تھے۔ ان کی شاعری میں داخلیت اور اعلیٰ شاعری کی اقدار اس قدر گہری تھیں کہ لکھنوی شاعری کا ماحول اور وہاں کے سماجی، تہذیبی اور عام مقبولیت کے تقاضے بھی ان کا انداز نہ بدل سکے۔

متوسط درجے کے جن شاعروں نے لکھنوی مزاج کو اپنایا۔ ان میں جرأت، انشاء وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ مصحفی نے ان کے مقابل وہ مقبولیت نہیں پائی۔ لیکن ان کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ ذہنی طور پر وہ قدما کی روایت سے متعلق رہے۔ اگرچہ اکثر انھیں لکھنؤ میں زندگی گزارنے اور انشاء اللہ خاں انشاء سے ٹکر لینے کے لیے مروّجہ انداز بھی اختیار کرنا پڑا۔ جرأت کے بارے میں میر تقی میر کا فقرہ مشہور ہے۔ لیکن جرأت کے کلام میں کم از کم سادگی تو ملتی ہے۔ اور ان کی غزلوں کی زمینیں یقیناً نامانوس اور

Marfat.com

ثقیل الفاظ لیے ہوئے نہیں ہوتیں۔ ان کی شاعری میں ہوس ناکی کے ساتھ کہیں کہیں وہ عشق بھی نظر آجاتا ہے جو شاعر کے صاحب درد ہونے کی طرف اشارہ کرتا ہے لیکن یہ سچا عشق ان کی شاعری کا غالب عنصر نہ بن سکا، اس لیے اُن کی ہوس ناکی نے معاملہ بندی کی صورت اختیار کرلی۔

اس کے بعد ناسخ کا دور آتا ہے۔ ناسخ کے ہاں بھی علوئے تخیل موجود نہیں ہے۔ ان کی تمام شاعری تصنع اور بوجھل اور ثقیل تراکیب و الفاظ سے بھری ہوئی ہے۔ اور اس شاعری سے محظوظ ہونے کے لیے خاصی ذہنی مشقت کی ضرورت ہے۔

اچھی اور بڑی شاعری میں تخیل کی بلندی اور شاعر کے طرز بیان کو بہت دخل ہوتا ہے پوری لکھنوی شاعری تشبیہات اور استعارات کے انوکھے پن اور پیش پا افتادہ باتوں کو نئے رنگ ڈھنگ سے کہنے کی کوشش ہے جس سے مراد قاری کو چونکانا ہے۔

شعراء لکھنؤ نے مختصر غزلوں کی بجائے طویل غزلیں کہنا شروع کیں اور زیادہ سے زیادہ اور مشکل قافیوں کے استعمال کو اپنی قابلیت اور قدرت بیان کے اظہار کے لیے استعمال کیا۔ اس میں شاعری کی اصل روح غائب ہو گئی۔

داخلی کیفیات کی عکاسی لکھنوی شاعری میں مفقود ہے۔ عشق کی دردمندی اور گھلاوٹ ان شعراء کی غزلوں میں کم یاب ہے۔ ہاں محبوب کی کنگھی چوٹی، زلف، خط و خال، انگیا، محرم، ناف، اور اسی قسم کے دوسرے موضوعات کی کثرت ہے۔

محبوب کے سراپا کے بارے میں اشعار ہمیں دہلوی شعراء اور اردو کے ممتاز شعراء کے ہاں بھی ملتے ہیں لیکن اشعار میں ایک دل گدازی اور اثر آفرینی و گھلاوٹ ہے۔ اور ان میں محبوب کے سراپا کی جو تعریف کی جاتی تھی وہ سننے والے کو ناگوار لگنے کے بجائے

Marfat.com

ان کے جمالیاتی احساس کو حظ پہنچاتی تھی۔ میر ہی کے شعر لیجئے ؎

نازکی اس کے لب کی کیا کہئے　　پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

یا

میر ان نیم باز آنکھوں میں　　ساری مستی شراب کی سی ہے

ولی دکنی کا شعر ہے ؎

تجھ لب کی صفت لعل بدخشاں سے کہوں گا　　جادو ہیں تیرے نین غزالاں سے کہوں گا

لکھنوی رنگ سخن کو انتہا تک پہنچانے والے شیخ امام بخش ناسخ ہیں۔ اور ہم شروع میں کہہ آئے ہیں کہ محسن لکھنوی لکھنؤ کے عام رنگ سے متاثر اور شیخ امام بخش ناسخ کے دبستان فکر کے مقلد ہیں۔ اور شیخ ناسخ کے لئے بہت اچھی رائے رکھتے تھے اور جگہ جگہ اپنے تذکرے میں انھیں امام الاکملا لکھا ہے۔

محسن لکھنوی کی تنقیدی صلاحیت بہت اچھی تھی۔ اس کا اندازہ ان کی ان آرار سے ہوتا ہے جو قائم کے تذکرے مخزن نکات کے ترجمے کے وقت انھوں نے ظاہر کی تھیں لیکن انھوں نے اپنی اس تنقیدی بصیرت سے خود اپنی شاعری کو کوئی خاطر خواہ فائدہ نہ پہنچایا۔ اور قدما بالخصوص ناسخ کی تقلید ہی کو کمال جانا۔

محسن کی جو غزلیں دستیاب ہوئی ہیں ان میں روایتی مضامین ہیں۔ ہوسناکی ہے، اور محبوب کے اعضا کے بارے میں صرف ایسے ہی اشعار ملتے ہیں جو خارجی کیفیت کے مظہر ہیں۔ علوئے تخیل یکسر ناپید ہے۔ البتہ یہ اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر اپنے تاثرات اور حسن کی آرائش و زیبائش کو بیان کرنے پر خاص قدرت رکھتا ہے اور محبوب کے ظاہر کا مشاہدہ اُس نے خاصی محنت سے کیا ہے۔

رعایت لفظی بھی اشعار میں موجود ہے۔ یہ شاعری سپاٹ اور بے روح ہے اور سیدھی سادی حقیقت نگاری ہے

Marfat.com

محسن لکھنوی ۔ زبان و بیان کے سلسلے میں خاصے محتاط ہیں نشست الفاظ اور بندش کے استعمال پر انھیں پوری قدرت ہے ۔ اکثر موقعوں پر تشبیہات و استعارات بھی خوبصورت اور اچھے لے آتے ہیں لیکن فکر اور جذبے کی بلندی مفقود ہے جب کہ شاعری جذبات ہی کی زبان ہے ۔ اسی لیے ان کے اشعار میں وہ بات نہیں ملتی جو ایک شعر کو اچھا شعر کہلواتی ہے ۔ اشعار کثیر آورد اور تصنع معلوم ہوتے ہیں اور اس سے ان کی استادانہ ریاضت کا اندازہ ہوتا ہے لکھنوی شاعری میں شکوہ الفاظ عام ہے ۔ محسن کے ہاں بھی ہم شکوہ الفاظ پاتے ہیں ۔ ان ساری باتوں کے باوجود محسن کے دستیاب شدہ کلام میں بعض ایسے شعر بھی ہیں، جو قاری کو اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں ۔ ایسے ہی چند شعر درج کیے جاتے ہیں ۔

انتخاب اشعار ؎

رات کو مہر درخشاں نظر آیا محسن
یار نے دست حنائی کو جو رکھا سر پہ

رہرو ملک عدم مجھ کو کیا پیری نے
یہ سفیدی نہیں ہے گرد سفر بالوں میں

خواب غفلت سے ہو بیدار کہ پیری آئی
صاف ظاہر ہے سفیدی سحر بالوں میں

چین جبیں کو ہم نے خدنگ قضا کہا
غصے میں دیکھ لی جو تمہاری کہیں جبیں

سونے میں ہاتھ شب کو جو رکھے وہ نازنیں
ہو ماہ زیر ابر تہہ آستیں جبیں

دیکھنا آور رونے دیدار اسے کہتے ہیں
کھولے ہیں حلقۂ آغوش تمنا آنکھیں

قید ہستی سے رہائی نہ ہوئی وائے نصیب
ہم نظر بند رہے جیسے ہوئیں وا آنکھیں

صورت اشک رواں حسرت دیدار میں ہوں
طے کریں پائے نگہ سے ابھی رستہ آنکھیں

تشبیہ چراغوں سے اگر دوں تو بجا ہے
جلتی ہیں یہ آنکھیں کہ شرر بار ہیں پلکیں

آتش رنگ حنا سے نقش پا جلتا ہے کیا
اے پری آتا ہے رو دو نقش جادو ناک میں

نہ ان سے سبزۂ بیگانہ آشنا ہو کبھی
شگفتہ مثل گل تر رہیں تمھارے گال

Marfat.com

ہر ایک کو شفق صبح رخ کا شبہ ہوا ‏ غضب سے لال ہوئے گر کہیں تمہارے گال
حرف سخن گراں جو نزاکت سے ہو گئے ‏ مانند غنچہ تنگ ہوئے وہ ہلا کے ہونٹ
محسن جفائیں سہتا ہے کرتا نہیں گلا ‏ گویا کہ سی دئیے ہیں ترے باوفا کے ہونٹ
کس کو ملا ہے اوس دہن تنگ کا نشاں ‏ یہ وہم ہے جو ہم کو ہوا ہے خیال لب
کرتے نہیں ہو فرط نزاکت سے تم سخن ‏ گویا دہن پہ مہر خموشی ہے خال لب
مستی کا رنگ شب ہے سفیدی بیاض صبح ‏ دکھلا رہے ہیں جلوہ لیل ونہار دانت
قاتل! کس مزے سے میں کرتا ادائے شکر ‏ میرے دہان زخم میں ہوتی اگر زبان
مثل بوئے گل کبھو جامے سے باہر کیوں ہوئے ‏ کیا ہوا خواہوں نے اے گل آج پھونکا کان میں
پیری کا لطف باد جوانی سے مٹ گیا ‏ دامان شب سے بجھ گئی شمع سحر کی لو
سمجھے پیام موت کو بھی ہم پیام یار ‏ ایسی لگی ہوئی تھی ہمیں نامہ بر کی لو
زاد سفر کا میں سفر میں رہے خیال ‏ دل کو لگی رہے جو ادھر کے سفر کی لو
اوس کا رتبہ نہ ہو کس طرح دو بالا محسن ‏ پایا بت توڑنے کو جس نے نبیؐ کا شانہ
زندگی بھر نہ کبھی وہ گل تر ہاتھ آیا ‏ بس یہی نخل محبت کا ثمر ہاتھ آیا
چرخ نے صورت سیار ٹھہرنے نہ دیا ‏ اتفاقاً جو کوئی درہم زر ہاتھ آیا
ہنس کے کہتے ہیں وہ عاشق کا جگر ہاتھ آیا ‏ شاخ شمشیر سے یہ ہم کو ثمر ہاتھ آیا
ناز سے کہتے ہیں وہ اکثر دکھا کر چھاتیاں ‏ سنگ دل جیسے ہیں ہم ویسی ہی ہیں پتھر چھاتیاں
دل کو ہوائے زلف نے ایسا بسا دیا ‏ ہم سمجھے کوئی نافہ آہو بغل میں ہے
کبھی سنے نہ حقیقت وہ تند خو دل کی ‏ جو چھیڑ دوں کبھی پہلو سے گفتگو دل کی
کسی کے کوچہ گیسو میں ڈھونڈا اے محسن ‏ عبث ہے سینہ سوزاں میں جستجو دل کی
وحشت یہ ہو جو دیکھ لے آنکھوں کو یار کی ‏ ٹھہرے کبھی نہ چشم غزال ختن میں روح

Marfat.com

تذکرہ مخزن نکات

میر جعفر، جعفر تخلص، سید صحیح النسب

بود، چوں اساس سخنوری اکثر بہ ہزل گذاشت بناءً علیہ زٹلیش می گفتند و ازاں جا کہ کلامش در عوام شہرت تام می یافت اعزہ ای آں زماں بپاس آبروی خویش بادی بہ سلوک شائستہ پیش می آمدند۔ گویند روزے بہ خدمت میرزا عبدالقادر بیدل وارد شد۔ ایشاں بعد استماع نظم و نثرش چند اشرفی بہ طریق انعام مرحمت فرمودند۔ بہ وقت رخصت ایں مصرع در مدیحہ اش خواند۔ مرخص شد:

ظہوری و عرفی بہ پیشِ تو پیش

(ص ۳۰-۳۱)

ترجمہ مخزن نکات

میر جعفر باشندہ دہلی، سید صحیح النسب

(نسب کذا) کلام ان کا اعجوبہ روزگار، ہندی فارسی عربی آمیز اکثر بطور ہجو بے سروپا بھا کا آمیز اس واسطے زٹلی مشہور۔ نظم و نثر کا ایک حال کلام اس کا ہر شہر و دیار میں موجود امرائے اس وقت کے [واسطے حفظ آبرو اپنی کے اس کو دوست رکھتے تھے۔ اور ہر طرح پر مسلوک ہوتے تھے] [ایک روز واسطے ملاقات مرزا عبدالقادر بیدل کے آئے اور نظم و نثر اپنا کہا ہوا ان کے روبرو پڑھا کئی اشرفی بطریق انعام مرزا صاحب نے دیں۔ بہ وقت رخصت یہ مصرع (۱) ان کی تعریف میں بدیہہ کہا ہے

ظہوری و عرفی بہ پیشِ تو پیش

(ورق ۳ الف) ص ۱۱

Marfat.com

خان بہادر سیّد جعفر حسین

علی گڑھ تحریک کا ایک مجاہد

کارلائل نے کہا ہے کہ دنیا میں ہر انسان اس قابل ہے کہ اس کی سوانح عمری لکھی جائے ۔ اس قول کی توجیہہ غالباً یہ ہو سکتی ہے کہ بڑی اور تاریخ ساز شخصیات کے علاوہ جنہوں نے کسی نہ کسی شعبہ ہائے حیات میں کار ہائے نمایاں سرانجام دیے ہوں، عام انسان کی زندگی میں بھی اس کے عہد کے معاشرتی، تمدنی اور تہذیبی اثرات کا سراغ لگایا جا سکتا ہے ۔

خاں بہادر جعفر حسین کی شہرت لا محدود نہ سہی، لیکن ان کی زندگی اس قابل ہے کہ اس کو صفحہ قرطاس پر پیش کیا جائے۔ عام انسانی حیثیت سے بھی ان کی زندگی کی جدوجہد کی داستان آنے والی نسلوں کے ان افراد سے لئے شمع کی مانند ہے جن کی ہمت ابتدائی زمانے میں حالات کی ناساعدت، اور راہ کی دشواریاں توڑ دیتی ہیں۔ ان کا تعلق ہماری زندگی کے ایک ایسے دور سے ہے کہ جب ہندوستان کے مسلمان زوال اور غلامی کی راہوں میں بھٹک رہے تھے۔

Marfat.com

سرسید احمد کی علی گڑھ تحریک انھیں روشنی دکھا رہی تھی اور ان کی اولوالعزمی ٹھہرے ہوئے لوگوں کو نئی منزل کے لئے آمادہ سفر کرنے کا آغاز کر چکی تھی۔

خاں بہادر جعفر حسین نے ۱۸۵۶ء کے لگ بھگ لکھنؤ میں ایک شریف اور شاندار روایات کے حامل خاندان میں آنکھ کھولی۔ اس وقت تک جاہ و حشمت اس خاندان سے رخصت ہو چکا تھی البتہ خاندانی شرافت و نجابت باقی تھی۔

اس زمانے میں لکھنؤ خود عبرت کا مرقع بننے والا تھا۔ ایک برس بعد، لکھنؤ کی بادشاہت کا وہ مدار بھی ختم ہونے والا تھا کہ جس کو پورے لکھنؤ کی تہذیبی زندگی کا محور کہنا چاہیئے۔ امراء و رؤسا اور طبقہ شرفا کی زندگیاں بے عملی، اور مثبت سوچ کے فقدان کا شکار ہو چکی تھیں۔ در بیشتر لوگ پدرم سلطان بود کے مصداق صرف ماضی کی عظمت رفتہ اور شوکت و حشمت کے دل خوش کن تذکروں میں مصروف تھے اور اپنی تباہی کا اپنے خاندان کے شاندار ماضی سے موازنہ کرکے پھر خواب غفلت میں سو جانے کے عادی ہو گئے تھے۔

لکھنؤ کی عام مجلسی زندگی کے منفی اثرات خانوادہ امیر کلال کے اس نوزائیدہ بچے پر بھی پڑنا فطری معلوم ہوتا ہے لیکن سید جعفر حسین نے اپنے خاندان کے شاندار ماضی کی راکھ سے ققنس کی طرح ایک نئی زندگی حاصل کی اور اپنی محنت و کاوش اور بے پناہ عملی قوت کے سبب آپ اپنا جہان پیدا کیا۔

سید جعفر حسین، مشہور شاعر اور تذکرہ سراپا سخن کے مصنف میر محسن لکھنوی کے فرزند تھے جن کا سلسلہ حضرت امیر کلال سے جا ملتا ہے جو حسینی سید تھے۔ میر محسن لکھنوی اپنی خاندانی شرافت، شاعری اور علم کے سبب لکھنؤ اور دوسرے علاقوں میں مشہور تھے۔ محسن لکھنوی نے ایک طویل عرصے تک نہایت معروف زندگی گزاری تھی اور زمانے کے

Marfat.com

گرم وسرد کو دیکھنے کے بعد کچھ تو عام لکھنوی فضا اور پھر طبعاً شاعر ہونے، اور ایک مشہور صوفی خاندان کے فرزند ہونے کے سبب، دنیا سے قطع تعلق کر کے، فقیرانہ روش اختیار کر لی تھی۔ ایسی صورت میں انکی توجہ دنیاوی بکھیڑوں اور اولاد کی تعلیم و تربیت کی طرف کم ہی رہی اور پھر سید جعفر حسین کے بچپن میں ہی ان کے والد انتقال بھی ہو گیا تھا۔

محسن لکھنوی کے تین لڑکے تھے، ایک سب سے بڑے جو عمر میں سید جعفر حسین سے سترہ اٹھارہ برس بڑے تھے۔ پرتاپ گڑھ میں اسکول ماسٹر تھے۔ دوسرے سید محمد حسین تھے۔ جنھوں نے لندن جاکر زراعت اور انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کی، اور ملکہ وکٹوریہ نے ان کے تعلیمی اخراجات برداشت کئے اور ان سے اپنے بیٹے کی طرح سلوک کیا۔ اس تعلق کی وجہ یہ ہے کہ سید محمد حسین، شاہی محل کے نیچے سے گزر رہے تھے۔ وہاں غالباً کچھ تعمیر کا کام ہو رہا تھا۔ اتفاق سے چند اینٹیں نیچے سید محمد حسین پر آگریں اور ان کی ٹانگ ٹوٹ گئی ملکہ وکٹوریہ کو معلوم ہوا تو اپنی مشہور زمانہ نیکی اور رحمدلی کے سبب سید محمد حسین کی عیادت کے لئے ہسپتال میں گئیں اور جب انھیں ان کے حالات معلوم ہوئے لندن میں قیام اور تعلیم کے تمام اخراجات ملکہ نے خود برداشت کرنے کا وعدہ کیا۔ سید محمد حسین نے بعد اداں بہت ترقی کی، اور حیدرآباد و کانپور میں دیوان رہے، برطانوی حکومت ہند میں بھی اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ زراعت کے موضوع پر کئی بلند پایہ کتابیں بھی ان سے یادگار ہیں۔

برصغیر میں سرسید احمد خاں کی تحریک کا آغاز ہو چکا تھا اور ہندوستان کے طول و عرض میں اس تحریک کے حامیوں اور مخالفوں میں سرسید اور ان کی درسگاہ کا شہرہ تھا۔ لکھنؤ میں بھی بہت سے نوجوان جدید تعلیم کی طرف متوجہ ہو رہے تھے گو ابتدائے عمر سے لیکر زندگی کی آخری سانسوں تک سید جعفر حسین سرسید کی تحریک کے سرگرم حامیوں میں سے ہے لیکن یہ بات

Marfat.com

یقین سے نہیں کہی جاسکتی کہ آیا انجینئرنگ کی تعلیم کے حصول کی خواہش، ان میں سرسید احمد خاں کی تحریک کے سبب پیدا ہوئی تھی یا بدلتی ہوئی زندگی کا شعور اور یہ خیال کہ مستقبل میں کس نوع کی تعلیم ہندوستان کے لوگوں کے لئے سود مند اور کارآمد ہوسکتی تھی انھیں رڑکی انجنیرنگ کالج تک لے گیا۔

انجینیرنگ کالج رڑکی میں داخلہ لینے کے سلسلے میں ان کے خاندان میں دو روایات مشہور ہیں ایک تو یہ کہ مروجہ تعلیم کے حصول کے بعد انھوں نے اپنی والدہ سے دس روپے مانگے اور رڑکی کالج میں داخلے کے لئے لکھنؤ سے روانہ ہو گئے۔

دوسری روایت یہ ہے کہ سید جعفر حسین کا قیام، اپنے بڑے بھائی کے پاس تھا جو شادی شدہ تھے اور ان سے عمر میں سترہ اٹھارہ برس بڑے تھے ان کے یہ بھائی اسسٹنٹ انسپکٹر آف اسکولز تھے اور پرتاب گڑھ میں تعینات تھے۔ سید جعفر حسین ان کے ساتھ ہی رہا کرتے تھے۔ اور وہیں انھوں نے مڈل تک تعلیم حاصل کی، اور انگریزی زبان سیکھی۔ ہر چند کہ اسکول پابندی سے نہیں جاتے تھے لیکن اپنی خداداد ذہانت اور بے مثال قوت حافظہ کے سبب اسکول میں باقاعدہ جانے والے ہم جماعتوں سے زیادہ اچھے نمبروں میں پاس ہوتے تھے اکثر اسکول جانے کے لئے گھر سے نکلتے لیکن راستے میں ایک پل کے نیچے بیٹھ کر مختلف قسم کے نقشے بناتے رہتے تھے۔ جب بڑے بھائی کو اس بات کی خبر ہوئی تو وہ ناراض ہوئے بھاوج نے بھی کہا کہ پڑھتے لکھتے نہیں ہو کیا خالی لکیریں کھینچ کھینچ کر روٹی کما سکو گے؟

بھائی کی بات کا تو شاید اس قدر اثر نہ ہوتا لیکن بھاوج کی بات ناگوار گزری اور گھر چھوڑ اور چنے لے کر پاپیادہ رڑکی کی جانب چل دیئے جہاں اس وقت انجنیرنگ کالج تھا۔ ڈیڑھ مہینے میں پیدل چل کر رڑکی کالج پہنچے اور داخلہ لے لیا۔ اور بہت محنت کے ساتھ پڑھا اور امتحان

Marfat.com

میں اوّل آئے۔

افراد اپنے اردگرد کے لوگوں کو متاثر کرتے ہیں اور اپنا اچھا یا برا تاثر دوسروں پر قائم کرتے ہیں۔ لیکن میرے خیال میں اگر کوئی شخص اپنی ذات سے کسی بڑے ادیب یا دانشور کو متاثر کرے تو اس کی شخصیت کے مکمل ہونے میں کسی قسم کا شک و شبہ باقی نہیں رہ جاتا۔ سید جعفر حسین بھی ایک ایسی ہی شخصیت ہیں جنھوں نے اپنی جدوجہد اور قوت عمل سے اردو کے عظیم ناول نگار مرزا ہادی رسوا کو متاثر کیا اور انھوں نے سید جعفر حسین کی زندگی پر ایک پورا ناول لکھ ڈالا۔ جو شریف زادہ کے نام سے مشہور ہے۔

لکھنؤ کے زوال پذیر معاشرے میں جہاں کا ہر فرد پدرم سلطان بود بنا ہوا تھا۔ مرزا ہادی رسوا نے سید جعفر حسین کے کردار میں وہ خصوصیات پائیں جس کا تعلق بے عمل زندگی سے نہیں تھا اور جو زندگی کی مثبت قدروں کا حامل تھا۔

یہاں سوال کیا جا سکتا ہے کہ اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ شریف زادہ کے ہیرو کی زندگی دراصل سید جعفر حسین کی زندگی ہی ہے بعض ہم عصر شہادتوں کے علاوہ شریف زادہ کے ہیرو کے کردار میں بیشتر باتیں اور واقعات ایسے ہیں جو سید جعفر حسین کی زندگی میں پیش آمدہ واقعات سے مماثلت رکھتے ہیں

تعلیم و تربیت و پیدائش میجر جنرل سید شاہد حامد صاحب کا بیان ہے کہ ان کے دادا سید جعفر حسین نے اسی برس کی عمر پائی اور ۱۹۳۶ء میں ان کا انتقال ہوا۔ اس حساب سے ان کا سن پیدائش ۱۸۵۶ء قرار پاتا ہے۔ سید شاہد حامد صاحب اور منشی عبدالغفور خاں اثر دلوی کے بیان کے مطابق

Marfat.com

جو رڑکی انجنیئرنگ کالج میں سید جعفر حسین صاحب سے دو سال پیچھے تھے[1]

سید جعفر حسین نے ۱۸۸۶ء میں انجنیئرنگ کا امتحان پاس کیا تھا۔ گویا ان کے سنہ پیدائش اور رڑکی انجنیئرنگ کالج سے فارغ التحصیل ہونے کے وقت ان کی عمر تیس[2] برس قرار پاتی ہے لیکن سید شاہد حامد صاحب کا بیان یہ بھی ہے کہ سید جعفر حسین نے پندرہ یا سولہ برس کی عمر میں انجنیئرنگ کالج میں داخلہ لیا تھا۔ بہر حال انجنیئرنگ کالج کا زمانہ تعلیم چار برسوں پر مشتمل تھا۔ اس لحاظ سے اگر ۱۸۵۶ء کو ان کا صحیح سنہ پیدائش مان لیا جائے تو پھر یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ انھوں نے تقریباً ۲۶ برس کی عمر میں کالج میں داخلہ لیا تھا۔ دوسری طرف اگر داخلے کے وقت پندرہ سولہ برس کی عمر فرض کر لی جائے تو اس حساب سے ان کا سنہ پیدائش ۱۸۶۶ء کے لگ بھگ قرار پاتا ہے اس سلسلے میں اگر مذکورہ روایت کو بھی ذہن میں رکھا جائے کہ سید جعفر حسین مڈل کے امتحان کے بعد کالج میں داخلے کے لئے گئے تھے تو اس اعتبار سے داخلے کے وقت پندرہ سولہ برس کی عمر صحیح معلوم ہوتی ہے۔

مولوی عبدالغفور خاں اترولوی کے بیان کے مطابق سید جعفر حسین کا سال پیدائش ۱۸۵۰ء یا ۱۸۵۵ بنتا ہے، وہ لکھتے ہیں۔

"۱۹۱۰ء کے شروع میں ان کی عمر ۵۰ اور ۶۰ سال کے درمیان پہنچ گئی تھی۔ نہایت ناموری کے بعد ملازمت سے ریٹائرڈ ہو گئے[2]۔"

ان تمام بیانات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ ۱۸۵۰ء اور ۱۸۵۵ء کے درمیانی برسوں میں پیدا ہوئے ہوں گے۔

۱۔ سوانح عمری مولوی عبدالغفور خاں اترولوی مطبوعہ برقی پریس آگرہ ص ۵۵

۲۔ سوانح عمری منشی عبدالغفور خاں اترولوی مطبوعہ برقی پریس آگرہ ص ۵۶-۵۵

Marfat.com

رڑکی انجنیئرنگ کالج میں داخلہ

والدہ سے رخصت ہو کر جس وقت رڑکی پہنچے تو پا پیادہ مسافت طے کرنے کے سبب لباس گرد آلود تھا۔ لیکن وہ اسی حالت میں پرنسپل کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ جوان کے ذوق و شوق کو دیکھکر بہت متاثر ہوا۔ اور فوراً ہی انھیں داخلہ دے دیا گیا۔ سید جعفر حسین نے جلد ہی اپنی محنت، دیانت اور ایمانداری کے سبب طلبہ میں امتیازی مقام حاصل کر لیا۔ اور تمام اساتذہ بھی ان کی طرف خاص طور پر متوجہ ہو گئے۔ ان کے کالج فیلو مولوی عبدالغفور خاں اتر ولوی کے بیان کے مطابق کالج کے زمانہ طالب علمی میں اپنے اخلاقِ حمیدہ کی بناء پر وہ تمام طلبہ میں ممتاز و محبوب تھے اور اساتذہ بھی ان سے شفقت سے پیش آتے تھے۔

کالج کے زمانہ قیام کے دوران سب سے بڑا مسئلہ تعلیمی مصارف کا تھا۔ اوّل تو گھر کے معاشی حالات ایسے نہ تھے کہ وہ رقم گھر سے منگوا سکتے۔ دوسرے اپنی بھاوج کے طعنے سن کر جس عزم کو لے کر وہ گھر سے رخصت ہوئے تھے، ایسی صورت میں ان کی غیرت نے بڑے بھائی کے آگے ہاتھ پھیلانا گوارا نہ کیا۔ چنانچہ ان کا قیام تو کالج کے ہوسٹل میں تھا لیکن اپنے اخراجات کے لئے تعلیمی مصروفیات سے وقت نکال کر رات کے وقت مقامی تاجروں کا حساب کتاب لکھتے تھے اور اس کے معاوضے سے اپنے تعلیمی مصارف برداشت کرتے تھے۔

رڑکی انجنیئرنگ کالج کے زمانہ تعلیم میں ان کا معمول یہی رہا اور وہ اس قدر انہماک اور توجہ کے ساتھ مطالعے میں مصروف رہے کہ والدہ کے جو خطوط ان کے نام آتے تھے انھیں پڑھے بغیر ہی ایک گھڑے میں ڈال دیا کرتے تھے کیونکہ انھیں ڈر تھا کہ کہیں گھر کے حالات کے سبب، یا ماں کی محبت کی بنا پر انھیں تعلیم ادھوری نہ چھوڑنا پڑ جائے یا وہ پوری دلجمعی کے ساتھ اپنی پڑھائی کی طرف توجہ نہ دے پائیں گے چنانچہ جب امتیاز کے ساتھ

Marfat.com

انجینیرنگ کا امتحان پاس کر لیا تو اس کے بعد والدہ کے تمام خطوط ایک ساتھ پڑھے۔

یو پی میں جن پہلے دو مسلمانوں نے انجینیرنگ امتحان پاس کیا ان میں سے ایک سید جعفر حسین تھے جنھیں یہ امتیاز بھی حاصل تھا کہ وہ امتحان میں اوّل آئے تھے۔

سرکاری ملازمت

امتحان پاس کرتے ہی ان کا تقرر محکمہ انہار میں ہو گیا۔ اور پہلی تعیناتی نیپال کی ترائی میں ہوئی تھی۔ صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ میں وہ پہلے مسلمان تھے جن کا تقرر بحیثیت انجینیر کیا گیا تھا۔ ہر کام کو پوری توجہ اور ایمانداری سے انجام دینے کے نتیجے میں جلد ہی ان کی شہرت اعلیٰ حکام تک جا پہنچی اور ملازمت کے اوائل میں ہی انھیں ایک قابل اور باصلاحیت انجینیر تسلیم کر لیا گیا۔

ان کے ایک کالج فیلو اور رفیق کار منشی عبدالغفور خاں آتروَلوی نے اپنی سوانح عمری میں بحیثیت انجینیر ان کا تقرر حیدر آباد دکن میں بتایا ہے لیکن وہ غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہیں۔ سید جعفر حسین تمام زندگی صوبجات متحدہ میں ہی مختلف خدمات سرانجام دیتے رہے۔ زمانہ ملازمت میں جس انداز میں مختلف اوقات میں جہاں جہاں وہ تعینات رہے ہیں اس کی تفصیل یہ ہے۔

۱۸۸۶ء میں ملازمت کا آغاز کیا۔

۱۸۹۵ء میں بلند شہر ڈویژن میں تعینات ہوئے۔ مارٹ ٹینکس ڈویژن آپ کی زیر نگرانی تعمیر ہوا۔ منشی عبدالغفور خاں آتروَلوی لکھتے ہیں۔

" ۱۸۹۵ء میں سید صاحب چند روز کے واسطے بلند شہر ڈویژن میں سب ڈویژنل آفیسر رہے تھے اور مجھ کو ماٹ برانچ نہر کے ہیڈ پر ان کی ماتحتی میں

۱:۔ سوانح عمری منشی عبدالغفور خاں آتروَلوی ص ۴ تا ۵۔

Marfat.com

قریب ایک ہفتہ کام انجام دینے کا موقعہ ملا تھا۔ اور منشی پربھودیال کی دراندازیوں سے واقف ہوگئے تھے.... میرے ہمدرد تھے اور مجھکو ذہین اور ہونہار خیال کرتے تھے۔ فتح پور ڈویژن میں بھی چند ماہ یکجائی قیام کا موقعہ ملا تھا۔ ٹینکس (TANKS) ڈویژن کا چارج لینے کے بعد سید صاحب نے مجھکو للت پور سے جھانسی تبدیل کرایا اور میری وقعت میری حیثیت سے زیادہ کرنے لگے.....

سید صاحب نے چارج لینے کے بعد کنسٹرکشن کا کام عملاً میرے سپرد کر دیا اور خود تالابوں کے جدید سائٹ تلاش کرنے میں مصروف ہو گئے..."

۱۸۹۸ء موضع گڑھ مئو جھانسی میں گنجیس کینال بنایا۔ چیف انجینئر مسٹر میکلوڈ نے ان کے کام کی تعریف کی اور حکومت کو سفارشات پیش کیں چنانچہ اس کے نتیجے میں انھیں خاں بہادر کا خطاب ملا۔

علاوہ ازیں فتح پور ڈویژن، ڈبڈبر ڈویژن، ٹینکس ڈویژن کے انچارج کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیں۔

سید جعفر حسین نے گنجس کینال کا جو منصوبہ پیش کیا تھا اسے حکام بالا نے پسند کیا تھا۔ اس سلسلے میں ہم صوبجات متحدہ کی حکومت کے ایک خط کا اردو ترجمہ پیش کر رہے ہیں۔

گورنمنٹ صوبہ جات متحدہ۔ یکم جون ۱۹۰۶ء

گورنمنٹ ہاؤس نینی تال

ڈیر سید جعفر حسین

جھانسی کے نزدیک گڑھ مئو کے مقام پر ایک بڑے آبی ذخیرے کی تعمیر کے سلسلے

Marfat.com

میں آپ کی مجوزہ تجویز کو مسٹر میکلوڈ میسٹن علم میں لاتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ یہ بند هیلکلنڈ میں ایک بہترین جھیل ہوگی اور آپکے نام کو ملک کے محسن کے طور پر دوام بخشے گی۔ میں اس عظیم الشان منصوبے کی تعمیر پر آپ کو انتہائی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ مذکورہ تعمیر اس نوع کے مزید کئی منصوبوں کی ایک کڑی ہوگا۔

آپ کا خیر خواہ

جے۔ ڈی۔ لاٹوش

۱۸۹۹ء۔ ریاست گوالیار کو ایک ایسے انجینئر کی ضرورت تھی جو ریاست میں مختلف نوعیت کے تعمیراتی منصوبوں کی تیاری اور تکمیل کرا سکے اس سلسلے میں برطانوی حکومت ہند سے کسی قابل انجینئر کی خدمات مستعار حاصل کرنے کے لئے درخواست کی گئی تھی۔ چنانچہ حکومت ہند نے سید جعفر حسین کی خدمات ڈیپوٹیشن پر ریاست گوالیار کو دے دیں۔ یہ تعیناتی پانچ سال کے لئے تھی اس وقت سرکار برطانیہ میں وہ صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ میں ڈپٹی مجسٹریٹ محکمہ انہار کی حیثیت سے فرائض سرانجام دے رہے تھے۔

ریاست گوالیار میں سید جعفر حسین کو مورار میں ڈویژنل انجینئر کے عہدے پر فائز کیا گیا تھا۔ وہ چار سال گوالیار میں تعینات رہے۔

۱۹۰۲ء۔ اس سال نواب محسن الملک آنریری سیکرٹری ایم۔ اے۔ او۔ کالج علی گڑھ کی درخواست پر ان کی خدمات لفٹیننٹ گورنر صوبجات متحدہ نے علی گڑھ کالج کو مستعار دے دی تھیں۔ جہاں سید جعفر حسین کی زیر نگرانی دن بیوٹی فنڈ کی اسکیم اور بعض نئے بلاکوں کی تعمیر کی

ا۔ بحوالہ مکتوب محسن الملک سیکرٹری ایم اے او کالج علی گڑھ بنام لیفٹیننٹ گورنر صوبجات متحدہ

Marfat.com

جانے والی تھی۔

۱۹۰۵ء:۔ اس سال سید جعفر حسین نے بینٹا نہر (BENTA CANAL) تعمیر کرائی۔

۱۹۰۷ء:۔ سایئوار (AIWAR ؟) ٹینک تعمیر کرایا۔ یہاں سید جعفر حسین کا قیام چار سال رہا۔

۱۹۰۸ء:۔ میں برد ا ساگر بنوایا۔

۱۹۱۰ء:۔ میں ریٹائرڈ ہوئے۔

اپنی سرکاری ملازمت کے دوران سید جعفر حسین نے بے شمار چھوٹی بڑی تعمیرات کیں لیکن ہم نے مذکورہ بالا صفحات میں صرف ان کے چند بڑے بڑے کارناموں کا تذکرہ کیا ہے۔

ہر شعبۂ حیات میں انسان کچھ ایسے کام کرتا ہے کہ اپنے بعد اپنے نقوش ثبت چھوڑ جاتا ہے سید جعفر حسین بھی ایسے ہی لوگوں میں سے تھے ان کی زندگی کے دو نقش خاص طور پر باقی رہنے والے ہیں ایک تو ان کی وہ خدمات ہیں جو انھوں نے مسلمانوں کی تعلیم اور علی گڑھ کالج کے سلسلے میں سرانجام دیں اور ان کا دوسرا نقش وہ عمارتیں، آبی ذخیرے اور نہریں وغیرہ ہیں جو انھوں نے سرکاری ملازمت کے دوران بنوائیں۔

ایک مصنف کی یادگار اس کی تصانیف ہوتی ہیں۔ سورماؤں اور فاتحوں کی بہادری اور کارناموں کی تفصیل تو تاریخ یاد رکھتی ہے یہی حال تعمیرات کا ہے کہ ان کا وجود اس کے خالق کی یاد دلاتا رہتا ہے۔ مولانا شبلی نے اپنی نظم خواب کہن میں کہا ہے کہ اگر تاریخ عالم سے مسلمانوں کا نام حذف بھی کر دیا جائے تو ان کی بنوائی ہوئی عمارتیں ان کے وجود کی گواہی دیں گی۔

اس صورت میں صوبجات متحدہ کے وہ آبی ذخیرے، عمارات اور نہریں:
اس کے بنانے والے کا نام زندہ رکھیں گی اور اپنے بنانے والے کی

Marfat.com

پیشہ ورانہ مہارت کی گواہ بن رہیں گی۔

ایک ماہر کی رائے

گنجیس کینال (GANGAS CANAL) کے سلسلے میں ہم گزشتہ صفحات میں سید جعفر حسین کے ایک افسر اعلیٰ کا تعریفی خط پیش کر چکے ہیں ممکن ہے بعض طبائع اس رائے کے صائب اور حقیقت پر مبنی ہونے میں کسی قسم کے شک و شبہ کا اظہار کریں کیونکہ عام مشاہدہ یہ ہے کہ بعض اوقات افسران بالا کے اس قسم کے خطوط ماتحتوں کے خوشامد یا تملق کے سلسلے میں بھی مل جاتے ہیں۔

چنانچہ اس شک کو دور کرنے کے لئے ہم مولوی عبدالغفور خاں اترولوی کی سوانح عمری سے ایک اقتباس پیش کرتے ہیں۔ یہ ایک ماہر فن کی رائے بھی ہے اور اس میں تفصیل سے انھوں نے سید جعفر حسین کے اس کارنامے کا تذکرہ کیا ہے جس پر انھیں خاں بہادر کا خطاب ملا تھا۔

عام مشاہدے میں یہ بات آئی ہے کہ آدمی بہت کم اپنے ہم پیشہ کی تعریف کرتا ہے لہذا ان کی تعریف کو حق بجانب تسلیم کر لینے میں کوئی عذر نہیں ہونا چاہیئے۔ اس تعریف کے سلسلے میں بھی ایک گمان یہ گزر سکتا ہے کہ مولوی عبدالغفور خاں اترولوی سید جعفر حسین کے ماتحت تھے لہذا انھوں نے اس قدر تعریف بر بنائے خوشامد کی ہو۔ لیکن واضح ہو کہ موصوف نے اپنی سوانح عمری اپنی ریٹائرمنٹ اور سید جعفر حسین کے انتقال کے کافی عرصہ بعد لکھی تھی۔ چنانچہ ہم ان کے بیان کی صداقت پر یقین کر سکتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

"موضع گرڈھ میڈو کے قریب دو اونچے پہاڑوں کے اتصال سے ایک قدرتی مثلث پیدا ہو گیا تھا۔ جس کی لمبائی ایک میل چھ فرلانگ اور قاعدہ چھ فرلانگ تھا۔ اور اس میں پانی تقریباً پچاس فٹ گہرائی تک جمع ہو جانے کا امکان تھا۔ مگر (CATCHMENT) ایریا بالکل ناکافی تھا۔ سید صاحب

Marfat.com

نے فوق العادت محنت اور جستجو کر کے ایک بڑا نالہ گڑھ میوٹینک میں ڈائیورٹ (DIVERT) کر دیا پسلینسڑی بند کی۔ لائن بے حد جدوجہد اور کاوش سے تقریباً تین میل لمبی تجویز کی اور درمیان میں راستہ پر ایک پل تقریباً تین سو فٹ لمبا تجویز کر دیا۔ اس طرح مندرجہ بالا پیمائش کا تالاب لبریز ہونا ممکن ہوگیا۔ جس کی گہرائی پچاس فٹ اور آب پاشی میں کام آنے کے قابل پانی کی گہرائی ۳۶ فٹ تھی۔ اس تالاب کی کیپیٹی (CAPACITY) غالباً ۴۰۰ ملین فٹ مکسر سے زیادہ تھی جو ۱۸ میل لمبی نہر کو سیراب کرنے کے واسطے کافی تھی۔ اس تمام پروجیکٹ کا تخمینہ چار لاکھ روپیہ ہوا۔

جس وقت یہ پروجیکٹ قریب الاختتام تھا جھانسی میں سید صاحب نے مجھ کو دکھایا اور ضروری تشریح کی، میں نے جواب دیا کہ اگر آپ کوئی اور بڑی اسکیم یہاں تیار نہ کر سکیں تو بھی یہی ایک کارنامہ ڈویژنل افسری کے جواز کے واسطے زندہ سرٹیفیکیٹ ہے۔ سید صاحب نے خوش ہو کر نسیم کا یہ شعر پڑھا۔

دی اس طرح سے نسیم نے داد سخن
شک مجھے بھی اپنی بے کمالی میں ہوا

یہ پروجیکٹ بعد تکمیل گورنمنٹ کو بھیجا گیا۔ مسٹر میکلوڈ کی تحریک سے جواب چیف انجنیئر ہو گئے تھے گورنر صاحب بہادر یوپی نے اپنا خاص دستخطی خط سید صاحب کے نام بھیجا جس میں دیگر تعریفوں کے بعد یہ فقرہ بھی درج تھا۔

IT WILL HAND YOUR NAME TO
AS A BENIFACTOR OF COUNTRY

Marfat.com

اور پھر اس سلسلے میں سید صاحب کو "خاں بہادر" کا خطاب ہوا۔ اور ہم سب کو بے حد مسرت ہوئی[1]۔"

ایک اور مقام پر اپنی سوانح عمری میں مولوی صاحب خان بہادر سید جعفر حسین کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"خود دیانتدار تھے۔ جفاکش اور بے حد متحمل مزاج تھے۔ تالابوں کی تجویز میں ایکسپرٹ (EXPERT) تھے اور نہایت دوراندیش تھے[2]۔"

مسلمان ریاستیں اور ہر وہ علاقہ جہاں مسلمان رہتے تھے۔ خان بہادر خاص طور سے اس علاقے میں نہایت توجہ اور دلچسپی کے ساتھ کام سرانجام دیتے تھے۔ چنانچہ ریاست بھوپال میں بھی کئی واٹر ورکس اور تالاب خاص اپنی نگرانی میں تعمیر کرائے تھے۔

اسی طرح اپنے آبائی شہر لکھنؤ کے کئی واٹر ورکس خاص اپنی نگرانی میں بنوائے۔ اور اس سلسلے میں کوئی معاوضہ طلب نہیں کیا۔ لکھنؤ میں شاہی زمانے کی نہروں کو ازسر نو درست کرایا اور کئی منصوبے بنائے۔ ہیوٹ انجینئرنگ کالج کا نقشہ بھی انھوں نے ہی بنایا تھا اور اس کی تعمیر بھی اپنی نگرانی میں کرائی تھی

اس وقت کی انگریزی حکومت نے ان سے مختلف اسکیمیں بنوائیں۔ ان میں سے ایک

ELECTRIFICATION OF GIP RAILWAY FROM JHANSI TO BOMBAY.

خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ اس زمانے میں اس اسکیم پر عمل درآمد نہ ہو سکا۔

اب سنا ہے کہ آزادی کے بعد حکومت ہند نے اس اسکیم کو عملی جامہ پہنایا ہے۔

۱:۔ سوانح عمری مولوی عبدالغفور خاں اترولوی مطبوعہ مرہتی پریس آگرہ صہ ۴۷ تا ۵۰
۲:۔ " " " " صہ ۴۷

Marfat.com

کاغذی تیاریوں کی تکمیل کے بعد جب معاوضہ کی ادائیگی کا وقت آیا تو خان بہادر سید جعفر حسین نے کوئی معاوضہ قبول کرنے سے انکار کر دیا اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ جب یہ اسکیم نافذالعمل ہو جائے تو اس کی آمدنی کا ایک حصّہ ان کے خاندان والوں کو دے دیا جائے۔

جب ہندوستان میں پُر فضا مقامات کو ہل اسٹیشن کے طور پر بنایا جانا مقصود ہوا تو دیگر مقامات کے علاوہ نظر انتخابات نینی تال پر بھی پڑی۔ چنانچہ نینی تال کو ہل اسٹیشن بنانے کی غرض سے اس علاقے کے سروے کا کام سید جعفر حسین کے سپرد کیا گیا۔ سید صاحب نے نہایت محنت سے اس کام کو سرانجام دیا۔ اس خدمت کے صلے میں انگریزی حکومت نے انھیں نینی تال میں ایک پہاڑی دینا چاہی لیکن انھوں نے یہ کہکر انعام لینے سے انکار کر دیا کہ جنگل میں زمین لیکر کیا کروں گا۔"

کچھ عرصے کے لئے آپ کو گورنمنٹ انجینئرنگ اسکول کا پرنسپل بھی مقرر کیا گیا تھا آپ نے اسکول کے نظم و نسق کو پہلے سے بہت بہتر کر دیا تھا اور حسن سلوک اور شفقت و مہربانی کے سبب طلبہ میں بہت مقبول ہوئے۔

سید جعفر حسین کے خاندانی کاغذات اور ان کے سروس ریکارڈ پر جن مختلف انگریز افسران کے ریمارک ہیں ان سے بھی سید جعفر حسین کی پیشہ ورانہ مہارت اور قابلیت و اہلیت کی تصدیق ہوتی ہے۔

لکھنؤ میں خان بہادر سید جعفر حسین نے جو خدمات انجام دی تھیں ان کے بارے میں سر این ایم میکلوڈ ممبر بورڈ آف ریونیو لکھتے ہیں۔

"خاں بہادر صاحب نے لکھنؤ کے شہر کو خوبصورت بنایا اور پانی فراہم کیا"

صوبجات متحدہ کے ایک مشہور انگریز چیف انجینئر نے ان کے بارے میں اس خیال

Marfat.com

کا اظہار کیا تھا۔

"خاں بہادر سید جعفر حسین سے بہتر انجینئر میں نے نہیں دیکھا۔۔۔۔"

لندن کے "انسٹیوٹ آف سول انجینیرز" کے ایک اجتماع میں سر چارلس اسٹورٹ بیلی گورنر بہار واڑیسہ نے خاں بہادر سید جعفر حسین کو ان الفاظ میں خراج تحسین ادا کیا۔

"خاں بہادر سید جعفر حسین نے ہندہیلکھنڈ کی نہروں کو بنوانے میں ایک زبردست نمایاں کام کیا ہے اور ملک ان کا مشکور ہے۔۔۔"

سر بی گارسٹن کا خیال ہے کہ:۔

"خاں بہادر سید جعفر حسین نے محکمہ نہر کے لئے جو کام انجام دیئے ہیں اس کا کوئی جواب نہیں ہے۔۔۔۔"

(GANGIS CANAL) گنجیس کینال کی تیاری پر خاں بہادری کے خطاب کے علاوہ وائسرائے ہند نے بھی انھیں مبارکباد دی اور سر جان ہیٹن نے ریاست گوالیار میں ان کی خدمات کی تعریف کی۔

ایمانداری برصغیر کے اکثر دفاتر میں یہ بات دیکھنے میں آتی ہے کہ حکومت کے پیسے کو بے دریغ اور بے رحمی سے خرچ کیا جاتا ہے اور اس بات کا خیال نہیں رکھا جاتا کہ وہ قومی سرمایہ ہے۔ اس سلسلے میں جو محکمے بدنام ہیں، ان میں تعمیرات کا محکمہ سرفہرست آتا ہے۔

لیکن سید جعفر حسین سرکاری رقومات کو بھی اس انداز میں اور نہایت ایمانداری کے ساتھ خرچ کرتے تھے جیسے ان کا ذاتی پیسہ ہو۔ اس سلسلے میں وہ کسی قسم کی بے ایمانی برداشت نہیں کر سکتے تھے اور نہ ہی ٹھیکیدار وغیرہ کو ناجائز حد تک منافع لینے دیتے تھے۔ پوری زندگی

Marfat.com

انھوں نے کم سے کم سرکاری روپے میں زیادہ سے زیادہ کام کرنے کی کوشش کی۔ اس احتیاط میں ان کے مدِ نظر ہمیشہ یہ بات رہی کہ ہر چند حکومت غیر ملکی ہے لیکن دولت تو ہندوستانی قوم کی ہے سید جعفر حسین ہمیشہ اس بات کی کوشش کرتے تھے کہ سرکاری کام تخمینے کی حدود میں ختم ہو جائے یہاں ایک واقعہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ جب آپ فتح پور میں تعینات کئے گئے تو سید صاحب کے چارج سنبھالنے سے قبل وہاں کے انگریز انجنیر نے سرکاری روپے میں غبن ہو جانے کے سبب خودکشی کر لی تھی۔ سید جعفر حسین نے چارج لینے کے فوراً بعد تمام ٹھیکیداروں اور اپنے ماتحتوں کو بلایا اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ مزید سرکاری روپیہ ضائع نہ ہو اور کام اسی تخمینے میں پورا ہو جائے۔ انھوں نے ٹھیکیداروں سے کہا کہ گو اس میں منافع کی شرح کم ہو جائے گی لیکن بہرحال یہ قربانی دینا ہی ہوگی۔ سید جعفر حسین کی اس دردمندی اور قومی دولت کے ضیاع کو روکنے کے اس جذبے کو ٹھیکیداروں نے بھی سراہا اور کم منافع لینے پر آمادہ ہو گئے چنانچہ غبن ہو جانے کے بعد جو سرکاری رقم بچ گئی تھی۔ اسی میں کینال کی تعمیر کا کام پورا ہو گیا۔

سید جعفر حسین اور علی گڑھ کالج

سر سید احمد خاں سے خان بہادر سید جعفر حسین کو بہت زیادہ عقیدت تھی وہ انھیں ہندوستانی مسلمانوں کا نجات دہندہ سمجھتے تھے۔ سید جعفر حسین کو چونکہ مسلمانوں کی زبوں حالی، معاشی بدحالی اور تعلیمی میدان میں ان کی پستی کا شدید احساس تھا۔ لہٰذا سر سید احمد خاں سے ان کی محبت و عقیدت میں بھی یہی جذبہ کارفرما تھا۔ علاوہ ازیں ان کا مشن وہی تھا جسے لے کر سر سید احمد خاں اٹھے تھے۔

سید جعفر حسین اپنی ذاتی حد تک مقامی سطح پر ان مسائل کے حل کی کوششوں میں لگے رہتے تھے۔ حتیٰ کہ سر سید احمد خاں تک ان کی شہرت جا پہنچی اور سر سید احمد خاں نے ملاقات

Marfat.com

کے لئے بلوایا۔ اور پہلی ہی ملاقات میں دونوں کے درمیان جو رشتہ محبت استوار ہوا وہ تازندگی قائم رہا اور اس دن کے بعد سے سید جعفر حسین بھی سرسید کی تحریک کے ایک سرگرم اور نامور کارکن بن گئے۔

سرسید کی مشاورت

سرسید احمد خاں نے ان کے خیالات اور پیشہ ورانہ مہارت کے پیش نظر انھیں علی گڑھ اسکول کے سلسلے میں کی جانے والی تعمیرات کا انچارج بنا رکھا تھا۔ اسکول اور بعدازاں کالج کے بلاکوں یا دوسری عمارتوں کا کوئی منصوبہ ایسا نہ ہوتا تھا جس میں سرسید احمد خاں پہلے ان سے مشورہ نہ کر لیتے ہوں۔ اور سید جعفر حسین یہ سارا کام بلامعاوضہ سرانجام دیتے تھے۔

جب نئے بلاکوں کی تعمیر شروع کی جانے والی ہوتی تو وہ اپنی ملازمت سے بلاتنخواہ رخصت لے کر سرسید کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے علی گڑھ چلے آتے تھے۔ سرسید احمد کو کالج کے کلی اور جزئی امور کی طرف توجہ دینے کی جو عادت تھی اس سے تمام لوگ آگاہ ہیں لیکن تعمیرات کی نگرانی وغیرہ کا کام سید جعفر حسین کے سنبھالتے ہی، سرسید احمد خاں خود کو اس سے بری الذمہ سمجھتے تھے۔

سرسید احمد خاں نے انھیں کالج کے کورٹ کا ممبر اور ٹرسٹی مقرر کیا تھا اور تازندگی وہ اس کے ممبر اور ٹرسٹی رہے۔ کالج کے لئے فنڈز کی فراہمی کے سلسلے میں بھی سید جعفر حسین نت نئی ترکیبیں لڑاتے رہتے تھے۔ سرسید احمد خاں نے پہلی ہی ملاقات میں جو ان کی حسب خواہش ہوئی تھی، سید جعفر حسین سے کہا تھا کہ قوم کو ان کی ضرورت ہے۔ چنانچہ انھوں نے کہا کہ جو خدمت بھی انھیں سونپی جائے گی وہ بسروچشم اس کو قبول کریں گے۔

علی گڑھ میں تعمیر کی جانے والی مختلف عمارتوں کی ایک ایک اینٹ ان کے سامنے رکھی

Marfat.com

جاتی تھی۔ نقشے بھی وہ خود بناتے تھے اور سردی گرمی سے بے نیاز خود کھڑے ہو کر کام کی نگرانی بھی کرتے تھے۔ جب انھیں آرام کا مشورہ دیا جاتا تھا تو وہ کہتے تھے کہ یہ غریب قوم کا پیسہ ہے اس کا مصرف صحیح ہونا چاہیئے۔ وہ اپنی اس قومی خدمت کے لئے اپنی تنخواہ کا نقصان کر کے بھی خوش رہتے تھے۔ اور علی گڑھ کی انتظامیہ سے کسی خاص امتیازی سلوک کے طلبگار نہیں ہوتے تھے طلبا کے ہوسٹل کے ایک کمرے میں ہی اپنا بستر لگا لیتے تھے اور طلبا کے لئے جو کھانا پکتا تھا اسی میں سے کھا لیتے تھے۔

ایک دلچسپ واقعہ سید جعفر حسین صاحب بتایا کرتے تھے کہ جب انھیں تعمیرات وغیرہ کے سلسلے میں سرسید احمد خاں سے گفتگو کرنا ہوتی تھی تو وہ دو تین گھنٹے قبل ریلوے اسٹیشن پر چلے جاتے تھے۔ سرسید احمد خاں کی عادت یہ تھی کہ وہ ہمیشہ گاڑی آنے سے ایک ڈیڑھ گھنٹہ قبل اسٹیشن پر آجایا کرتے تھے۔ چنانچہ سید جعفر حسین تعمیری امور کے بارے میں اکثر ان سے تفصیلی گفتگو اسٹیشن پر ہی کیا کرتے تھے جہاں اور جگہوں کے علاوہ سرسید احمد خان کو نسبتاً زیادہ مہلت ہوتی تھی اور وہ بہت تفصیل سے بات چیت کر سکتے تھے۔

سرسید احمد خاں کے انتقال کے بعد انھوں نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ کالج کو یونیورسٹی کا درجہ دینے کے لئے جو مصارف ہوں گے ان کے لئے "ون روپی فنڈ" کی مہم کا آغاز کیا جائے۔ ان دنوں سید جعفر حسین ریاست گوالیار میں ڈیپوٹیشن پر کام کر رہے تھے چنانچہ علیگڑھ کالج کے آنریری سیکرٹری نواب محسن الملک نے لیفٹیننٹ گورنر صوبجات متحدہ کو ایک چھٹی لکھی تھی جس میں سید جعفر حسین کی خدمات علی گڑھ کالج کے لئے مستعار مانگی گئی تھیں اس خط میں سید جعفر حسین کا ذکر نواب محسن الملک نے نہایت محبت اور احترام سے کیا ہے۔

Marfat.com

نواب محسن الملک کا خط

خط بنام پرائیویٹ سیکرٹری برائے لیفٹیننٹ گورنر صاحب صوبجات متحدہ۔ ہند۔

• جناب عالی! میں آپ کا از حد مشکور ہوں گا اگر آپ مندرجہ ذیل معروضات عالی جناب لیفٹیننٹ گورنر صاحب کی خدمت میں پیش فرمادیں:۔

گزشتہ اگست میں ہزآنر کی علیگڑھ میں تشریف آوری کے موقعہ پر آں جناب کے علم میں یہ بات لائی گئی تھی کہ ہمیں ایک ایسے مسلمان شخص کی ضرورت ہے کہ جو سرسید میموریل فنڈ کے جمع کرنے کے کام کی نگرانی کامیابی اور ہوشیاری کے ساتھ کرسکے۔ علاوہ ازیں کالج کے بلڈنگ ڈپارٹمنٹ کی بھی کماحقہ نگرانی کرسکے جس کی دیکھ بھال اور باقاعدہ نظم و ضبط کی شدید ضرورت ہے۔ مطلوبہ شخصیت ایسی ہونی چاہیئے جس میں اہلیت اور جفاکشی و جانفشانی کے ساتھ ساتھ کالج سے محبت اور اس کے مفادات کی نگہداشت کا جذبہ بھی موجود ہو۔ نیز اسے مسلمانوں کا اعتماد بھی حاصل ہو اور وہ ان کے لئے واجب التعظیم ہو۔

چنانچہ میں ہزآنر کے حضور سید جعفر حسین کا نام پیش کرنے کا اعزاز حاصل کر رہا ہوں جو صوبجات متحدہ کے محکمہ انہار میں ڈپٹی مجسٹریٹ ہیں اور ان دنوں ریاست گوالیار میں ڈیپوٹیشن پر کام کر رہے ہیں۔

کالج کے معاملات میں ان کے ذوق و شوق اور سرکاری فرائض کی بجاآوری میں ان کی نیک نامی کے پیش نظر میں اور میرے تمام ساتھی اس بات پر پورا یقین رکھتے ہیں کہ ہماری موجودہ ضروریات کے لئے وہ انتہائی موزوں اور سودمند شخصیت ہیں۔

Marfat.com

ایک تجربہ کار اور قابل سرکاری افسر ہونے کے علاوہ انھیں مسلمان قوم کا بھرپور اعتماد حاصل ہے یہاں میں کالج کے سلسلے میں ان کی حالیہ خدمت کا تذکرہ کروں گا جو انھوں نے ون روپی فنڈ کی اسکیم کو منظم اور آغاز کر کے سرانجام دی ہے۔ اور یہ یقیناً ان کی انتھک محنت، ہمت اور لگن کا نتیجہ ہے کہ مذکورہ فنڈ میں اب تک چودہ ہزار روپیہ جمع ہو چکا ہے۔ میں یہاں یہ بھی عرض کرنے کی جسارت کروں گا کہ اگر حکومت اجازت دے دے گی۔ تو شخص مذکور کالج کی ذمے داری سنبھالنے کے لئے مکمل طور پر آمادہ ہیں۔

لہٰذا میں ملتمس ہوں کہ ہزآنر علیگڑھ کالج کے لئے سید جعفر حسین کی خدمات کی منتقلی منظور فرمائیں گے۔ شخص مذکور اور علیگڑھ کالج کے حکام کے درمیان شرائط کار سرکاری ضوابط کے دائرہ کار میں طے ہوں گی۔

سید جعفر حسین کو ریاست گوالیار میں پانچ سال کے لئے ڈیپوٹیشن پہ بھیجا گیا تھا۔ اس مدت میں سے چار برس مکمل ہو چکے ہیں۔ اگر حکومت ازراہ عنایت ان کی خدمات علیگڑھ کالج کو مستعار دینے پہ رضامند ہو تو وہ اپنی واپسی کی درخواست حکومت میں پیش کرنے کو تیار ہیں۔۔۔۔"

دستخط محسن الملک آنریری سیکرٹری۔

ون روپی فنڈ کے سلسلے میں سید جعفر حسین کی تحریک کو کتنی اہمیت دی گئی تھی۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:۔

<u>ONE RUPEE FUND</u>

SYED JAFFAR HUSSAIN, A CANAL

Marfat.com

MAGISTRATE IN U.P. THEN ON DEPUTATION WITH. THE GOVERNMENT OF GWALIOR OUTLINED A 'BOLD SCHEME; WHICH HE CALLED "THE ONE RUPEE FUND." HE UNDERTOOK TO COLLECT A LAKH OF RUPEES A YEAR, FOR THE PROPOSED UNIVERSITY THE RATE OF A RUPEE PER INDIDUAL. BY DECEMBER 31, 1903, HE HAD COLLECTED RS, 18, 824, WHICH WENT UPTO RS, 26,000 IN AUGUST, 1904,

TOTAL REALISATIONS FOR BULLDING CONSTRUCTION AND THE "ONE RUPEE FUND" FROM APRIL 1898 TO SEPTEMBER 30, 1904, AMOUNTED TO RS. 4,05,708

علیگڑھ میں قیام کی خواہش

علی گڑھ کی درسگاہ سے انھیں غیر معمولی دلچسپی تھی۔ چنانچہ وہیں مستقل قیام کا ارادہ تھا۔ اور اس خیال سے علی گڑھ میں بھی ایک خوبصورت گھر تعمیر کرایا تھا اور اس کا نام جعفر منزل رکھا تھا۔ بعدازاں یہ گھر ایم۔ اے۔ او۔ کالج کو دے دیا تھا۔

ساری عمر نہایت پابندی کے ساتھ اپنی تنخواہ کا دسواں حصّہ ایم۔ اے۔ او۔ کالج کو بطور عطیہ دیتے رہے۔ اپنے دوست، احباب، عزیز و اقربا سب کو ہمیشہ تلقین کیا کرتے

Marfat.com

تھے کہ وہ حسب استطاعت کچھ نہ کچھ عطیات ایم۔ اے۔ او کالج کو دیا کریں۔ خود بھی لوگوں سے چندہ وصول کر کے کالج بھیجا کرتے تھے۔

علیگڑھ کا سالانہ ڈنر

سید جعفر حسین کی ملاقاتیں ہندوستان کے نامور مسلم اشخاص سے رہا کرتی تھیں۔ یہ تمام شخصیات کورٹ کے ممبروں کے سالانہ اجتماعات میں شرکت کے لئے علی گڑھ آیا کرتی تھیں۔ انہی اجتماعات میں ان کے مراسم پشاور کے صاحبزادہ سر عبدالقیوم سے بھی ہوئے۔ کورٹ کے ممبروں کے اس سالانہ اجتماع میں، ایک ڈنر بھی ہوا کرتا تھا جس میں علیگڑھ کے طلبا اور کورٹ کے تمام ممبر شریک ہوتے تھے اور وہ طلبا کے مسائل اور ان کی سوچ اور فکر سے آگاہ ہوا کرتے تھے۔ سید جعفر حسین بھی اس سلسلے میں پیش پیش ہوتے تھے اور طالب علموں کے مسائل سے آگاہی حاصل کرتے تھے۔

ہندوستان کے یہ مختلف مسلم زعما جن کی شناسائی سید جعفر حسین سے ہو جاتی تھی۔ ان کے خلوص اور بے غرض محنت کے دل سے معترف ہو کر جاتے تھے۔ خود سر سید احمد خاں اور ان کے بعد نواب محسن الملک اور وقار الملک وغیرہ نے بھی بارہا اپنے ایڈریسوں اور تقاریر میں سید جعفر حسین کی خدمات کو سراہا تھا۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسوں کے انعقاد کے سلسلے میں بھی سید جعفر حسین بے پناہ دلچسپی دکھاتے تھے اور عملی طور پر اس کانفرنس کے انعقاد کے لئے کام کرتے تھے۔

غریب طلبہ کی امداد

جس زمانے میں علیگڑھ میں اپنا ذاتی مکان جعفر منزل بنوایا تھا تو علیگڑھ میں قیام کے دوران اسی

Marfat.com

مکان میں رہتے تھے۔ جن طلبہ کو بورڈنگ ہاؤس میں جگہ نہیں ملتی تھی یا وہ تعلیمی مصارف برداشت نہیں کر سکتے تھے تو انھیں سید جعفر حسین اپنے مکان میں ٹھہرا لیا کرتے تھے اور ان کی ہر ممکن مدد کرتے تھے۔

علی گڑھ میں نئے لڑکوں کی آمد کے موقع پر انھیں اپنے ہاں ڈنر پر بھی مدعو کرتے تھے اس سلسلے میں ایک اقتباس ملاحظہ ہو:۔

OLD COLLEGE STUDENTS WERE SENT TO THE RAILWAY STATION TO RECEIVE THE NEW COMMERS AND CONDUCT THEM PRIVAT, BOARDING HOUSES. THIS ARRANGE-MENT WERE HOWEVER SOON DIS CONTINUED FROM NOV, 15, 1908. THERE WARDS WERE-SHIFTED TO JAFAR MANZIL AND TO PAHASU HOUSE WHOSE RESPECTIVE LANDLORDS VOLUNTARILY OFFERD TO ACEOMMODATE THEM. SYED JAFFR HUSAIN, EXECUTIVE ENGINEER, WHO WAS HOLDING AT ALIGARAH WELCOME THE STUDENTS ON THERE ARRIVAL, WITH A DINNER."

Marfat.com

ایک غریب لڑکا

اگر کسی غریب لڑکے میں واقعی حصول علم کی سچی لگن اور تڑپ پاتے تو اپنی جیب سے اس کے تعلیمی مصارف برداشت کرتے تھے اور اپنی اولاد کی طرح اس کا خیال رکھتے تھے۔ ایک بار علی گڑھ میں ٹھہرے ہوئے تھے کہ دس گیارہ سال کا ایک لڑکا ان کے پاس آیا۔ اور ان سے ملنے کی خواہش کی۔ ملاقات پر لڑکے نے بتایا کہ میں پنجاب سے آیا ہوں جہاں میری ماں چکی پیس پیس کر مجھے تعلیم دلاتی رہی ہے۔ اب اس کے انتقال کے سبب آگے پڑھنے سے مجبور ہو گیا ہوں اگر آپ میری مدد کریں تو بہت شکر گزار ہوں گا۔ سید جعفر حسین بہت متاثر ہوئے اسی وقت اپنے بیٹے کے کپڑے اسے پہنائے اور تعلیم دلانے کی حامی بھر لی۔ اس لڑکے کا نام نذیر احمد تھا۔ بہت ذہین اور محنتی تھا چنانچہ ایک مہینے میں ہی انگریزی کی کئی کتابیں پڑھ لیں۔ سید صاحب اس لڑکے کی تعلیمی ترقی سے بہت خوش ہوتے تھے اور ہر آنے جانے والے سے اس کی ذہانت اور تحصیل علم کے شوق کی تعریف کرتے تھے اس لڑکے کو انجینئرنگ کی تعلیم دلائی۔ بعد میں وہ انجینئر کے عہدے پر فائز ہوا۔

اعتراف خدمت

سید جعفر حسین کو علی گڑھ سے کس درجہ محبت تھی۔ اور علی گڑھ کالج کے لئے وہ کیا کیا پروگرام اور منصوبے بناتے رہتے تھے اس کا حال رسالہ اولڈ بوائے سے معلوم ہوتا ہے۔ ہم ذیل میں رسالہ ہذا سے چند اقتباسات پیش کرتے ہیں۔

۱۹۱۰ء میں جب خان بہادر سید جعفر حسین سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہو گئے تو ہر چند کہ قویٰ اضمحلال کی جانب گامزن تھے لیکن علی گڑھ کی درسگاہ کی خدمت کے لئے ان میں ایک نیا جوش اور ولولا پیدا ہو چکا تھا۔ چنانچہ وہ اپنی محبوب درسگاہ میں آکر قیام پذیر ہو گئے درج ذیل اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ "اولڈ بوائے" میں سید جعفر حسین کا تحریر کردہ کوئی ایسا

Marfat.com

مضمون شائع ہوا ہوگا جس میں انھوں نے بعض منصوبوں کو بروئے کار لانے کا اظہار کیا ہوگا۔

۱؎ بہ ہمارے مخدوم دوست سید جعفر حسین کی قومی ہمدردی اور آئندہ نیک ارادوں کا ذکر ہے۔ ہم کو اس سے کلیتاً اتفاق ہے اور جناب خان بہادر صاحب کا علی گڑھ میں تشریف لانا باعثِ خوشی ہے۔ چونکہ یہ ایک نہایت ہوشیار اور ہمدرد اور قابل آدمی ہیں اور امید ہے کہ جس کام پر وہ مامور ہوں گے آئندہ وہ کام عمدگی اور کفایت سے ہوگا۔۔۔"

اولڈ بوائے لاج کے نقشوں کی تیاری اور تعمیر

"سالانہ جلسے کے حالات جو ہم نے کسی دوسری جگہ شائع کئے ہیں۔ ان میں ایک بات خوشی سے دیکھی جائے گی کہ اولڈ بوائے لاج کا سنگِ بنیاد عرصہ کے انتظار کے بعد نواب وقار الملک کے دستِ مبارک سے رکھ دیا گیا ہے۔ اس خبر کو سن کر اولڈ بوائز اور زیادہ مسرور ہوں گے کہ خان بہادر سید جعفر حسین صاحب نقشوں کی درستگی میں مصروف ہیں۔ انشاءاللہ بہت خوبصورت عمارت ہماری ایسوسی ایشن کے شان کے شایاں ہوگی۔[۲]

اولڈ بوائے لاج کمیٹی کے ممبر مقرر ہونے پر اولڈ بوائے میگزین میں یہ اطلاع شائع ہوئی

"خان بہادر سید جعفر حسین اولڈ بوائے لاج کی کمیٹی پر مقرر ہوئے[۳]۔۔۔

منٹو سرکل

منٹو سرکل کی تعمیر کے سلسلے میں اولڈ بوائے میں خان بہادر سید جعفر حسین کا ذکر ان لفظوں میں کیا گیا۔

۱۔ علی گڑھ اولڈ بوائے شمارہ فروری ۱۹۱۱

۲۔ علی گڑھ اولڈ بوائے شمارہ نومبر ۱۹۱۱

۳۔ " " شمارہ جون ۱۹۱۲

Marfat.com

"منٹو سرکل کے قریب قریب چاروں بلاک تیار ہو گئے ہیں۔ اور ہم سید جعفر حسین اور سرفراز خاں کو مبارک باد دیتے ہیں کہ انھوں نے اس جانب خاص توجہ فرمائی۔ نیو ہیرک کے دو کمرے پختہ ہو گئے ہیں۔ باقی بھی انشاءاللہ جلد تیار ہو جائیں گے[1]..."

رسالہ علی گڑھ اولڈ بوائے کی جولائی ۱۹۲۵ء کی اشاعت میں لکھا ہے۔

"نواب اسحاق خاں مرحوم کی جماعت کے سرگرم رکن خواجہ عبدالمجید تھے جو اپنی ذکاوت و کاوش کے علاوہ جوانان علی گڑھ میں ایک خاص مرتبہ و منزلت رکھتے تھے بحیثیت اولڈ بوائے ایسوسی ایشن کے سیکرٹری ہونے کی حیثیت سے مولانا شوکت علی کی جانشینی کا فخر بھی انھیں حاصل تھا دوسری جانب مائی لارڈ سید جعفر حسین اپنی قابل رشک ہمت و جوش سے سرگرم پیکار تھے۔ اور مستقلاً اس کام کے لئے تمام اطراف ہند کے دورہ پر نکلے تھے..."

سید جعفر حسین کا سراپا

خاں بہادر سید جعفر حسین کے خاندان کے گل سرسید جنرل (ریٹائرڈ) سید شاہد حامد صاحب نے اپنے دادا جان کی شکل و صورت اور اخلاق و عادات کے بارے میں جو کچھ بتایا ہے انھیں سطور ذیل میں بیان کیا جاتا ہے۔

سید جعفر حسین کا قد چھ فٹ سے زیادہ تھا۔ ان کی ناک ستواں تھی۔ اور منہ پر گھنی اور لمبی داڑھی، بڑھاپے میں یہ داڑھی سفید ہو گئی تھی جس کے سبب ان کے چہرے کی خوبصورتی میں اور اضافہ ہو گیا تھا۔ اور وہ نورانی شکل و صورت کے بزرگ معلوم ہوتے تھے۔

---

(۱) ماہنامہ علی گڑھ اولڈ بوائے شمارہ اکتوبر (۲) اس کی وضاحت آئندہ صفحات میں ہوگی۔

Marfat.com

ہمیشہ اپنا ہاتھ جس میں چھڑی پکڑی ہوئی ہوتی تھی، کمر کے ساتھ رکھتے تھے انتہائی شریف، حلیم اور منکسر المزاج تھے، وضعداری اور خوش اخلاقی کا نمونہ تھے۔ باوضع، مہذب اور شرمیلے تھے۔ یہاں تک کہ بہت کم نگاہیں اٹھا کر بات کرتے تھے۔

اکثر و بیشتر خود فراموشی کے عالم میں اور اپنی دھن میں مگن دکھائی دیتے تھے چنانچہ ان سے پہلی ملاقات میں ہمیشہ ملنے والے پر یہی تاثر قائم ہوتا تھا۔ وہ بہت کم گو تھے اور زیادہ بات چیت کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ ہمیشہ اختصار سے اور نفس مضمون سے متعلق بات کرتے تھے گو وہ ایک محبت بھرا دل رکھتے تھے۔ لیکن اپنی اس محبت یا تعلق خاطر کا اظہار بہت کم کیا کرتے تھے۔

بچوں سے بھی بہت کم گفتگو کرتے تھے البتہ بچوں کو کھیلتے ہوئے دیکھتے رہتے اور ان کی معصوم اور بھولی بھالی باتوں سے لطف اندوز ہوتے تھے اور گھنٹوں محویت اور محبت کے عالم میں بچوں کو شرارتیں کرتے دیکھتے رہتے تھے۔

سید شاہد حامد صاحب کا بیان ہے کہ "مجھے اب بھی وہ منظر یاد ہے کہ میری دو بہنیں جو اس زمانے میں بہت کم سن تھی۔ آپس میں لڑ رہی تھیں اور میرے دادا جان ان کو نہایت دلچسپی اور محویت کے عالم میں لڑتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ جب میری والدہ محترمہ نے ان بچیوں کو دادا کے سامنے لڑنے جھگڑنے اور شور کرنے سے منع کیا تو انھوں نے میری والدہ کو روکا اور کہا کہ منع مت کرو میں تو ان کی باتوں سے محظوظ ہو رہا ہوں۔

"میرے والد اکثر ان سے کہا کرتے تھے کہ اب وہ مستقلاً گھر میں قیام کر لیں لیکن انھوں نے ہمیشہ ان کی اس خواہش کو ماننے سے انکار کر دیا۔ وہ بغیر کسی اطلاع کے اپنے بیٹے کے گھر تشریف لے آیا کرتے تھے۔ چند دن قیام کرتے اور پھر یہ بتائے بغیر کہ وہ کہاں اور کتنے دن

Marfat.com

کے لئے جا رہے ہیں گھر سے چلے جاتے تھے۔ گھر میں ان کے لئے ایک کمرہ مخصوص تھا جو ہمیشہ مقفل رہتا تھا بس ان کی آمد کے موقع پر کھولا جاتا تھا۔

ایک دن والد محترم کے بے حد اصرار پر انھوں نے جواب دیا تھا کہ اگر میں یہاں مستقل قیام کروں تو عدم مصروفیت کی بنا پر مر جاؤں گا۔

" ان کے دوستوں کا ایک خاص حلقہ تھا جن میں سے اکثر و بیشتر کا تعلق کسی نہ کسی صورت سے علی گڑھ سے ضرور تھا۔ غالباً ان میں سے بیشتر علی گڑھ کورٹ کے ممبر اور ٹرسٹی تھے۔ میں اکثر اپنے دادا جان کے پاس ان لوگوں کو آتے جاتے اور بیٹھتے ہوئے دیکھتا تھا ایسے لوگوں میں سے مولوی طفیل احمد منگلوری، خاں بہادر حبیب اللہ، میر ولایت حسین وغیرہ کے نام مجھے اب بھی یاد ہیں۔

" ہم بچوں کے لئے ان بزرگوں کی یہ محفل حیرت و استعجاب اور لطف سے خالی نہ ہوتی تھی۔ وہ تمام لوگ گہرے خیالوں میں محو اور سر جھکائے بیٹھے ہوتے تھے۔ غالباً اس وقت بھی ان کے پیش نظر مسلمان قوم اور علی گڑھ کی فکر دامنگیر ہوتی تھی۔"

" یہ کہنا قطعی مبالغہ نہ ہوگا کہ انھوں نے اپنی ساری عمر خدمت خلق میں گزار دی تھی ایک بار انھوں نے مجھ سے فرمایا تھا کہ جب کبھی کسی شخص کی بھلائی اور بہتری کے لئے کوئی کام کرو تو کبھی اس کا تذکرہ دوسروں سے مت کرنا۔ ہمیشہ نہایت خاموشی سے لوگوں کی خدمت کرو اور فراموش کر دو۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ سب سے بڑی عبادت، خدمت خلق ہے اور اس سلسلے میں ان کے قول و فعل میں کوئی تضاد نہیں تھا۔"

" گورنمنٹ کی بعض اسکیموں کے سلسلے میں مشیروں کا جو معاوضہ انھیں ملا کرتا تھا اس رقم کے متعلق اہل خاندان میں سے کسی کو کچھ معلوم نہ ہوتا تھا کہ اس کا کیا ہوا۔ اگر

Marfat.com

میرے والد ماجد اس سلسلے میں کبھی ان سے دریافت بھی کرتے تھے تو وہ نہایت معصومیت اور بے نیازی سے جواب دیتے کہ کسی شخص کو اس رقم کی شدید ضرورت تھی میں نے اسے دے دی ہے۔

" اتنے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہنے کے باوجود انھوں نے کبھی کچھ پس انداز نہ کیا۔ دولت کی طرف سے ہمیشہ بے نیاز رہے کوئی بنک بیلنس نہ تھا۔ حقیقت میں دنیاوی سرمایے کی ان کے نزدیک پرکاہ کے برابر اہمیت نہ تھی۔

" ان کی پوری زندگی کا سرمایہ ٹین کا ایک صندوق تھا۔ ان کے پاس دو شیروانیاں تھیں۔ ایک پہنے رہتے اور دوسری شیروانی ان کے صندوق میں رہتی تھی۔ اس کے علاوہ چند جوڑے کرتے پاجامے اور ضرورت کی معمولی چیزیں ہوتی تھیں۔

" اچھے سے اچھے درجے میں سفر کرنے کی استطاعت رکھنے کے باوجود ہمیشہ تھرڈ کلاس میں سفر کرتے تھے۔ اپنے کسی نوکر وغیرہ کو بھی ساتھ نہیں رکھتے تھے۔ اور اپنا سامان خود اٹھایا کرتے تھے۔ اثنائے سفر میں کریم بسکٹ اور بٹر چیز کے علاوہ کچھ نہ کھاتے تھے یہ چیزیں انھیں پسند بھی بہت تھیں۔ اکثر سفر میں اپنی کوئی نہ کوئی چیز بھول جاتے تھے۔ اور بعد میں ہنس کر فرمایا کرتے تھے کہ چلو کسی غریب کا بھلا ہو گیا ہوگا۔

" جب میں فوج میں کمیشن ملنے کے بعد سفید ہرسٹ جا رہا تھا تو میرے دادا مرحوم بھوپال اسٹیشن پر تشریف لائے تھے انھوں نے مجھے ایک ہزار روپوں کی تھیلی عنایت کی لیکن تاکید کی تھی کہ میں اس رقم کا تذکرہ اپنے والد سے نہ کروں۔"

" حقیقت میں وہ فرشتہ خصلت انسان تھے۔ اہل خاندان، دوست احباب اور عام ملاقاتی سب کو ہی ان کی ذات پر بڑا اعتماد تھا۔ ہمیشہ خلوص دل سے لوگوں کے آڑے

Marfat.com

وقت میں ان کے کام آنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس سبب سے تمام لوگوں میں بے حد مقبول تھے ان کا حافظہ بھی حیرت انگیز تھا۔ اپنے زمانہ ملازمت میں جو تعمیرات انھوں نے کرائیں تھیں ان کی جزئی تفصیلات بڑھاپے تک انھیں یاد تھیں۔

"ایک بار میرے والد کو بھی کوئی ایسا ہی کام سونپا گیا جس نوع کے کام کو میرے دادا اپنے زمانہ ملازمت میں انجام دے چکے تھے۔ میرے والد نے ان سے بعض آبی ذخیروں (RESERVIORS) کے بارے میں کچھ دریافت کیا۔ دادا جان مرحوم نے جو تخمینے وغیرہ بتائے۔ جب انھیں باقاعدہ کاغذ پر جوڑ کر دیکھا گیا تو وہ بالکل صحیح تھے۔ (LAHCHURA) لہ کا ڈیم جو یو پی سے صوبجات متحدہ میں مشہور ہے انہی کا بنوایا ہوا تھا۔ انجینئرنگ کے تمام شعبوں سے ان کو کمال آگاہی تھی۔ وہ اپنے رہنما اور استاد خود تھے اور ہمیشہ اپنے موضوع اور دیگر علوم پر بھی مطالعہ کرتے رہتے تھے۔

مشاغل

سید صاحب کو شکار کا بہت شوق تو نہ تھا لیکن کبھی کبھی جنگلوں میں شکار کھیل لیا کرتے تھے۔ انھیں باغ لگانے اور اس میں نت نئے پھل پھول لگانے کا بہت شوق تھا۔

مولوی عبدالغفور خاں اترولوی نے ایک ایسے ہی شکار کا ذکر اپنی کتاب میں کیا ہے۔ جس میں مصنف، سید جعفر حسین اور ڈاکٹر سر ضیاءالدین شریک تھے۔ ایک اور شکار کا حال مولوی عبدالغفور لکھتے ہیں۔

" سید صاحب موصوف کے ہمراہ چوبیس میل سفر کر کے پورا کلاں ٹینک کنسٹرکشن کا معائنہ کیا۔ دونوں کی بندوقیں ہمراہ تھیں۔ واپسی میں تال بہٹ سے چار پانچ میل ادھر سید صاحب نے کہا کہ تمام دن بندوقیں ساتھ لئے پھرے

مگر شکار نظر سے بھی نہ گزرا۔ میں نے کہا ان جنگلوں میں جس مقام پہ دیکھا جائے ہمیشہ شکار موجود پایا جاتا ہے۔ ہم ایک چھوٹی پہاڑی پر چڑھ گئے۔ اور چاروں طرف نظر ڈالی۔ دور دو تین گلہ ہرنوں کے نظر آئے مگر تھکان تھا، ہم نے فاصلہ پر چلنے کی کوشش نہیں کی۔ اتفاقاً قریب ہی چند چکارہ دوڑتے ہوئے نظر آگئے۔ بندوق کی زد سے باہر تھے مگر سید صاحب نے فائر کر دیا۔ قضارا ایک چکارہ شکار ہو گیا۔ سید صاحب بہت خوش ہوئے کیونکہ وہ عادتاً شکار کے واسطے کم محنت کرتے تھے[1]۔"

باقاعدہ شکار وغیرہ کے لئے نہیں جاتے تھے البتہ جب سرکاری کاموں کی انجام دہی میں کیمپوں میں رہتے تھے تو شکار وغیرہ بھی کر لیا کرتے تھے۔ آم لگانے کا بہت شوق تھا۔ ان کی عادت تھی کہ ہر موسم کا پھل منڈی سے ڈھیریوں کی تعداد میں خرید کر لایا کرتے تھے۔ اور یہ پھل گھر میں بلا تخصیص سب کو تقسیم ہوتا تھا اور گھریلو ملازموں کو اپنے ساتھ بٹھا کر کھلاتے تھے۔ طبیعت میں رحمدلی کا مادہ بہت تھا۔ ماتحت یا ملازمین سے کوئی قصور کبھی سرزد ہو جاتا تھا اول تو کچھ کہتے ہی نہیں تھے اگر کبھی ڈانٹ ڈپٹ دیا کرتے تھے تو بعد میں حسن سلوک سے

ا۔ سوانح عمری مولوی عبدالغفور خاں نساخ [?] مطبوعہ آگرہ بستی پریس آگرہ صفحہ ۲۳۵-۲۳۶

Marfat.com

اس کی تلافی کر دیا کرتے تھے۔ مزدوروں سے نرمی کا برتاؤ کیا کرتے تھے۔ اور اگر کبھی کام میں تساہل یا غفلت کی بنا پر ڈانٹ دیتے تو کام ختم ہونے سے قبل جلیبیاں منگوا کر اس مزدور کو کھلاتے تھے۔ اکثر کام کی نگرانی کرتے ہوئے خود بھی مزدوروں کے ساتھ کام میں شامل ہو جاتے تھے۔ کام کرتے کرتے کپڑے اور ہاتھ پاؤں مٹی میں اٹ جاتے لیکن وہ اسی صورت سے کام میں مصروف رہتے۔ چنانچہ ۱۹۱۹ء میں جب لکھنؤ میں اپنی کوٹھی جعفر منزل اور اس کے قریب ہی اپنی بیٹی کا گھر بنوا رہے تھے تو خود بھی مزدوروں کے ساتھ کام میں مصروف تھے اتفاق سے ایک شخص جان سے پہلے کبھی نہیں ملا تھا۔ ملاقات کی غرض سے ... آگیا جب اس نے کام کرنے والوں سے سید جعفر حسین کے بارے میں دریافت کیا اور انہیں عام مزدوروں کی طرح کام کرتے دیکھا تو بہت حیران ہوا۔

بھکارن کا واقعہ

ایک بار میرٹھ میں اپنی بیٹی کے یہاں گئے ہوئے تھے گھر میں ایک اندھی بڑھیا بھیک مانگنے آئی آپ نے فوراً کھانا منگوا کر اپنے ہاتھ سے اس کو دیا۔ گرمی کا موسم تھا اور بڑھیا کے ارد گرد بے تحاشہ مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں جس کی وجہ سے وہ مسلسل چلا رہی تھی۔ خان بہادر سید جعفر حسین سے بڑھیا کی یہ کیفیت دیکھی نہ گئی۔ پنکھا لے کر اس بڑھیا کی مکھیاں اڑانے لگے پھر اپنی بیٹی سے کہا کہ یہ بڑھیا روز تمہارے ہاں کھانا کھائے گی اور تم بیٹھ کر اس کی مکھیاں اڑایا کرنا۔

بھولنے کی عادت بہت تھی بعض اوقات اس عادت سے نہایت دلچسپ صورتحال پیدا ہو جاتی تھی۔ ایک بار گورنمنٹ ہاؤس میں پارٹی تھی جس میں سید صاحب کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ انھوں نے لباس تو تبدیل کر لیا لیکن جوتا پہننا بھول گئے۔ بازار میں پہنچ کر معلوم ہوا کہ جوتا پہننا تو بھول ہی گئے چنانچہ اسی وقت دکان سے ایک نیا جوتا خرید کر پہنا اور پارٹی میں شریک ہوئے

Marfat.com

جب کبھی کسی کام میں معروف ہوتے۔ تو دنیا ومافیہا سے بے خبر ہوجاتے تھے ایک
دفعہ عینک کھو گئی جس کی تلاش گئی گریبے گھر میں کہیں نہ ملی۔ آخر خود بولے کہ جو کنٹوپ
پہنا تھا اس کے بیچ میں رکھ کر بھول گیا تھا۔

پوشاک

زندگی حد سے زیادہ تھی۔ دنیاوی شان وشوکت سے بے نیاز تھے
لباس بہت معمولی پہنتے تھے کہ پہلی نظر میں کوئی شخص یہ باور نہیں
کرسکتا تھا کہ وہ حکومت ہند کے انجنیئر ہیں۔

مولوی طفیل احمد منگلوری نے لکھا ہے کہ "ان کی ظاہری وضع قطع کو دیکھتے
ہوئے زیادہ سے زیادہ ان پر ایک سب اوورسیر ہونیکا گمان گزرتا تھا ۔۔۔"

دو دلچسپ واقعات

سید صاحب کی سرکاری ملازمت کا کافی عرصہ مختلف
جنگلوں اور کیمپوں میں گزرا، جہاں اکثر انھیں دلچسپ
واقعات پیش آتے رہتے تھے۔ اکثر بہت سے ایسے دلچسپ واقعے سنایا کرتے تھے۔ ایسے
ہی دو واقعے یہاں بیان کئے جاتے ہیں۔

" ان کا پہلا تقرر نیپال کی ترائی میں ہوا تھا۔ جو شیروں اور دوسرے جنگلی
درندوں سے بھری ہوئی تھی۔ وہاں رہنے کے لئے ایک جھونپڑی بنوالی تھی۔
دن بھر تو کام کاج میں معروف رہتے البتہ دن میں کبھی کبھار اس جھونپڑی میں
آرام کرلیا کرتے تھے لیکن رات کے وقت غیر محفوظ ہونے کے سبب درخت
پر چڑھ کر بیٹھ جاتے تھے۔ اس زمانے میں پگڑی باندھا کرتے تھے لہٰذا نیند کے
عالم میں گرجانے کے خوف سے اسی پگڑی کو درخت اور اپنے گرد باندھ
لیا کرتے تھے۔

Marfat.com

ایک شام درخت پر بیٹھے ہوئے انھوں نے شیر کو دیکھا جس نے ایک جانور کا شکار کر رکھا تھا اور اسے کھا رہا تھا۔ کھانے کے دوران تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد شیر ایک درخت پر آتا اور اس کی لکڑی کو چبانے کے بعد دوبارہ آکر شکار کھانے لگتا تھا۔ سید جعفر حسین نے صبح اس درخت کی لکڑی چبا کر دیکھی تو فوراً بھوک لگنے لگی غرض جس چیز کو بھی کھانے کے بعد اس لکڑی کو چبایا جاتا تو وہ فوراً ہضم ہو جاتی تھی چنانچہ جب کبھی مزدوروں کے پیٹ میں درد وغیرہ ہو جاتا تو اسے وہی لکڑی چبانے کو دی جاتی تھی۔

"ایک مرتبہ جنگل میں قیام تھا کسی چیز نے ان کو کاٹ لیا جس کی وجہ سے نیند بہت آنے لگی خیال ہوا کہ شاید سانپ نے کاٹ لیا ہے چونکہ کوئی دوا پاس نہ تھی لہذا زندگی سے مایوس ہو گئے البتہ اس وقت بھی گھبرائے نہیں۔ نہایت اطمینان و سکون کے ساتھ وصیت کی اور سب لوگوں کو جو وہاں موجود تھے۔ الوداع کہی اور پلنگ پر دراز ہو گئے۔

صبح سو کر اٹھے تو بھلے چنگے تھے کہنے لگے غلط فہمی ہو گئی تھی اس وقت جو لوگ وہاں موجود تھے۔ ان کا بیان ہے کہ اس نازک وقت میں کہ جب موت سامنے تھی انھوں نے نہ تو آہ فاری کی اور نہ ہی گھبرائے بلکہ ایک سچے مسلمان کی طرح نہایت صبر و ضبط اور خاموشی و وقار کے ساتھ اپنی تقدیر پر شاکر رہے۔۔۔"

قومی ہمدردی کا ایک واقعہ

مسلمان قوم کے اجتماعی اور انفرادی فائدے سے وہ کس قدر خیال رکھتے تھے اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوگا۔ یہ واقعہ یوپی کے ایک ریٹائرڈ چیف انجینئر خاں بہادر عبدالعزیز کے ساتھ پیش آیا۔ وہ بتایا کرتے تھے کہ جس وقت مجھے انجینئرنگ کالج سے فارغ التحصیل ہونے

Marfat.com

رکاری ملازمت کا پروانہ ملا۔ تو اسی وقت میرے ایک ہم جماعت ہندو کا بھی تقرر ہوا۔ چنانچہ سیکھنے اور رپورٹ دینے کے لئے ہمیں سید جعفر حسین کے پاس بھیجا گیا جو اس وقت جھانسی میں ات تھے جب ہم وہاں پہنچے تو خاں بہادر سید جعفر حسین آؤٹ ڈور ڈیوٹی پر کیمپ میں تھے ں نے وہیں سے حکم بھیج دیا کہ مسلمان کو تو میں دفتر میں رپورٹ کرنے دو اور ہندو انجینئر کو رے پاس بھیج دیا جائے۔ مجھے یہ بات بہت بُری لگی کہ خاں بہادر صاحب نے مجھے تو دفتر تعینات کر دیا اور ہندو کو اپنے پاس بلا لیا۔ لہٰذا وہ تو کام سیکھ جائے گا اور میں دفتر میں یونہی جارہوں گا۔ در اصل اس طرح سید جعفر حسین کا مقصد مسلمان انجینئر کو فائدہ پہنچانا تھا۔ چنانچہ ہو انجینئر فوراً بعد کیمپ میں رپورٹ دے سکا اور یوں مسلمان سینئر ہو گیا اور تمام زندگی ترقی ے ہر موقع پر سینیارٹی کے لحاظ سے اس کو پہلے ترقی ملتی رہی۔

جہل مرکب یہ چند ہم خیال لوگوں کا ایک گروہ تھا۔ جنھوں نے اپنی مجلس کا نام جہل مرکب رکھا ہوا تھا اس کے ممبران میں سید جعفر حسین بھی ریک تھے ۔اس کا ہر ممبر مائی لارڈ کہلاتا تھا۔ اور ہر ممبر دوسرے کو اسی خطاب سے مخاطب تاتھا۔ ا.م.(علیگ) لکھتے ہیں۔

• کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو علی گڑھ سے منسلک رہ کر بھی اپنی انفرادی حیثیت کو قائم رکھنا چاہتے تھے یہ مائی لارڈز کا وہ گروپ تھا جنھوں نے اپنی مجلس کا نام جہل مرکب رکھ چھوڑا تھا۔ خدا معلوم صاحبزادہ آفتاب احمد خاں اور ڈاکٹر ضیاء الدین جو انگریزی لباس پہنتے، کانٹا چھری کے ساتھ میز پر کھانا کھاتے اور کبھی کبھار کھڑے ہو کر پیشاب بھی کر لیا کرتے تھے۔ کس طرح ان لوگوں میں جا

۱۔ رسالہ تہذیب الاخلاق (پاکستان) جولائی ۱۹۶۸ء

Marfat.com

پھنسے جو سب اچھی خاصی داڑھی رکھتے، سادہ کیا بالکل ہی معمولی قسم کا لباس پہنتے تھے اور گو اپنی قابلیت اور عہدوں کے لحاظ سے کتنے ہی بلند ہیں لیکن بادی النظر میں مزدور نہیں تو کسی معمولی حیثیت کے فرد ضرور نظر آتے تھے غالباً داڑھی قدر مشترک تھی.....!"

جہل مرکب کے ممبران کے نام یہ تھے۔

(۱) صاحبزادہ آفتاب احمد خاں (۲) ڈاکٹر سر ضیاء الدین، (۳) مولانا ابو البشر (جو چھوٹے سر سید کہلاتے تھے) (۴) نظامی (جنھوں نے دیوان غالب کا اولین جاذب نظر ایڈیشن شائع کیا تھا) (۵) مولوی طفیل احمد منگلوری (رسالہ سود متد کے بانی اور "مسلمانوں کا روشن مستقبل" کے مصنف) (۶) خاں بہادر حبیب اللہ خاں (۷) میر ولایت حسین (۸) خاں بہادر سید جعفر حسین (جو ایگزیکیوٹو انجینئر ہونے کے باوجود اچھتی نظر میں معمولی سب اور سیر معلوم ہوتے تھے) اور (۹) نثار حسین تھے۔

مضمون کے مصنف نے جہل مرکب کی اس مجلس کے اراکین کی قدر مشترک داڑھی بیان کی ہے لیکن ہمارے خیال میں ان سب میں ایک اور قدر مشترک بھی تھی سب کے سب علیگڑھ تحریک کے متوالوں میں سے تھے۔

"جہل مرکب" نامی مضمون کے مصنف نے جو خاص خاص خوبیاں بیان کی ہیں ان کے مطابق بے قاعدگی ان بزرگوں کا طرۂ امتیاز تھی، جہل مرکب کے اجلاس بھی بے قاعدہ ہی منعقد ہوتے تھے اور اجلاس سے قبل کسی قسم کا ایجنڈا بھی پہلے سے تیار نہ ہوتا تھا۔ وقت، مقام، جگہ کسی چیز کی کوئی قید نہ تھی جس جگہ بھی دو چار ممبر مل بیٹھے، جہل مرکب کا اجلاس شروع ہو جاتا تھا۔ یہ ممبران کرسیوں کے بجائے پلنگوں پر بیٹھ کر، یا گھاس کے کسی قطعے پر درخت کے

Marfat.com

نیچے بیٹھ کر اجلاس منعقد کرتے تھے یہ سب مبارک ایک دوسرے کو مائی لارڈ سے مخاطب کرتے تھے۔ اس سلسلے میں ایک لطیفہ ملاحظہ ہو:-

نواب محسن الملک کا زمانہ تھا۔ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس رنگون میں ہونے والا تھا۔ اور تمام عمائدین مع نواب صاحب ایک جہاز میں کلکتہ سے رنگون جا رہے تھے۔ زیادہ تر ممبر فرسٹ کلاس کے مسافر تھے لیکن یہ لوگ ڈیک پر سفر کر رہے تھے اس لئے جماؤ زیادہ تر وہیں رہتا تھا۔ جہاز کا کپتان ایک اینگلو انگریز تھا جو اردو سمجھ تو لیتا تھا لیکن بول نہ سکتا تھا۔ اس نے جب ان لوگوں کی باتیں سنیں تو دل ہی دل میں ان کی قابلیت اور ذہانت کا معترف ہو گیا یہ صاحبان ایک دوسرے کو مخاطب کرتے تو "مائی لارڈ" کا لفظ استعمال کرتے تھے اس لئے کہ ان کو علی گڑھ کی اصطلاح میں مائی لارڈ گروپ کہا جاتا تھا یہ طرز تخاطب اس انگریز کی سمجھ میں نہ آتا تھا جس کے ملک میں لارڈ ہونا تمول اور اعلیٰ تہذیب کی نشانی سمجھا جاتا تھا۔ آخر نہ رہ گیا تو ایک دن صاحبزادہ صاحب سے پوچھ ہی بیٹھا کہ یہ لوگ اتنے کم حیثیت ہیں پھر ایک دوسرے کو مائی لارڈ کیوں کہتے ہیں۔ صاحبزادہ کہتے تھے کہ میرے دل میں اس سوال سے گدگدی پیدا ہوئی اور میں نے بہت سنجیدہ صورت بنا کر کہا کہ یہ سب لوگ نسبتی ہیں اعظم ہیں اور مغلیہ سرکار سے ان کے آباؤ اجداد کو خطاب ملا ہوا تھا لیکن غدر کے زمانے میں تمہاری سلطنت نے ان کی جائیدادیں ضبط کر لیں اور یہ غریب ہو گئے۔ قوم کے دل میں ان کی اب بھی عزت ہے اور سلطنت نے ان کے خطاب

ا۔ جہل مرکب، مصنفہ ا۔م۔ علیگ، مطبوعہ رسالہ تہذیب الاخلاق (دوہرا) جولائی ۱۹۶۸ء

Marfat.com

سے تعرض نہیں کیا۔ اس لئے یہ لوگ اب بھی مائی لارڈ کہلاتے ہیں۔ یہ سن کر کپتان پر ایک سکتہ طاری ہو گیا۔ بہت دیر تک ان کی حالت پر افسوس کرتا رہا پھر فرداً فرداً ہر ایک کو نہایت ادب سے ٹوپی اتار کر سلام کیا۔ رات کو اپنی کیبن میں کھانے پر مدعو کیا اور بہت عزت سے پیش آیا۔ اس کے بعد تو یہ حال ہو گیا کہ صبح اٹھ کر سب سے پہلے ان کو سلام کرتا اور خیریت پوچھتا کبھی پھل اور میوے پیش کرتا اور ان کے سامنے بچھا جاتا تھا۔ سفر ختم ہونے پر معذرت کی کہ میں آپ کی خاطر خواہ خدمت نہ کر سکا۔ ان لوگوں کو حیرت تھی کہ کپتان میں یہ تبدیلی یکایک کس طرح پیدا ہو گئی۔ آخر کانفرنس کے دوران جب یہ راز افشا ہوا تو لوگوں کے پیٹ میں ہنس ہنس کر بل پڑ پڑ گئے ......"

سر سید احمد خاں اور علی گڑھ تحریک سے تو سید جعفر حسین کو عشق کی حد تک لگاؤ تھا ہی لیکن اس کے علاوہ بھی اگر ہندوستان میں کسی جگہ مسلمانوں کی کوئی تنظیم یا کوئی فرد کوئی درسگاہ قائم کرتا تھا تو سید جعفر حسین اس کی اعانت بھی دامے، درمے قدمے سخنے کرتے تھے۔

اسلامیہ اسکول و کالج اٹاوہ

اٹاوہ کے مولوی بشیر الدین تعلیمی میدان کی ایک معروف شخصیت گزرے ہیں۔ جنھوں نے اپنی بساط بھر مسلمان قوم کی تعلیمی خدمت کی۔ انھوں نے اٹاوہ میں ایک مسلم اسکول قائم کیا تھا جو بعد میں ترقی کرتے کرتے انٹر کالج بنا اور سیکڑوں مسلمان گھرانوں کے بچوں نے ان اداروں میں تعلیم پائی۔ اس اسکول کے قیام کے زمانے سے لے کر اسے کالج کی سطح تک لے جانے میں مولوی بشیر الدین کا جن لوگوں نے ہاتھ بٹایا ان میں سید جعفر حسین کا نام سر فہرست ہے۔ جب اس اسکول کو کالج بنائے جانے کا مرحلہ آیا تو سید جعفر حسین نے ملی مدینی فنڈ کے ذریعے ایک لاکھ روپے

Marfat.com

چندہ جمع کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ اس قسم کا منصوبہ وہ علی گڑھ کالج کے سلسلے میں بھی بنا چکے تھے اور اسے کامیابی سے ہمکنار کرا چکے تھے۔

ملازمت کے دوران علیگڑھ کے علاوہ اٹاوہ بھی جاتے رہتے تھے اور اس اسکول اور کالج کی خدمت کرتے۔ اٹاوہ میں ان کا قیام مہینوں رہتا تھا۔ حتیٰ کہ انتقال سے کچھ عرصہ قبل بیماری کی حالت میں بھی اٹاوہ میں مولوی بشیرالدین کے پاس ہی اس تعلیمی ادارے کے کام کے سلسلے میں ٹھہرے ہوئے تھے جہاں سے ان کے صاحبزادے سید حامد حسین بااصرار لکھنؤ لے گئے تھے۔

انتقال

جس زمانے میں اسلامیہ کالج اٹاوہ کے سلسلے میں اٹاوہ میں مقیم تھے تو ان کے صاحبزادے سید حامد حسین الخیر الفیس بااصرار لکھنؤ اپنی کوٹھی میں لے آئے تھے جہاں علاج معالجے کے بعد مکمل طور پر صحت یاب ہو گئے تھے۔

ایک دن بیٹے نے فرمائش کی کہ کوٹھی کے باغ میں آم کے پودے لگوا دیں۔ بیٹے کی اس فرمائش کو پورا کرنے کے لئے سید جعفر حسین کاکوری اور ملیح آباد گئے جہاں تمام دن صرف کر کے آم کے چالیس پودے منتخب کر کے آئے اور آتے ہی کوٹھی میں آم لگانا شروع کر دیئے ہر چند کہ مالی موجود تھے لیکن انھوں نے اپنے ہاتھ سے ہی ان پودوں کو لگانا پسند کیا۔ کام کرتے کرتے رات ہو گئی تو ان کی بہو نے درخواست کی کہ رات ہو گئی ہے باقی پودے کل لگا لئے جائیں گے لیکن انھوں نے جواب دیا زندگی کا کیا اعتبار ہے، میں اسی وقت یہ تمام پودے لگاؤں گا۔

چنانچہ رات گئے تک تمام پودے لگا دیئے۔ نہایت ہشاش بشاش اور خوش تھے۔ اسی رات صبح صادق کے وقت داعی اجل کو لبیک کہا۔ جب نوکر ان کا حقہ تازہ کرنے کی غرض سے ان کے بستر کے قریب گیا تو معلوم ہوا کہ اس عالم فانی سے عالم جاودانی کو سدھار گئے ہیں۔ تمام زندگی کسی سے کوئی خدمت نہیں لی تھی چنانچہ زندگی کے آخری لمحوں میں بھی کسی کو تکلیف دیئے

Marfat.com

بغیر نہایت خاموشی سے سفرِ آخرت اختیار کر گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

اعترافِ خدمت

خاں بہادر سید جعفر حسین کے انتقال پر مولوی بشیر الدین نے اپنے رسالے البشیر میں جو کچھ تحریر کیا تھا اسے یہاں من وعن نقل کیا جاتا ہے یہ ایک ایسے آدمی کی گواہی ہے جو خود بھی طویل عرصے سے قومی بھلائی اور بالخصوص مسلمانوں کی تعلیمی خدمت کے اہم اور قابلِ قدر کام میں مصروف تھا۔ یہ سطور ان کے ایک رفیق کار مخلص دوست اور صاحبِ دل شخص کا ہدیۂ تبریک بھی ہے اور اعترافِ خدمات بھی، نیز ان سطور میں قومی خدمت سے معمور ان کی زندگی کا ایک اجمالی خاکہ بھی موجود ہے۔

"نہایت افسوس کے ساتھ یہ خبر درج کی جاتی ہے کہ خاں بہادر سید جعفر حسین پینشنر ایگزیکٹو انجینئر نے اسی (۸۰) برس کی عمر میں اس دنیائے فانی سے رحلت فرمائی۔ مرحوم بہت اچھے اوصاف کے آدمی تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم اگرچہ بہت معمولی ہوئی تھی تاہم وہ اپنے شوق سے پرانے زمانے کی سب اوورسیری کے امتحان کی تیاری کے لئے رڑکی کالج میں داخل ہوئے۔ اس ادنیٰ درجے کے امتحان پاس کرنے کے بعد وہ ڈرافٹ مین ہوئے بعد ازاں سب اوورسیر مقرر ہوئے۔ پھر ترقی پا کر ضلعدار اور اس کے بعد ڈپٹی مجسٹریٹ نہر مقرر ہوئے۔ ڈپٹی مجسٹریٹ کے بعد وہ ذمہ دار ایگزیکٹو انجینئر مقرر ہوئے اگرچہ ان کی تعلیم بہت معمولی درجے کی تھی۔

لیکن انجینئری سے چونکہ ان کو خاص شوق تھا لہذا اپنے شوق اور انہماک کی وجہ سے ان کا شمار اعلیٰ درجے کے انجینئر میں کیا جاتا تھا۔ میکینک کی اگرچہ

۱- از مولوی بشیر الدین ایڈیٹر البشیر ۱۲ جولائی ۱۹۳۶ء

Marfat.com

انھوں نے کوئی خاص تعلیم نہ پائی تھی لیکن بوجہ شوق کے اس میں بھی انھوں نے اعلیٰ دستگاہ حاصل کرلی تھی جب سے سرسید علیہ الرحمتہ نے علی گڑھ کی تحریک شروع کی یہ شروع سے اس تحریک کے حامی رہے۔

سرسید کے معتقدین میں ان کا نمبر بہت زیادہ بڑھا ہوا تھا۔ ان کے دل میں علی گڑھ کالج کی محبت اور اس کی ترقی کے متعلق غیر معمولی شغف موجود تھا وہ جہاں رہتے اور جہاں جاتے اپنے حلقۂ اثر میں لوگوں کو سرسید کا مقصد بتاتے اور علی گڑھ کی اعانت پر آمادہ کرتے تھے۔

غرضیکہ مرحوم کی ذات سے علیگڑھ کالج اور آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کو اخلاقی اور مادی ہمیشہ فائدہ پہنچتا رہا وہ علیگڑھ کالج کے پرانے ٹرسٹی تھے اور جب کالج یونیورسٹی کے درجے پر پہنچا تو اس کے کورٹ کے ممبر رہے۔ انھوں نے یہ ارادہ کیا تھا کہ علیگڑھ میں مستقل سکونت اختیار کریں اور اس غرض سے انھوں نے علیگڑھ میں ایک کوٹھی جعفر منزل کے نام سے بنوائی تھی۔ لیکن بعض خانگی مجبوریوں کی وجہ سے وہ علیگڑھ میں قیام نہ کرسکے۔

اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ جبکہ ایک مکتب کی شکل میں تھا جب سے وہ اسکول کے ہمدرد اور اس کے معاون رہے۔ اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ کی ترقی کے لئے انھوں نے کئی مرتبہ اٹاوہ میں سکونت اختیار کرنے کا ارادہ بھی کیا۔ یہاں آکر کئی کئی ماہ تک وہ رہے لیکن بعض خانگی مجبوریوں کی وجہ سے ان کو باہر جانے کی ضرورت پیش آئی۔ اگست ۱۹۲۵ء میں وہ آخری مرتبہ پھر اٹاوہ تشریف لائے اور اس ارادے سے آئے تھے کہ "دن ریزنی فنڈ" کے ذریعہ سے اسلامیہ ہائی

Marfat.com

اسکول اٹاوہ کو انٹر کالج بنانے کے لئے ایک لاکھ روپیہ جمع کریں گے۔

چنانچہ انھوں نے اس تجویز کو کامیاب بنانے کے لئے مختلف قسم کے رجسٹر تجویز کئے لیکن اسکول کی بدقسمتی سے وہ ایک ماہ بھی کام نہیں کر پائے تھے کہ سخت علیل ہو گئے اس سخت علالت کی حالت میں بھی وہ لیٹے لیٹے کام کرتے تھے یہاں ان کے مرض میں افاقہ ہو گیا تھا۔ تو ان کے لڑکے خاں بہادر حامد حسین ایگزیکیوٹو انجینئر ان کی اور میری مرضی کے خلاف ان کو زبردستی لکھنؤ لے گئے اور بلرام پور ہسپتال کے یورپین وارڈ میں ان کو داخل کر دیا۔

کئی ماہ تک ہسپتال میں علاج ہوا جب تک ان کے ہاتھ میں لکھنے کی سکت رہی وہ "دن روپی فنڈ" کے متعلق اپنے خیالات اور تجاویز لکھکر بھیجتے رہے۔ جب ہسپتال میں فائدہ نہ ہوا تو وہ حامد حسین کے مکان میں اٹھ آئے۔ اور ہومیوپیتھک علاج شروع کیا۔

پہلے خبر آئی کہ ان کو روز بروز آرام ہو رہا ہے لیکن یکایک حامد حسین کا تار آیا کہ مرحوم نے ۱۶ر تاریخ کو اس دار فانی سے انتقال کیا (انا للہ وانا الیہ راجعون)

مرحوم نہایت جفاکش محنتی آدمی تھے۔ میں نے اپنی تمام عمر میں سید جعفر حسین کے برابر کسی دوسرے شخص کو محنتی اور جفاکش نہ پایا۔ گرمی سردی میں وہ برابر شل مزدوروں اور قلیوں کے کام کرتے تھے۔ باوجودیکہ وہ حقہ پینے اور پان کھانے کے عادی تھے لیکن جب کام میں مصروف ہوتے تھے تو نہ ان کو حقہ پینے کا خیال ہوتا تھا اور نہ پان کھانے کا نہ اپنی بیماری کا خیال کرتے تھے۔ حتیٰ کہ سخت بیماری کی حالت میں بھی وہ تندرست آدمی سے زیادہ محنت کرنے کے عادی تھے۔

Marfat.com

مسلمانوں کے افلاس کی ان کے دل پر ایک چوٹ لگی ہوئی تھی۔ وہ اپنے غریب عزیزوں اور دوسرے لوگوں کی مالی امداد اس خاموشی کے ساتھ کرتے تھے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی تھی۔

یہی وجہ تھی کہ باوجود معقول تنخواہ اور سادہ زندگی کے وہ ہمیشہ تہی دست رہتے تھے۔ وہ ہمیشہ اس ادھیڑ بن میں رہتے تھے کہ کس طرح مسلمانوں کی حالت کو بہتر سے بہتر بنایا جائے چنانچہ سینکڑوں ایسے نوجوانوں کو جنھوں نے بہت کم تعلیم حاصل کی تھی ان کو سب اور سیری کی تعلیم دیتے تھے اور اپنی کوشش سے بہت سے ایسے نوجوانوں کو نوکر بھی کرا دیتے تھے۔

چنانچہ آج ان میں سے بہت اچھے عہدوں پر ہیں۔ ان کی یہ خدمت ایسی تھی کہ جس کی کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوتی تھی۔ انگریزی تعلیم یا علی گڑھ کالج کے جو لوگ مخالف تھے وہ ہمیشہ کوشش کر کے ان کے بچوں کو مقامی اسکولوں میں داخل کرا دیتے تھے۔ یا علی گڑھ کالج یا اسلامیہ ہائی اسکول میں تعلیم دلانے کے لئے ان کے والدین کو آمادہ کرتے تھے۔

میری ان سے دوستی کو پچاس برس گزر چکے ہیں۔ میرے ساتھ ان کو جو محبت تھی وہ اعتدال سے بڑھی ہوئی تھی۔ ان کو میرے ساتھ اس وقت سے محبت ہوئی ہے جب کہ ان کی پوزیشن زمانہ کے اعتبار سے بہت اچھی تھی اور میں ہر اعتبار سے پست اور ادنیٰ حالت میں تھا۔ ان کو میری ذات کے ساتھ نہ صرف محبت تھی بلکہ میری ذات سے ان کو ضرورت سے زیادہ حسن ظن اور حسن عقیدت تھی اور یہ حالت آخر عمر تک قائم رہی۔ ایسے زمانے میں جبکہ میری بدقسمتی سے سب

ساتھ محبت کرنے والے اور میری نسبت اچھی رائے قائم کرنے والے ایک کے بعد دوسرے اٹھتے جاتے ہیں ان کی موت کا مجھ کو سخت صدمہ ہوا ہے اس قسم کے اندوہناک واقعات کو زیادہ عمر پانے والا برداشت کرتا ہے کہ اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے عزیز اور دوست مرتے چلے جاتے ہیں اور جو عزیز مرتا ہے اس کی جگہ لینے والا کوئی دوسرا نہیں ہوتا۔

میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ اور کوئی صدمہ مجھ کو برداشت نہ کرنا پڑے اور خدا سے مرحوم سید جعفر حسین کی مغفرت کی دعا کرتا ہوں جب سید جعفر حسین صاحب کی وفات کی خبر اٹاوہ پہنچی تو اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ کے طلبا اور اسٹاف کا ایک تعزیتی جلسہ ہوا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے مرحوم کے اوصاف بیان کئے۔ جمعہ کی نماز کے بعد بورڈنگ ہاؤس کی مسجد میں قرآن خوانی کر کے مرحوم کی روح کو ایصال ثواب پہنچایا گیا......"

خان بہادر سید جعفر حسین کے انتقال پُر ملال پر مختلف اخباروں، رسالوں اور انجمنوں نے انھیں خراج تحسین پیش کیا۔ جن مسلمان زعمانے ان کے بارے میں اپنے خیالات و جذبات کا اظہار کیا۔ ان میں سر رضا علی اور سر یعقوب کے نام قابل ذکر ہیں۔

Marfat.com

خان بہادر سید حامد حسین

خان بہادر سید حامد حسین، خان بہادر سید جعفر حسین لکھنوی کے سب سے بڑے صاحبزادے تھے۔ سید جعفر حسین کے کل چھ بچے تھے جن میں چار لڑکیاں اور دو لڑکے تھے۔ سید حامد حسین اپنے بہن بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ اور سید جعفر حسین کے بہت چہیتے اور لاڈلے تھے۔

امیر کلال علیہ رحمتہ کا خاندان تاریخ کے مختلف ادوار میں زمانے کے نشیب و فراز سے گزرتا رہا ہے۔ کبھی اس خاندان کے افراد کا شمار صاحب ثروت لوگوں میں ہوتا تھا تو کبھی یہ لوگ تہی دست اور مفلس ہو جاتے تھے لیکن ہر دور میں شرافت و نجابت اس خاندان کا طرۂ امتیاز رہا۔ گو ہر دو چار نسلوں کے بعد سایۂ ہما ان کے سروں سے اٹھ جاتا تھا، لیکن خاندانی شرافت و نجابت کا گوہر تابدار ہمیشہ اس خاندان کے پاس رہا۔

خان بہادر سید جعفر حسین نے جن کو آجکل کی اصطلاح میں سلف میڈ انسان کہنا چاہیئے اپنے زور بازو سے دنیاوی مناصب کو حاصل کیا تھا۔ جس وقت سید حامد حسین پیدا ہوئے تو گھر میں دولت کی ریل پیل تھی۔ اس اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ حامد حسین چاندی کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہوئے تھے۔ لیکن اس کے باوجود بے پناہ محنت کے عادی تھے۔ چنانچہ وہ مزدوروں کی طرح کام کرتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ آدمی کو پوری پوری کوشش کرنی چاہیئے اور نتائج خدا پر چھوڑ دینے چاہئیں۔

Marfat.com

تعلیم و تربیت

خان بہادر سید جعفر حسین نے بہت محنت اور جدوجہد سے اپنی زندگی بنائی تھی۔ اور نہایت مشکل سے تعلیم حاصل کی تھی اور خود بھی سرسید احمد خان کی تحریک سے متاثر تھے۔ سرسید احمد خان اور ان کے رفقائے کار نے مسلمانوں کو انگریزی تعلیم کی جانب توجہ دلائی تھی۔ گو آغاز میں اس کی مخالفت ہوئی تھی لیکن جلد ہی مسلمانوں نے سمجھ لیا کہ ہوا کا رخ کدھر کو ہے۔ لہذا اب مسلمانوں میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں تھی جو اپنے بچوں کو سرسید کے قائم کردہ تعلیمی ادارے میں بھیجتے تھے۔ پھر سید جعفر حسین تو خود مغربی تعلیم کے حق میں تھے۔ لہذا ان کی دلی تمنا تھی کہ ان کا بیٹا اعلیٰ تعلیم حاصل کرے۔ اور اس سلسلے میں انھوں نے ہر ممکن کوشش کی۔ چنانچہ ۱۹۰۳ء میں سید حامد حسین نے علی گڑھ سے میٹریکولیشن کا امتحان پاس کیا۔ گو ان کے والد کی تربیت اور نگہداشت سخت تھی اور سید حامد حسین جس درجے تک بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتے، انھیں اس کے مواقع حاصل تھے۔ لیکن سید حامد حسین کی دلچسپی کھیل کود میں زیادہ تھی۔ اس بنا پر انھوں نے میٹرک کے بعد تعلیم کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ سید جعفر حسین کی خواہش تھی کہ بیٹا اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں کالج میں داخل ہو۔ لیکن سید حامد حسین نے بصد احترام اپنے محترم والد کا حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ میٹرک کی تعلیم بھی انھوں نے طالب علموں کی روایتی محنت و مطالعہ کے ساتھ حاصل نہیں کی تھی۔ ان کی تمام تر توجہ کرکٹ کی طرف مبذول تھی جس کے وہ اپنے زمانے کے بہترین کھلاڑی سمجھے جاتے تھے۔ جیسا کہ مشاہدے میں آیا ہے کہ عموماً کھیل کود میں اپنا زیادہ تر وقت گزارنے والے بچے، شاندار تعلیمی نتائج اس لئے حاصل نہیں کر پاتے کہ وہ تعلیم کی طرف پوری توجہ اور انہماک ظاہر نہیں کرتے۔ لیکن ایسے بچے انتہائی ذہین اور طباع ہوتے ہیں۔ چنانچہ سید حامد حسین بھی انتہائی ذہین اور طباع تھے۔

Marfat.com

شادی

خان بہادر سید حامد حسین کی شادی کم سنی میں ہی کر دی گئی تھی۔ لیکن ان کی بیوی کا انتقال ہو گیا تھا۔ پہلی بیوی سے صرف ایک لڑکا تھا۔ پھر انھوں نے دوسری شادی کی جس سے میجر جنرل شاہد حامد صاحب اور ان کے بہن بھائی ہوئے۔

ملازمت

سید حامد حسین کے فرزند میجر جنرل (ریٹائرڈ) سید شاہد حامد صاحب کا بیان ہے کہ میٹرک کے امتحان کے بعد میرے دادا جان کے اصرار اور خواہش کے باوجود وہ آگے پڑھنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ بلکہ ملازمت کے خواہش مند تھے چنانچہ میرے دادا نے انھیں خود انجینئرنگ کی تعلیم دی اور صوبجات متحدہ کے محکمہ انہار میں ملازم کرا دیا۔ یہ عام مشاہدہ ہے کہ بیٹا، باپ کے پیشے کو نہیں اپناتا۔ لیکن سید حامد حسین کا آیڈیل ان کے عظیم والد تھے۔ اور انھوں نے اسی پیشے کو اپنانے کی آرزو کا اظہار کیا۔ اور بعد میں وہ خود بھی محکمہ انہار کے ایک نامور انجینئر ہوئے۔ چنانچہ انجینئرنگ سے فطری مناسبت اور ذوق و شوق کے سبب انھوں نے جلد ہی محکمہ میں اپنا مقام بنا لیا اور افسران بالا نے ان کی قابلیت کا اعتراف کرتے ہوئے جلد ہی انھیں سب ڈویژنل آفیسر بنا دیا۔

قیام ہلدوانی

۱۹۱۰ء میں سید حامد حسین کا تبادلہ ہلدوانی کر دیا گیا۔ یہ بہت دلکش جگہ تھی۔ یہ مقام نینی تال جاتے ہوئے راستے میں نیپالی قبیلے کے پاس واقع تھا۔ یہاں انھوں نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا سب سے پہلا کارنامہ انجام دیا۔ اس جگہ دریا پر بند باندھ کر اس سے ایک نہر نکالا جانا تھی۔ ایک جانب اس نہر کو ایک محراب نما بند ھ باندھ کر روک دیا گیا تھا۔ یہ ایک بہت بڑی کنکریٹ کی محراب تھی۔ جو دریا کے دونوں کناروں پر واقع تھی۔ اس کی تعمیر کا کام ۱۹۱۱ء میں اختتام کو پہنچا۔ ہلدوانی میں یہ آج بھی پکنک کے اعتبار سے سب سے دلکش مقام سمجھا جاتا ہے۔

Marfat.com

نگینہ اس بند کی تعمیر کے بعد سید حامد حسین کا تبادلہ نگینہ میں کر دیا گیا۔ یہاں ان کا قیام کافی عرصہ تک رہا۔ یہاں کے خاص و عام میں وہ ہر دلعزیز تھے۔ چنانچہ ایک طویل عرصے تک قیام کرنے کے بعد جب ان کا تبادلہ ہونے لگا تو ضلع نگینہ کے لوگوں نے حکومت کو درخواست دی کہ سید حامد حسین کا تبادلہ منسوخ کر دیا جائے۔ اس درخواست پر کثیر تعداد میں لوگوں کے دستخط تھے۔ اور ضلع نگینہ کے تمام بڑے بڑے جاگیرداروں، زمینداروں اور بلند سماجی حیثیت کے لوگوں نے اس پر دستخط کئے تھے۔

سید حامد حسین کو خود بھی یہ علاقہ بہت پسند تھا۔ کیونکہ اس جگہ شکار وغیرہ کی افراط تھی اور شکار ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ جب وہ سرکاری دورے پر جاتے تو سرکاری فرائض کی بجا آوری کے بعد اپنا فرصت کا وقت سیر و شکار میں گزارتے تھے۔ چونکہ ضلع بجنور کا علاقہ اس اعتبار سے ان کے لئے جنت سے کم نہیں تھا لہٰذا وہ یہاں سے تبدیل کئے جانے کے خیال سے ہی مضطرب ہو جاتے تھے۔ چنانچہ جب ان کا تبادلہ بجنور سے ہونے کے احکامات آ گئے تو وہ کافی پریشان ہوئے۔ ادھر شہر کے معززافراد بھی چاہتے تھے کہ ان کا تبادلہ منسوخ ہو جائے۔ شہر کے روساء اور امراء نے صوبجات متحدہ کی حکومت کے نام ایک مشترکہ درخواست بھیجی جس میں لکھا گیا تھا۔ "ہم نگینہ کے شہریوں نے سنا ہے کہ سید حامد حسین کو بجنور سے تبدیل کر دیا گیا ہے۔ لہٰذا ہم ملتمس ہیں کہ ان کے تبادلے کے احکامات منسوخ کئے جائیں۔ مسٹر سید حامد حسین کی ذات اس شہر اور ضلع کے لوگوں کے لئے بہت مفید اور ہمدرد ہی ہے۔ ملیریا کے خلاف مہم میں انھوں نے نہایت توجہ اور انہماک سے کام کیا ہے۔ بحیثیت میونسپل کمشنر کے بھی ان کی شخصیت سے اس علاقے کے لوگوں کو فائدے پہنچے ہیں۔ وہ شہر کے ہر طبقے کے تمام لوگوں میں یکساں مقبول ہیں۔ اریگیشن کے کاموں میں ان کے زمانۂ قیام کے دوران معتد بہ اضافہ ہوا ہے۔ جس سے کاشت کا رقبہ

Marfat.com

کو بہت زیادہ فائدہ پہنچا ہے۔ عوام اور خاص طور پر اس علاقے کے زمینداروں کو ان پر خاص اعتماد ہے۔ ہم یہاں ان تمام کارناموں اور خدمات کو بیان نہیں کر سکتے جو موصوف نے اس ضلع کی بہبود کی لئے کئے ہیں۔ نہ صرف محکمہ انہار میں بلکہ اس ضلع کے اور دوسرے شعبوں میں بھی ان کی مساعی و جدوجہد اور خدمات قابل قدر اور کثیر التعداد ہیں۔ انھوں نے نہایت خوبصورتی اور فہم و فراست سے اس علاقوں کے لوگوں کی دیرینہ باہمی رنجشوں اور آویزشوں کو بھی دور کرا دیا ہے۔ وہ کلب کے آنریری آرگنائزر بھی ہیں اور اس کی نگرانی اور انتظام کا کام بھی ان کے ہی سپرد ہے۔"

لیکن حکومت کے احکامات اس زمانے میں نادری ہوا کرتے ہیں۔ چنانچہ اس درخواست کا بھی کوئی اثر نہ ہوا اور ان کے تبادلے کے احکامات منسوخ نہیں کئے گئے۔ لوگوں میں اضطراب کی ایک کیفیت تھی۔ ان لوگوں کی محبت صرف دکھاوے کی نہیں تھی کہ جو افسران کو خوش کرنے کے سلسلے میں کی جاتی ہے۔ بلکہ جب تبادلے کے احکامات منسوخ نہ ہو سکے تو شہر کے لوگوں نے سید حامد حسین کو مشورہ دیا کہ وہ ملازمت سے مستعفی ہو جائیں۔ علاقے کے لوگوں نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ بھی کیا تھا کہ وہ انھیں صوبائی لیجسلیٹو کونسل کے الیکشن میں، جو ہندوستان میں اس زمانے میں پہلی بار ہو رہے تھے، اپنے علاقے سے ممبر منتخب کریں گے۔

ایک طرف لوگوں کا اصرار اور خلوص تھا۔ دوسری طرف سید حامد حسین عجیب گومگو کی حالت میں تھے نہ تو ان سے ایسے مخلص اور محب لوگوں کی بات ٹالتے بن رہی تھی اور نہ ہی وہ ملازمت ترک کرنے کو کوئی دانش مندانہ اقدام سمجھتے تھے۔ بالآخر ایک شدید کشمکش کے بعد انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ نوکری جاری رکھیں گے۔ کیونکہ انھیں سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ تاہم حکومت نے شہریوں کی درخواست کے جواب دیتے ہوئے اس بات پر مسرت کا اظہار کیا تھا

Marfat.com

لہ سید حامد حسین نے جو حکومت کے ایک افسر تھے، لوگوں کی ایسی شاندار خدمات انجام دیں تھی۔

ایک انعام

جنگِ عظیم اوّل میں سید حامد حسین نے بہت سے ہندوستانیوں کو برطانوی فوج میں بھرتی کرایا تھا۔ اس خدمت کے صلے میں جنگ کے اختتام پر حکومت ہند نے انھیں ایک قیمتی بندوق انعام میں دی تھی اور ہر قسم کے آتشیں اسلحہ کے لائسنس سے مبرّا قرار دیا تھا۔

سارده کینال ہیڈ ورکس

۱۹۲۱ء میں صوبجات متحدہ کے چیف انجینئر نے ایک تقریب میں کہا تھا کہ حکومت کو سارده کینال ہیڈ ورکس کی تعمیر کے لئے ایک انتہائی قابل اور ذہین و محنتی افسر کی ضرورت ہے اور حکومت کی نگاہِ انتخاب اس سلسلے میں سید حامد حسین پر ہے۔ لہذا انھیں نئی ذمہ داری قبول کرنے کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ سید حامد حسین نے اس حسنِ انتخاب کا حق ادا کر دیا۔ چنانچہ ۱۹۲۱ء سے ۱۹۲۸ء تک کہ جب سارده کینال ہیڈ ورکس مکمل طور پر تیار ہوا۔ انھیں مختلف خدمات کی بجاآوری کے سلسلے میں افسران کے توصیفی خطوط موصول ہوتے رہے۔

۱۹۲۰ء میں سید حامد حسین بلدوانی میں دوبارہ تعینات کئے گئے تھے۔ جہاں سے تھوڑے عرصے کے بعد انھیں پیلی بھیت میں تبدیل کر دیا گیا۔ اس زمانے میں ہی برصغیر کا دوسرا سب سے بڑے آبرسانی کے منصوبے سارده کینال ہیڈ ورکس کا آغاز ہوا تھا۔ ایک عظیم دریا سارده پیلی بھیت سے چالیس میل کے فاصلے پر بن باسا کے مقام پر بہتا تھا۔ یہ دریا نیپال سے بہتا ہوا اس مقام پر آتا تھا۔ چنانچہ اسی مقام پر اس دریا پر ایک ڈیم بنائے جانے کا منصوبہ تیار کیا گیا تھا۔ یہ آبی منصوبہ اس وقت کے غیر منقسم ہندوستان میں سکھر پراجیکٹ کے بعد دوسرے نمبر پر آتا تھا۔ آبرسانی کے اس منصوبے کی تعمیر کا بنیادی مقصد ضلع اودھ

Marfat.com

کو پانی کی فراہمی تھی۔

اس ڈیم کے سروے کا آغاز ۱۹۲۰ء میں کیا گیا تھا۔ اس کی تعمیر میں کل آٹھ برس صرف ہوئے اور ۱۹۲۸ء یا ۱۹۲۹ء کے اوائل میں اس ڈیم نے کام کرنا شروع کیا تھا۔ جس وقت سروے کا آغاز ہوا تو سید حامد حسین کا ہیڈ کوارٹر پیلی بھیت میں واقع تھا جو بن باسا سے جہاں ڈیم تعمیر کیا جاتا تھا، چالیس میل کے فاصلے پر تھا۔ ابتدائی دنوں میں سید حامد حسین صبح کی ٹرین سے بن باسا چلے جایا کرتے تھے اور شام کی ٹرین سے واپس اپنے ہیڈ کوارٹر آجاتے تھے۔ ٹرین یہ فاصلہ ڈیڑھ گھنٹے میں طے کرتی تھی۔ سید شاہد حامد صاحب کا بیان ہے کہ ہم بچوں کے لئے یہ منظر بھی خوب ہوتا تھا۔ روزانہ صبح کے وقت ٹرین ہمارے سرکاری بنگلے کے سامنے سے گزرتی تھی۔ ہمارے والد صاحب ہاتھ ہلا کر انڈین ڈرائیور کو گاڑی روکنے کا اشارہ کرتے تھے۔ اور ٹرین میں سوار ہو جاتے تھے۔ واپسی میں بھی یہی ہوتا تھا۔ بن باسا بہت گھنے جنگلوں میں واقع تھا۔ اور ان جنگلات میں ہر قسم کی جنگلی مخلوق بکثرت پائی جاتی تھی۔

دریا پر ڈیم تعمیر کئے جانے سے قبل ملازمین کے لئے بنگلے، سڑکیں، ہلکی ریلوے لائن اور مزدوروں کے رہائشی علاقوں کی تعمیر کی گئی تھی۔ ان تعمیرات کے ساتھ ساتھ اس علاقے کا تفصیلی جائزہ بھی جاری تھا۔

۱۹۲۲ء میں سید حامد حسین بن باسا منتقل ہو گئے۔ تاکہ کام کی براہ راست نگرانی میں کوئی رکاوٹ نہ پڑے۔ اس علاقے میں مچھر اور سانپ بکثرت تھے۔ مچھروں کی کثرت کی بنا پر گرمی کے موسم میں اس علاقے میں رہنا ناممکن ہو جاتا تھا۔ اس سبب سے یہاں سارا سال کام نہیں کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ سارے کام جون یا جولائی کے اواخر میں بند کر کے عملہ نینی تال منتقل ہو جاتا تھا۔ اکتوبر میں دوبارہ کام شروع ہوتا تھا۔

Marfat.com

سارده ہیڈورکس کی تعمیر اس زمانے میں ہندوستان کا ایک نہایت زبردست آبی منصوبہ تھا یہ بات شاید آج ناقابل یقین نظر آئے کہ اس عظیم الشان منصوبے کی تعمیر میں ذرائع نقل وحمل کا کام گدھوں سے لیا گیا تھا۔ شروع میں کھدائی اور مٹی کو باہر پھینکنے کے لئے مشینری استعمال کی گئی تھی لیکن جلد ہی اندازہ ہوا کہ ان مشینوں کی جگہ، گدھوں کو استعمال کرنا مالی اعتبار سے بھی منفعت بخش ہے۔ دوسرے جنگل میں جہاں مشینیں نہیں لے جائی جاسکتی ہیں وہاں ان گدھوں کے ذریعے ہر قسم کا سامان بہ آسانی پہنچایا جاسکتا تھا۔ بے شمار مزدور اور ٹھیکیدار مقرر کئے گئے تھے۔ یہاں کام کرنے والے بیشتر مزدوروں کا تعلق غیر منقسم ہندوستان کے شمالی علاقوں سے تھا۔ ان میں پنجاب کے غریب علاقوں، بلوچستان، کشمیر اور تبت کے مزدور پیشہ لوگوں کی کثرت تھی۔

کام کا آغاز اس علاقے میں پھیلے ہوئے وسیع وعریض جنگلوں کو کاٹنے سے ہوا چنانچہ ان درختوں کو کاٹنے اور پھر وہاں سے ہٹانے میں بہت زیادہ وقت صرف ہوا۔ ایک وقت میں تیس چالیس ہزار مزدور کام کرتے تھے جنگل میں دیکھتے دیکھتے ایک عارضی شہر آباد ہو گیا۔

دریائے سارده کی رفتار انتہائی تیز تھی۔ ہر سال صرف مون سون کے خاتمے کے بعد ہی وہاں کام شروع کیا جاسکتا تھا۔ جسے زیادہ سے زیادہ ماہ اپریل کے اواخر یا مئی کے اوائل تک جاری رکھا جاسکتا تھا۔ تیز وتند دریا کو قابو میں لانے کے لئے پہلے بے شمار چھوٹے چھوٹے ڈیم بنائے گئے تھے۔ اور ایک ریلوے لائن پتھروں وغیرہ کو وہاں تک لانے لیجانے کے لئے بچھائی گئی تھی۔ دریا کو عبور کرنے کیلئے کشتیاں استعمال نہیں کی جاتی تھیں اس مقام پر دریا کو کشتی کے ذریعے عبور کرنا ناممکن تھا۔ درختوں کے بڑے بڑے لٹھوں کو باہم جوڑ کر شیکزوں سے دریا کو پار کیا جاتا تھا یہی سب سے تیز رفتار اور محفوظ طریقہ تھا۔ بسا اوقات ہاتھیوں

Marfat.com

کے ذریعے بھی دریا کو عبور کیا جاتا تھا۔ سرد سے کے سلسلے میں بھی ہاتھیوں کو ہی استعمال کیا جاتا تھا۔ اس دریا میں مچھلیاں بھی بکثرت تھیں۔

اس عظیم الشان ڈیم کی تکمیل کے بعد دریا سے پانچ بڑی بڑی نہریں نکالی گئیں۔ جن میں سے ایک نہر کے پل پر سنگ مرمر کی ایک لوح آج بھی نصب ہے اس پر سید حامد حسین کا نام لکھا ہوا۔ اور اس منصوبے کی تمام تفصیلات درج ہیں۔

۱۹۲۴ء میں چیف انجینئر نے انھیں ایک خط لکھا جس میں کہا گیا تھا کہ ہز ایکسیلنسی گورنر صاحب بہادر صوبجات متحدہ سید حامد حسین کے کام کو بہ نظر تعریف دیکھتے ہیں اور انھوں نے اپنے جذبات سے سید صاحب کو مطلع کرنے کا حکم دیا ہے۔ چیف انجینئر نے آگے چل کر اسی خط میں لکھا تھا کہ میں آپ کی خدمات کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ ان چھ سات برس کی مدت کے درمیان لکھے ہوئے اور بہت سے ایسے خطوط ہیں جن میں ان کی خدمات کو سراہا گیا تھا۔

۱۹۲۶ء میں چیف انجینئر نے انھیں ایک اور خط بھیجا جس میں لکھا تھا۔" دریا ٹے بن بلا میں آنے والی حالیہ طغیانیوں میں سید حامد حسین نے جو خدمات انجام دی ہیں۔ حکومت نے مجھے ہدایت کی ہے کہ میں اس سلسلے میں ان سے اظہار تشکر کروں۔"

۲۹-۱۹۲۸ء میں اس عظیم الشان منصوبے کا افتتاح ہوا۔ تمام درجے کے سرکاری افسروں اور صوبجات متحدہ کے گورنر، محکمہ انہار کے چیف انجینئر اور اس علاقے کے ممتاز لوگوں نے اس تقریب افتتاح میں شرکت کی تھی۔ یہ تقریب تین دن تک جاری رہی۔ اس

Marfat.com

تقریب کے اختتام پر سید حامد حسین کو حکومت کا ایک خط موصول ہوا جس میں اس حسن و خوبی کے ساتھ تقریب کا اہتمام کرنے پر ان کی تعریف کی گئی تھی۔ گورنر صوبجات متحدہ نے بھی اس تقریب کے اختتام پر اپنی ذاتی حیثیت میں سید حامد حسین کو تعریف کا ایک خط بھیجا تھا۔ علاوہ ازیں گورنر کے ماتحت اعلیٰ سرکاری افسران نے انھیں اپنے خطوط ارسال کئے تھے جس میں نہ صرف خان بہادر سید حامد حسین بلکہ ان کے تمام رفقائے کار کا شکریہ ادا کیا گیا تھا۔

مشہور شاعر عزیز لکھنوی نے اس موقع کے لئے مندرجہ ذیل نظم لکھی تھی۔

قطعۂ تاریخ افتتاح نہر سارده

سنہ ۱۹۲۸ء

نہر در آغوش تھا ہر صوبہ ہندوستاں
تھا فقط محروم شادابی اودھ کا بوستاں

شکر منعم ہے کہ نہر سارده جاری ہوئی
چپہ چپہ پر اودھ کے آج گلکاری ہوئی

مدتوں نقشے بنے پیمائشیں ہوتی رہیں
فکر کے میدان میں افزائشیں ہوتی رہیں

سخت مشکل سے نظیر آفاق ہیں جن کی ملے
خوش نصیبی تھی کہ ایسے ہی معاون بھی ملے

نو برس کی جو مسلسل سعی تھی مشکور ہے
سچ ہے دیر آید درست آید مثل مشہور ہے

بخت کی خوبی ملا سر مالکم ہیلی کا دور
جن کے دست فیض گستر سے بڑھی عزت کچھ اور

کار مشکل حل نہر راحت افزا سے ہوا
افتتاح چشمۂ فیض ایک دریا سے ہوا

کی عزیز لکھنوی نے منزل تاریخ طے
فیض نہر سارده سے سب اودھ فردوس ہے

Marfat.com

سارده کینال ہیڈ ورکس، خان بہادر سید حامد حسین کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے جس پر وہ بجا طور پر فخر کرتے تھے۔ سکھر بیراج کے بعد یہ سب سے بڑی نہر تھی۔

خان بہادر کا خطاب سارده کینال ہیڈ ورکس کی تعمیر کے زمانے میں ہی ۱۹۲۵ء میں سید حامد حسین کو خان بہادر کا خطاب ملا۔

یوپی کی صنعتی وزرعی نمائش ۳۷-۱۹۳۶ء میں صوبہ جات متحدہ کی پہلی عظیم الشان صنعتی وزرعی نمائش لکھنؤ میں کی گئی اس کی مجلس منتظمہ اور مجلس استقبالیہ کے ایک رکن خان بہادر سید حامد حسین بھی تھے۔ اس نمائش کے سلسلے میں قطعۂ زمین کا انتخاب اور اسٹالوں کی ترتیب وغیرہ کی نگرانی کا کام بھی بحیثیت انجینئر انہی کے سپرد تھا۔ اس نمائش کے لئے پانچ سو ایکڑ جگہ مخصوص کی گئی تھی۔

سید حامد حسین نے اس سلسلے میں جو قطعۂ زمین منتخب کیا تھا اس کی حیثیت تاریخی تھی۔ یہ وسیع وعریض میدان ایک جانب امام باڑے سے شروع ہو کر دریائے گمتی کے دائیں جانب تک پھیلا ہوا تھا۔ اس کی پوری پلاننگ اور نقشوں کی تیاری خاں بہادر سید حامد حسین نے کرائی تھی۔ پورے قطعہ اراضی کو مختلف بلاکوں میں بانٹ دیا گیا تھا۔ کل چودہ بلاک تھے۔ ان میں جو خاص پویلین تھے۔ ان میں وائسرائے پویلین اور گورنر پویلین قابلِ ذکر تھے۔

دوسرے خاص اسٹالوں میں زراعتی اسٹال، زراعتی استعمال میں آنے والی اشیاء کا اسٹال، کیمیکلز اسٹال، ٹیکسٹائل میوزیم، آرٹس اسٹال، ہینڈی کرافٹس اسٹال، ہارٹی کلچر پویلین، جیولری ایسپی لینڈ اسٹال (JEVELLERY ESPLANADE STALL) اریگیشن موڈل رومز، لیدر کرافٹ اسٹال، میوزک کانفرنس پنڈال، میڈیکل سکیشن اسٹال، میسور

Marfat.com

گورنمنٹ پویلین، رامپور اسٹیٹ پویلین، شوگر فیکٹری، شوگر اسٹال، وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

اس موقع پر نمائش میں ٹیلی فون کا لکھنؤ نمائش سب ایکسچنج بھی قائم کیا گیا تھا۔ ہز ایکسلنسی سرہیری ہیگ نے ہفتہ کی سہ پہر میں اس یادگار نمائش کا افتتاح کیا تھا۔ آنریبل ڈاکٹر سر جوالا پرشاد سر استوا وزیر صنعت حکومت ہند نے خطبہ استقبالیہ پڑھا تھا۔ سر ہیگ نے ڈائرکٹر آف انڈسٹریز مسٹر شیو دیسائی اور انجینئر انچارج خان بہادر سید حامد حسین کی خدمات کو سراہا۔

اس نمائش کو لکھنؤ میں تمام لوگوں نے پسند کیا اور ارد گرد کے شہروں اور دیہاتوں کے لوگ بھی کثیر تعداد میں نمائش دیکھنے آتے رہے۔

اخبارات میں بھی خصوصی مضامین اس نمائش کے بارے میں شائع ہوتے رہے۔

بن باسا میں سارده ہیڈ ورکس کینال کے منصوبے کے پایۂ اختتام

لکھنؤ کا تبادلہ کو پہنچتے پر خان بہادر سید حامد حسین کا تبادلہ لکھنؤ کا ہو گیا تھا اس مقام کو چھوڑتے ہوئے انھیں کچھ رنج سا محسوس ہوا۔ ایک تو اس وجہ سے کہ اپنی زندگی کے بہترین دن انھوں نے یہاں اس ڈیم کی تعمیر میں گزارے تھے۔ دوسرے بن باسا میں شکار کھیلنے کی بہت آسانیاں تھیں۔ اور شکار ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ لکھنؤ تبدیل کئے جانے کے بعد وہ سیر و شکار کی ان بڑی مہمات سے تو محروم ہو گئے تھے۔ لیکن جلد ہی اس آبائی شہر میں ملازمت کے بعد دوسرے مشغلوں میں وہ مصروف ہو گئے۔

لکھنؤ آنے کے بعد پہلی بار وہ جعفر منزل میں مقیم ہوئے۔ یہ وہ مکان تھا جو ان کے نامور والد سید جعفر حسین نے اپنی ذاتی نگرانی میں تعمیر کرایا تھا۔ جعفر منزل کے برابر ہی انھوں نے اپنا ایک مکان بنوایا تھا۔ اور اس کا نام حامد منزل رکھا تھا۔

Marfat.com

مرزاپور کا تبادلہ لکھنؤ میں کافی عرصہ قیام کے بعد ان کا تبادلہ مرزاپور کا ہوگیا۔ غالباً اس تبادلے کے محرک وہ خود تھے۔ شکار کے اعتبار سے مرزاپور کا ضلع بہت اچھا سمجھا جاتا تھا۔ مرزاپور الہ آباد سے چالیس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اسی طرح بنارس سے بھی قریب ہی واقع ہے۔ اس ضلع میں بہت سی چھوٹی نہریں اور آبی ذخیرے موجود تھے۔ اور بہت سے آبی ذخیروں کی تعمیر اور نہروں کی کھدائی کا کام تقریباً تمام سال ہی جاری رہتا تھا۔ یہ بہت بڑا ضلع تھا، اور اس کی حدود بہت سی ہندوستانی ریاستوں سے ملی ہوئی تھیں۔

مرزاپور کے قیام کے دوران ہی ان کے سب سے بڑے بیٹے سید شاہد حامد کو انڈین آرمی میں کمیشن ملا۔ جو بعد میں ترقی کرتے کرتے پاکستان کی مسلح افواج میں میجر جنرل کے عہدے تک پہنچے اور اسی عہدے سے ریٹائر ہوئے۔

ریٹائرمنٹ مرزاپور سے خان بہادر صاحب کا تبادلہ دوبارہ لکھنؤ کا ہوگیا تھا۔ جہاں سے تھوڑے عرصے کے بعد وہ ملازمت سے ریٹائر ہوئے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد انھوں نے لکھنؤ میں گورنمنٹ ہاؤس کے بالکل قریب اپنی کوٹھی بنوائی جو پورے لکھنؤ میں فیروزہ کوٹھی کے نام سے معروف تھی اس کوٹھی کا نام انھوں نے اپنی اہلیہ کے نام پر رکھا تھا۔

ریٹائرمنٹ کے بعد انھوں نے آرکیٹکٹ اور انجینئر کی حیثیت سے اپنا ذاتی کام شروع کیا تھا۔ لیکن اپنی فطری بے نیازی کے سبب وہ اس کاروبار میں کامیاب نہ ہو سکے۔ یا تو وہ اپنے سیر و شکار کے مشغلے اور طبیعت کی بے نیازی کی بنا پر بل بھیجنا بھول جاتے تھے یا پھر ان کے بہت سے دوست احباب جو اپنے نقشے بنوا کر لے جاتے تھے

Marfat.com

ان کو معاوضہ کی رقم ادا نہیں کرتے تھے۔

لکھنؤ میں جو بھی آدمی اپنا مکان بنوانے کا ارادہ کرتا تھا وہ خان بہادر سید حامد حسین کے پاس نقشہ بنوانے اور دوسرے مشورے لینے ضرور آتا تھا۔ اور بغیر معاوضے کا مطالبہ کئے خان بہادر صاحب انھیں تمام ضروری چیزیں بنا کر دے دیتے تھے۔ اکثر اوقات ان کی اہلیہ کہتیں کہ یہ سب لوگ جو آپ سے پلان بنوا کر لے جاتے ہیں صاحب حیثیت لوگ ہیں۔ آپ ان سے اپنا حق محنت کیوں نہیں وصول کرتے یا ان کے گھر پر بل بھجوا دیجئے۔ تو وہ ہنس کر جواب دیتے۔ بھئی وہ بیچارے دوست ہیں۔ لکھنؤ کا شاید ہی کوئی قابل ذکر آدمی ہوگا جو ان کو نہ جانتا ہوگا جس کے ان سے مراسم نہ ہوں۔ وہ لکھنؤ کی ہر دلعزیز شخصیت تھے۔ اکثر اوقات شام میں برج کھیلنے کے لئے کلب جایا کرتے تھے۔ وہ برج کے بڑے اچھے کھلاڑی تھے۔

فیروز کوٹھی کا پلان اور اس کی تعمیر کے کام کی تمام تر نگرانی انھوں نے بذات خود کی تھی۔ بنیادی طور پر وہ آرکیٹیکٹ نہیں تھے۔ اور محکمہ انہار کے انجینئر تھے۔ لیکن قدرت نے چونکہ انھیں اعلیٰ ذہنی صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ لہٰذا وہ انجینئرنگ کے تمام شعبوں میں مہارت رکھتے تھے۔

احباب

خان بہادر سید حامد حسین کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا۔ جس سے بھی ایک دفعہ تعلقات استوار ہو جاتے پھر پوری وضع داری سے انھیں نبھاتے تھے۔ ان کے حلقہ احباب میں ہر قسم اور ہر سماجی مرتبے کے لوگ شامل تھے لیکن ان لوگوں سے ان کی دوستی زیادہ تھی جن کے مشاغل ان کے مشاغل سے ملتے جلتے تھے۔ وہ اپنی ملازمت کے زمانے میں جہاں جہاں رہے۔ وہاں سے تبدیل ہو جانے کے

Marfat.com

بعد بھی مقامی لوگوں سے ان کے سلوک اور دوستی میں فرق نہ آتا تھا۔

نگینہ اور بجنور میں ان کا قیام بہ سلسلۂ ملازمت طویل عرصے تک رہا۔ اس جگہ سے ان کے تبادلے کے سلسلے میں وہاں کے لوگوں کی خواہشات اور پسندیدگی کا تذکرہ ہم گزشتہ صفحات میں کر آئے ہیں۔ نگینہ سے تبدیل ہو جانے کے بعد بھی اس علاقے کے لوگ برابر پابندی کے ساتھ ان سے ملاقات کی غرض سے آتے رہتے تھے۔ آتے ہوئے موسمی پھلوں اور آموں وغیرہ کی ٹوکریاں بھی خان بہادر صاحب کے لئے لے کر آتے تھے۔ آموں کی فصل کے موقع پر سینکڑوں پارسل بجنور اور نگینہ سے ہر سال آتے رہتے تھے۔

نگینہ ہی میں ان کے برادرانہ تعلقات سید عین الدین صاحب سے قائم ہوئے تھے سید صاحب وہاں تحصیلدار تھے اور سید حامد حسین کے بچوں سے بہت زیادہ پیار کرتے تھے۔ سید شاہد حامد صاحب کا بیان ہے کہ "عین الدین صاحب مجھ سے بالخصوص بہت محبت کرتے تھے۔ چنانچہ میں بھی ان سے مانوس تھا۔ میری عمر تین سال کی تھی لیکن عین الدین صاحب سرکاری دورے پر جاتے ہوئے مجھے اپنے ہمراہ لے جاتے تھے اور میں دو دو تین تین دن تک والدین سے دور ان کے ساتھ نہایت خوش و خرم رہتا تھا۔" سید عین الدین صاحب سے سید حامد حسین کے تادم زندگی برادرانہ مراسم رہے۔

خان بہادر سید حامد حسین کے انگریز حلقۂ احباب میں سے ایک مسٹر ٹی ایچ وارس تھے۔ جو خان بہادر صاحب کے دوست تھے۔ حالانکہ وہ ان کے زمانہ طالب علمی میں علیگڑھ اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ بعد میں علیگڑھ کالج کے پرنسپل بھی ہوئے۔ یہ آکسفورڈ کے فارغ التحصیل تھے اور اکثر اپنے شاگرد سے ملنے ان کے گھر تشریف لاتے تھے۔ ان کے تعلقات استادی شاگردی سے زیادہ دوستی کے تھے۔ مسٹر ٹی ایچ وارس بعد میں کچھ عرصہ

Marfat.com

سندھ مدرسہ کراچی کے بھی پرنسپل رہے تھے۔

اسی طرح مسٹر کونسے ریسی ایک اور انگریز تھے۔ یہ بھی پرنسپل کے عہدے پر فائز رہ چکے تھے۔ آکسفورڈ کے فارغ التحصیل تھے اور نہایت شریف النفس اور خاندانی انگریز تھے۔

ان کے ہندوستانی دوستوں میں نواب بھوپال، نواب سر اسماعیل خان اور نواب زادہ لیاقت علیخاں تھے۔ جو بعد میں پاکستان کے وزیر اعظم بنے۔ ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد نواب بھوپال نے انھیں ریاست بھوپال آنے کی دعوت دی تھی۔ چونکہ ان کے مراسم نواب صاحب موصوف سے دوستانہ تھے۔ لہذا وہ وہاں جانا نہ چاہتے تھے۔ لیکن نواب صاحب کی لکھنؤ آمد اور ان کے اصرار پر بادل ناخواستہ انھیں بھوپال جانا پڑا۔ یہاں ان کی حیثیت ایک مشیر کی سی تھی۔

بھوپال میں اپنی آمد کے فوراً بعد انھوں نے اپنی رہائش کے لئے ایک خوبصورت بنگلہ بنوایا۔ جو AHINI BUNGLOW کے نام سے مشہور تھا۔ یہ نہایت خوبصورت مقام تھا۔ اور اس کا محل وقوع بھی نہایت دلکش تھا۔ اونچی پہاڑی پر ایستادہ یہ مکان دس بارہ میل سے نظر آتا تھا۔

بھوپال میں ان کا قیام پانچ برس تک رہا۔ یہاں انھوں نے بہت زیادہ کام نہیں کیا۔ بلکہ ان کی حیثیت ریاست کے مشیر تعمیرات اور نواب صاحب کے ذاتی دوست کی سی تھی اکثر رات گئے تک انھیں نواب صاحب کے ساتھ رہنا پڑتا۔ اور چونکہ وہ رات کو دیر تک جاگنے کے عادی نہیں تھے لہذا اس شب بیداری نے ان کی صحت پر خراب اثر ڈالا۔ اور لکھنؤ میں واپسی تک ان کی صحت بہت بگڑ گئی تھی۔

تاہم بھوپال میں اپنے قیام کے زمانے میں انھوں نے کئی محلات، مکانات اور عمارتیں

Marfat.com

تعمیر کرائیں۔ بھوپال کی سب سے خوبصورت مسجد کا نقشہ ڈیزائن اور تعمیر بھی انھوں نے کرائی تھی۔

بھوپال میں اپنے زمانہ قیام کے دوران انھوں نے لکھنؤ والی اپنی فیرز کوٹھی جناب رفیع احمد قدوائی کو کرائے پر دے دی تھی جو اس زمانے میں یوپی گورنمنٹ میں وزیر تھے۔

بھوپال میں بھی سید حامد حسین صاحب کا دل خوب لگ گیا تھا۔ کیونکہ ریاست بھوپال مناظر قدرت سے مالا مال ہے۔ اور یہاں ندی نالے، جھیلیں، جنگلات بکثرت موجود ہیں لیکن ریاست میں شیر کا شکار منع تھا اس کے لئے نواب بھوپال سے خصوصی اجازت حاصل کرنا پڑتی تھی۔

جم کاربٹ

سیر و شکار کی کہانیوں سے دلچسپی رکھنے والا اردو داں طبقہ جم کاربٹ کے نام سے ضرور واقف ہوگا۔ یہ وہ مشہور شکاری ہے۔ جس کی شکار کی داستانیں بہت مشہور ہیں۔ جم نے ہندوستان کے گھنے جنگلوں میں بہت سے خونخوار آدم خور شیروں اور چیتوں کو ہلاک کیا تھا۔ جم کاربٹ نینی تال میں رہتا تھا۔ اور خان بہادر سید حامد حسین سے اس کے گہرے مراسم تھے۔ بعض شکاری مہمات میں خان بہادر اور جم کاربٹ کا ساتھ رہا تھا۔ لیکن جم کاربٹ کوئی عام شکاری نہیں تھا بلکہ وہ صرف ایسے درندوں اور بالخصوص شیروں کا شکار کرتا تھا۔ جنھوں نے اپنے علاقے میں لوگوں میں خوف و دہشت پھیلا رکھی ہو اور جو کم از کم دو سو تین سو آدمیوں کو اپنی خوراک بنا چکے ہوں۔ جن شیروں کو مارنے میں بڑے بڑے ماہر شکاری ناکام ہو جاتے تھے۔ جم کاربٹ ان درندوں سے مقابلے کا بیڑا اٹھاتا تھا۔ اور انھیں ہلاک کرتا تھا۔

جن مقفل بن باسا میں سارده ہیڈ ورکس کی تعمیر کا کام مچھروں، سانپوں اور بارشوں کی کثرت کے سبب بند کر دیا جاتا تھا تو خان بہادر سید حامد حسین اپنے اہل و عیال

Marfat.com

کے ہمراہ نینی تال منتقل ہو جاتے تھے۔ یہاں ان کا قیام تین چار ماہ تک رہتا تھا۔ اس عرصے میں اکثر شام کے وقت کبھی خود جم کاربٹ کے گھر ملاقات کے لئے جاتے تھے اور کبھی جم کاربٹ ان کے گھر آتا تھا۔ سید شاہد حامد صاحب جو اکثر ان ملاقاتوں کے وقت اپنے والد کے ہمراہ ہوتے تھے کا بیان ہے۔ کہ نینی تال میں 'میں اپنے والد کے ہمراہ ان کے ایک خاص انگریز دوست کے بنگلے پر جایا کرتا تھا۔ یہ عظیم شکاری جم کاربٹ تھا۔ جس سے میرے والد ملنے جایا کرتے تھے۔ یہ وہی شکاری ہے جو بعد میں اپنی عظیم شکاری مہمات کے سبب دنیا بھر میں مشہور ہوا۔ بعد میں وہ ہندوستان چھوڑ کر افریقہ میں جا کر آباد ہو گیا تھا۔ جہاں اس نے اپنا مشہور زمانہ (TREE HOUSE) بنوایا تھا۔ جم کاربٹ بالخصوص آدم خور شیروں اور چیتوں کا شکار کیا کرتا تھا۔ اور بعض ایسے شیر اور چیتے بھی اس نے مارے تھے جو دو دو تین سو آدمیوں کو ہلاک کر چکے تھے۔ حقیقت میں آدم خور شیروں اور چیتوں کے شکار کے لئے بڑے دل گردے کے شکاری کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیونکہ ایسے جانور اپنی خونخواری اور عیاری میں عام جانوروں سے زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔

مشاغل

جیسا کہ ہم ابتدا میں تذکرہ کر آئے ہیں کہ خان بہادر سید حامد حسین کو تعلیم سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ بلکہ ان کو کھیل کود اور سیر و شکار سے دلچسپی تھی۔ وہ اپنے لڑکپن میں سارا سارا دن کرکٹ کھیلتے رہتے تھے۔ اور زمانۂ طالبعلمی میں کرکٹ کے بہت اچھے کھلاڑیوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ علاوہ ازیں برج کے کھیل سے بھی بہت دلچسپی تھی۔ ان کے صاحبزادے سید شاہد حامد صاحب کا بیان ہے کہ برج، کھیلنا انھیں، ان کے والد نے اس وقت سکھایا تھا جب ان کی عمر تیرہ چودہ برس کی تھی۔ ان کا سلوک اپنے بچوں بالخصوص سید شاہد حامد صاحب سے دوستانہ تھا۔ ان کا بیان ہے

Marfat.com

جب ستار نے فوج میں ملازمت کر لی تھی اس کے بعد بھی جب کبھی چھٹی پر گھر آتا تو سب سے پہلے
سیتا کے ساتھ برج کھیلنے میں مصروف ہو جاتے تھے ایک بار تو جب میں گھر آیا تو والد صاحب
نے میرے ساتھ برج کھیلنا شروع کیا۔ اور اگلے دن اپنی والدہ سے ملاقات کر سکا۔ جا س
بات پر کافی ناراض بھی ہوئیں۔

لیکن ان کو سب سے زیادہ شکار سے دلچسپی تھی۔ اور زندگی بھر جب تک قویٰ مضبوط
رہے وہ برابر شکار کھیلنے کو جاتے رہے۔

نگینہ میں قیام کے دوران وہ برابر سرکاری فرائض کی بجا آوری کے بعد شکار کھیلنے کو جاتے
تھے۔ ان کا نشانہ بہت اچھا تھا۔ اور رائفل اور شوٹ گن دونوں سے شکار کر لیتے تھے۔ نگینہ
میں قیام کے دوران ان کا معمول تھا کہ روزانہ صبح سویرے تین چار بجے بیدار ہو کر جھیل پر
چلے جاتے تھے۔ جہاں سپیدۂ سحری کے وقت مرغابیاں اور دوسرے آبی پرندے آتے
تھے۔ اور سید صاحب بہ آسانی انھیں شکار کر لیتے تھے۔

اس زمانے میں ابھی موٹر گاڑی کا رواج نہیں ہوا تھا۔ تمام تر سفر گھوڑوں پر ہوتا تھا۔
سید حامد حسین اعلیٰ درجے کے شہسوار تھے اور دن بھر میں چالیس پچاس میل کا فاصلہ
آسانی طے کر لیتے تھے۔ شکاری تھیلوں کو گھوڑے کی کاٹھی کے ساتھ لٹکا دیتے تھے اور شکار
ان تھیلوں میں بند کر کے گھوڑے پر سوار ہو کر واپس گھر آ جاتے تھے۔

نگینہ اور بجنور میں وہ اپنے دوستوں کے ہمراہ جنگل میں شیر کے شکار کو جایا کرتے تھے
قیام کے دوران وہ جنگل میں کیمپ لگا لیتے تھے۔ اور ہاتھی پر بیٹھ کر یا مچان پر بیٹھ کر
شکار کیا کرتے تھے۔

ان کے گھر کا ہر کمرہ مختلف جانوروں کے سروں، کھالوں وغیرہ سے آراستہ رہتا تھا۔

Marfat.com

ان میں سے بیشتر کا انھوں نے خود شکار کیا تھا۔ اسی طرح بہت سی ٹرافیاں بھی ان کے مکان کے مختلف کمروں میں رکھی ہوئی نظر آتی تھیں۔ یہ ٹرافیاں انھیں شکار کے انعام کے طور پر ملی ہوئی تھیں۔

وہ خود ہی اپنی بارہ بور کی بندوق بھرتے تھے۔ اور چونکہ ان کا تعلق محکمہ انہار سے تھا جس کی وجہ سے معائنے کے لئے انھیں نگینہ ضلع کے اندرونی مقامات تک جانا پڑتا تھا۔ لہذا ایسے دوروں کے موقع پر وہ سرکاری فرائض کی بجاآوری کے بعد مختلف شکار پارٹیاں ترتیب دیتے تھے۔ خان بہادر سید حامد حسین کا ایک ملازم نذیر نامی تھا۔ یہ پستہ قد کا آدمی تھا۔ لیکن اس کا نشانہ بہت اچھا تھا بلکہ اس کے ماہر نشانہ باز ہونے کے معترف خود خان بہادر صاحب بھی تھے۔ شکار کے دوران اس کے پاس بھی ایک بندوق ہوتی تھی۔ نگینہ کے سید عین الدین تحصیلدار بھی اکثر ان کے ہمراہ شکار پارٹی میں شامل ہوتے تھے۔ سید عین الدین صاحب بھی بہت ماہر نشانچی تھے۔

چونکہ بن باسا میں شکار کی بہتات تھی لہذا سید حامد حسین کو یہ علاقہ بہت پسند تھا۔ اس جنگل میں شیروں، ہاتھیوں، چیتوں اور ریچھوں کی بہتات تھی۔ یہ جنگلی جانور اکثر راتوں کو بنگلوں کے دالانوں میں ٹہلتے ہوئے آنکلتے تھے۔ حتیٰ کہ بعض اوقات کھانے پینے کی چیزوں کی تلاش میں بنگلوں کے باورچی خانوں تک میں آجاتے تھے۔ اکثر رات کے وقت کمروں کی کھڑکیوں سے ایسے درندوں کو شکار کرلیا جاتا تھا۔ ان گھنے جنگلوں میں شکار کے لئے کسی قسم کی دوڑ دھوپ نہیں کرنا پڑتی تھی۔ جنگل کے اندر قدم رکھتے ہی شکاری کا سامنا کسی نہ کسی خونناک درندے سے ہو جاتا تھا۔

اس جنگل میں گھاس بہت گھنی اور لمبی تھی۔ اس گھاس کی لمبائی کم از کم دس بارہ

Marfat.com

فٹ ہوتی تھی۔ اور اس میں چلنا آسان بات نہ تھی۔ اس سبب سے گھنی گھاس میں پیدل چل کر شکار کرنا بہت دشوار تھا۔ شکار اکثر ریلوے لائن کے قریب کیا جاتا تھا۔ اس جگہ کو صاف کر دیا گیا تھا جنگلی جانور اس مقام تک ٹہلتے ہوئے آ نکلتے تھے۔

اس علاقے کے سب سے بڑے زمیندار دو بھائی منگل خاں اور بالا خاں تھے۔ یہ دونوں حقیقی بھائی تھے اور اس جنگل کا بیشتر حصہ ان کی ذاتی ملکیت تھا۔ شکار کی غرض سے یہ دونوں بھائی اس علاقے میں رہتے تھے۔ دونوں بہت زبردست شکاری تھے۔ اور تمام بڑے بڑے سرکاری افسروں سے ان کے دوستانہ مراسم تھے۔ صوبجات متحدہ کے گورنروں سے لے کر ڈپٹی کمشنروں تک سے ان کے دوستانہ مراسم تھے۔ اور یہ لوگ اس علاقے میں شکار کی غرض سے آتے رہتے تھے۔

سید حامد حسین کے بھی ان دونوں بھائیوں سے بڑے گہرے مراسم تھے۔ اور وہ اکثر ان بھائیوں کی فرمائش پر ان کے ہمراہ شکار پارٹیوں میں شرکت کرتے تھے۔ سید شاہد حامد نے ایک ایسے ہی دلچسپ شکار کا حال بیان کیا ہے۔ جس میں وہ اپنے والد کے ہمراہ خود بھی شریک تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

"بچپن ہی سے اپنے والد کے ہمراہ میں بھی شکار پارٹیوں میں شریک ہوتا تھا۔ اس موقع پر بہت سے ہاتھی یکجا کر لئے جاتے تھے۔ جس پر شکار میں شریک ہونے والے تمام لوگ بیٹھتے تھے۔ ایک ایسے ہی شکار کا منظر ابھی تک میری نظر دل کے سامنے گھوم رہا ہے۔ اس شکار کے موقع پر ایک غیر ملکی مہمان بھی ہم لوگوں کے درمیان موجود تھا۔ اس کا ایک دس گیارہ برس کا لڑکا بھی اپنی لوائنٹ ۲۲ کی بندوق لئے ہوئے تھا۔ مہم کے دوران ایک شیر کو نشانہ بنایا گیا۔ یہ شیر ایک

Marfat.com

مقام پر جاکر ڈھیر ہوگیا۔ یہ اس جگہ سے کچھ زیادہ دور نہ تھا۔ جہاں ہم ہاتھیوں پر سوار تھے۔ جب وہ شیر گر چکا تو اس غیر ملکی مہمان نے اپنے بیٹے سے کہا کہ وہ بھی شیر پر فائر کرے۔ لڑکے نے شیر کا نشانہ باندھا اور گولی شیر کے سر میں پیوست ہوگئی۔ اس کے بعد پارٹی کے تمام آدمی ہاتھیوں سے اتر کر شیر کو دیکھنے اور اس کی جسامت وغیرہ کا اندازہ لگانے کے لئے نیچے اتر آئے۔ شیر کے نزدیک جاکر معلوم ہوا کہ اس چھوٹے بچے کی پوائنٹ ۲۲ کی گولی کے علاوہ جو شیر کے دماغ میں پیوست ہوگئی تھی۔ اس کے جسم پر اور کوئی نشان نہ تھا۔ واقعہ یہ تھا کہ شیر بہت سارے ہاتھیوں کو دیکھ کر چوکنا ہوگیا تھا۔ اور گھبرا کر بھاگتے ہوئے لکڑی کے ایک بہت بڑے لٹھے سے جا ٹکرایا۔ جو وہاں زمین میں پڑا ہوا تھا۔ سر ٹکرا جانے کے سبب زخمی ہونے کے باوجود وہ زندہ حالت میں وہاں موجود تھا۔ ہم لوگ یہ سمجھے تھے کہ شیر ہلاک ہو چکا ہے۔ اس لڑکے کے گولی چلانے تک شیر زندہ تھا۔ اور جس وقت ہم لوگ اس کی جسامت کا اندازہ لگانے کے لئے اس کے قریب جاتے تو وہ حملہ آور ہو جاتا۔ ایسی صورت میں ہم میں سے نہ جانے کتنے اس کا شکار بن جاتے۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ اس لڑکے کی بندوق سے نکلنے والی گولی شیر کو موت سے ہمکنار کر چکی تھی۔ اصل صورت حال سے واقف ہو جانے کے بعد سب کی رگوں میں خوف کی لہر سی دوڑ گئی تھی۔"

سید شاہد حامد صاحب بن باسا کے دوران قیام کا ایک اور دلچسپ واقعہ بیان کرتے ہیں۔

Marfat.com

"ایک بار رات کے وقت گھر کے لوگ کھانا کھا کر فارغ ہوئے ہی تھے کہ ایک شخص میرے والد سید حامد حسین صاحب کے پاس آیا۔ اس نے بتایا کہ ریلوے لائن پر ایک ریچھ بیٹھا ہوا ہے۔ میرے والد نے رائفل اٹھائی اور ٹارچ ہمراہ لے کر باہر نکلے اور تھوڑے فاصلے پر جاکر نشانہ باندھ کر فائر کردیا یکے بعد دیگرے انھوں نے دو گولیاں چلائیں لیکن ریچھ نے کوئی جنبش نہ کی۔ صاف ظاہر تھا کہ ریچھ ڈھیر ہوگیا تھا۔ جب میرے والد شکار کے قریب پہنچے تو معلوم ہوا کہ کوئی شخص سیاہ کمبل اوڑھے سو رہا تھا۔ یہ دیکھ کر کہ نشانہ بننے والا جانور نہیں بلکہ انسان ہے میرے والد صاحب گھبرا گئے۔ گولیوں کی آواز سن کر بھی وہ شخص نہ جاگا۔ خوش قسمتی سے گولیاں اس کے کمبل کو صرف چھوتے ہوئے گزر گئی تھیں۔ جب اس آدمی کو جگا کر دریافت کیا گیا کہ وہ کیوں اس غیر محفوظ جگہ پر سو رہا ہے تو اس نے بتایا کہ اس کے پاس سونے کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے میرے والد نے اسی وقت اس شخص کے سونے کا انتظام کیا۔"

خان بہادر سید حامد حسین اپنی رحمدلی کے سبب بھی بہت مشہور تھے۔ جب بن باسا میں ڈیم کی تعمیر کا کام بند کردیا جاتا تھا تو خان بہادر صاحب اور ان کا پورا عملہ نینی تال منتقل ہو جاتا تھا۔ اس زمانے میں خان بہادر صاحب کی دلچسپیوں اور مشاغل میں تبدیلی آجاتی تھی۔ اب ان کا زیادہ وقت ٹینس پارٹیوں، ٹی پارٹیوں، ڈنر پارٹیوں، کلب اور برج وغیرہ میں بسر ہوتا تھا۔ اس زمانے میں ہندوستان کے صاحب ثروت افراد نینی تال کے ہل اسٹیشن پر جمع ہو گئے تھے۔ نواب چھتاری سے خاص دوستی تھی۔ اور ان سے نینی تال میں اکثر ملاقات ہوتی تھی۔

جب بن باسا میں ڈیم کی تعمیر مکمل ہو جانے کے بعد ان کا تبادلہ پہلے لکھنؤ اور

Marfat.com

بعدازاں مرزاپور میں ہوا تو ان کی سیر و شکار کی زندگی دوبارہ عروج پر آگئی۔ مرزاپور بھی اپنے گھنے جنگلوں اور ان میں پائی جانے والی جنگلی مخلوقات کے لئے مشہور تھا۔ یہاں وہ مرزاپور ضلع کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی ہرنوں اور آبی ذخیروں کے معائنے پر جاتے تھے ڈاک بنگلوں میں قیام کیا جاتا تھا۔ اور فرصت کے اوقات میں شکار پارٹیاں ترتیب دی جاتی تھیں۔ ان شکار پارٹیوں میں ان کے بڑے صاحبزادے سید شاہد حامد صاحب بھی برابر کے شریک ہوتے تھے اور مرزاپور ہی میں انھوں نے پہلے شیر کا شکار کیا تھا۔ مرزاپور کے قیام کے زمانے میں ہی ان کے چہیتے بیٹے کو فوج میں کمیشن مل گیا۔ اور وہ برطانوی رجمنٹ کے ساتھ منسلک ہو گئے۔ خان بہادر سید حامد حسین اولاد سے محبت کے معاملے میں بہت زیادہ جذباتی واقع ہوئے تھے۔ اور خاص طور پر سید شاہد حامد صاحب سے تو وہ بہت زیادہ پیار کرتے تھے۔ اور باپ بیٹے ایک جان دو قالب تھے۔ بیٹے کے فوج میں چلے جانے کے بعد گھنے جنگلوں میں شکار کھیلتے ہوئے انھیں اپنے لائق اور ہونہار بیٹے کی یاد بہت زیادہ آتی تھی۔ ایسے مواقع پر جو خطوط انھوں نے اپنے بیٹے کو لکھے تھے۔ اس سے ان کے جذباتی ہونے کا پتہ چلتا ہے۔

آخر والد کی فرمائش پر ہی سید شاہد حامد صاحب نے اس برطانوی رجمنٹ میں اپنی پوسٹنگ کی درخواست دی، جو اس زمانے میں الہ آباد میں مقیم تھی۔ ان کی درخواست منظور کر لی گئی۔ اس کے بعد گزشتہ دن پھر لوٹ آئے اور سید شاہد حامد صاحب ہر چھٹی کے روز شکار کے لئے اپنے والد کے پاس مرزاپور یا اس زمانے میں ضلع کے جس مقام پر بھی ہوتے تھے۔ جاتے تھے۔ اور اپنے والد کے ہمراہ شکار کھیلتے تھے۔

کرسمس کی تعطیلات میں خان بہادر سید حامد حسین اپنے دوستوں کو ہمراہ لے کر

Marfat.com

دس روز کے لئے شکار کے لئے چلے جاتے تھے۔ایک ایسے ہی شکار کے موقع پر جب ان کا محبوب بیٹا ان کے پاس نہیں تھا۔ افضل نے لکھا تھا۔

"ہم سب الاؤ کے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں اس منظر سے لطف اندوز ہو رہا ہوں۔لیکن کسی چیز کی کمی شدت سے محسوس ہو رہی ہے اور وہ تمھاری ذات ہے۔میں اپنے چاروں طرف امید بھری نگاہ ڈالتا ہوں کہ شاید میرا چہیتا اور سب سے عزیز بیٹا آرہا ہو۔ ہر گزرتے ہوئے لمحے میں تمھاری کمی کو شدت سے محسوس کر رہا ہوں۔گزشتہ سال کا وہ منظر ابھی تک میری نظروں کے سامنے گھوم رہا ہے کہ جب تم جودھپور کے جنگل میں ہاتھ میں رائفل لئے ہوئے سیاہ بھینسے کا تعاقب کر رہے تھے۔اس وقت تم نے بغیر جرابوں کے شکاری بوٹ پہن رکھے تھے اور کئی دنوں کا شیو بڑھا ہوا تھا۔میں پھر ایک بار تمھیں یونہی شکار کرتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہوں۔"

یادِ ایام مرزاپور میں خان بہادر سید حامد حسین کے قیام کے زمانہ میں صوبجات متحدہ کی حکومت نے یہ حکم دیا کہ خان بہادر صاحب یوپی کی لیجسلیٹو اسمبلی کے اراکین اور بعض دوسرے معززین کو سارودہ کینال ہیڈ ورکس دکھانے لے جائیں۔ان افراد میں سے بہت سے تو ان کے ذاتی دوست ہی تھے۔ مثلاً راجہ صاحب محمود آباد، نواب چھتاری، سر محمد یوسف، سر سیتارام، مبشر حسین وغیرہ۔لکھنؤ میں ان لوگوں نے لنچ کیا۔اور شام میں پانچ بجے اس عظیم الشان آبی منصوبے پر پہنچے۔ اس زمانے میں اس بند سے نکلنے والی پانچویں نہریں کھول دی گئی تھی۔ گو سید حامد حسین نے اس پورے منصوبے کی تعمیر اپنے سامنے کرائی تھی۔

Marfat.com

لیکن ان ہیڈورکس سے پانی گزرتے ہوئے خود انھوں نے بھی پہلی بار اس موقع پر ہی دیکھا تھا۔ یہ آبشار ۶۸ فٹ کی بلندی سے گر رہی تھی۔ رات کے وقت انتہائی تیز روشنیوں میں اس ہیڈورکس کا معائنہ کیا گیا۔ اس وقت برقی روشنیوں کے عکس پانی میں بہت دلکش منظر پیدا کر رہے تھے۔

اس وقت خان بہادر سید حامد حسین کی دلی کیفیت عجیب ہو رہی تھی۔ یہ حقیقت انھیں طمانیت بخش رہی تھی کہ ان کی برسوں کی محنت شاقہ نے ایک عظیم الشان حقیقت کا روپ دھار لیا ہے۔ جو بنی نوع انسان کی بہتری کے لئے ہے۔ اس وقت کی کیفیت کے بارے میں انھوں نے اپنی ذاتی ڈائری میں یہ رقم کیا تھا کہ:۔

"جب سب مہمان ہیڈورکس کو دیکھ رہے تھے تو میں ایک جگہ بیٹھ گیا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں میں نے اپنی زندگی کے طویل شب و روز بسر کئے تھے۔ اس خیال کو عملی روپ دینے کے لئے، یہ سوچ کر میری آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ کہ یہاں میں نے اپنی زندگی کے آٹھ برس گزارے تھے۔ اور یہاں میں وقت سے پہلے بوڑھا ہو گیا تھا۔ اگر میں بن باسا نہ جاتا تو آج نسبتاً جوان ہوتا۔ لیکن اس تاسف کے ساتھ ساتھ ایک فخر کا احساس بھی مجھے ہو رہا تھا۔"

اس پوری بستی کے بارے میں آگے چل کر وہ لکھتے ہیں کہ میرے زمانے کے بنوائے ہوئے بہت سے مکانات گرا دیئے گئے ہیں اور ان کی جگہ نئی تعمیرات بھی کی گئی ہیں۔ تاہم اس مکان کے آگے جہاں میں کبھی رہتا تھا۔ آج بھی گل مہر کے پودے اسی خوبصورتی اور دلکشی کے ساتھ لہلا رہے ہیں جنھیں میں نے وہاں لگایا تھا۔ میں نے گئے دنوں کی یاد اور جوش مسرت میں گل مہر کے ان پودوں کو چوما۔ یہاں ابھی ایسے بہت سے لوگ ہیڈ

Marfat.com

ورکس پر کام کر رہے ہیں جو میرے زمانے میں میری ماتحتی میں کام کر چکے تھے۔ ان سب سے مل کر گزرے زمانے کی یاد تازہ ہو گئی۔"

خان بہادر سید حامد حسین اپنے ماتحت کام کرنے والوں کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ اور اپنے حسن سلوک سے ان کا دل موہ لیتے تھے۔ ساردہ ہیڈ ورکس کے زمانے میں ان کی ماتحتی میں کام کرنے والا ایک ریٹائرڈ صوبیدار تھا۔ اس کی اچھی عادتوں کی بنا پر سید صاحب اس کو پسند کرتے تھے۔ بعد میں اِن دونوں کے درمیان دوستانہ مراسم قائم ہو گئے تھے۔ یہ صوبیدار پنجاب کے شہر گوجر خاں کا رہنے والا تھا۔ اس کا بیٹا بھی پاکستان کی بری فوج میں ملازم تھا۔ جب اسے کسی طرح معلوم ہوا کہ میجر جنرل (ریٹائرڈ) سید شاہد حامد صاحب خان بہادر سید حامد حسین کے فرزند ہیں، جن کے ساتھ اس کے والد کام کر چکے ہیں۔ اور جن سے اس نے خان بہادر صاحب کے بارے میں بہت سے واقعات اور باتیں سن رکھی تھیں تو وہ سید شاہد حامد صاحب سے ملا۔ اور انھیں اپنے گاؤں آنے کی دعوت دی۔ سید شاہد حامد صاحب کا بیان ہے کہ: "میں اس کے ہمراہ ان کے آبائی گاؤں گیا۔ جہاں اسّی نوے برس کی عمر کے کئی بوڑھوں نے میرے والد کا تذکرہ نہایت اچھے لفظوں میں کیا۔ انھوں نے ہماری بہت خاطر مدارات کیں۔ اور جب تک میں ان کے ہمراہ بیٹھا رہا وہ میرے والد کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔"

اولاد سے محبت

خان بہادر سید حامد حسین اولاد سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ پہلی بیوی کی یادگار ایک لڑکا تھا، دوسری بیوی سے سب سے بڑے لڑکے سید شاہد حامد صاحب ہیں۔ سید صاحب کا سلوک اپنے بچوں سے دوستانہ ہوتا تھا۔

Marfat.com

بچوں سے لاڈ پیار کرنے کے باوجود ان کی تعلیم کی طرف سے غفلت یا کوتاہی کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اس خاندان میں ہمیشہ سے یہ تصور چلا آ رہا تھا کہ پہلے اپنے آپ میں صلاحیت پیدا کرو اس کے بعد تائید ایزدی کے متوقع رہو۔ سید شاہد حامد صاحب کا بیان ہے کہ ہمارے بچپن میں ہمارے دادا جان سید جعفر حسین صاحب بھی تعلیم کے معاملے میں ہر وقت ہمیں سمجھاتے رہتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ خوب دل لگا کر تعلیم حاصل کرو ورنہ گھسیارے بن کر رہ جاؤ گے۔

خان بہادر سید حامد حسین نے بچوں کی تعلیم کے لئے گھر پر بھی استاد مقرر کر رکھے تھے اپنی سرکاری مصروفیات اور مشاغل کے باوجود برابر بچوں کے اساتذہ سے، ان کی تعلیمی حالت کے بارے میں کرید کرید کر پوچھتے رہتے تھے۔

سید شاہد حامد صاحب کا بیان ہے کہ میں بہت لاڈلا تھا۔ لیکن ایک بار جب میں سات آٹھ برس کا تھا۔ میرے استاد نے جو ریاضی پڑھانے آتے تھے۔ تعلیم میں میری عدم دلچسپی کی شکایت والد سے کر دی۔ میرے والد صاحب کو بہت غصہ آیا اور انھوں نے میرے پاؤں رسی سے باندھ کر مجھے درخت سے لٹکا دیا۔ میں دو تین منٹ تک اسی طرح لٹکا رہا اور اگر میرے رونے کی آواز سن کر والدہ نہ آجاتیں تو شاید ابھی اور سزا ملتی۔

بچوں اور بچیوں کو کانونٹ اسکولوں میں جدید انگریزی تعلیم دلائی گئی تھی۔ لیکن ان کی مذہبی تعلیم کا بھی خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ چنانچہ اسلامیات اور اردو وغیرہ پڑھانے کے لئے الگ اساتذہ مقرر تھے۔ اپنے بچوں، بالخصوص سید شاہد حامد صاحب کو انھوں نے اپنے دوستوں کی طرح پالا تھا۔ تمام مسائل میں ان سے مشورہ کرتے تھے۔ اور ہر موضوع پر بے تکلفانہ گفتگو باپ بیٹے میں ہو سکتی تھی۔ ان کا اصول یہ تھا کہ والد کو بچوں کا معاون بننا چاہیئے اور ان پر

Marfat.com

اپنی رائے زبردستی نہیں ٹھونسنا چاہیئے۔ چنانچہ جب سید شاہد حامد صاحب نے اپنی پسندیدہ شریک حیات کو خود منتخب کر لیا تو انھوں نے اپنی اس خواہش کا اظہار اپنے والد سے کیا۔ اس وقت جو محبت بھرا خط انھوں نے جواب میں لکھا ہے۔ اس سے اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ بچوں کے معاملات میں وہ کس درجہ فراخ دل تھے اور ان کی رائے کا احترام کرتے تھے۔

"شاہد بیٹے! میں نے طاہرہ کو نہیں دیکھا اور ڈاکٹر بٹ سے بھی بہت کم واقف ہوں۔ تم نے طاہرہ کو دیکھا ہے اور اسے پسند کرتے ہو۔ میرے لئے یہی کافی ہے۔ میرے بیٹے تم اپنے والد کی عادت سے واقف ہو۔ اس نے کبھی اس چیز کو ناپسند نہیں کیا جس کو تم نے پسند کیا ہو۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ تمھارا باپ ایک ایسے اہم معاملے میں تمھاری پسند کی مخالفت کرے گا!

نہیں بالکل نہیں۔ میری مسرتوں اور خواہشوں کا محور تمھاری ذات ہے۔ میں اپنی جان تک تم پر قربان کرنے کو تیار ہوں۔ تم میری زندگی اور میری عمر بھر کی کمائی ہو۔ اور تمھاری ذات میں مجھے بے پناہ خوشیاں ملتی ہیں۔ میری زندگی کا کل سرمایہ تمھاری ذات ہے۔

شاہد بیٹے! میں نے تمھیں اولاد کی طرح نہیں اپنے دوست کی طرح پرورش کیا ہے۔ تمھاری خوشی میری خوشی ہے۔ کاش میں تمھیں اپنا دل چیر کر دکھا سکتا جس میں تمھاری بے پناہ محبت موجزن ہے۔ میں طاہرہ سے بھی اسی طرح محبت کروں گا جس طرح تم سے کرتا ہوں۔"

زندگی بھر وہ اپنی بہو طاہرہ سے اپنی بیٹی کی طرح محبت کرتے رہے۔

Marfat.com

عادات و خصائل خاں بہادر سید حامد حسین اوصاف حمیدہ کے مالک تھے۔ وہ نہایت ملنسار، منکسر المزاج، اور خندہ پیشانی سے لوگوں سے ملتے تھے۔ ان کے تعلقات اپنے سے کم مرتبہ لوگوں کے ساتھ بھی تھے۔ لیکن ان لوگوں سے وہ اس طرح ملتے تھے کہ انھیں کسی قسم کا احساس نہ ہونے پائے۔ اس طرح بڑے درجے کے لوگوں سے، برابری کے ساتھ ملتے تھے۔

شدید محنت کرنے کی عادت انھیں اپنے والد سے ورثے میں ملی تھی جب کسی کام کی ذمے داری قبول کر لیتے تھے تو پھر جب تک اسے بحسن و خوبی سر انجام نہ دے لیتے، چین سے نہ بیٹھتے تھے۔ چنانچہ بڑھاپے میں بھی ریٹائرمنٹ کے بعد جب نواب بھوپال کے اصرار پر بطول ناخواستہ ریاست بھوپال میں عہدہ قبول کیا تو جوانوں کے سے انداز میں محنت کرتے رہے۔ اور اسی شدید محنت نے ان کی صحت پر خراب اثر ڈالا۔

جو شخص بھی ایک دفعہ ان سے مل لیتا تھا ان کے حسنِ اخلاق کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔ غرور و تکبر ان میں نام کو نہ تھا۔ وہ مشرقی شرافت اور وضعداری کے کامل نمونہ تھے۔

دسترخوان پر تنہا کھانا انھیں پسند نہ تھا۔ وہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں میں لوگوں کو شریک کرنا پسند کرتے تھے۔ جب ان کے گھر میں کوئی رشتہ دار یا احباب میں سے کوئی شخص یا کافی تعداد میں لوگ آجاتے تھے تو بہت خوش ہوتے تھے۔ مہمانوں کی خاطر مدارات میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے تھے۔ اور یہ چاہتے تھے کہ مہمان زیادہ سے زیادہ دن ٹھہرے رہیں۔

اکثر دعوتوں پر اپنے دوست احباب کو بلاتے رہتے تھے۔ بھول جانے کی عادت بہت تھی۔ انھیں یہ یاد نہ رہتا تھا کہ کتنے لوگوں کو مدعو کیا ہے۔ ان کی بیگم، ان کی اس عادت سے

Marfat.com

واقف تھیں لہذا اگر وہ دعوت میں مدعو کئے جانے والے احباب کی تعداد دس بتاتے تو ان کی اہلیہ کم ازکم بیس آدمیوں کا کھانا تیار کرتی تھیں۔ کئی دفعہ ایسا ہوتا کہ دوست احباب کو دعوت پر مدعو کر لیتے لیکن گھر میں بتانا بھول جاتے۔ عین وقت پر ان کی اہلیہ کو بڑی پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا۔

خان بہادر سید حامد حسین کا جمالیاتی ذوق اعلےٰ درجے کا تھا۔ انھیں تمام حسین اور خوبصورت چیزوں سے محبت تھی۔ اور اپنے ارد گرد کوئی بھونڈی اور خراب شے دیکھنا پسند کرتے تھے۔

پھولوں کو بہت پسند کرتے تھے اور (HARTICULTURE) پر ان کی رائے مستند سمجھی جاتی تھی۔ اعلےٰ درجے کے خوش پوشاک آدمی تھے نگینوں اور پتھروں سے بھی خاص دلچسپی تھی۔ اپنی بیگم کے لئے انھوں نے زیورات خود منتخب کئے تھے۔ اسی طرح اپنے بچوں کی شادیوں کے موقع پر بھی خاص اپنی پسند کے زیورات بنوائے تھے۔

خان بہادر صاحب کا مطالعہ بہت وسیع اور متنوع تھا۔ اپنے پیشے سے متعلق کتابوں کے علاوہ تاریخ، مذہب، ادب، اور سیاست کے موضوعات پر مختلف کتابیں ہمیشہ ان کے زیر مطالعہ رہتی تھیں۔ صرف اعلےٰ درجے کی اور بڑے مصنفوں کی کتابیں پڑھنا پسند کرتے تھے۔

یہ بات تو ناممکن ہے کہ کسی شخص نے لکھنؤ میں آنکھ کھولی اور پرورش پائی ہو اور وہ شعر و شاعری سے بیگانہ ہو۔ خان بہادر سید حامد حسین کو بھی شاعری کے مطالعے کا بہت شوق تھا۔ لیکن اس سلسلے میں ان کا انتخاب محدود تھا۔ وہ مرزا غالب کے علاوہ اور کسی شاعر کو نہیں پڑھتے تھے۔ غالب کے سینکڑوں شعر ازبر تھے۔ سرکاری عہدوں کے وقت اور بیرونشکار

Marfat.com

کے وقت گھنے جنگلوں میں بھی دیوان غالب کا ایک خوبصورت نسخہ ہمیشہ ان کے پاس رہتا تھا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ اگر آپ غالب کو پڑھ لیں تو پھر آپ کو کسی دوسرے شاعر کو پڑھنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔۔

وہ نہایت ذہین اور دانا آدمی تھے اور ہر معاملے کی تہہ کو بہت جلد پہنچ جاتے تھے۔ ان کے بیٹے کا بیان ہے کہ میں نے زندگی بھر ان سے کسی کے بارے میں کبھی کوئی ناروا کلمات نہیں سنے۔ ایک بار مجھے یاد ہے کہ ہم لوگ کسی شخص کی برائی کر رہے تھے۔ وہ خاموشی سے سنتے رہے جب بات ختم ہو چکی تو انھوں نے فرمایا تھا کہ تم نے اس شخص کے عیوب تو گنوا دیئے ہیں اب اس کے محاسن بھی تو بیان کرو!

اپنے مخالفوں کے بارے میں کبھی انھوں نے ایک لفظ تک نہ کہا۔ جب غصہ آجاتا تھا تو وہ خاموش ہو جاتے تھے۔ ان کی اسی خوبی کی بنا پر سب لوگ ان سے محبت کرتے تھے ہمارے خیال میں ان کا کوئی دشمن تھا ہی نہیں۔ وہ کہا کرتے تھے کہ ایک محبت بھرا لفظ لوگوں کے دل جیتنے کو کافی ہوتا ہے۔

سید شاہد حامد صاحب کا بیان ہے کہ ان کے والد کو دوستی نبھانے کا فن خوب آتا تھا۔ اور اپنے دوستوں کے لئے وہ اپنا سکھ چین تک تج دینے کو تیار رہتے تھے۔ کہتے تھے کہ جب کسی کو دوست بناؤ تو زندگی بھر اس کے ساتھ بنا ہو۔ جس زمانے میں خان بہادر صاحب کا قیام بھوپال میں تھا تو وہاں کا ایک ٹھیکیدار ان کا انتہائی گہرا دوست تھا۔ اس کا روپیہ پیسہ سب خان بہادر صاحب کے پاس امانت رہتا تھا۔ اکثر خان بہادر صاحب اس سے کہتے کہ وہ اس ذمے داری کو قبول کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ کبھی گھر میں چوری وغیرہ ہو سکتی ہے۔ لیکن وہ نہیں مانتا تھا۔ وہ خان بہادر صاحب کو اپنے بھائیوں سے زیادہ عزیز

Marfat.com

رکھتا تھا۔ جب وہ مرض الموت میں مبتلا ہوا تو اس نے اپنے عزیز و اقارب سے کہا کہ مجھے خان بہادر سید حامد حسین کے گھر پر لے چلو۔ میں چاہتا ہوں کہ میری آخری سانسیں اپنے دوست کے سامنے نکلیں۔ اس کے اعزّہ نے اس کی خواہش کی تکمیل کی۔ اس وقت خان بہادر صاحب کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ ان کے دوست کے لئے فوراً ایک کمرہ مخصوص کر دیا گیا۔ جب خان بہادر صاحب واپس آئے تو وہ اپنے مریض دوست کے کمرے میں آ گئے اس کے بعد چھ دن تک ان کا دوست موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا رہا۔ اس عرصے میں خان بہادر صاحب ایک لمحے کے لئے بھی کمرے سے باہر نہیں گئے۔ اور ان کے دوست نے ان کے بازوؤں میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ فی زمانہ ایسی مثالیں نایاب ہیں۔

ایک دلچسپ واقعہ

خان بہادر سید حامد حسین کے ساتھ اگر کوئی شخص تعلّی سے کام لیتا تھا۔ تو وہ مسکرا کر خاموش ہو جاتے تھے یا پھر آہستگی سے کوئی ایسی بات کہہ دیتے جس میں دل آزاری بھی نہ ہوتی لیکن اس شخص کو احساس ہو جاتا کہ خان بہادر صاحب اصل حقیقت خوب سمجھتے ہیں۔ ایک ایسا ہی دلچسپ واقعہ ان کے ساتھ ایک سفر میں پیش آیا۔ خان بہادر صاحب کانپور سے بذریعہ ٹرین لکھنؤ جا رہے تھے۔ ان کے ساتھ کمپارٹمنٹ میں ایک اور شخص بھی سوار تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے لئے اجنبی تھے۔ بات چیت شروع ہوئی تو اس شخص نے خان بہادر صاحب کو بتانا شروع کیا کہ وہ اسٹاف کالج کوئٹہ میں انسٹرکٹر ہے۔ یہ اعزاز بہت کم لوگوں کو ملتا ہے۔ اور وہ ہی واحد ایسا شخص ہے جو اس مرتبے پر فائز ہے وغیرہ وغیرہ، خان بہادر صاحب تمام سفر کے دوران اس شخص کی لن ترانیاں سنتے رہے جب سفر اختتام کو پہنچا تو انھوں نے اس شخص سے کہا کہ میرا بھی ایک بیٹا اسٹاف کالج میں انسٹرکٹر ہے۔ اور انھوں

Marfat.com

نے اپنے بیٹے سید شاہد حامد کا نام اسے بتایا۔ یہ سن کر اس شخص پر گھڑوں پانی پڑ گیا اور وہ خان بہادر صاحب سے نگاہیں نہ ملا سکا۔ یہ شخص منشی چودھری تھا جو اس وقت لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے پر فائز تھا۔ اور بعد میں بھارت کی افواج کا کمانڈر انچیف بنا۔ جن لوگوں نے ہندوستان کی مسلح افواج کے لیفٹیننٹ جنرل کول کی سوانح حیات ان کہی کہانی (UNTOLD STORY) پڑھی ہے۔ وہ اس بات سے واقف ہوں گے کہ جنرل چودھری کو اپنے بارے میں مبالغہ آمیز باتیں کرنے کی بہت عادت تھی۔

علالت ساری زندگی خان بہادر سید حامد حسین کی صحت قابلِ رشک رہی تھی لیکن بڑھاپے میں ریاست بھوپال کے پانچ برس کے قیام کے دوران شدید محنت نے ان کے اعصاب پر بڑا بُرا اثر ڈالا تھا۔ یہیں سے ان کی بیماری شروع ہوئی۔ ریاست بھوپال میں ہی ان کی علالت کی خبر سن کر قائداعظم محمد علی جناح ان کی عیادت کے لئے خان بہادر صاحب کی کوٹھی پر تشریف لے گئے تھے اور کچھ دیر ان کے ساتھ رہے تھے۔ جب صحت زیادہ خراب ہو گئی تو خان بہادر صاحب اپنے وطن لکھنؤ واپس آگئے۔

لکھنؤ آکر انھیں دل کی شکایت ہو گئی تھی۔ اور آخر اسی بیماری میں ان کا انتقال ہوا لکھنؤ میں ان کی عیادت کے لئے بڑے بڑے لوگ آئے تھے جن سے ان کی ذاتی دوستی تھی۔

ڈاکٹروں نے نہایت توجہ سے ان کا علاج کیا۔ یہ ڈاکٹر جن کا شمار اس زمانے کے مشہور ڈاکٹروں میں ہوتا تھا، ان کے دوست ہی تھے۔ ڈاکٹر ہکو، ڈاکٹر کرنل برکی، میجر نگم ڈاکٹر ریاض، ڈاکٹر حمید اور ان کے انتہائی قریبی دوست ڈاکٹر مکم نے ان کا علاج کیا۔ لیکن کوئی افاقہ نہ ہوا۔ آخر اسی بیماری کے ہاتھوں انھوں نے ۱۹۴۵ء داعی اجل کو لبیک کہا۔

اپنے زمانہ علالت میں وہ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ میں اپنے خدا کا شکر ادا نہیں کر سکتا

Marfat.com

جس نے مجھے بے شمار نعمتوں سے نوازا۔ اور مجھے اتنی محبت کرنے والی اولاد عطا کی۔ وہ ایک شاد کام و بامراد زندگی گزار کر ایسے عالم میں دنیا سے سدھارے کہ ان کے تمام بیٹے بیٹیاں دنیاوی اعتبار سے مرفہ الحال تھے۔

مدفن

خان بہادر سید حامد حسین نے اپنی زندگی میں ہی یہ طے کیا تھا کہ وہ اپنے والد کے پہلو میں دفن ہوں گے۔ چنانچہ اپنے آبائی قبرستان میں والد کے پہلو میں آسودۂ خاک ہوئے۔ یہاں دونوں کی قبروں پر نصب لوح مزار پر ان کے نام اور مختصر الفاظ میں ان کی وہ خدمات تحریر ہیں جو انھوں نے زندگی میں سرانجام دی تھیں۔ ان قبروں کے اردگرد لہلاتے ہوئے پھول اور سبزہ اس بات کی گواہی دیتے رہیں گے کہ ان کے کارنامے زندہ ہیں۔

تعزیتی پیغامات

خان بہادر سید حامد حسین کے انتقال پر جن ممتاز شخصیات نے تعزیتی خطوط لکھے تھے، ان میں محترمہ فاطمہ جناح، نواب زادہ لیاقت علی خان، خواجہ ناظم الدین، نواب سر محمد اسماعیل خان، ڈاکٹر سر ضیاء الدین، پروفیسر محمد حبیب، کرنل حیدر خاں۔ سر محمد یوسف، میجر سعید محمد خاں، محسن علی کانپور کے ایس ایم بشیر، ایم اے اصفہانی، سر مہاراج سنگھ، میاں عبدالعزیز، سر پی پرشاد، رفیع احمد قدوائی، سر حسام الدین، مہاراجہ جہانگیر آباد، کرنل سلامت، سردار بہادر موہن سنگھ، نواب بہاول پور، نواب و بیگم بھوپال، سر ایڈورڈ اور ریاست بھوپال کے دیوان کے نام قابل ذکر ہیں۔

علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن نے ان کے انتقال پر ایک جلسہ کیا اور قرارداد تعزیت منظور کی۔

Marfat.com

محترمہ فاطمہ جناح نے اپنے تعزیتی پیغام میں جو ۲۷ مئی ۱۹۴۷ء کو لکھا گیا کہا :-

DEAR PIARIE

I WAS EXTEREMELY SORRY TO LEARN THE NEWS OF YOUR FATHER'S DEATH. IT WAS ONLY YESTER DAY THAT I READ THE NEWS IN THE DAWN.

MR. JINNAH JOINS ME IN SENDING YOU OUR DEEPEST SYMPATHY IN YOUR SAD BEREVEMENT.

YOURS SINCERELY

SD/-

FATIMA JINNAH.

Marfat.com

نواب زادہ لیاقت علی خان نے اپنے خط میں ان جذبات کا اظہار کیا :-

GULL-I-RAANA

HARDING AVENUE

NEW DELHI

5.6.45.

MY DEAR SHAHID,

I WAS TERRIBLY SHOCKED TO LEARN THE TRAGIC NEWS OF THE SUDDEN DEATH OF YOUR FATHER ON MY RETURN FROM A TOUR OF ASSAM AND BENGAL.

MY WIFE AND I SEND YOU ALL OUR DEEPEST SYMPNTHY AND CONDO-LENCES. MAY THE DEPARTED SOUL REST IN PEACE AND MAY GOD GIVE YOU ALL ENOUGH COURAGE TO BEAR THIS TERRIBLE LOSS!

YOURS SINCERELY

SD/-

(LIAQUET ALI KHAN)

Marfat.com

نواب سر محمد اسماعیل خان نے اپنے تعزیتی خط میں لکھا :

مصطفےٰ کاسل میرٹھ

۲۴ ر مئی ۵۴ء

مکرمی تسلیم

کل کے " DAWN " میں یہ خبر انتہائی رنج و قلق سے پڑھی کہ خان بہادر صاحب نے اس دار فانی سے کوچ کیا۔ اس حادثہ نے جو کچھ آپ پر اثر کیا ہو وہ بالکل بجا ہے۔ ان کے ہر دوست اور ملنے والے کے لیے بھی یہ خبر باعث اذیت ہے۔ مرحوم بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ میری دلی دعا ہے کہ خدا ان کو جنت الفردوس میں بلند مرتبہ عطا فرمائے اور آپ کے اور مرحوم کے سب بچوں کے دلوں کو صبر و سکون۔

مشیت ایزدی کے آگے انسان مجبور و لاچار ہے۔ میں اور میرے خاندان کے سب لوگ دل سے آپ کے غم میں شریک ہیں۔

اخیر میں پھر خدا سے دعا ہے کہ وہ آپ سب کے دلوں کو صبر عطا فرمائے آمین !

فقط والسلام

دستخط /-

محمد اسماعیل خاں

Marfat.com

ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد نے اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا :

VICE CHANCELLOR

MUSLIM UNIVERSITY ALIGARH

DATED. 5.6.45.

MY DEAR COLONEL SHAHID HAMID,

I RECEIVED WITH GREAT SORROW THE SAD NEWS OF THE DEMISE OF YOUR REVERED FATHER. IT IS A GREAT LOSS TO THE FAMILY. MAY GOD GIVE YOU THE STRENGTH TO BEAR THIS LOSS AND MAY HE GRANT HIS SOUL PEACE IN HEAVEN.

YOURS SINCERELY

SD/-

ZIA UD DIN AHMAD

LT. COLONEL

S. SHAHID HAMID

FEROZ KOTHI

LUCKNOW.

Marfat.com

سیّد رفیق حسین

اُردو کا ایک منفرد افسانہ نگار

سید رفیق حسین اردو کے ایک منفرد افسانہ نگار ہیں۔ ان کی شہرت محدود ہے لیکن ایک بار جو بھی ان کی تحریروں سے متعارف ہو جائے وہ ان کا مدّاح بن جاتا ہے۔

حالاتِ زندگی سید رفیق حسین خان بہادر سید جعفر حسین کے چھوٹے بیٹے تھے۔ باپ سے محبت کی وجہ سے اپنے نام کے ساتھ جعفری بھی لکھتے تھے۔ سید جعفر حسین، جن کا تذکرہ گزشتہ صفحات میں تفصیل سے آ چکا ہے یوپی کے محکمہ انہار میں انجینئر تھے۔ ان کے بڑے بیٹے خان بہادر سید حامد حسین بھی محکمہ انہار کے ایگزیکیٹو انجینئر تھے۔ سید رفیق حسین بھی پیشہ کے اعتبار سے انجینئر ہی تھے۔ انجینئرنگ کی بنیادی تعلیم انہوں نے اپنے والد محترم سے پائی تھی

سید رفیق حسین کی زندگی تضادات کا مجموعہ تھی۔ ان کے والد نے ان کی والدہ کے انتقال کے بعد دوسری شادی کر لی تھی۔ ہمارے معاشرے میں سوتیلی مائیں ایسے بچوں سے جو سلوک کرتی ہیں اس سے سبھی واقف ہیں۔ سید رفیق حسین کی زندگی میں اس محرومی نے ایک بڑا خلا پیدا کر دیا تھا۔ اگرچہ وہ باپ کے لاڈلے تھے۔ اور ان کے والد اپنے پانچوں بہن بھائیوں سے بہت محبت کرتے تھے۔ لیکن پھر بھی سوتیلی ماں کی موجودگی نے ان کی شخصیت کو متاثر کیا۔

Marfat.com

ان کے خاندان کے بعض لوگوں نے جو مضامین لکھے ہیں[1]، ان کے مطابق بچپن میں وہ بہت شریر تھے۔ اور اپنی نت نئی شرارتوں سے گھر والوں کو پریشان رکھتے تھے۔ ایک بار انہوں نے بوتل میں ڈائنامیٹ بھر کر پاس کی پہاڑیوں میں جا کر دھماکہ کر دیا تھا۔ یہ ڈائنامیٹ انہوں نے اپنے والد کے دفتر سے حاصل کیا تھا۔

ان کی زندگی کا ایک اور دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ ان کی جوتیاں ٹوٹ گئی تھیں۔ اور بار بار کہنے کے باوجود سوتیلی والدہ منگوا کر نہیں دے رہی تھیں۔ سید رفیق حسین نے ایک رات تمام گھر والوں کی جوتیاں اٹھا کر قریب بہنے والی نہر میں جا کر ڈال دیں۔ اور صبح کو اپنی اس حرکت کا اقرار کر لیا۔ اس کے نتیجے میں تمام گھر والوں کے ساتھ ان کے بھی جوتے آ گئے۔

سوتیلی والدہ کے اس سلوک کی ان کے والد کو خبر نہیں ہوتی تھی۔ سید رفیق حسین کی بہن کی روایت ہے کہ ان کے بڑے بھائی سید حامد حسین صاحب نے اپنے بھائیوں بہنوں سے کہہ رکھا تھا کہ تم بہن بھائیوں کو جو شکایت ہو مجھ سے کہا کرو ابا کے سامنے نہ کہنا کیونکہ انہیں اپنی اولاد سے اتنی محبت ہے کہ وہ سوتیلی اماں کو چھوڑ دیں گے۔ اور یوں خاندان کی بہت بدنامی ہوگی۔

سید رفیق حسین ایک آسودہ حال گھرانے میں پل کر بڑے ہوئے۔ اس گھرانے

---

[1] مطبوعہ نیا دور شمارہ ۴۵ ۔ الطاف فاطمہ، فضل قدیر اور مختار اکبر کے مضامین۔ نیز میجر جنرل (ریٹائرڈ) سید شاہد حامد صاحب کے بیان کردہ واقعات، حالات زندگی کے سلسلے میں ماخوذ ہیں۔

Marfat.com

میں ان کے لیے سب کچھ تھا لیکن سوتیلی ماں کی زیادتیوں نے ان کو بہت زیادہ بے چین کر رکھا تھا۔ پھر وہ بلا کے حساس تھے۔ چناں چہ ایک بار انہیں اپنی سوتیلی والدہ کی کوئی بات ناگوار گزری اور انہوں نے اسی رات گھر چھوڑ دیا۔ عرصہ دراز تک کسی کو ان کے بارے میں معلوم نہ ہو سکا۔ آخر کافی عرصہ گزر جانے کے بعد معلوم ہوا کہ سید رفیق حسین بمبئی میں ہیں۔ اور انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

سید رفیق حسین نے بمبئی میں اپنے ابتدائی زمانے میں بہت تکالیف اُٹھائیں۔ فٹ پاتھوں پہ سوتے اور ایک سائیکل والے کی دکان پہ کام کرکے اخراجات کی سبیل کرتے تھے۔ اور بمبئی کے وکٹوریہ میکنیکل انجینئرنگ کالج میں پڑھتے تھے۔ یہیں سے انہوں نے میکانیکل انجینئرنگ میں ڈپلومہ لیا۔ یہ بیسویں صدی کے اوائل کا واقعہ ہے۔ اس زمانے میں مسلمانوں میں اعلیٰ تعلیم اتنی عام نہیں ہوئی تھی۔ اور بالخصوص فنی اور تکنیکی علوم کی طرف تو لوگ بہت کم متوجہ ہوتے تھے۔ کالج سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد ایک بحری جہاز پر انجینئر کی حیثیت سے ملازم ہو گئے۔ اسی جہاز کی ملازمت کے دوران وہ ہندوستان سے باہر گئے اور کئی ممالک کی سیر بھی کی۔ اتفاق سے جب یہ جہاز جدہ پہنچا ہے تو حج کا زمانہ تھا۔ چناں چہ سید رفیق حسین نے حج بھی کر لیا۔

سید رفیق حسین لاابالی قسم کے انسان تھے۔ وہ جلد جلد ملازمتیں ترک کر دینے کے عادی تھے۔ بادی النظر میں اس کو ان کی غیر ذمہ دارانہ روش کہا جا سکتا ہے مگر دراصل ایسا نہیں تھا۔ انہیں اپنی حد درجہ ایمان داری کی وجہ سے ملازمت ترک کرنا پڑتی تھی۔ جس محکمے میں وہ ملازمت کرتے تھے۔ اس میں قدم قدم پر ناجائز آمدنی کی ترغیبات موجود ہوتی تھیں۔ لہٰذا وہ بے ایمانی پر آمادہ کرنے والے کا تو کچھ بگاڑ نہیں سکتے تھے۔ خود

Marfat.com

ہی ملازمت سے مستعفی ہو جاتے تھے ۔

سید رفیق حسین اپنے بڑے بھائی خان بہادر سید حامد حسین سے بہت ڈرتے تھے ۔ اور ان کے سامنے بالکل بات نہیں کرتے تھے ۔ دونوں بھائیوں میں بہت محبت تھی ۔ لیکن خان بہادر صاحب اکثر انہیں جلد جلد نوکریاں چھوڑ دینے کی وجہ سے ڈانٹ دیا کرتے تھے ۔ سید رفیق حسین کو بڑے بھائی سے جو بات بھی کہنا ہوتی تو وہ سید شاہد حامد صاحب کے ذریعے ہی کہلوایا کرتے تھے ۔

گھر بار سے بے نیاز آدمی تھے ۔ اور گھر کے معاملات میں بالکل دخل نہیں دیا کرتے تھے ۔ سید شاہد حامد صاحب کا بیان ہے کہ کچھ مدت تک ایک جگہ ملازمت کرنے کے بعد جب نوکری چھوڑ کر آتے تو سارا اندوختہ بیوی کے ہاتھ پہ رکھ کر کہتے کہ لو اتنے دن کا خرچ ہے اب اس سے پہلے مجھے تنگ مت کرنا ۔ اس کے بعد اپنے ذاتی دل چسپی کے کاموں میں مصروف ہو جاتے ۔ گھر کے ایک کمرے میں بند ہو جاتے تھے ۔ کئی کئی دن سوئے رہتے ، یا کئی کئی دن جاگتے رہتے ، اور کوئی نہ کوئی دل چسپ کام کیے جاتے ۔ جب پیسے ختم ہو جاتے تو بیوی یاد دلا دیتی ۔ اس کے بعد پھر رزق کی تلاش شروع کرتے ۔ خوش قسمتی سے بیلائے ملازمت ان پہ ہمیشہ مہربان رہی تھی ۔ چناں چہ جلد ہی پھر کسی جگہ برسرِکار ہو جاتے ۔ تھوڑے عرصے کے بعد پھر گھر آ کر بیٹھ جاتے ۔

غصہ ان کی ناک پہ دھرا رہتا تھا ۔ ایک بار ایک انگریز انجینئر کے تھپڑ مار دیا تھا ۔

Marfat.com

شادی | سید رفیق حسین کی شادی کا واقعہ بھی نہایت دلچسپ ہے۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے والد کا کس درجہ احترام کرتے تھے۔ یہ ابھی بمبئی میں ہی زیر تعلیم تھے کہ خان بہادر سید جعفر حسین اپنی بڑی بیٹی کی شادی میں مدعو کرنے کے لیے اپنے بھتیجوں کے پاس بنارس گئے۔ اپنے بھتیجے صادق حسین سے دوسرے مرحوم بھتیجے کی بچی کے بارے میں دریافت کیا کہ شادی ابھی تک کیوں نہیں کی۔ انہوں نے جواب دیا کہ ابھی تک کوئی اچھا رشتہ ہی نہیں ملا۔ سید جعفر حسین یہ سن کر چپ ہو گئے۔ اسی وقت بیٹے کو تار دے کر بمبئی سے بلوایا اور مرحوم بھتیجے کی بیٹی سے نکاح پڑھوا دیا۔

ایک بار سید رفیق حسین کے ایک دوست نے انہیں کوئی کھانے کی چیز تحفے میں بھیجی۔ انہیں یہ چیز پسند نہیں آئی لیکن کھاتے بھی رہے۔ اور دوست کو برا بھلا کہتے رہے۔ ان کی بہو نے ان سے کہا کہ اگر یہ چیز پسند نہیں آرہی ہے تو کیوں کھا رہے ہو۔ اس پر انہوں نے جواب دیا کہ "اس نے بھیجی ہے۔ کیسے نہ کھاؤں۔ جب وہ اتنا بد مذاق ہے تو میں بھی انتقاماً کھا رہا ہوں۔"

شکار | بچپن میں وہ اپنے والد کے ہمراہ ریاست گوالیار اور ریاست بھوپال میں بھی رہے تھے۔ جو شکار کے اعتبار سے پورے برصغیر میں مشہور علاقے تھے۔ جوانی میں جب انہیں بن باسا کے جنگلوں میں رہنے کا بہ سلسلۂ ملازمت اتفاق ہوا، تو سیر و شکار کی دیرینہ عادت عود کر آئی۔

سید رفیق حسین پر اپنے مضمون میں مختار اکبر نے لکھا ہے کہ وہ بہ سبب تنگدستی کے مچان باندھ کر شکار نہیں کھیلتے تھے۔ درحقیقت ایسا نہیں تھا۔ ان کے بڑے بھائی کے

Marfat.com

بیٹے میجر جنرل ریٹائرڈ سید شاہد حامد صاحب کا بیان ہے کہ اصل میں وہ بہت زیادہ نڈر اور بے خوف آدمی تھے اور انہیں اپنے نشانے پر مکمل اعتماد تھا۔ نیز ایک اعلیٰ درجے کے شکاری میں جو خود اعتمادی موجود ہونا چاہیے وہ ان میں موجود تھی۔ لہٰذا کبھی بھی انہوں نے مچان پر بیٹھ کر یا ہاتھی کی پیٹھ پر بیٹھ کر شکار کرنا پسند نہ کیا۔ وہ ہمیشہ زمین پر آمنے سامنے کھڑے ہو کر شیر کا شکار کر لیتے تھے۔ اور بعض اوقات تو یہ فاصلہ بہت ہی کم ہوتا تھا۔

سید شاہد حامد صاحب کا بیان ہے کہ ان کی اپنے چچا سے بہت دوستی اور قربت تھی دونوں میں دوستوں کی سی بے تکلفی تھی۔ اگرچہ عمروں میں کافی تفاوت تھا۔ شکار پارٹیوں میں یہ دونوں ایک ہی خیمہ میں رہتے تھے۔ اور اکٹھے ہی شکار کیا کرتے تھے۔

ملازمت سید رفیق حسن نے سب سے پہلی ملازمت بمبئی میں ایک بحری جہاز پر کی تھی۔ اس کے بعد کچھ عرصہ کے لیے ریلوے میں بھی رہے۔ بعد ازاں ان کا تقرر سب ڈویژنل انجینئر کی حیثیت بن باسا ڈویژن میں ہو گیا جہاں اس زمانے میں نہر سارد کی تعمیر جاری تھی۔ بن باسا کا یہ علاقہ نیپال کی سرحد کے قریب پیلی بھیت سے چالیس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہاں سید رفیق حسین بحیثیت الیکٹریکل سپروائزر کے کام کرتے تھے۔ اور ان ہی کی نگرانی میں اس علاقے میں بجلی کی لائنیں بچھانے کا اہم سرانجام پایا۔

۲۷-۱۹۲۶ء میں جب نہر سارد کی تعمیر مکمل ہو چکی تھی تو انہوں نے اپنے سرمایے سے شکر سازی کا ایک کارخانہ قائم کیا۔ شکر سازی کے کارخانے کی تنصیب وغیرہ کے کام میں بہت مہارت رکھتے تھے۔ اور اس سلسلے میں برصغیر کے دُور دراز کے علاقوں کے لوگ بھی اپنی فیکٹریاں لگانے کے لیے ان کی خدمات حاصل کرتے تھے۔ شکر سازی کے اس ذاتی کارخانے کی تعمیر میں انہوں نے اپنا سارا اندوختہ خرچ کر دیا حتیٰ کہ بیوی اور بچی کا تمام

Marfat.com

زیور بھی اس فیکٹری کی نذر ہوگیا۔ جب اس قدر مصارف کے بعد بھی رقم کی ضرورت پڑی تو فیکٹری کو رہن رکھ کر ایک بنیے سے قرض لیا لیکن یہ رقم بھی تھوڑی پڑ گئی۔ اس کے بعد یکایک ان کا دل اس سے اچاٹ ہوگیا اور سب کچھ یوں ہی چھوڑ کر چلے گئے۔ بنیے نے اپنی رقم کی وصول یابی کے لیے نالش کر دی۔ اس زمانے میں ان کے ایک قرابت دار اس علاقے کے ذمے دار افسر تھے۔ انہوں نے سید رفیق حسین کو بہت سمجھایا اور امید دلائی کہ فیکٹری کے نیلام کے بعد بنیے کے قرض کی ادائیگی کے بعد بھی چار پانچ ہزار روپے کی رقم ان کے لیے بچ جائے گی لیکن سید رفیق حسین نے پھر ادھر کا رُخ نہ کیا۔

اس کے بعد بہار شوگر فیکٹری میں بحیثیت ورک شاپ سپرنٹنڈنٹ ان کا تقرر ہو گیا۔ یہاں کچھ عرصے تک مالکان سے خوب نبھی۔ اور وہ ان کی ایمانداری کی وجہ سے ان کا بہت زیادہ احترام کرتے تھے لیکن کسی بات پہ ناراض ہو کر ملازمت ترک کر دی۔

بجنور میں ایک بڑی مشہور شوگر فیکٹری تھی۔ اس کو مارواڑی سیٹھ نے خرید کر ریاست اودے پور کے مقام کریا میں منتقل کرنا چاہا۔ چناں چہ اس نے سید رفیق حسین کی خدمات حاصل کیں۔ انہوں نے ہی یہ تمام فیکٹری بجنور سے منتقل کر کے نئے مقام پہ نصب کی اور نہایت سلیقے سے اس کام کو سرانجام دیا۔

ایک واقعہ سید شاہد حامد صاحب کا کہنا ہے کہ یہ واقعہ انہیں سید رفیق حسین نے سنایا تھا: بن باسہ کے قیام کے دوران ایک بار جب وہ سائٹ پر کام کر رہے تھے تو ان کے نوکر نے جو باورچی کا کام بھی کرتا تھا آکر بتایا کہ کئی دن سے چوں کہ دال سبزی وغیرہ پہ گزارا ہو رہا ہے لہٰذا اگر کوئی شکار کر لیا جائے تو گوشت پک جائے گا۔ سید رفیق حسین نے اپنے ساتھ کام کرنے والے چار پانچ ماتحتوں کو جنگل میں ہانکا لگانے کے لیے بھیج دیا۔

Marfat.com

اور خود بھی چالیس پچاس قدم جنگل کے اندر جا کر بندوق ہاتھ میں پکڑے ہوئے مٹی کے ایک تودے کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے۔ خیال تھا کہ جب ہانکا لگایا جائے گا تو جنگلی مرغیاں ادھر سے گزریں گی ان کو شکار کر لیا جائے گا۔ سید رفیق حسین اس وقت بندوق ہاتھ میں لیے اور ایک ٹانگ کو دوسری ٹانگ پر رکھے ہوئے مٹی کے اس تودے سے ٹیک لگائے کھڑے ہوئے تھے۔ اور اپنے پاؤں کو ہلا رہے تھے۔ یکایک انہیں اپنے دائیں طرف گال پر گرم گرم ہوا محسوس ہوئی۔ وہ بہت حیران ہوئے کہ یہ سانس کی سی گرم ہوا کس کی ہو سکتی ہے۔ سید رفیق حسین کہتے تھے کہ جب میں نے سر گھما کر دیکھا تو میرے چہرے کے بالکل اوپر دو تین فٹ کے فاصلے سے شیر ببر اس صورت سے کھڑا ہوا تھا کہ اس کا دایاں پنجہ ہوا میں معلق تھا۔ چند منٹوں تک ایک عجیب سی کیفیت رہی۔ شیر اور میں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے تھوڑی دیر تک ایک دوسرے کو گھورتے رہے۔ اس کے بعد شیر نے اپنا پنجہ نیچے کیا اور واپس چلا گیا۔ اس جنگل میں آدم خور شیر تھے۔ غالباً مٹی کے تودے کے پیچھے سے پیر ہلاتے دیکھ کر شیر اس طرف چلا آیا۔ سید رفیق حسین کہتے تھے کہ ان کو اس وقت ایسی دہشت ہوئی کہ وہ شکار وغیرہ سب کچھ بھول گئے اسی وقت انھوں نے اپنا بوریا بستر اٹھایا اور لکھنؤ آ گئے۔ وہ کہتے تھے کہ اس کے بعد چھ ماہ تک مجھے جنگل میں جانے کی ہمت نہیں ہوئی"

سیّد رفیق حسین کی افسانہ نگاری

سیّد رفیق حسین نے اپنے انتقال سے چھ سات برس قبل افسانے لکھنا شروع کیے تھے سید حامد صاحب کے بیان کے مطابق ان کی ملاقات اتفاق سے شاہد احمد دہلوی سے ہو گئی تھی۔ شاہد احمد دہلوی سے دو چار ملاقاتوں میں سید رفیق حسین نے شکار کے بعض واقعات ان

Marfat.com

کو سنائے اور کچھ جانوروں کی نفسیات وغیرہ بھی زیر بحث آئی۔ شاہد احمد دہلوی نے انہیں مشورہ دیا کہ ان تجربات کو اگر وہ افسانے کی صورت میں لکھ دیں تو یہ اردو ادب میں ایک نئی چیز ہوگی۔ اور وہ انہیں اپنے رسالے 'ساقی' میں شائع کر دیں گے۔

سید رفیق حسین نے اس پر یہ عذر پیش کیا کہ وہ اردو نثر لکھنے پہ قادر نہیں ہیں۔ اور اردو انہیں واجبی سی آتی ہے۔ شاہد احمد صاحب نے ان سے کہا کہ وہ اس کی پرواہ نہ کریں نثر وہ خود ٹھیک کر لیں گے۔ چناں چہ ابتدائی افسانے اور اپنے طنزیہ اور سماجی افسانے انہوں نے لکھ کر شاہد احمد دہلوی کو بھیجے۔ ان کے خاندان کے لوگوں کا بیان ہے کہ سید رفیق حسین افسانہ آدھا اردو، انگریزی الفاظ میں ملا جلا کر پہلے لکھ لیتے تھے۔ بعد میں اپنی بیٹی قمرالنسا کے مشورے سے اس کی زبان تبدیل کرتے۔ اور انگریزی الفاظ کی جگہ اردو الفاظ لاتے۔

جدید اردو ادب کی بہت سی قدآور شخصیات کو متعارف کرانے والے شاہد احمد دہلوی ہی تھے۔

اردو افسانہ نگاری کے موضوعات کچھ بہت زیادہ متنوع نہیں رہے ہیں۔ اور ماضی میں اگر موضوعات نسبتاً متنوع تھے بھی تو افسانہ نگاری کے جدید دور میں تو موضوعات کا تنوع گھٹ گھٹا کر صرف شہروں کی زندگی کے بیان تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔

اردو کی ابتدائی افسانہ نگاری کے موضوعات کسانوں کی زندگی، ان کے طبقاتی کردار اور ان کی زندگیوں کی محرومی تک محدود رہیں۔ البتہ ان میں طبقاتی تضاد اور کش مکش کو ظاہر کیا گیا ہے۔

چناں چہ ایسے افسانہ نگاروں کی اکثریت اردو کے ابتدائی دور کے افسانوی عہد میں ہی نظر آتی ہے۔ سدرشن، اعظم کریوی، پریم چند وغیرہ کے افسانوں کے موضوعات زیادہ تر

Marfat.com

دیہاتی زندگی سے متعلق ہیں۔ ان افسانہ نگاروں کے ہاں شہری زندگی کے کردار ملتے تو ہیں۔ لیکن ان کی تمام تر توجہ کا مرکز دیہات اور دیہاتی لوگ ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اُردو میں رومانی افسانہ نگاروں کی ایک اور کھیپ بھی نظر آتی ہے لیکن رومانی افسانہ نگاری کا یہ دور نہایت مختصر ہے۔

ترقی پسند تحریک کے زیر اثر معاشرے میں موجود طبقاتی امتیاز کو نمایاں کرنے اور پس ماندہ طبقوں میں سماجی شعور پیدا کرنے کی کوشش کی گئی چناں چہ اس دور کے افسانوں میں یا تو محنت و سرمایہ کی کش مکش دکھانا مقصود رہی ہے یا پھر محبت کو بھی معاشرے کے معاشی تقاضوں اور دباؤ کے حوالے سے پیش کیا جاتا رہا ہے۔ اس دور کے افسانوں کا موضوع بھی وہی ہے۔

چنانچہ اگر اردو کے افسانوی ادب کی اب تک کی تاریخ سامنے رکھی جائے تو سرمایہ و محنت اور طبقاتی کردار، محبت اور دیہات کی زندگی کے موضوعات نمایاں نظر آتے ہیں مگر زمانہ افسانے سے دیہات کا موضوع بھی خارج ہو چکا ہے۔

پریم چند کے بعد ہمارے افسانہ نگاروں کی اس نسل نے جس نے ۱۹۳۶ء کے بعد ترقی پسند تحریک کے زیر اثر لکھنا شروع کیا تھا، دیہات کے مسائل کو بھی اپنا موضوع بنایا۔ ان تمام افسانہ نگاروں کے افسانوں کا معتدبہ حصہ دیہات اور دیہاتوں میں بسنے والے کسانوں اور ان کے مسائل کے بارے میں ہے۔ اس کا سبب یہ بھی ہے کہ ان میں سے بیشتر افسانہ نگاروں کا تعلق دیہاتوں سے تھا۔ وہ دیہاتوں کی زندگی کے بارے میں بہت زیادہ جانتے تھے۔ ان کے بعد کے افسانہ نگاروں کا تجربہ شہری زندگی تک محدود ہو گیا۔ چناں چہ بیس پچیس برسوں میں لکھے جانے والے افسانوں میں ہم دیہاتی زندگی اور دیہاتوں میں رونما ہونے والی تبدیلیوں

Marfat.com

کا تذکرہ اردو افسانے میں بہت کم پاتے ہیں۔ اس عرصے میں ہمارے افسانے کے موضوعات متوسط طبقے کے لوگوں کی محبتوں اور ان کے دوسرے مسائل رہے ہیں۔ چناں چہ اب افسانوں میں شہروں میں رہنے والے درمیانہ اور نچلے طبقے اور مزدور طبقے کے بارے میں زیادہ لکھا جارہا ہے۔ کیوں کہ ہمارے افسانے نگار کا مشاہدہ اور تجربہ اب شہری زندگی تک محدود ہوگیا ہے۔

جنگلی جانوروں کے بارے میں لکھے ہوئے سید رفیق حسین کے افسانے، اردو افسانے کی ایک نئی جہت کہے جاسکتے ہیں۔ سید رفیق حسین نے جانوروں کی نفسیات کو نہایت خوبی سے بیان کیا ہے۔ سید رفیق حسین بہت اچھے شکاری تھے۔ اور کئی کئی مہینے سیر و شکار میں گزارتے تھے۔ اس دوران انہیں جانوروں کی اور بالخصوص ایسے جانوروں کی نفسیات کو جاننے کا موقعہ ملا کہ جنہیں ہم مہذب دُنیا والے وحشی اور خونخوار درندے کہتے ہیں۔

اردو میں اس موضوع پر نہ تو سید رفیق حسین سے قبل کسی نے قلم اٹھایا اور نہ ان کی موت کے بعد، جسے آج چالیس سال ہونے آئے ہیں، کسی نے اس موضوع پر خامہ فرسائی کی ہے۔ اس کی وجہ وہی مشاہدے اور تجربات کا محدود ہونا ہے۔

جس طرح ادب کو سنجیدہ اور تفریحی دو اقسام میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ اسی طرح شکار کی کہانیوں کو بھی دو اقسام میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک سنجیدہ کہانیاں اور دوسرے تفریحی، لیکن اس قسم کے امتیاز کا سوال بھی اس وقت اٹھتا ہے کہ جب سید رفیق حسین کو شکار کی کہانیوں کا مصنف قرار دیا جائے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ سید رفیق حسین نے ان درندوں کی رحم دلی، انسانیت اور محبت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے جس کو مہذب دُنیا کے انسان وحشی کہتے ہیں۔ اور جن میں نہاں رحمدلی و محبت

Marfat.com

کے جذبات کو ڈھونڈنے کی ضرورت انسان نے محسوس نہیں کی ۔

کہا جاتا ہے کہ دوسری زبانوں کے ادبیات میں بھی اس نوع کی کہانیاں نہیں ملتیں، لیکن اس دعوے کا ثبوت پیش نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ یہ حقیقت ہے کہ اُردو میں اس موضوع کی ابتدا کرنے والے سید رفیق حسین ہیں۔ اور وہی اس کے خاتم بھی ہیں ۔

سید رفیق حسین کے ہاں ہمیں دو قسم کی تحریریں ملتی ہیں۔ ایک تو خالصتاً ان کے وہ افسانے ہیں جن کا مرکزی موضوع اور کردار جانور ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے بعض افسانوں کا موضوع سماجی اور معاشرتی بُرائیاں ہیں ۔

سید رفیق حسین نے جب لکھنا شروع کیا۔ تو اس وقت تک ترقی پسند افسانے نے اپنی ایک روایت قائم کی تھی۔ چناں چہ جانوروں پہ لکھے جانے والے افسانوں کے علاوہ سید رفیق حسین کے دوسری نوع کے افسانوں میں ہمیں سماجی حقیقت نگاری اور معاشرے کی بُرائیوں کو نمایاں کرنے کا رجحان بھی ملتا ہے۔ ان کے اس نوع کے افسانوں میں "گدھا نہیں بھرتا" بہت نمایاں ہے۔ یہ ایک سماجی موضوع پہ محیط افسانہ ہے۔ اور سرکاری دفاتر کی بدعنوانیوں کو سامنے لاتا ہے۔ لیکن سید رفیق حسین کی بنیادی اہمیت کا باعث ان کے وہی افسانے ہیں جن کا موضوع جانور ہیں ۔

سید رفیق حسین نے ۲۷-۱۹۲۸ء میں لکھنا شروع کیا۔ ان کا پہلا مضمون "امید" تھا۔ یہ بھی رسالہ 'ساقی' میں شائع ہوا تھا۔ لیکن ساقی میں شائع ہونے والی ان کی سب سے پہلی تحریر "میٹھی میٹھی باتیں" تھا۔ جو ۱۹۴۲-۴۱ء میں شائع ہوا۔ اس تحریر کے ساتھ وہ منظر عام پہ آئے۔ اس کے بعد انہوں نے جانوروں کے بارے میں اور ان کی فطری معصومیت کے بارے میں افسانے لکھے۔ اور جلد ہی قارئین کی توجہ اپنی جانب مبذول کرا لی ۔

Marfat.com

فضل قدیر صاحب کا بیان ہے کہ سید رفیق حسین کہا کرتے تھے کہ "انسان بہت خوفناک جانور ہے۔ یہ لیگ آف نیشنز، یہ امن و آشتی کے آدرش، سب ڈھکوسلے ہیں، جانوروں کی معصومیت سے وہ بہت متاثر تھے۔ اور انہیں فطرت کے ان گھڑ کھلونے تصور کرتے تھے۔ جو انجانے انداز میں ..... کا کفارہ بڑی مسکینی سے ادا کرتے ہیں[1]۔

کفارہ، سید رفیق حسین کا نمائندہ افسانہ ہے۔ ایک گھنے جنگل میں بہاری نامی ایک مفرور ملزم قانون کی نگاہوں سے بچ کر روپوش ہے۔ یہ بات اپنی جگہ خود دلچسپ ہے کہ وہ اپنے قتل کو چھپانے کے لیے انسانوں میں نہیں رہ سکتا اور وحشی درندوں کے درمیان آکر آباد ہوتا ہے۔ جنگل کے جانوروں میں ایک اشرف المخلوقات آجاتا ہے، جس کو اب ایک نہیں دو بڑے بڑے خطرے درپیش ہیں۔ ایک تو انسانوں کا اور قانون کے محافظوں کا جو اس کی تلاش میں جنگل میں آتے ہیں۔ لیکن وہ گھنے درختوں میں روپوش ہے۔ دوسری طرف جنگلی درندوں کا۔ کئی بار وہ چاہتا ہے کہ جنگل سے بھاگ جائے اور واپس شہر چلا جائے۔ اس خوف زدہ اور نہتے انسان کا سامنا کئی دفعہ شیر اور شیرنی سے ہو جاتا ہے لیکن ہر بار شیر اس کی طرف سے بے نیازی سے منہ موڑ کر چلا جاتا ہے، چوں کہ اس کی آنکھوں میں بہاری اور شرافت ہے۔ وہ آدم خور نہیں ہے۔ شیرنی ہر بار بہاری کا شکار کرنا چاہتی ہے۔ لیکن شیر آڑے آجاتا ہے۔

جنگل کے اس بادشاہ کی ملکہ یعنی شیرنی اور انسان کے درمیان یہ جنگ اس وقت شدت اختیار کر جاتی ہے۔ جب بہاری شیر کا شکار کیے ہوئے جانوروں سے

---

[1] نیا دور، ص ۱۳۰ - شمارہ ۴۵۔

Marfat.com

وقتاً فوقتاً اپنے پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے گوشت کے پارچے کاٹتا ہے۔ ایک ایسے ہی مرد، سانبھر کا گوشت کاٹتے ہوئے، بہاری کا سامنا شیرنی سے ہوجاتا ہے۔ آخر کار شیرنی اپنے چور کا پتہ لگا لیتی ہے۔ شیر چند قدم دور ہے۔ اور شیرنی غصے میں بہاری کو جان سے مار ڈالتی ہے۔ شیرنی، شیر جیسی صاحب ظرف نہیں ہے، وہ بہاری کو جان سے مار ڈالتی ہے۔ جو شیر کے خیال میں ناقابل معافی جرم ہے۔ اس کی کوتاہی سے بہاری کا قتل ہوجاتا ہے۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے شیرنی کو چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ اس کہانی کا ہیرو بہاری نہیں شیر ہے، شیر جس میں تمام تر انسانی صفات موجود ہیں۔ اگر انسان اس کے مقابلے میں نہیں آتا یا اس کو نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کرتا تو ایسی صورت میں وہ اس کے ساتھ جنگل میں بحفاظت تمام رہ سکتا ہے۔ یہی وہ بنیادی جذبہ ہے جو شیرنی کو چھوڑ دینے کا محرک بنتا ہے۔

اسی طرح کلوا، افسانے میں کتے کا کردار دوستی، محبت اور رفاقت کی علامت ہے۔ کلوا، میں سید رفیق حسین کا کردار ایک کتا اور چھوٹا سا بچہ منی ہے جو کتے کو پالتا ہے۔ پھر کتا اس سے جدا ہوجاتا ہے۔ یہی کتا ایک اور جگہ محبت تلاش کرتا ہے اور ایک لڑکی اس سے اچھا سلوک کرتی ہے۔ لڑکی کلوے سے بے مہری کا اظہار کرتی ہے لڑکی کی واپس میکے آمد پر کتا جو کچھ محسوس کرتا ہے اس کی نہایت خوب صورت تصویر سید رفیق حسین نے پیش کی ہے۔ لڑکی کے واپس جانے پر اس کے گھر والے کلوا کو گھر کے اندر تک رہنے کی اجازت نہیں دیتے۔ وہ کئی دن تک سوگوار دروازے کے آگے پڑا رہتا ہے آخر کار تلاش کرتے کرتے، اور دوسری گلیوں کے کتوں کی خونخواری سے بچتے ہوئے وہ دوبارہ منی کے گھر پہنچتا ہے۔ اس گھر سے آنے والی خوشبو اس کو مانوس نظر آتی ہے

Marfat.com

اس افسانے میں کلوا کی شدید محبت کو موضوع بنایا گیا ہے۔

سید رفیق حسین کے ایک اور معرکۃ الآرا افسانے گوری ہو گوری کی ہیروئن گوری (گائے) ہے۔ ایک چھوٹی سی بستی رات کے وقت سیلاب کی زد میں آجاتی ہے۔ سب لوگ ڈیڑھ دو میل پر واقع ریلوے لائن پر چلے جاتے ہیں۔ رمکلیا کی ماں اور بہن بھائی اور اس کا باپ بھی ان آفت رسیدہ لوگوں میں ہیں۔ رمکلیا کی ماں ایک دوسرے آدمی کے کہنے پر کہ وہ رمکلیا کو اٹھا لائے گا ریل کی پٹڑی کی جانب دوسرے بچوں کو اٹھائے ہوئے چلی جاتی ہے۔ جب دن نکلتا ہے تو نقصان کا اندازہ لگانے پر معلوم ہوتا ہے کہ رمکلیا گم ہو گئی ہے۔ اور چند دوسرے لوگ جو باغ میں موجود تھے وہ بھی پھنس گئے ہیں لیکن ان لوگوں کے بارے میں زیادہ تشویش نہیں تھی کیوں کہ وہ تیرنا بھی جانتے تھے اور دوسرے کسی نہ کسی درخت پر چڑھ کر جان بچا لیتے اس وقت افراتفری کا عالم ہے۔ رمکلیا کی ماں، اپنی بیٹی کی جدائی پر بہت زور زور سے رو رہی ہے سب اس کو تسلی دیتے ہیں۔ اس وقت پورے گردو میں صرف گوری ہی ایسی ہے جو اس درد مشترک میں اس کا ساتھ دے رہی ہے۔ وہ بھی مالکن کے جواب میں روتی ہے اس کا بچہ بھی سیلاب میں پھنس گیا ہے۔ آخر وہ تلاش کے لیے واپس گھر پہنچتی ہے اور اپنے بچے اور رمکلیا کو لے کر آتی ہے۔ جس وقت گوری واپس اپنے بچے اور رمکلیا کی تلاش میں جاتی ہے۔ تو وہ پہلے ماتا کے فطری تقاضے کے سبب اپنے بچے کو ہی سیلاب سے بچانا چاہتی ہے۔ ایسے وقت میں کہ جب انسانوں کو ایک انسان کی جان کی کوئی فکر نہیں ہے۔ تو ایک جانور ایسے اہم فریضے کو انجام دیتا ہے۔

سید رفیق حسین کے ان افسانوں میں جن کے موضوعات سماجی ہیں۔ زبان نہایت پر لطف ہوتی ہے۔ انہیں طنز نگاری میں بھی کمال حاصل ہے۔

Marfat.com

"گدھا نہیں مجرتا" میں طنز ملاحظہ ہو :

"یہاں ایک جنس بڑی قابل تعریف عجائبات قدرت میں سے ہوتی ہے اسپ اور رسیر۔ کیسے کہوں بگڑ جائیں گے) آپ بابوجی ہیں۔ بڑے سیدھے بڑے نیک خاکساری آپ کا شیوہ ہے۔ انکساری آپ کی طینت ہے۔ لیکن وہیں تک یعنی صاحب علاقہ صاحب کے ڈیرے یا بنگلے تک۔ اس سے ہٹ کر آپ ذرا کھنچ ہی جاتے ہیں۔ ذرا تن بھی جاتے ہیں اور ذرا اکڑ بھی جاتے ہیں۔ اور کبھی اگر ایسے دیسے ہیں کہ بد کر "ہم ری پکیا بلیا بھی بنائے دیو" تو ان کو "گبستہ" بھی آجاتا ہے۔ ذرا یہ ہی عادت بری ہے ویسے آدمی بڑے بھلے مانس ہیں"

ان کی تحریروں میں بعض فقرے بڑا لطف پیدا کرتے ہیں مختلف کرداروں کو سید رفیق حسین صرف ایک فقرے میں نہایت خوبی سے پیش کر دیتے ہیں۔ اور بات اس صورت سے کہتے ہیں کہ پڑھنے والا مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔

"مولوی صاحب۔ برکت نما گول توند یہ معلوم ہوتا ہے کہ علم کی تجوری لیے پھرتے ہیں"

اپنے مضمون "گھریلیات" میں ان افراد کا نقشہ کھینچا ہے۔ کہ جن کے دم سے گھروں کی رونق ہے۔ اور بعض ایسے کردار بھی پیش کیے ہیں کہ جن کا بظاہر گھر سے تعلق نہیں ہے لیکن اس کے باوجود سب سے زیادہ تعلق کے دعوے دار ہوتے ہیں۔ اور پورے گھر میں انہی کی سب سے زیادہ اہمیت ہوتی ہے۔ مثلاً بیوی کے بھائی کے لیے "سالار جنگ" کی ترکیب گو یہ ترکیب عام ہے لیکن اس کردار کے بارے میں جو رنگ سید رفیق حسین بھرتے ہیں وہ قابل داد ہے :

Marfat.com

"ایک نمبر کے واسطے آپ کا وجود لازمی ہے۔ وہ گھر جس میں سالار نہ ہو ایسا ہی ہے جیسے بے کھونٹے کی چکی۔ بلکہ آپ کی ہستی کھونٹے سے بھی زیادہ اہم چیز ہے۔ اور کمال نزول خود اس بات کی دلیل ہے۔"

یاد کیجئے وہ دن جب بوئے گُل ہر گوشے سے آتی تھی۔ جب باد سحر دامن سے اٹھلاتی تھی۔ جب دنیا میں شور مچا تھا جب نغموں میں جوش بھرا تھا۔ ارے جب بادشاہت لٹتی تھی۔ جب آپ بھی ہنستے تھے۔ جب دُنیا بھی ہنستی تھی۔ اس وقت یہ حضرت نمونۃً آپ کو پیش کیے گئے تھے۔ (ہاں آپ کو ہوش کہاں تھا، آپ نشے میں تھے۔) بعد میں بطور تحفہ آپ کو جہیز کے ساتھ ملے۔ آپ نئے نئے آئے تھے تو میاؤں کرنا بھی نہ آتی تھی۔ اب کھاتے ہیں اور غراتے ہیں اور پھر بھی آپ ناز اُٹھاتے ہیں۔"

سید رئیس حسین کے ان فقروں کا اور اس میں مزاح کا جو پُرلطف پہلو ہے۔ اس کی داد نہ دینا زیادتی ہو گی۔ ان کی ادبی زندگی پر فارسی کا یہ مصرعہ صادق آتا ہے۔ ؎

خورشید درخشید ولے شعلہ مستعجل بود

Marfat.com

ظفر عمر

اُردو کا پہلا جاسوسی ناول نگار

حالاتِ زندگی ظفر عمر بی۔ اے کے نام سے دنیائے ادب کا ہر قاری واقف ہے۔ سنجیدہ اور تفریحی ادب پڑھنے والے دونوں قسم کے قارئین ان سے واقف ہیں۔ آج اردو میں جاسوسی ناول لکھنے والوں کی کمی نہیں ہے لیکن اردو زبان میں جاسوسی ناول نگاری کی ابتدا کرنے والے ظفر عمر ہیں۔ ظفر عمر بی۔ اے کے اجداد کا وطن تھانہ بھون ضلع مظفر نگر تھا لیکن ۱۸۵۷ء کے جہادِ آزادی کی ناکامی کے بعد یہ خاندان ترکِ وطن کر کے قصبہ بڑوت میں آکر آباد ہو گیا تھا۔ ظفر عمر نے علی گڑھ سے بی۔ اے پاس کیا۔ ان کا شمار علی گڑھ کے مشہور طلبہ میں ہوتا تھا۔ زمانہ طالب علمی میں نہ صرف ان کا تعلیمی کیریر شاندار رہا بلکہ وہ کھیلوں میں بھی نمایاں تھے اور علی گڑھ یونیورسٹی کی فٹ بال ٹیم کے کپتان بھی رہے۔

علی گڑھ کے زمانہ قیام میں ہی ان کے تعلقات خان بہادر سید جعفر حسین سے ہوئے۔ بعد میں خان بہادر صاحب کی منجھلی صاحبزادی سے ان کی شادی ہو گئی۔

ملازمت بی۔ اے پاس کرنے کے بعد سب سے پہلے ان کا تقرر نواب محسن الملک کے پرائیویٹ سکریٹری کی حیثیت سے ہوا۔ جو اس زمانے میں ایم۔ اے او کالج علی گڑھ کے سکریٹری تھے۔ بعد ازاں ان کی خدمات بیگم صاحبہ بھوپال نے حاصل کریں۔ بھوپال کے زمانہ قیام میں بیگم صاحبہ کے

Marfat.com

پرائیویٹ سکریٹری کے فرائض کی بجاآوری کے ساتھ ساتھ انہوں نے نواب حمیداللہ خان کی اتالیقی کے فرائض بھی سرانجام دیئے۔ اسی زمانے میں خان بہادر سید جعفر حسین نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ سرکاری ملازمت میں آجائیں۔ چناں چہ وہ پولیس کی ملازمت کے مقابلے کے امتحان میں بیٹھے اور نمایاں حیثیت سے کامیاب ہوئے۔ الہ آباد کے پولیس ٹریننگ اسکول سے تربیت لینے کے بعد ان کا تقرر براہ راست ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ آف پولیس کے عہدے پہ ہوگیا۔ اس زمانے میں کسی ہندوستانی کا اس عہدے پر براہ راست تقرر ہوجانا بہت اعزاز کی بات سمجھی جاتی تھی۔

ظفر عمر صاحب نہایت اصول پرست انسان تھے۔ اور اصول کے معاملے میں بڑے بڑے افسران کی بات نہ مانتے تھے۔ چناں چہ اسی سبب سے افسران بالا کی نگاہوں میں ہمیشہ معتوب رہے۔ لیکن ان کا سروس ریکارڈ اتنا اچھا تھا کہ ناراض افسران ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے تھے۔ البتہ تنگ کرنے کے لیے ہمیشہ ان کا تبادلہ دور دراز کے پرخطر علاقوں میں کر دیا جاتا تھا۔

جب صوبجات متحدہ میں پہلی بار مقامی افراد پہ مشتمل حکومت بنی تو اس کے سربراہ راجہ صاحب محمود آباد ہوئے۔ راجہ صاحب نے ظفر عمر کو ڈیپوٹیشن پہ اپنے ہاں بلالیا۔ اور ان کو پبلسٹی آفیسر کے عہدے پہ تعینات کیا۔ ظفر عمر کو راجہ صاحب کے مزاج میں بہت دخل تھا۔ اور راجہ صاحب ان کی ایمان داری، خلوص اور احساس ذمے داری کے بہت مدّاح تھے۔ گو ان کا عہدہ تو پبلسٹی آفیسر کا تھا لیکن کام وہ راجہ صاحب کے پرائیویٹ سکریٹری کا کرتے تھے۔ اور تمام فائلیں اور دیگر سرکاری کاغذات ظفر عمر کے توسط سے راجہ صاحب کی خدمت میں بھیجے جاتے تھے۔ اس زمانے میں ظفر عمر نے پولیس کے محکمے میں اصلاح اور ردو بدل کی بہت کوشش کی جس سے ان کے انگریز افسران بالا ان سے اور زیادہ ناراض ہوگئے۔ چناں چہ جب وہ راجہ صاحب کی خدمت سے سبکدوش ہوئے اور واپس محکمہ

Marfat.com

پولیس میں بھیجے گئے تو حالات کو ناساز گار پاتے ہوئے انہوں نے ریٹائر ہو جانے کو ستر ین مصلحت جانا۔ اس وقت تک وہ ترقی پا کر ایس پی ہو چکے تھے۔

ایک بار شکار کھیلتے ہوئے ایک گولی ان کی داہنی ٹانگ میں آ لگی تھی جس کے سبب ٹانگ کو اوپر تک کٹوانا پڑا تھا۔ اور لکڑی کی ٹانگ لگوالی تھی چنانچہ اسی صورت سے وہ اپنے محکمانہ فرائض سرانجام دیتے رہے تھے۔

۱۹۳۰ء میں ریٹائر ہو جانے کے بعد انہوں نے مستقل طور پر علی گڑھ میں رہائش اختیار کر لی تھی۔ اور اپنا ایک ذاتی مکان بنوا لیا تھا۔ علی گڑھ میں اس زمانے میں انہوں نے علی گڑھ اولڈ بوائز لاج کے سکریٹری کا عہدہ بھی سنبھال لیا تھا۔

قیام پاکستان کے بعد ظفر عمر ۱۹۴۷ء (میں) لاہور آ گئے تھے۔ اور یہاں اپنی مشہور فرم عمر اینڈ سنز قائم کی تھی۔ ان کے بعد ان کے صاحب زادے اس فرم کو چلاتے رہے ظفر عمر کے بڑے صاحب زادے شوکت عمر سے خان بہادر سید حامد حسین صاحب کی صاحب زادی کی شادی ہوئی تھی۔

<u>ظفر عمر بحیثیت ناول نگار</u> ظفر عمر کو اردو میں جاسوسی ناول نگاری کا بانی قرار دیا جا سکتا ہے۔ ان کی ناول نگاری کا آغاز "نیلی چھتری" سے ہوا جسے انہوں نے ۱۹۱۶ء میں لکھا تھا۔ ان کے مشہور جاسوسی ناول نیلی چھتری، بہرام کی گرفتاری، لال کھجور اور چوروں کا کلب ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے انگریزی زبان میں ایک کتاب "دی انڈین پولیس مین" بھی لکھی تھی جو ہندوستان کے مختلف پولیس ٹریننگ اسکولوں میں بطور نصابی کتاب کے پڑھائی جاتی تھی۔ ہنگری کے پروفیسر کی ایک شہرہ آفاق کتاب کے ایک باب کا اردو ترجمہ بھی مستقبل اسلام کے نام سے کیا تھا۔ جو باقاعدہ مصنف کی اجازت سے شائع کیا گیا تھا۔

Marfat.com

سید شاہد حامد صاحب کا بیان ہے کہ "صرف ایک ناول "نیلی چھتری" سے اس زمانے میں انہیں پندرہ ہزار روپے بطور رائلٹی کے وصول ہوئے تھے جس سے انہوں نے علی گڑھ میں ایک مکان تعمیر کرایا تھا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد ان کا معمول تھا کہ ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر ناول لکھنے بیٹھ جاتے تھے یا پھر مطالعے میں مصروف ہو جاتے تھے۔"

اس سلسلے میں کوئی حتمی بات نہیں کہی جا سکتی کہ آیا جاسوسی ناول لکھنے کا خیال انہیں انگریزی میں لکھے جانے والے جاسوسی ناول پڑھنے کے بعد آیا تھا۔ البتہ ان کے تمام ناولوں میں مسعود کا کردار ملتا ہے جس کا پیشہ جاسوسی ہے۔ ممکن ہے کہ اس نوع کے کردار تخلیق کرنے کا خیال انہیں سر آرتھر کانن ڈائل کے ناول پڑھنے کے بعد آیا ہو جس کے ناولوں میں بھی ایک ہی کردار "شرلاک ہومز" ملتا ہے۔

نیلی چھتری نیلی چھتری ظفر عمر بی۔ اے کا لکھا ہوا اوّلین ناول ہے۔ اس کا ذیلی نام "شاہان دہلی کا خزانہ" بھی ہے۔ یہ کتاب اوّل تا آخر نہایت دلچسپ ہے اور اسی کتاب میں ہم مسعود کے کردار سے پہلے پہل متعارف ہوتے ہیں۔

ناول کا قصہ مسٹر سہراب جی دہلی کے ایک متموّل سوداگر ہیں۔ ان کی ایک بیٹی رتن بائی اور بھتیجی فیروزہ بائی ان کے ہمراہ رہتی ہیں۔ مسٹر سہراب جی کے پاس نوادرات کا قیمتی ذخیرہ ہے۔ ایک رات نامعلوم چور اکوٹھی میں آتے ہیں۔ فیروزہ بائی کے پستول سے ایک چور زخمی ہو کر محل کے مقبرے کے پاس جا کر غائب ہو جاتا ہے۔ کوٹھی میں کسی قسم کا سامان بھی چوری نہیں ہوتا پھر چوروں کی آمد کا مطلب کیا ہے؟ اس پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔ پولیس کا عملہ اور خود کوتوال شہر تفتیش کے لیے آتے ہیں لیکن ان کی تفتیش کے نتائج کچھ زیادہ حوصلہ افزا ثابت نہیں ہوتے جائے واردات پر موجود ایک نوجوان پولیس کے لوگوں سے نہایت ماہرانہ انداز میں گفتگو کرتا

Marfat.com

ہے۔ پولیس کے حکام شک کی بنا پر اسے گرفتار کرلیتے ہیں۔ بعد میں بے قصور ہونے پر اسے رہا کر دیا جاتا ہے۔ چناں چہ اختتام تک... یہ کردار (مسعود) سہراب جی، اور پولیس والوں کی مدد کرتا ہے۔ اور بہت زیادہ شہرت اسے حاصل ہو جاتی ہے۔ مسعود بہادری سے مقابلہ کرتا ہے۔ اور آخر کار نیلی چھتری کے اسرار کا پردہ فاش کرتا ہے۔ بہرام کو شکست کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اور وہ اپنی ایجاد "راشقل" میں بیٹھ کر پولیس کی گرفتاری سے بچ جاتا ہے۔

مسعود کا کردار | نیلی چھتری میں دو کردار نمایاں ہیں۔ ایک مسعود اور دوسرے بہرام۔ دراصل اس کہانی کا ہیرو بہرام نہیں مسعود ہے۔ لیکن مسعود کے کردار کی خوبیوں کو اس صورت سے بیان کیا گیا ہے کہ جس سے وہ ایک غیر حقیقی کردار بن کر رہ جاتا ہے۔ بہرام کا کردار بھی صرف اسی وقت سامنے آتا ہے کہ جب وہ مسعود کو کوئی نیا فریب دے دیتا ہے۔ ان دو کرداروں کے علاوہ کوتوال شہر، خفیہ پولیس کا انسپکٹر ذوالفقار حسین، اور داروغہ شب سنگھ وغیرہ میں کردار کے اعتبار سے کوئی جان نہیں ہے۔ یہ کردار کٹھ پتلیاں ہیں اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے پولیس کے محکمے کی تحقیر کی خاطر انہیں اس انداز میں پیش کیا ہے۔ ان پولیس والوں کو بالکل نااہل دکھایا گیا ہے۔ اور شروع سے آخر تک تمام تر کامرانیوں کا سہرا مسعود کے سر باندھا گیا ہے۔ اصل میں ظفر عمر خود بھی پولیس میں رہ چکے تھے۔ اور چوں کہ اپنے محکمے سے بددل رہے اور افسران سے ناچاقی رہی۔ لہٰذا نفسیاتی طور پر وہ پولیس والوں کے کردار کو اسی صورت سے پیش کر سکتے تھے۔

مسعود کے کردار کی تعمیر کے جوش میں ناول نگار باقی کرداروں کے ساتھ انصاف نہیں کر پایا ہے۔ مسعود کے کردار کو غیر معمولی اہمیت دینے کی ایک اور وجہ بھی سمجھ

Marfat.com

نیں آتی ہے مسعود کو علی گڑھ کا طالب علم دکھایا گیا ہے۔ واضح رہے کہ مصنف خود بھی علی گڑھ کا طالب علم رہ چکا ہے۔ اور اپنی پوری زندگی کو علی گڑھ کے لیے وقف کیے ہوئے ہے مصنف یہ بتانا چاہتا ہے کہ علی گڑھ کے طلبہ نے صرف قومی اور سیاسی زندگی میں ہی شاندار خدمات انجام نہیں دی ہیں بلکہ لاقانونیت اور جرائم کو ختم کرانے میں بھی ان کی کوششیں قابل قدر ہیں مسعود ایک موقع پر اس قسم کے خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ ملاحظہ ہو

"اسکول میں ہم لوگ شرلک ہومز کے قصے اور اسی طرح کے حیرت انگیز افسانے بکثرت پڑھتے ہیں۔ اور اکثر بھیس بدل بدل کر ان قصوں کی مشقیں کرتے ہیں۔ ہمارے استاد بھی ان باتوں میں ہماری مدد کرتے ہیں۔ چناں چہ ہمارے سابق ہیڈ ماسٹر مسٹر کارنا نے ایک قصہ بھی انگریزی نظم میں ہمارے لیے چھاپا ہے۔ ہملٹ اور مرچنٹ آف وینس کی بدولت میاں شفقت اور معین الدین نے اس قدر نام پیدا کیا۔ اب کالج میں دل چسپی کی نظر سے نہیں دیکھے جاتے" (ص ۲۶)

یہاں مصنف نے ایک جانب تو طلبہ کے بدلتے ہوئے ذوق کی جانب بھی نشان دہی کی ہے۔ اسی طرح آگے چل کر ایک علیگی ہونے کی بنا پر وہ علی گڑھ کے طلبہ کے سیاست بازی میں ملوث ہونے کے الزام کو اس صورت سے رد کرتے ہیں۔ جب کوتوال شہر مرزا صاحب مسعود سے پوچھتے ہیں۔

"مرزا صاحب:- میاں اخبار اور بڑے لوگ تو کہتے ہیں کہ علی گڑھ کے لڑکے رات دن پالیٹکس میں پڑے رہتے ہیں؟"

"مسعود:- جی یہ سب غلط ہے۔ بالکل بہتان ہے۔ لوگ جو کچھ پانیر میں پڑھتے ہیں۔ سچ سمجھنے لگتے ہیں۔ پڑھنے لکھنے سے ہمارا جو وقت بچتا ہے ہم عمدہ کھیلوں اور سراغرسانی کے قصوں میں صرف کرتے ہیں۔" (ص ۲۷)۔

مسعود جس نے یہ تمام کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ دسویں جماعت کا ایک سترہ سالہ لڑکا ہے

Marfat.com

خداداد ذہانت کے علاوہ اس کے پاس سراغ رسانی کی اور کوئی تربیت نہیں ہے۔ اس کا سرپرست کون ہے۔ اور تفتیش میں ہونے والے اخراجات کون ادا کرتا ہے۔ اسی طرح پولیس والوں کا یہ رویہ بھی حیرت ناک ہے کہ کوتوال صرف مسعود کو اس تمام کام کی ذمے داری سونپ دیتا ہے۔ اور کئی مقامات پر تو وہ اس لڑکے سے ملتجیانہ انداز میں گتھیوں کے حل کرنے کے لیے کہتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس کے بارے میں اس کے استاد کی یہ رائے پیش کی ہے "مسعود تمام علی گڑھ میں معروف ہے اور آگے چل کر ہندوستان کا شرلاک ہومز ہوگا"۔ مصنف نے مسعود کے کردار میں علی گڑھ کے ایک آئیڈیل طالب علم کا کردار پیش کیا ہے۔ اس میں حد درجے کی انکساری بھی دکھائی گئی ہے جب ایک مرحلے پر مسعود پولیس والوں کو اپنی ذہانت سے دنگ کر دیتا ہے۔ اور اس کے دعوے کے ثبوت میں سہراب جی کو بلوایا جاتا ہے۔ اس وقت کا منظر ملاحظہ ہو:

"سہراب جی ملاقات کے کمرے میں بلوائے گئے۔ ایسے تجربہ کار افسروں کو حیرت میں ڈالنا مسعود کے لیے کچھ کم کامیابی کی بات نہ تھی۔ لیکن اس پر فخر کرنے کی بجائے مسعود اپنی نظریں نیچی کیے سہراب جی کا انتظار کر رہا تھا۔ کبھی کبھی کن انکھیوں سے پولیس افسروں کی طرف دیکھ دیکھ کر دل ہی دل میں خوش ہوتا تھا۔" (ص ۴۶)۔

اسی طرح ایک اور جگہ مسعود کو کالج کی آن کی خاطر خطرات میں کودتا ہوا دکھایا گیا ہے۔

"آخر کار مسعود اپنی بات کا پکا ثابت ہوا۔ بہرام کی گیدڑ بھبکیوں سے مرعوب ہو کر مضمون بدل کر چھاپنے کا وعدہ تو کر لیا مگر بعد میں شاید اس نے جواں مردی اور اپنے پیارے کالج کی عزت اور شان کے خلاف سمجھا کر ایک حق بات محض ایک شاطر چور کی دھمکی میں آکر دوسری طرح بیان کی جائے اور تمام دنیا کو جو اس کے مضمون کا انتظار کر رہی تھی دھوکہ دیا جائے۔" (ص ۱۱۶)۔

Marfat.com

مسعود معاملات کی چھان بین کے سلسلے میں تمام پولیس والوں کو پیچھے چھوڑ دیتا ہے۔ مثلاً سہراب جی کی کوٹھی "نور محل" جہاں بہرام نے قتل کیا ہے اور گولی لگنے کے باوجود مکینوں اور نوکروں کے سامنے غائب ہو جاتا ہے۔ پولیس کو اس سلسلے میں کسی قسم کی معلومات نہیں ہیں۔ یہ مسعود ہی ہے جو "نور محل" کی تاریخ پر بھی روشنی ڈالتا ہے چناں چہ سہراب جی کی کوٹھی پر روشنی ڈالتے ہوئے وہ سرسید کی کتاب 'آثار الصنادید' کا حوالہ دیتے ہوئے کہتا ہے:

"مسعود: اگر آپ سرسید کی تصنیف 'آثار الصنادید' غور سے پڑھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ جس جگہ اب نور محل واقع ہے کسی زمانے میں یہاں جین مذہب کا مندر اور اس کے متعلق پادریوں کے رہنے کے مکانات بنے ہوئے تھے۔ ان مکانات میں جابجا تہ خانے بنے ہوئے تھے۔ جہاں لڑائی اور ہل چل کے زمانے میں یہ لوگ چھپ جایا کرتے تھے۔ یہ عمارت جسے عام طور پہ مقبرہ کہا جاتا ہے اس زمانے کا ایک مندر معلوم ہوتا ہے۔ میرا قیاس ہے کہ اس کے نیچے بھی تہ خانہ ہوگا مگر اب یہ پہلی راہیں سب بند ہو گئی ہیں۔ غالباً بہرام کو ان میں سے کوئی راستہ معلوم ہوگا۔ اور وہ اس تہ خانے میں چھپا ہوگا۔" (ص ۷۷)

بہرام کا کردار بہرام ایک بہادر اور نڈر آدمی ہے۔ وہ معمولی درجے کا چور اچکا نہیں ہے۔ وہ ہر جگہ موجود ہوتا ہے۔ اور چھلاوے کی طرح غائب ہو جاتا ہے۔ بہرام بہادر ہونے کے سبب اپنے بہادر دشمن کا بھی احترام کرتا ہے۔ جب مسعود نیلی چھتری کا راز فاش کر دیتا ہے۔ اور پہاڑوں کے اندر سے بہرام کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ اس وقت بہرام اس کے سامنے تمام اسرار پر سے پردہ اٹھاتا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ اب کھیل ختم ہونے والا ہے۔ اور پولیس اس کی تلاش میں تہ خانے کے دروازے یکے بعد دیگرے توڑتی ہوئی چلی آ رہی ہے۔ اس وقت

Marfat.com

بھی کہ جب اس کے دشمن مسعود کی بدولت اس کی ارضی جنت تباہ ہو رہی ہے۔ وہ مسعود سے نہایت اچھا سلوک کرتا ہے۔ جب کہ وہ اسے بہ آسانی قتل بھی کر سکتا تھا۔ وہ اس کو تمام راز بتاتا ہے۔

بہرام موجد اور خلاق بھی ہے۔ اس نے ایک شیشے کا جسیم کرّہ بنا رکھا ہے جس کو میکانکی انداز میں چلاتا ہے۔ اور اس میں مسعود کو بٹھا کر اپنے تہ خانے سے پولیس کی دسترس سے دور نکل بھاگتا ہے۔ اس جسیم کرّے میں بیٹھ کر وہ مسعود کو اس کی تکنیک سے آگاہ کرتا ہے۔ اپنی اس ایجاد کا نام بہرام نے "روشنفل" رکھا ہوا ہے۔ شہر میں ایک مقام پر مسعود کو اُتار کر بہرام اپنی محبوبہ کے ساتھ اوپر پرواز کر جاتا ہے لیکن بہرام کا کردار مسعود کے مقابلے میں اس قدر نمایاں نہیں بن پاتا۔

عمومی تبصرہ | بلا شبہ اس ناول اور دوسرے تمام ناولوں کے مطالعے سے یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ظفر عمر بی۔ اے میں بے پناہ قوت تخلیق تھی۔ انہیں بات کو نہایت خوبصورتی سے کہنے کا فن آتا تھا۔ اور شروع سے آخر تک ناول میں سنسنی خیزی برقرار رکھتے تھے۔ جو جاسوسی ناول کی ایک نہایت اہم خوبی ہے۔ ان کا فن اس لحاظ سے بھی قابل تعریف نظر آتا ہے کہ جس زمانے میں انہوں نے جاسوسی ناول لکھنے کا آغاز کیا۔ اردو میں جاسوسی ناول کی کوئی روایت موجود نہیں تھی۔ یہ بھی وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ انہوں نے دوسری زبانوں بالخصوص انگریزی زبان کے جاسوسی ادب کو پڑھا تھا یا نہیں۔ تاہم اگر انہیں اس نوع کے ناول لکھنے اور ایک جاسوسی کردار کو تخلیق کرنے کا خیال انگریزی ناول پڑھنے کے بعد بھی آیا تھا تو بھی اس میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اپنے ادب میں اس

Marfat.com

نوع کے تجربات کرنا قابل تحسین ہے۔ آج ہم عہد جدید کے جاسوسی ناول نگاروں کو دیکھتے ہیں کہ ان کے بیشتر قصے ماخوذ ہیں۔ اور ان کے ناولوں میں کرداروں کے ناموں کے علاوہ مقامیت کی چھاپ کا دور دور تک پتہ نہیں چلتا۔ جب کہ ظفر عمر کے تمام ناولوں کے کردار اور ان کی فضا تمام تر ہندوستانی ہے اور وہ اس کو پوری طرح پیش کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔

پلاٹ بنانے میں بھی مصنف کامیاب نظر آتا ہے۔ واقعات کی کڑیوں کے تسلسل میں کہیں کہیں جھٹکا سا محسوس ہوتا ہے۔ ظفر عمر ناول کو ڈرامائی انداز میں شروع کرتے ہیں اور واقعات کے بیان میں تمہید کے طور پر غیر ضروری طوالت سے گریز کرتے ہیں۔

ظفر عمر نے اس ناول کی بنیاد بھی چند مفروضوں پر رکھی ہے بعض تفصیلات کے سلسلے میں سرسید کی آثار الصنادید کا حوالہ دیتے ہیں۔ جو دہلی کی قدیم عمارتوں کے بارے میں تفصیلات فراہم کرتی ہے۔ نیلی چھتری میں سلاطین دہلی سے مغلیہ خاندان تک کے محفوظ دولت کے ذخائر دفن ہیں۔ تاریخ اور افسانے کی باہمی آمیزش سے ظفر عمر نے کہانی کا تانا بانا خوب اچھی طرح بنا ہے۔ ظفر عمر کے ناولوں میں گو بعض جگہ واقعات کی کڑیوں میں جھول بھی محسوس ہوتا ہے لیکن ان میں دلچسپی اور سنسنی خیزی اس حد تک ہے کہ ایک بار شروع کرکے بغیر ختم کیے ناول کو رکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ عموماً تفریحی ناولوں میں ہیروئن کا کردار ضروری ہوتا ہے۔ جو آخر تک تمام ناول میں اپنی عشوہ طرازیوں سے قارئین کو متوجہ کیے رکھتی ہے۔ لیکن ظفر عمر کے ناولوں میں عشق و محبت کے سہارے داستان آگے نہیں بڑھتی اور اس کے باوجود دلچسپی برابر قائم رہتی ہے۔ ان ناولوں میں عورتوں کے نام بھی آتے ہیں۔ اور ان کے کردار بھی موجود ہیں لیکن یہ کردار بہت نمایاں نہیں ہیں۔ اور پورے ناول میں کہیں

Marfat.com

عشق و محبت کا روایتی تعلق نہیں پیدا ہوتا۔ گو آخر میں صرف رستم جی کی بھانجی کے عشق میں بہرام کو گرفتار ہوتے دکھایا ہے۔ یہ واقعہ بھی صرف ضمنی طور پر پیش ہوتا ہے۔

لال کھنڈر | ظفر عمر نے تین ناول لکھے تھے۔ نیلی چھتری، بہرام کی گرفتاری اور لال کھنڈر میری نظر سے صرف دو ناول نیلی چھتری اور لال کھنڈر گزرے ہیں۔ اور انہی کا جائزہ ان صفحات میں لیا جا رہا ہے۔ کہانی مختلف ہونے کے باوجود ان ناولوں میں مسعود اور بہرام کے رول مشترک ہیں۔ نیلی چھتری میں بہرام ایک جرائم پیشہ دکھایا گیا ہے۔ ہم اس سے اس وقت رخصت ہوتے ہیں جب وہ اپنی ایجاد "رو نقل" میں بیٹھ کر فضا میں غائب ہو جاتا ہے۔ بہرام کی واپسی اس کے دوبارہ جرائم پیشہ زندگی میں لوٹ آنے سے عبارت ہے۔

لال کھنڈر کا کردار کنور محراب جنگ، اصل میں بہرام ہی ہے۔ جو جرائم سے تائب ہو کر نیک اور شریفانہ زندگی گزارنا شروع کرتا ہے۔ اور مسعود کو بھی اپنے ساتھ ملا لیتا ہے۔ چناں چہ محراب جنگ، میں محراب کے حروف کو الٹا جائے تو بہرام بن جاتا ہے۔ اس ناول میں یہ لوگ "خدائی فوجدار" کے روپ میں متعارف کرائے گئے ہیں۔ یہ لوگ ان جرائم پیشہ لوگوں کی سرکوبی کرتے ہیں اور انہیں قرار واقعی سزا دیتے ہیں جو پولیس کے ہاتھ سے بچ نکلتے ہیں۔ اس ناول میں ہم مسعود کو بہ اعتبار عمر زیادہ سنجیدہ پاتے ہیں۔

قصہ | محراب جنگ، لوک بہادر اور مسعود شہر دہلی میں "خدائی فوجداروں کے نام سے مشہور ہیں۔ دلّی میں ہی مرزا بلگرامی نام کا ایک شخص بمع اپنے گروہ کے رہتا ہے

Marfat.com

یہ جرائم پیشہ آدمی ہے لیکن قانون کی نگاہوں سے بچنے کے لیے سماجی کارکن اور مذہبی آدمی کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہے۔ اس ناول کا تمام تر قصہ ایک خفیہ خزانے کی تلاش کے گرد گھومتا ہے گھوکھلے نامی ایک مرہٹہ خدائی فوجداروں کے پاس اپنی جان کی حفاظت کے لیے آتا ہے گھوکھلے ان لوگوں کو اپنے راز سے آگاہ نہیں کرتا۔ اور دلی آمد کے تیسرے دن ہی سانپ کے کاٹنے سے پارک میں مردہ پایا جاتا ہے۔

ادھر مرزا بلگرامی اپنے اسکول میں مصوری اور کشیدہ کاری وغیرہ سکھانے کے لیے ایک پارسی لڑکی کی ضرورت کا اشتہار دیتا ہے۔ ہیرا بائی میرٹھ میں رہنے والی ایک لڑکی ہے جو اس ناول کی ہیروئن ہے۔ انٹرویو کے لیے آتی ہے اور ملازم ہو جاتی ہے۔ مرزا بلگرامی کا مقصود اصل میں ہیرا بائی کی تلاش ہی تھا ہیرا بائی مرزا بلگرامی اور اس کے ایک جرائم پیشہ ساتھی رتم جی کے ہاتھ چڑھ جاتی ہے لیکن خدائی فوجدار اسے ان لوگوں کے چنگل سے بچانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں گھوکھلے کی موت کے بعد سیٹھ بنارسی داس اس کی تلاش میں دہلی آتا ہے اور خدائی فوجداروں سے ملاقات کرتا ہے۔ وہ انہیں ہیرا بائی کے اغوا اور گھوکھلے کے راز سے آگاہ کرنا چاہتا ہے۔ مرزا بلگرامی کا گروہ لالہ بنارسی داس کی کوٹھی پر حملہ آور ہوتا ہے۔ مسعود، محراب جنگ اور پولیس کے افراد کی مدد سے مرزا بلگرامی کے فرستادہ غنڈے پکڑ لیے جاتے ہیں۔ اور تہ خانے سے محراب جنگ اور مسعود کو گھوکھلے کا لکھا ہوا طویل خط لالہ بنارسی داس کے نام ملتا ہے۔ جو تمام راز کی پردہ کشائی کرتا ہے۔

گھوکھلے کی تحقیقات و روایت کے مطابق سرکار بھوپال کے ہاں فریدوں نامی ایک انجینئر تھا جس کو سانچی ٹوپ کے جنگلات کا علاقہ حکومت کی خدمت کے صلے میں بارہ سال کی مستاجری پر ملا تھا۔ یہاں لال کھٹور نامی ایک مقام میں کروڑوں روپے

Marfat.com

کی سونے کے بُت ہیں۔ فریدوں جی اپنی اس جاگیر پر دشمنوں کے ہاتھوں مارا جاتا ہے۔ مرزا بلگرامی کو معلوم ہے کہ فریدوں جی کی ایک وارث لڑکی ہے۔ اگر تاریخ ختم ہونے تک وہ لڑکی اس جاگیر کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے درخواست نہ دے سکی تو مرزا بلگرامی اس جاگیر کو رستم جی پر حاصل کر کے کروڑوں روپے کی دولت کا مالک بن جائے گا۔ اس ضمن میں سیرا بائی کی تلاش کی جاتی ہے لیکن خدائی فوجدار مرزا بلگرامی اور اس کے ساتھی رستم جی کی تمام کارروائیوں کو ناکام بنا دیتے ہیں۔ آخر وہ جاگیر مسعود اور محراب جنگ کی کوششوں کی بدولت سیرا بائی کو ہی مل جاتی ہے۔

نیلی چھتری پر تنقید کرتے ہوئے ہم کہہ آئے ہیں کہ مصنف کو تاریخی واقعات اور بعض علاقوں میں مدفون دولت کے خزینوں سے خصوصی دلچسپی ہے۔ اس کہانی کی بنیاد بھی ایک ایسی ہی داستان ہے۔ کہ سانچی ٹوپ کے جنگلوں میں زیر زمین تہ خانوں میں سونے چاندی کے مدفون خزانے ہیں۔ مصنف اس علاقے کو بہت سے بادشاہوں کی رزم آرائیوں کا مرکز بتاتا ہے اور اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہاں بے شمار خزانہ دفن ہے۔ اس علاقے میں ایک کہاوت مشہور ہے۔

اونچی اٹریا لال کنوڑ
جس میں گڑے چھپن کروڑ

اسی کو مصنف نے داستان کی بنیاد بنایا ہے۔ اور اس کے ارد گرد بہت خوب صورت واقعات کا تانا بانا مہارت سے بُنا ہے۔ کہ قاری اوّل سے آخر تک اس کی دلچسپی میں کھویا رہتا ہے۔

مرزا بلگرامی کا کردار | نیلی چھتری کے برعکس اس ناول میں مسعود کے علاوہ مرزا بلگرامی کا

Marfat.com

کردار ہی جیتا جاگتا اور رہائل کردار ہے۔ وہ کٹھ پتلی نہیں ہے۔ اس کردار کے حوالے سے مصنف سماجی بُرائیوں کی جانب اشارہ کرتا ہے۔ مرزا بلگرامی دلی شہر کی ایک ممتاز سیاسی سماجی اور مذہبی شخصیت ہے۔ لیکن مصنف نے اسے حسن بن سباح کا مماثل قرار دیا ہے۔ اور اس کردار کے روپ میں مصنف نام نہاد مولویوں، مذہب کے نام لیواؤں اور معاشرے کے ٹھیکیداروں پہ طنز کرتا ہے۔ مذہبی اور تعلیمی معاملات میں مرزا بلگرامی دلچسپی لیتا ہے لیکن اندرونی طور پر وہ ایک سماج دشمن فرد ہے۔ اس کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ وہ فرقہ وارانہ فسادات کراتا ہے۔ ایک ایسے ہی موقعہ پہ مصنف اس کی زبان سے اس کے باطنی احوال کو یوں بیان کرتا ہے "ہندو مسلمان ایک دوسرے کے خون کے پیاسے اب ایسے نہیں رہے جیسے پہلے تھے۔ اور دونوں قومیں ایک دوسرے کے قریب آتی جاتی ہیں باوجود کوشش کے نہ کہیں بلوے ہوتے ہیں نہ مقدمہ بازی!"....

مرزا بلگرامی اپنے آپ کو حسن بن سباح سے زیادہ با اثر اور کامیاب انسان سمجھتا ہے۔ اس نے سانپ کے زہر کی خاص ترکیب سے گولیاں بنا رکھی ہیں جنھیں پائپ کے ذریعے دشمنوں کے جسم پہ مارتا ہے۔ اور زہر مساموں میں داخل ہو کر انسان کو قتل کر دیتا ہے: "بے شک حسن بن سباح اپنے وقت کا عجیب شخص تھا۔ جس کے خوف سے ممالک کے تاجدار بڑے بڑے مدبر اور جید عالم سب کانپتے تھے۔ اس کے فدائی دائمی بہت پختہ اور وفادار تھے لیکن چھری سے قتل کرنے کا طریقہ بہت بھونڈا اور وحشیانہ تھا۔ آج وہ زندہ ہوتا اور میرے طرز عمل کو دیکھتا تو ضرور میرے شاگردوں کے گروہ میں شامل ہو جاتا۔ اس لحاظ سے مجھے شیخ الجبل پہ بڑی فوقیت ہے۔ میرے مقابلے میں حسن بن سباح طفل مکتب کی حیثیت رکھتا ہے۔ حسن بن سباح نے اپنے فدائیوں پر تسلط حاصل کرنے کے لیے کیا کیا پاکھنڈ پھیلا رکھے تھے۔ ایک مصنوعی بہشت بھی بنائی تھی۔ جہاں خوبصورت اور نوجوان عورتوں کو حوروں کے لباس میں رکھتا تھا۔ اور ان کے عشاق کو اس مصنوعی بہشت میں ان کے نظارے سے متوحش کرتا۔ اور ان سے ملاقات کے وعدے پہ اپنے فدائیوں کے زمرے میں شامل کرتا تھا لیکن

Marfat.com

میرے فدائی اور شاگرد کار گزاری کے لحاظ سے شیخ الجبل کے فدائیوں سے کسی طرح کم نہیں۔ میرے اشارے پر کٹھ پتلی کی طرح کام کرتے ہیں۔ اور بڑی خوبصورتی سے لوگوں کو اس دنیائے فانی کے علائق سے آزاد کر دیتے ہیں۔ میں نہ حوروں کی ملاقات کا سبز باغ دکھاتا ہوں۔ نہ ان کی عاقبت درست کرنے کا وعدہ کرتا ہوں۔ انسان کا دماغ بھی عجیب چیز ہے۔ میں اپنی دماغی فوقیت کی بدولت بہ آسانی لوگوں کو مسحور کر لیتا ہوں۔ اور جو چاہتا ہوں کام لیتا ہوں۔ کچھ دنوں بعد جب موجودہ زمانے کی تاریخ لکھی جائے گی تو میرا نام حسن بن صباح کے مقابلے میں سنہرے حروف میں لکھا جائے گا۔" (ص ۶۷-۶۸)

مصنف نے اس انداز میں بہت خوبی کے ساتھ مرزا بلگرامی کے کردار کو کبریہ انداز میں پیش کر دیا ہے مرزا بلگرامی کو علم کیمیا کا بھی شوق ہے۔ علاوہ ازیں اس کا مطالعہ وسیع اور متنوع بھی ہے جس سے وہ لوگوں کو متاثر کر لیتا ہے جب وہ اپنے پیرو مرزا علی غضنفر کو خطرناک زہر دے کر اسے مسعود کے قتل پہ اکساتا ہے تو اس کے ضمیر کو مطمئن کرنے کے لیے یہ کہہ کر تسلی دیتا ہے۔ "تم بڑے نا سمجھ ہو۔ یہ قتل کیسا ہوا۔ کیا تم نے نہیں پڑھا کہ خدا بڑا انتقام لینے والا ہے۔ فرعون نے خدائی کا دعویٰ کیا۔ اس سے انتقام لینا ضروری تھا۔ خدا نے موسیٰ کے ہاتھ سے انتقام لیا۔ اور اسے غرق کر دیا۔ نمرود کو بھی خدا نے اسی طرح اس کے غرور کی سزا دی۔ ان مثالوں سے ثابت ہوا کہ انتقام لینا نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہے میں معاملات کے مذہبی پہلو سے بخوبی واقف ہوں۔ اگر کوئی بات خلاف مذہب ہوتی تو مجھ جیسا خدا پرست اور متقی آدمی کبھی تم سے نہ کہتا۔ مسعود نے تمہارے کوڑے لگائے۔ اس نے میرے معصوم بھائی کو ناحق قتل کیا۔ ایسی حالت میں انتقام لینا بالکل درست اور سراسر جائز ہے۔ اس کے علاوہ اپنے پیر کو خوش کرنا اور اس حکم کی تعمیل کرنا عین عبادت ہے۔ میں تمہاری کامیابی کے لیے دعا کروں گا تم اس خطرناک آدمی کو اپنے اور میرے راستے سے ہٹا دو گے۔"

لال کشور میں بھی بہت سے کردار سامنے آتے ہیں۔ مثلاً بکرم سنگھ، مرزا بلگرامی، رستم جی، کملا بائی، ہیرا بائی

Marfat.com

مسعود، محراب جنگ، گھوکھلے، لوک بہادر، بنارسی داس، بندو وغیرہ لیکن نیلی چھتری کی طرح اس ناول میں بھی یہی خامی کھٹکتی ہے کہ اس کے بیشتر کردار بے جان ہیں۔ لال کنور میں صرف مسعود اور مرزا علی زندہ کردار ہیں۔

ناول میں بعض فقروں کی تکرار بہت کھٹکتی ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کو قاری کے حافظے پر اعتبار نہیں ہے۔ اور اکثر جگہ وہ بار بار ایک ہی بات کہتے ہیں۔ مثلاً مسعود کے کردار کے بارے میں ایک ہی جگہ یہ فقرہ کہہ دینا کافی تھا جس سے اس کردار کی یہ خوبی قاری کے ذہن میں اپنا نقش جما لیتی "مسعود کو دوسرے لوگوں کے انداز گفتگو اور بشرے سے یہ معلوم کرنے کی مہارت حاصل تھی کہ بیان سچ ہے یا غلط۔" (ص ۶۴) یہ فقرہ بس ایک ہی جگہ شروع میں کردار کی خوبیاں متعارف کراتے ہوئے لکھ دینا کافی تھا لیکن بار بار آتا ہے بحیثیت مجموعی یہ ناول بھی دلچسپ ہے۔

ہیرا بائی، جو اس ناول کی ہیروئن کہلائی جا سکتی ہے۔ اس کا کردار بھی بہت زیادہ ابھر کر سامنے نہیں آیا وہ بہادر ہے لیکن اس کشمکش میں اس کے کردار کی جدوجہد کو نمایاں نہیں کیا گیا۔ رستم جی کی داشتہ کا یہ فقرہ ہیرا بائی کے کردار کے بارے میں روشنی ڈالتا ہے "۔۔۔ ہے تو نو عمر مگر بوڑھوں کی طرح سنجیدہ۔ لڑکیوں کی طرح چہل پہل کی باتیں نہیں کرتی۔" (ص ۵۵)

ناول کے مطالعے کے دوران جگہ جگہ پولیس والوں کے خلاف ریمارکس ملتے ہیں۔ یہ بات اس لیے اور بھی دلچسپ ہے کہ مصنف خود بھی ایک ذمے دار پولیس افسر رہ چکا ہے۔ اس سلسلے میں چند اقتباسات ملاحظہ ہوں

"اسی خوشی میں اگر مرزا رحیم بیگ (کوتوال شہر) نے مقدمے کے حالات اخبارات کے رپورٹروں سے بھی کہہ دیے۔ اور تمام پولیس افسران کی عادت کے خلاف جو ہر کارروائی کو فردی کی کوششوں سے

منسوب کیا کرتے ہیں مرزا صاحب نے اس کامیابی کا سہرا مسعود کے سر باندھا"

(ص ۵۹) ۔

پولیس کے انداز تفتیش کے بارے میں ایک اور جگہ مصنف کا نقطہ نظر مسعود کی زبان سے یوں ادا ہوتا ہے :۔

مرزا صاحب :" سوچنے کا یہ کون سا موقع ہے ۔ پہلے تو ادھر اُدھر دیکھنا پڑتا لوگوں سے حال پوچھنا ۔ اور واقعات معلوم کرنا اور سراغ لگانا چاہیے ۔ اس کے بعد سوچنے غور کرنے اور واقعات سے نتیجہ نکالنے کا وقت آتا ہے"

مسعود :" جی ہاں ، مجھے معلوم ہے پولیس کا یہی دستور ہے لیکن میرا طریقہ اس سے مختلف ہے ۔ میں پہلے غور کرتا ہوں تاکہ مقدمے کا خاکہ سمجھ میں آجائے پھر واقعات کی چولیں اس ڈھانچے کے مطابق بٹھانے کی کوشش کرتا ہوں" (ص ۶۵) ۔

ایک اور جگہ ......

" علاوہ اس کے پولیس کی سست رفتاری اور بے ڈھنگے پن سے معاملہ خراب ہوجانے کا احتمال تھا" (ص ۱۲۲) ۔

اسی طرح ان کے دوسرے ناول لال کھنڈر میں ایک جگہ گھو کھلے مرہٹہ پولیس کی شکایت یوں کرتا ہے :۔

"تم کیسی باتیں کرتے ہو ۔ جہاں میں تھا وہاں پولیس کا کہیں پتہ نہ تھا ؟ جنگل بیابان تھا ۔ علاوہ اس کے پولیس کرتی ہی کیا ہے ۔ مجھے پولیس کا تلخ تجربہ ہے"

مجموعی طور سے لال کھنڈر اور نیلی چھتری دونوں ناول اچھے ہیں ۔

Marfat.com

مستقبل اسلام | "مستقبل اسلام" مشہور مستشرق پروفیسر دامبری کی کتاب "مغربی تمدن اور مشرقی ممالک" کے آخری باب کا اردو ترجمہ ہے۔ جسے ۱۹۱۰ء میں لاہور کے ایک ناشر نے شائع کیا تھا۔ پروفیسر دامبری مایۂ ناز عالم تھے۔ ان کی ابتدائی زندگی سخت نامساعد حالات میں گزری۔ وہ کئی زبانوں کے ماہر تھے۔ اور مسلم ملکوں کی تاریخ، ملّت اسلامیہ کی تہذیب و ثقافت ان کا پسندیدہ موضوع تھا۔ گزشتہ تین صدیوں میں مسلمان ملکوں میں رونما ہونے والی سیاسی، تہذیبی اور تمدنی تحریکوں کا مطالعہ، مغربی تمدن اور ان ملکوں کے باشندوں پر مغربی تمدن نے کیا اثرات قائم کیے ہیں، ان کی فکر اور قلم کا محور رہی ہے۔

پروفیسر موصوف کو بہت سے اسلامی ملکوں بالخصوص ترکی میں طویل عرصے تک رہنے کا موقع ملا۔ وہ ترکی کے وزیر خارجہ کے سکریٹری بھی رہے۔ لہٰذا اسلامی ملکوں اور وہاں کے باشندوں اور ان کے طرز تمدن پر مغربی تمدن کے مشاہدے کا بھی انہیں موقع ملا۔

بعض ارباب دانش کا خیال تھا کہ چوں کہ انگلستان مسلمان ملکوں سے دور دراز مقام پہ واقع ہے لہٰذا اس کے تہذیبی و تمدنی اثرات مسلمان ملکوں پہ زیادہ اثر انداز نہیں ہو سکتے اور نہ ہی تمدنی اعتبار سے وہ مشرقی ممالک کو متاثر کر سکتا ہے۔ جبکہ روس چونکہ بعض مشرقی ممالک کے بہت قریب ہے۔ وہ تمدنی اعتبار سے ان مشرقی ممالک پہ زیادہ اثر انداز ہو سکتا ہے۔ مصنف نے اس نقطہ نظر کو تاریخی حوالوں سے غلط قرار دیا ہے۔

ہمارے خیال میں اس کتاب کے آخری باب کے ترجمہ کرنے کی کئی وجوہ ہو سکتی ہیں پہلی وجہ تو یہ ہے کہ اس کتاب میں پروفیسر دامبری نے مسلمان ملکوں کی تہذیبی، سیاسی اور ثقافتی تحریکوں کو زیر بحث لاتے ہوئے سرسید احمد خان کی تحریک کو بھی ملحوظ رکھا ہے۔ اور ان کی جانب سے کی جانے والی کوششوں اور اقدامات کی تعریف کی ہے۔ چوں کہ مصنف خود بھی ایک عیسائی

Marfat.com

تھے ۔ اور سرسید احمد خان کے نقطہ نظر سے متفق تھے ۔ لہٰذا ان کی ذاتی دلچسپی اس کتاب کے ترجمے کا باعث ہوسکتی ہے ۔

اس کی دوسری وجہ سیاسی تھی ۔ انگریزوں کو غیر منقسم ہندوستان میں ہمیشہ روس کی جانب سے خوف لگا رہا تھا ۔ چوں کہ اس کتاب میں پروفیسر وامبری نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ برطانوی تہذیب و ثقافت نے بالخصوص ہندوستان کے مسلمانوں پر خوش گوار اثرات ڈالے ہیں ۔ جب کہ اس کے مقابلے میں روسی تمدن کے اثرات نہ تو برصغیر کے مسلمانوں پر اور نہ ہی وسط ایشیا کے مسلمانوں کے حق میں بہتر ثابت ہوسکتے ہیں ۔ اس طرح اس کتاب کا مطالعہ برصغیر کے مسلمانوں کے دلوں میں انگریزی حکومت کے لیے اور زیادہ ہمدردانہ نقطہ نظر پیدا کرنے کا باعث بن سکتا تھا ۔ ایک جگہ مترجم لکھتا ہے :

"مؤلف نے انگریزی حکومت کے اثر کا ذکر کرتے ہوئے جا بجا روسی حکومت کے طرز عمل سے مقابلہ کیا ہے ۔ اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ انگریزی تمدن کا اثر سرعت کے ساتھ ترقی کر رہا ہے ۔ اور بہ نسبت روسی تمدن کے اس کی بنیاد زیادہ مستحکم اور پائیدار ہے[1] ۔"

ظفر عمر بی ۔ اے نے یہ ترجمہ مصنف کی اجازت سے کیا تھا ۔ مصنف کے خط کو ذیل میں پیش کیا جاتا ہے :-

بوڈاپسٹ

۱۳ر جنوری ۱۹۱۰ء

جناب من ! جو خیالات آپ نے میری کتاب اور خصوصاً اس حصّے کی بابت ظاہر

---

[1] مستقبل اسلام ۔ ص: ۱۰ - ۱۱ ۔

Marfat.com

فرمائے ہیں۔ جو مستقبل اسلام سے متعلق ہیں اسے دیکھ کر بڑی مسرت حاصل ہوئی۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ اسلامی دنیا کے مختلف حصوں سے آپ جیسے روشن خیال اصحاب نے اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ مصنفین کا سب سے بڑا انعام یہ ہے کہ ناظرین ان سے اتفاق آرا کریں۔ ترکی اور ایران کے تازہ ترین واقعات نے میرے خیالات کو بالکل حق بجانب ثابت کیا ہے۔ اور اگر دُنیا جان بوجھ کر اندھی ہونا نہیں چاہتی، تو وہ دیکھ لے گی کہ اسلام باوجودیکہ اس کے جسم پر اس کے سابق فرماں رواؤں نے نہایت کاری زخم لگائے ہیں مرنے والا نہیں ہے۔ اگر آپ میری کتاب کے اس حصے کا اردو میں ترجمہ کریں تو میں بہت خوش ہوں گا۔ میں اپنی جانب سے آپ کو پوری اجازت دیتا ہوں۔ اور اپنی تصویر بھی پیش کرتا ہوں۔ جب ترجمہ شائع ہو تو مجھے بھی ایک نسخہ عنایت کیجیے۔

نیاز مند

دا مبری

مستقبل اسلام تقریباً پونے دو سو صفحات پر محیط ہے۔ اس کے کل نو باب ہیں۔ مترجم نے نہایت رواں دواں اور سلیس ترجمہ کیا ہے۔

Marfat.com

میجر جنرل (ریٹائرڈ) سید شاہد حامد

خان بہادر سید حامد حسین کی شادی مرزا محمد فصیح کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ مرزا فصیح کا شمار لکھنؤ کے ممتاز وکلا میں ہوتا تھا۔ ان کی رہائش قیصر باغ کے ایک عظیم الشان مکان میں تھی جو کسی زمانے میں شاہانِ اودھ کی ملکیت رہ چکا تھا۔ انہی خاتون کے بطن سے میجر جنرل (ریٹائرڈ) سید شاہد حامد پیدا ہوئے۔ سید شاہد حامد صاحب کی نانی، سردار بہادر میر جعفر کی صاحبزادی تھیں۔ سردار بہادر میر جعفر کا شمار اپنے زمانے کے نامور سپاہیوں میں ہوتا تھا۔ ان کی شجاعت اور بہادری کے قصے عام تھے۔ شروع میں انہوں نے انگریزوں کے خلاف کئی جنگوں میں حصہ لیا اور دادِ شجاعت دی۔ آخر میں انگریزی فوج میں ملازمت اختیار کر لی تھی۔ مختلف جنگوں میں وہ اٹھارہ بار زخمی ہوئے۔ بہادری و شجاعت کے اعتراف میں انھیں تمغہ بھی ملا تھا۔ جو اپنی اہمیت کے اعتبار سے وکٹوریہ کراس کے برابر تھا۔

مرزا محمد فصیح کے صاحبزادے مرزا محمد وجیہہ اودھ کے ایک تعلقدار اور انکم ٹیکس کمشنر تھے۔ سید شاہد حامد صاحب کی دادی جان کا تعلق بھی ہندوستان کے ایک معزز اور شریف خاندان سے تھا۔ وہ مشہور صوفی شاہ کلیم اللہ دہلوی کے خاندان سے تھیں۔ جن کا مزار دہلی میں قلعے کے پاس ہی ہے۔

Marfat.com

ولادت ۱۹۱۱ء میں لکھنؤ میں ہی قیصر باغ میں اپنی ننہال کے گھر میں سید شاہد حامد صاحب پیدا ہوئے۔ بچپن کا زیادہ تر حصہ لکھنؤ میں گزرا۔ قدیم روایات کے حامل ایک ایسے متمول گھرانے میں سید شاہد حامد صاحب نے اپنا بچپن گزرا۔ جہاں مغربی تعلیم کی تازہ ہوا بھی آرہی تھی۔

ہندوستان کے شریف گھرانوں کی روایت کے مطابق سید شاہد حامد صاحب کی مذہبی تعلیم کا سب سے پہلے آغاز ہوا۔ اس کے ساتھ ساتھ انہیں اسکول کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ گھر میں دینوی اور دینی تعلیم دینے کے لئے مولوی اور ماسٹر مقرر تھے۔ بچوں کی تعلیم و تربیت میں بے جا لاڈ پیار نہیں کیا جاتا تھا۔ چنانچہ سید شاہد حامد صاحب کا بیان ہے کہ ایک بار مولوی صاحب کی شکایت پر ان کے والد نے ان کے ہاتھ باندھ کر درخت سے لٹکا دیا تھا۔ گو بچوں کے لئے آرام و آسائش کے جملہ سامان مہیا تھے لیکن ان کے والد اپنے بچوں کی تربیت اس صورت سے کرنا چاہتے تھے کہ ان میں اپنی ذات پر زیادہ سے زیادہ اعتماد پیدا ہو سکے۔

علیگڑھ اسکول سید شاہد حامد صاحب کے خاندان کی روایت دو نسلوں سے یہ بن چکی تھی کہ بچوں کو تعلیم کے لئے علیگڑھ اسکول اور کالج بھیجا جاتا تھا۔ چنانچہ ۱۹۲۲ء میں سید شاہد حامد صاحب اور ان کے بھائی سید محمود حامد کو علیگڑھ اسکول میں داخل کرا دیا گیا۔ لیکن اس اسکول میں دونوں بھائیوں کو ایک سال تک پڑھنے کے بعد واپس لکھنؤ بلا لیا گیا۔

کلونت تعلقدار اسکول اس اسکول میں سید شاہد حامد صاحب کے چچا بھی زیر تعلیم رہ چکے تھے۔ یہ اسکول صرف تعلقداروں یا طبقہ امرا کے بچوں کی تعلیم کے لئے مخصوص تھا۔ یہ لاہور کے ایچی سن کالج کی طرز کا ادارہ تھا۔

Marfat.com

یہ ایک چھوٹا سا اسکول تھا جو تعلقداروں کے بچوں کی تعلیمی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے کافی تھا۔ اس اسکول کے اساتذہ زیادہ تر یورپین ہوتے تھے۔

اکثر و بیشتر صوبجات متحدہ کا گورنر اس اسکول کے معائنے کے لئے آتا رہتا تھا۔ کبھی کبھی وائسرائے ہند بھی اس اسکول کے معائنے کے لئے آتا تھا۔ سید شاہد حامد صاحب کا بیان ہے کہ ان کے زمانہ طالب علمی میں مہاتما گاندھی، موتی لال نہرو اور ہندوستان کے دوسرے صف اوّل کے قومی لیڈر بھی اس اسکول میں آتے جاتے رہتے تھے۔

سید شاہد حامد صاحب کے زمانہ طالب علمی میں کلونت تعلقدار اسکول کے پرنسپل مشہور ماہر تعلیم کونرے ریسی تھے۔ جو کسی زمانے میں علیگڑھ اسکول کے پرنسپل بھی رہ چکے تھے۔ سید شاہد حامد صاحب کا بیان ہے کہ اسکول میں شرارتی لڑکوں کے سرگروہ ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ جب شرارتوں پر بازپرس ہوا کرتی تو وہ اس کا اعتراف کر لیتے تھے۔ ایک بار ایسے ہی ایک موقع پر پرنسپل نے انھیں کاندھوں سے پکڑ کر جھنجوڑتے ہوئے کہا تھا کہ شرارتوں میں تو تم اپنے والد سے بھی دو ہاتھ آگے ہو۔ چنانچہ ان کی شرارتوں کے بارے میں ایک خط ان کے والد کو لکھا گیا۔ والد کے دریافت کرنے پر جب سید شاہد حامد صاحب نے تمام واقعہ سنایا تو وہ مسکرا کر خاموش ہو گئے۔

اسکول کے قانون کے مطابق تمام طلبہ کے لئے بورڈنگ ہاؤس میں رہنا لازمی تھا البتہ ہر طالب علم کو اپنے ذاتی ملازم اور خانساماں رکھنے کی اجازت تھی۔ جو ان کے جملہ کام کرتے تھے

اردو کے استاد کا مشورہ

اس اسکول میں اردو پڑھانے پر ایک نہایت قابل مولوی صاحب مقرر تھے۔ ایک بار جماعت میں انھوں نے طلبہ کو بتایا کہ جب تک انھیں "مناسب صحبت" میسر نہیں آئے گی وہ اردو

Marfat.com

میں قابل نہیں ہو سکیں گے۔ تمام جماعت اس بات پر متعجب ہوئی اور جب ان سے دریافت کیا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ ان کی مراد "بازارِ حسن" سے ہے۔ بہر حال لڑکوں نے اپنے استاد کے مشورے پر عمل نہیں کیا۔

برجیش سنگھ

تعلقداروں کے بچے تعلیم کی طرف زیادہ توجہ نہیں دیتے تھے یہاں ہندو اور مسلمان تعلقداروں کے بچے پڑھتے تھے۔ اکثر بچے اسکول میں ابتدائی برسوں کے بعد ہی تعلیم ادھوری چھوڑ کر چلے جاتے تھے۔ کم بچے میٹرک تک پڑھنے کی زحمت گوارا کرتے تھے۔ اور جو بچہ اس اسکول سے میٹرک پاس کر لیتا تھا۔ اس کو ساتھیوں اور تعلقدار گھرانوں میں قدر و منزلت کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔

اسی اسکول میں ایک سکھ تعلقدار کے تین بچے بھی سید شاہد حامد صاحب کے زمانہ طالب علمی میں پڑھتے تھے۔ ان بھائیوں سے سید صاحب کی دوستی تھی۔ ان میں سے ایک جس کا نام برجیش سنگھ تھا۔ ہندوستان کا مشہور کمیونسٹ لیڈر بنا۔ جو بعد ازاں سوویت یونین چلا گیا تھا۔ اور اسٹالن کی بیٹی سویتلانہ سے شادی کر لی تھی۔ اسی کے انتقال کے بعد سویتلانہ اس کی راکھ لے کر ہندوستان آئی تھی۔ اور وہاں سے اپنے وطن واپس جانے کے بجائے مستقل طور پر امریکہ چلی گئی تھی۔

علیگڑھ کالج

کالج کی تعلیم کے لئے سید شاہد حامد صاحب علی گڑھ کالج گئے یہ وہی درس گاہ تھی۔ جہاں ان کے خاندان کے دیگر افراد بھی تعلیم حاصل کرنے جاتے تھے۔ اس درس گاہ میں ان کے دادا سید جعفر حسین کی نشانیاں قدم قدم پر تھیں۔ جو سر سید احمد خاں کے مشیر تعمیرات تھے۔

علی گڑھ میں طلبہ کی تعلیم و تربیت کی طرف خصوصی توجہ دی جاتی تھی اور تمام لوگ

Marfat.com

ایک جذبے کے ساتھ زندگی گزارتے تھے۔ طلبہ کی تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کے کھیل کود کی طرف بھی خاص توجہ دی جاتی تھی۔ سید شاہد حامد صاحب کے زمانہ طالب علمی میں علی گڑھ انٹرمیڈیٹ کالج کے پرنسپل عبدالمجید قریشی تھے۔ جو طلبہ میں بہت مقبول ۔ اور نظم و ضبط کے پابند تھے وہ بہت سی انسانی خوبیوں سے متصف تھے۔

اسی زمانے میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہو جانے کے بعد جب سر راس مسعود انٹرمیڈیٹ کالج میں پہلی بار آئے تو طلبہ کی طرف سے خیر مقدمی تقریر کے لئے سید شاہد حامد صاحب کو منتخب کیا گیا۔ انگریزی کے پروفیسر لوری نے انھیں تقریر لکھ کر زبانی یاد کرنے کے لئے دے دی۔ سید شاہد حامد صاحب کا بیان ہے کہ "میں نے تقریر تو اچھی طرح یاد کرلی تھی۔ لیکن جب تقریر کرنے کھڑا ہوا تو بھول گیا۔ آخر اسی وقت جس طرح ممکن ہوا اپنے الفاظ میں تقریر کی۔"

علی گڑھ کالج کے ٹرسٹی اور مسلمانوں کی تعلیم میں دلچسپی رکھنے والے ہندوستان کے بہت سے لیڈر درس گاہ میں آتے رہتے تھے۔ اور گھنٹوں طلبہ کے ساتھ مل بیٹھ کر ان کے مسائل پر گفتگو کیا کرتے تھے۔ سید شاہد حامد صاحب کا بیان ہے کہ ایک بار میرے دادا دو افراد کے ساتھ میرے کمرے میں آئے۔ ان میں سے ایک صوبہ سرحد کے صاحبزادہ سر عبدالقیوم اور دوسرے مدراس کے سر محمد عثمان تھے۔

علی گڑھ انٹرمیڈیٹ کالج کے سال آخر میں سید شاہد حامد صاحب کو کالج کی ٹیبل ٹینس کی ٹیم کے کپتان ہونے کی وجہ سے برصغیر کے مختلف شہروں اور کالجوں میں جانا پڑا۔ اس سبب سے وہ تعلیم کی طرف خاطر خواہ توجہ نہ دے سکے۔ علی گڑھ کالج کے اس زمانے کے اساتذہ طلبہ پر انفرادی توجہ دیتے تھے اور ان کے مسائل سے باخبر رہتے تھے۔

Marfat.com

چنانچہ اساتذہ نے سید شاہد حامد صاحب سے کہا کہ انھوں نے بہت سا وقت کھیل کود میں نکال دیا ہے۔ لہٰذا اب اس کمی کو دور کیا جانا چاہیئے۔ چنانچہ ہر روز سید صاحب ایک ایک استاد کے گھر جاتے اور وہ ان کو پڑھاتے تھے۔ چنانچہ جب نتیجہ نکلا تو اساتذہ کی اس خصوصی اور بے لوث توجہ کے سبب سید صاحب نے نہایت اچھے نمبر حاصل کئے۔

یونیورسٹی میں داخلہ

سید شاہد حامد صاحب کے والد اپنے بیٹے کو انجینئر بنانا چاہتے تھے۔ چنانچہ جب یونیورسٹی میں داخلے کا وقت آیا تو انھیں کلیۂ سائنس میں داخلہ لینے کو کہا گیا۔ اس وقت سید شاہد حامد صاحب نے ریاضی میں کمزور ہونے کے سبب آرٹس میں داخلہ لینا پسند کیا۔

کمیشن

جب بی اے کے سال آخر میں پہنچے تو اپنے والد کی فرمائش پر سید صاحب نے سینڈ ہرسٹ ملٹری کالج میں داخلے کے مقابلے کی تیاری شروع کر دی۔ سید صاحب کا بیان ہے کہ جب میں نے وائس چانسلر سے اپنی والد کی خواہش کا تذکرہ کیا تو وہ بہت خوش ہوئے اور انھوں نے فرمایا کہ میں اور یونیورسٹی کے تمام اساتذہ تمھاری پوری پوری مدد کریں گے۔ چنانچہ متعلقہ مضامین کے پروفیسر حضرات تین ماہ تک ان مضامین کی تیاری میں میری مدد کرتے رہے اور میں پہلے ہی مرحلے میں اس امتحان میں کامیاب ہو گیا۔" تحریری مقابلے میں تین سو امیدوار شریک ہوئے تھے۔ سید شاہد حامد صاحب تمام امیدواروں میں اوّل نمبر پر آئے۔ اور منتخب ہونے والے اولین دس لڑکوں میں بھی ان کا نمبر پہلا تھا۔

جملہ اہل خاندان کو بالعموم اور خان بہادر سید حامد حسین کو بالخصوص اپنے بیٹے کی اس کامیابی پر بہت زیادہ خوشی ہوئی۔

Marfat.com

سینڈہرسٹ روانگی اور تعلیم

۱۹۲۲ء میں سید شاہد حامد صاحب لکھنؤ سے روانہ ہوئے۔ بھوپال ریلوے اسٹیشن پر خان بہادر سید جعفر حسین نے جو اس زمانے میں بھوپال میں ملازم تھے۔ انھیں ایک ہزار روپیہ دیا اور تاکید کردی کہ کسی سے اس کا ذکر مت کرنا۔

بمبئی پہنچ کر بذریعہ بحری جہاز سید صاحب اپنے دوسرے ساتھیوں کے ہمراہ انگلستان روانہ ہوئے۔ نیا ملک جس کو دیکھنے کی ہر نوجوان ہندوستانی میں تمنا تھی۔ اپنی پوری جلوہ سامانیوں کے ساتھ ان کے سامنے تھا۔ سینڈہرسٹ پہنچنے کے دوسرے دن ہی سے تربیت کا آغاز ہوگیا۔ سینڈہرسٹ کالج کی زندگی کا ایک ایک پل قواعد وضوابط میں جکڑا ہوا تھا۔ یہاں طلبہ کو تمام دن مصروف رہنا پڑتا تھا۔ سخت کوشی کی زندگی تھی۔ اور ابتدائی دنوں میں نو وارد طلبہ کا گھبرا جانا فطری بات تھی۔ تاہم صبر وتحمل سے کام لئے جانے کے بعد دو تین ہفتوں میں ہی انسان اس زندگی کا عادی ہو جاتا تھا۔

سینڈہرسٹ کالج میں پڑھائی کے ساتھ ساتھ سید صاحب کھیلوں میں بھی نمایاں تھے۔ یہاں وہ ہاکی اور ٹینس کھیلا کرتے تھے۔ وہ کالج کی ٹینس کی ٹیم کے رکن تھے اور انھیں ٹینس بلیو کلر ملا ہوا تھا۔

سینڈہرسٹ میں اس زمانے میں بعض انگریز ہم جماعتوں کے گھروں میں بھی سید شاہد حامد صاحب کو آنے جانے کا اتفاق ہوا۔ مشہور ادیب وشاعر اور مجسمہ ساز لارڈ ڈنسینی LORD DWNSANY کے صاحبزادے بھی سید صاحب کے ہم جماعت تھے۔ چنانچہ سید صاحب کو لارڈ ڈلسینی سے بھی ملاقات کا موقع ملا۔

سینڈہرسٹ میں اس زمانے میں جان ماسٹرز بھی زیر تعلیم تھے۔ جو بعد میں بحیثیت

Marfat.com

مصنف بہت مشہور ہوئے جان ماسٹرز، سینڈ ہرسٹ کالج کے بورڈنگ ہاؤس میں سید صاحب کے برابر کے کمرے میں رہا کرتے تھے۔ دونوں میں آج بھی دوستانہ مراسم ہیں۔ اور جان ماسٹرز امریکہ سے پابندی کے ساتھ سید صاحب سے خط و کتابت کرتے ہیں۔

پاسنگ آؤٹ پریڈ

سینڈ ہرسٹ ملٹری کالج سے فارغ التحصیل ہونے والے طلبہ کی پاسنگ آؤٹ پریڈ کے معائنے کے لئے ملکہ وکٹوریہ کے بیٹے ڈیوک آف کناٹ تشریف لائے تھے۔ سید شاہد حامد صاحب اور ان کے باقی ساتھیوں کو شہنشاہ جارج پنجم کے دستخطوں سے کمیشن دیا گیا تھا۔

ہندوستان واپسی اور پہلی تقرری

کمیشن ملنے کے بعد جب سید شاہد حامد صاحب واپس ہندوستان پہنچے۔ تو ان کا پہلا تقرر الہ آباد میں ایک انگریزی رجمنٹ میں کیا گیا۔ یہ تقرر ان کی فرمائش پر ہی کیا گیا تھا۔ کیونکہ مرزا پور الہ آباد سے قریب تھا۔ جہاں ان کے والد خان بہادر سید حامد حسین صاحب تعینات تھے۔

ان دنوں الہ آباد برصغیر کی سیاست کا گڑھ بنا ہوا تھا۔ اور فرقہ وارانہ کشیدگی کے مناظر بھی عام دیکھنے میں آتے تھے۔ یہیں سید صاحب کی ملاقاتیں پنڈت موتی لال نہرو اور سر تیج بہادر سپرو سے ہوئیں۔

برطانوی کمپنی کا قیام شہنشاہ اکبر کے تعمیر کردہ عظیم الشان قلعہ میں تھا۔ جہاں لب دریا اکثر پارٹیاں وغیرہ بھی ہوتی تھیں۔ افسران کا مشغلہ پولو کھیلنا تھا۔

تبادلہ

برطانوی رجمنٹ میں تقریباً ایک سال تک سید شاہد حامد صاحب نے فرائض سرانجام دیئے۔ اس کے بعد برطانوی رجمنٹ نے

Marfat.com

حکومت سے درخواست کی کہ سید صاحب کا تبادلہ برطانوی فوج کے انڈین یونٹ میں نہ کیا جائے اور انھیں مستقل طور پر اسی رجمنٹ کے ساتھ وابستہ رہنے دیا جائے۔ لیکن جنرل ہیڈ کوارٹرز نے اس درخواست کو نامنظور کر دیا۔

یہاں سے سید صاحب کا تبادلہ تھرڈ کیولری میں ہو گیا۔ تھرڈ کیولری کے افسران کو شاہانہ زندگی گزارنا پڑتی تھی۔ ان کے مصارف ان کی تنخواہوں کے مقابلے میں بہت زیادہ ہوتے تھے۔ چنانچہ اپنے بیٹے کے مصارف کو خان بہادر سید حامد حسین صاحب نے برداشت کیا۔ یہیں ایک بار گھوڑ سواری کے دوران سید شاہد صاحب گھوڑے سے گر پڑے۔ اور ان کا بازو ٹوٹ گیا۔ علاج کی غرض سے سید صاحب کو ویانا جانا پڑا جہاں مشہور ڈاکٹر بوور (BOWER) نے ان کا علاج کیا۔ اور بازو دوبارہ ٹھیک ہو گیا۔

قاضی عیسیٰ

انگلستان کے زمانہ قیام میں سید صاحب کی ملاقات مشہور مسلم لیگی اور قائد اعظم کے قریبی دوست قاضی عیسیٰ سے ہوئی تھی۔ قاضی عیسیٰ انگلستان میں بیرسٹری کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے گئے تھے۔ وہیں ان کی ملاقات سید صاحب سے ہوئی۔ بعد میں دوستی کا یہ تعلق بڑھ کر رشتہ داری میں تبدیل ہو گیا۔ اور سید صاحب کی بہن سیدہ بیگم کی شادی قاضی عیسیٰ سے ہو گئی۔ سیدہ بیگم خود بھی بہت پڑھی لکھی خاتون ہیں۔ اور انھوں نے تحریک پاکستان کے زمانے میں انگریزی میں ایک کتاب (A NATION BETRAYED) لکھی تھی۔ قائد اعظم کو یہ کتاب بہت پسند تھی۔ اور جب لوگ ان سے پاکستان کے بارے میں کوئی سوال کرتے تھے تو وہ انھیں اس کتاب کے پڑھنے کا مشورہ دیا کرتے تھے۔

سید شاہد حامد صاحب کی ایک اور بہن سیدہ رضیہ بیگم کی شادی جنرل انیس احمد خاں

Marfat.com

سے ہوئی تھی۔ جو صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کے چھوٹے بھائی تھے۔ اور سیدہ جمیلہ بیگم کی شادی ظفر عمر صاحب کے بیٹے شوکت عمر سے ہوئی تھی۔

قائداعظم سے پہلی ملاقات

لندن میں سب سے پہلے سید شاہد حامد صاحب اور قاضی عیسیٰ کی ملاقات قائد اعظم سے ہوئی تھی چنانچہ اس ملاقات کے بارے میں ان کا کہنا ہے۔ "ایک بار میں لندن گیا ہوا تھا۔ اور قاضی عیسیٰ اور چند دوسرے دوست لندن کے پارک لین ہوٹل کے ہال میں بیٹھے ہوئے چائے پی رہے تھے۔ یکایک ہماری نگاہیں ہال میں داخل ہونے والے ایک شخص کی طرف بے اختیار اٹھ گئیں۔ جو سیڑھیوں سے اتر کر میزوں کے درمیان چلتا ہوا کسی خالی میز کی طرف جا رہا تھا اپنی وضع قطع اور طور طریق سے نو وارد تمام لوگوں میں ممتاز اور منفرد نظر آرہا تھا۔ ہم لوگوں نے ایک دوسرے سے اس شخص کے بارے میں پوچھا لیکن کوئی بھی اس سے واقف نہیں تھا۔ میرے خیال میں اس شخص نے بھی اندازہ لگا لیا تھا کہ ہم اس کے بارے میں گفتگو کر رہے ہیں۔ چنانچہ وہ ہمارے پاس آکر ٹھہرا۔ ہم اس کے احترام میں کھڑے ہو گئے اس نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ "میرا نام محمد علی جناح " ہے۔ آپ لوگ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟ اور انگلستان میں کس سلسلے میں مقیم ہیں۔ ہم لوگوں نے اپنا تعارف کرایا۔ وہ پانچ منٹ تک ہم لوگوں کے پاس ٹھہرے رہے اور پھر واپس چلے گئے یہ ہماری قائداعظم سے پہلی ملاقات تھی۔ بعدازاں قائداعظم سے گول میز کانفرنس اور مختلف پارٹیوں اور کانفرنسوں میں سید صاحب اور قاضی عیسیٰ کی ملاقاتیں ہوتی رہیں۔

علامہ اقبال سے روابط

اسی زمانے میں انگلستان میں سید شاہد حامد صاحب کی ملاقاتیں علامہ اقبال سے بھی ہوئیں۔ علامہ اقبال

Marfat.com

نے انھیں وہ نظم اپنے قلم سے لکھ کر دی تھی۔ جو ان کے مجموعہ کلام میں "جاوید کا پہلا خط آنے پر" کے عنوان کے تحت شامل ہے۔

جہانِ شوق میں اپنا مقام پیدا کر ۔۔۔ نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر
خدا اگر دلِ فطرت شناس دے تجھکو ۔۔۔ سکوتِ لالہ و گل سے کلام پیدا کر
مرا طریق امارت نہیں! محبت ہے ۔۔۔ خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

اس نظم پر ۱۸ دسمبر ۱۹۳۲ء کی تاریخ پڑی ہوئی ہے۔ علامہ اقبال نے بعد میں اس نظم کے آخری شعر کے مصرعہ اوّل میں مندرجہ ذیل تبدیلی کی تھی۔

مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے

پونا میں تقرری

۱۹۳۹ء میں سید صاحب کا تبادلہ پونا کر دیا گیا۔ اس زمانے میں لندن سے واپسی کے بعد قاضی عیسیٰ بمبئی میں وکالت کا آغاز کر چکے تھے۔ اور قائد اعظم بھی ان دنوں بمبئی میں ہی مقیم تھے۔ چنانچہ ہفتہ واری تعطیلات میں سید شاہد حامد صاحب اپنے بہنوئی اور گہرے دوست قاضی عیسیٰ سے ملنے بمبئی جاتے رہتے تھے۔ اور ہر بار قاضی عیسیٰ کے ساتھ قائد اعظم کی خدمت میں بھی حاضر ہوتے تھے۔ سید صاحب کا بیان ہے کہ "اکثر شاموں کو ہم قائد اعظم کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ ایک ملاقات میں میں نے ان سے کہا کہ فوج کے افراد کے لئے ان کا کیا پیغام یا نصیحت ہے؟" قائد اعظم نے جواب دیا کہ انھیں چاہئے کہ اپنے پیشے میں مہارت پیدا کریں۔"

اس زمانے میں دوسری جنگِ عظیم کا آغاز ہو چکا تھا۔ اور جاپانی جنگ میں فتوحات کرتے ہوئے برما تک آگئے تھے۔

Marfat.com

برما کے محاذ پر

دوسری جنگ عظیم کے دوران سید شاہد حامد صاحب کا تبادلہ پہلے فورٹ سنڈیمان کا ہوا۔ اور وہاں سے انھیں برما کے جنگی محاذ پر بھیج دیا گیا۔ جس وقت سید صاحب برما کے محاذِ جنگ پر پہنچے ہیں تو جاپانیوں کا حملہ ہو چکا تھا۔ محاذِ جنگ سے دوبارہ ان کا تبادلہ سٹاف کالج کوئٹہ میں بطور انسٹرکٹر کر دیا گیا۔ اور تھوڑے ہی عرصہ کے بعد دوبارہ محاذِ جنگ پر بھیج دیا گیا۔ جہاں کچھ عرصہ خدمات انجام دینے کے بعد دوبارہ سٹاف کالج کوئٹہ میں تدریسی ذمے داریاں سونپ دی گئیں۔

شادی

کوئٹہ کے ہی دوران قیام ۱۹۴۰ء میں سید صاحب نے ڈاکٹر عطا اللہ بٹ کی صاحبزادی طاہرہ سے شادی کی۔ ڈاکٹر عطا اللہ بٹ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی میں میڈیکل آفیسر تھے۔ طاہرہ بیگم آمنہ مجید ملک کی بہن ہیں اور اس رشتے سے کرنل مجید ملک، سید صاحب کے ہم زلف ہیں۔

لکھنؤ میں

۱۹۴۵ء میں جب لکھنؤ میں خان بہادر سید حامد حسین صاحب کا انتقال ہوا تو سید شاہد حامد صاحب کا تبادلہ لکھنؤ کر دیا گیا۔ یہاں کچھ عرصہ تعینات رہے۔ اس کے بعد ۲۹ ویں ڈویژن کے A ۵ ۵ کی حیثیت سے ان کی تعیناتی ہوئی۔

کمانڈر انچیف کے سیکرٹری

۲۹ ویں ڈویژن میں خدمات کی انجام دہی کے دوران سید شاہد حامد صاحب کو افواج ہند کے کمانڈر انچیف کے پرائیویٹ سیکرٹری کے لئے منتخب کر لیا گیا۔ سید شاہد حامد صاحب پہلے ہندوستانی افسر تھے جنھیں اس عہدے کے لئے منتخب کیا گیا تھا۔

اس وقت کمانڈر انچیف فیلڈ مارشل سر کلاڈ ی آک لنک تھے۔ سید صاحب اس

Marfat.com

وقت کرنل کے عہدے پر فائز تھے۔ اس سے قبل نہ تو ان کی کبھی فیلڈ مارشل سے ملاقات ہوئی تھی اور نہ ہی وہ کبھی دلی گئے تھے اور وہاں کسی کو جانتے تھے۔

تقریباً دو برس تک سید شاہد حامد صاحب کمانڈر انچیف کے سیکرٹری کے عہدے پر فائز رہے۔ یہ برصغیر پاک و ہند کی سیاسی تاریخ کا نازک ترین دور تھا۔ آزادی کی منزل قریب آچکی تھی۔ اس وقت برصغیر میں انگریزی حکومت کی تمام تر قوت کی علامتیں دو تھیں۔ ایک وائسرائے ہند اور دوسرے کمانڈر انچیف۔

اس زمانے میں قائد اعظم بھی دلی میں منتقل ہو چکے تھے۔ سید شاہد حامد صاحب حالانکہ ایک ذمے دار سرکاری عہدے پر فائز تھے لیکن سیاسی لیڈروں اور کارکنوں سے ملنے جلنے پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ مسلم لیگ کے بہت سے زعما اور قائدین سے سید صاحب کے ذاتی اور خاندانی مراسم تھے۔ ان لوگوں میں خواجہ ناظم الدین، لیاقت علیخاں اور سر نواب اسماعیل خاں وغیرہ شامل ہیں یہ لوگ جب دلی آتے تو سید شاہد حامد صاحب کی سرکاری قیام گاہ پر ہی رہائش اختیار کرتے تھے۔

مشہور کانگریسی لیڈروں پنڈت نہرو، مہاتما گاندھی، سر تیج بہادر سردار پٹیل، مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ سے بھی اس زمانے میں سید صاحب کو ملنے اور انھیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ برصغیر کے ممتاز کمیونسٹ لیڈروں سے بھی سید صاحب کی ملاقاتیں ہوئیں۔ ان کی ایک بہن سیدہ جمیلہ بیگم اشتراکی خیالات رکھتی تھیں۔ ان کا تعلق انجمن ترقی پسند مصنفین سے تھا۔ اور سجاد ظہیر اور بالخصوص مجاز لکھنوی سے ان کے مراسم تھے اور وہ بہت سرگرم ترقی پسند خاتون تھیں۔ شروع شروع میں وہ قیام پاکستان کے حق میں نہ تھیں۔ چنانچہ ایک بار بہن کی فرمائش پر سید شاہد حامد صاحب انھیں قائد اعظم سے ملاقات کے لیے لے گئے۔ سید صاحب کا بیان ہے کہ قائد اعظم اپنے مخصوص دھیمے دھیمے لہجے میں ان کی بہن کے ہر سوال

Marfat.com

کا جواب دیتے گئے۔ حتیٰ کہ ایک موقع ایسا آیا کہ جب مجھے احساس ہوا کہ میری بہن سوالات کرنے میں حد ادب سے بڑھنے لگی ہیں تو میں نے انھیں ٹوکا۔ لیکن قائد اعظم نے مجھے منع فرما دیا اور کہا کہ انھیں آزادی سے سوال کرنے دو۔ بالآخر وہ قائد اعظم کے دلائل سے متاثر ہو کر اٹھیں اور اس دن سے قیام پاکستان کی زبردست حامی بن گئیں۔ اور بعد ازاں خواجہ ناظم الدین کے ہمراہ بنگال میں پاکستان کے لیے بہت کچھ کام کیا۔ افسوس کہ جوانی میں ہی ان کا انتقال ہو گیا۔

دلی میں قائد اعظم سے ملاقات

کمانڈر انچیف کے سیکرٹری کے فرائض کی انجام دہی کے ان دو برسوں کے دوران سید صاحب کو قائد اعظم سے کم و بیش روزانہ ملنے کا موقع ملتا رہا۔ قائد اعظم نے ان سے کہہ رکھا تھا کہ وہ وقت طے کیے بغیر کسی بھی وقت ان سے ملاقات کرنے آسکتے ہیں۔

سید شاہد حامد صاحب کا بیان ہے کہ ایک بار قائد اعظم نے ان سے دریافت کیا کہ فوجی افسران ان کے بارے میں کیا تاثر رکھتے ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ وہ آپ کو بہت کم آمیز خیال کرتے ہیں۔" اس کے بعد میں نے فوج کے افسران سے قائد اعظم کی ملاقات کرانے کے لیے اپنی کوٹھی پر ایک دعوت کا اہتمام کیا۔ جس میں کمانڈر انچیف سمیت ۱۵۰ فوجی افسران نے شرکت کی۔ اس میں ہندو اور مسلمان سب افسران شریک تھے۔ بعض ہندو جنرل بھی اس میں شریک تھے۔ جب قائد اعظم تشریف لائے تو ان کا تعارف قطار میں کھڑے ہوئے تمام فوجی افسران سے کرایا گیا۔ ایک مسلمان فوجی افسر نے تعارف کے بعد قائد اعظم سے دریافت کیا کہ پاکستان میں ہم لوگوں کی ترقی کے کیا امکانات ہیں؟" قائد اعظم نے اس بات پر سخت ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔

سید شاہد حامد صاحب فرماتے ہیں کہ " برطانوی راج کی عملداری یعنی متحدہ ہندوستان میں

Marfat.com

ہونے والے تمام واقعات سے وہ قائدِ اعظم کو ان کی خواہش کے مطابق مطلع کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ جب لندن سے اس مضمون کا کیبل آیا کہ تقسیم ہند کو تسلیم کیا جا چکا ہے۔ اور اب براہِ راست قیام پاکستان کے موضوع پر مذاکرت ہوں تو میں اسی وقت لے یہ دو پہر کا وقت تھا) قائدِ اعظم کی رہائش گاہ پر گیا۔ قائدِ اعظم اس وقت اوپر جا چکے تھے۔ بہر حال اطلاع ملتے ہی ملاقات کے کمرے میں تشریف لائے اور جب میں نے انھیں صورت حال بتائی تو وہ بہت خوش ہوئے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ ضرور پوچھا کہ کیا تمھیں یقین ہے۔" میں نے جواب دیا کہ میں خود کیبل کو پڑھ کر آرہا ہوں۔"

کمانڈر انچیف کے ہمراہ سید شاہد حامد صاحب کو برصغیر کے تمام علاقوں کے لیڈروں اور ان علاقوں میں تعینات اعلیٰ فوجی افسروں سے ملنے جلنے کے مواقع ملتے رہے۔ ہر دوسرے تیسرے مہینے انھیں مختلف سرکاری کانفرنسوں کے سلسلے میں کمانڈر انچیف کے ہمراہ انگلستان جانا پڑتا تھا۔

لارڈ ویول

اسی زمانے میں سید شاہد حامد صاحب کو لارڈ ویول سے بھی ملاقات کا بارہا موقع ملا۔ ان کے خیال میں "لارڈ ویول ایک عظیم وائسرائے ایک عظیم جرنیل اور ایک عظیم انسان تھا۔" لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے بھی سید صاحب کو ملاقاتوں کا موقع ملا۔ لیکن اس کی شخصیت ان کی نظر میں ناپسندیدہ ہی ٹھہری۔ ان کے خیال میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن بہت سطحی آدمی (SHOW BOY) تھا۔ جب ہندوستان میں کیبنٹ مشن آیا تو اس کے اراکین سے بھی سید شاہد حامد صاحب کو ملاقات کا موقع ملا۔ اس طرح انھیں تحریکِ پاکستان نہایت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔

Marfat.com

فیلڈ مارشل آکن لیک

فیلڈ مارشل لارڈ آکن لیک بھی بہت خوبیوں کا مالک تھا سید شاہد حامد صاحب کو اس کی شخصیت نے بہت متاثر کیا۔ وہ بھی سید صاحب کو بہت زیادہ پسند کرتا تھا۔ اور ان کے بچوں سے بہت محبت رکھتا تھا۔ سید صاحب کا بیان ہے کہ جب بھی وہ ہندوستان یا انگلستان سرکاری کام سے جاتے تو واپسی پر ان کے بچوں کے لئے کھلونے ضرور لاتے تھے۔

تقسیم ملک کے وقت اسے ہندوستانی افواج کا کمانڈر انچیف بنایا گیا تھا۔ چنانچہ اس نے سید صاحب سے کہا کہ وہ ہندوستان ہی میں رہیں اور یہاں ان کی ترقی کے زیادہ مواقع ہو سکتے ہیں۔ لیکن سید صاحب نے اپنے اس معزز کرمفرما کے مشورے کو قبول نہ کیا اور پاکستان چلے آئے۔

پاکستان میں آمد

قیام پاکستان کے فوری بعد سید شاہد حامد صاحب نے رخت سفر باندھا اور جنرل ہیڈکوارٹرز میں آکر رپورٹ کی۔ بعد میں ان کے اہل خانہ بھی ہندوستان سے پاکستان پہنچ گئے۔

نیشنل گارڈز کی تنظیم

قیام پاکستان کے بعد سید شاہد حامد صاحب کو بریگیڈیر کے عہدے پر ترقی ملی۔ اسی زمانے میں قائد اعظم نے انھیں پاکستان نیشنل گارڈز کو بنانے اور اسے منظم کرنے کی ذمے داری سونپی۔ یہ بڑی ذمے داری کا کام تھا۔ نیشنل گارڈز اپنی اہمیت کے اعتبار سے کسی بھی ملک کی دوسری دفاعی لائن ہوتی ہے۔ سید شاہد حامد صاحب نے اس کی ۵۶ بٹالینیں تشکیل دے دی تھیں۔ لیکن قائد اعظم کے بعد اس زمانے کے بعض ارباب حل و عقد نے اس عظیم اور ضروری اسکیم کو تشنۂ تکمیل ہی چھوڑ دیا۔

Marfat.com

پاکستان انٹر سروسز انٹلی جنس کی تشکیل اس کے بعد سید صاحب کو پاکستان انٹر سروسز انٹیلجنس کو جدید خطوط پر تشکیل دینے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ اس زمانے میں یہ بہت دشوار کام تھا۔ بالخصوص ان حالات کی بنا پر کہ بھارت سے تعلقات بہت خراب تھے۔

ماسٹر جنرل آف آرڈیننس ۱۹۵۰ء میں سید شاہد حامد صاحب نے علی الترتیب پشاور بریگیڈ اور کوہاٹ بریگیڈ کی کمان کی ۱۹۵۱ء میں انھیں ماسٹر جنرل آف آرڈیننس کے عہدے پر ترقی دے دی گئی۔ یہاں انھوں نے چھ برس تک خدمات سرانجام دیں۔ یہ کام سید صاحب کے لئے نیا بھی تھا اور دشوار بھی۔ کیونکہ ایک نئی مملکت کی فوج کی تشکیل اور اس کے لئے جملہ ساز و سامان کی فراہمی ایک نہایت دشوار اور کٹھن معاملہ تھا۔ لیکن سید صاحب نے اپنی بے پناہ محنت اور لگن سے کام لیا۔ اس عہدے پر فائز رہتے ہوئے انھوں نے تمام دنیا کا دورہ کیا۔ بالخصوص بڑے ملکوں کے دورے کئے۔ اور پاکستانی فوج کے لئے جدید ترین اسلحہ جات کی خریداری اور فراہمی کے لئے ریاست ہائے متحدہ امریکہ سے حکومت کی ہدایات کے مطابق معاہدے کئے۔

مارشل لاء ۱۹۵۸ء میں جب ایوب خاں نے ملک میں مارشل لاء نافذ کیا تو سید شاہد حامد صاحب اڈجوٹنٹ جنرل اور اسٹاف کے سینئر ترین افسر تھے۔ سید شاہد حامد صاحب کا بیان ہے کہ جب ایوب خان نے مارشل لاء لگایا تو مجھ سے اس بات کو پوشیدہ رکھا۔ کیونکہ ایوب خاں میرے نظریات سے بخوبی آگاہ تھے۔ اور وہ جانتے تھے کہ میں کبھی بھی ان کو آئین کو منسوخ کرنے اور عنان حکومت سنبھالنے کا مشورہ نہیں دوں گا۔ چنانچہ میں نے بھی اس ملک کے کروڑوں شہریوں کی طرح صرف ریڈیو پر مارشل لاء کے نفاذ

Marfat.com

کا اعلان سنا۔ جب جنرل محمد موسیٰ کمانڈر انچیف کی حیثیت سے آئے تو ان سے بھی اختلافات رہے۔ چنانچہ ایک روز ایوب خاں نے بحیثیت صدر پاکستان مجھے بلا کر دریافت کیا کہ "آیا میں موجودہ عہدے پر فائز رہتے ہوئے ان کے ساتھ کام کرنا پسند کروں گا"؟ میرے انکار پر انھوں نے مجھے اسمال انڈسٹریز کارپوریشن کو منظم کرنے کا کام سونپ دیا۔ اور میں نے اس نئی ذمے داری کو قبول کرتے ہوئے فوج سے علیحدگی اختیار کر لی۔

سید شاہد حامد صاحب کا بیان ہے کہ جب اسمال انڈسٹریز کو منظم کر چکا تو اس کے بعد دوبارہ صدر ایوب خاں سے میرے اختلافات ہو گئے۔ اور میں نے اس ذمے داری سے بھی استعفیٰ دے دیا۔

ان کا کہنا ہے کہ ایوب خان سے تا زندگی میرے دوستانہ مراسم رہے اور اقتدار سے علیحدگی کے بعد بھی میری ان سے برابر ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔ ایوب خان اپنے حلقۂ احباب میں کہا کرتے تھے کہ "سید شاہد حامد وہ تنہا آدمی ہے کہ جس نے نہ تو کبھی میرے زیر کمان رہتے ہوئے کچھ مانگا اور نہ ہی جب میں صدر مملکت ہوں تو کبھی کسی چیز کا طلب گار ہوا ہے"۔

اولاد

سید شاہد حامد صاحب کے سب سے بڑے صاحبزادے حسن حامد ہیں ان کی تعلیم کیمرج اور مانچسٹر میں ہوئی۔ اور لندن اسکول آف اکنامکس کے فارغ التحصیل ہیں۔ فلپس لندن میں ملازم ہیں۔ دوسرے صاحبزادے علی حامد ہیں۔ جو پاک فوج میں میجر کے عہدے پر فائز ہیں۔ ایک بیٹی شہناز کی شادی گائیڈس کیولری کے کرنل جعفر سے ہوئی ہے اور دوسری بیٹی شمع کی شادی ڈاکٹر امتیاز حسین سے ہوئی ہے۔ جو لندن میں پریکٹس کرتے ہیں۔

زندگی گزار

ان دنوں میجر جنرل (ریٹائرڈ) سید شاہد حامد صاحب راولپنڈی میں رہے ہیں۔ سید صاحب ایک نیک دل، خدا ترس اور پابند صوم و صلوٰۃ آدمی ہیں۔

Marfat.com

خاندان حفیظت کی چند دوسری شخصیات

مولوی محمد حسین لندنی مولوی محمد حسین، محمد حسین لندنی کے نام سے معروف ہیں۔ یہ محسن کے سب سے بڑے لڑکے، اور خان بہادر سید جعفر حسین کے سب سے بڑے بھائی تھے۔ انگریزوں کے زمانے میں یہ صوبہ جات متحدہ یوپی کے پہلے مسلمان تھے جو اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان گئے تھے۔ انگلستان سے مسافر لندن کے نام سے خطوط اور ڈائریاں بھی لکھتے رہے تھے جو اس زمانے کے اردو اخبارات میں شائع ہوتے تھے۔ لندن میں ایک روز یہ شاہی محل کے قریب سے گزر رہے تھے۔ محل میں اوپر کہیں مرمت وغیرہ کا کام ہو رہا تھا۔ ایک اینٹ ان پر آگری جس سے ان کی ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ ملکہ وکٹوریہ نے جن کی رحم دلی مشہور زمانہ ہے، انہیں اپنا منہ بولا بیٹا بنا لیا۔ انہی کے خرچ پر لندن میں زراعت کی تعلیم حاصل کی۔

ہندوستان واپس آکر محکمہ زراعت میں ملازم ہوئے اور ترقی کرتے کرتے ڈپٹی ڈائرکٹر کے عہدے تک پہنچے۔ کان پور زراعتی کالج کے پرنسپل بھی رہے۔ تصنیف و تالیف کا شوق تھا فن زراعت پر کئی کتابیں لکھیں۔ جو شائع بھی ہو چکی ہیں۔ پاکستان و ہند کی لائبریریوں میں تلاش بسیار کے باوجود ان کی تصنیف کردہ کتب نہ مل سکیں۔ البتہ کتابوں کے بعض نسخے انڈیا آفس لائبریری میں موجود ہیں۔ یہ بڑے اچھے شاعر بھی تھے۔ ان کا کلام بھی اب دستیاب نہیں

Marfat.com

ہو سکا۔ خوب صورت اور وجیہہ شکیل انسان تھے۔

محمد فضل امین | خان بہادر سید جعفر حسین کی سب سے چھوٹی صاحب زادی سیدہ ممتاز جہاں بیگم، محمد فضل امین سے منسوب تھیں۔

مولوی محمد فضل امین اس صدی کے اوائل میں خیر آباد ضلع اودھ کے علما کے ایک نامور خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے جد امجد علامہ فضل امام خیر آبادی تھے جن کی علمیت تقدس اور پاکیزہ شخصیت سے سرسید احمد خان بہت متاثر تھے۔ اور ان کا ذکر آثار الصنادید میں نہایت عقیدت و احترام سے کیا ہے۔ مولانا فضل امام کا انتقال ۱۸۲۴ء میں ہوا۔ غالب نے ان کی تاریخ وفات کہی تھی۔

یہ صاحب تصنیف تھے۔ فارسی سیکھنے کے لیے ان کی تالیف آمد نامہ ہے۔ علاوہ ازیں منطق میں مشہور تصنیف مرقات ہے۔ اور رسالہ میر زاہد ملا جلال اور افق المبین کے حواشی بھی لکھے تھے۔ دہلی میں صدر الصدور رہے۔

علامہ فضل امام کے بڑے صاحب زادے مولانا فضل حق خیر آبادی تھے جن کے نام اور کارناموں سے برصغیر کا ہر حریت پسند شخص بخوبی واقف ہے۔ یہ بھی اپنے زمانے کے جید عالم تھے۔ اور مومن و غالب اور معاصر مشاہیر شعرا و ادبا سے ان کے گہرے تعلقات تھے۔

انھوں نے شاہنشاہ کو جہاد آزادی کے دوران ایک جمہوری کونسل کے ذریعے حکومت کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ جو آئین علامہ فضل حق خیر آبادی نے بنایا تھا۔ وہ شائع ہو چکا ہے۔ اس میں پہلی بار دور ملوکیت میں ایک ہر دل عزیز عوامی حکومت کا منشور پیش کیا گیا تھا۔

بغاوت میں سرگرم حصہ لینے کی بنا پر انھیں برطانوی حکومت کی قید و بند کی صعوبتوں سے گزرنا پڑا۔ اور کالے پانی جلا وطن کر دیا گیا [redacted]

Marfat.com

نامہ الثورۃ الہندیہ اور قصائد فتنۃ الہند ان کی دو تصانیف ہیں جن سے بغاوت کے اسباب و واقعات پر روشنی پڑتی ہے ۔

مولوی فضل حق خیرآبادی کا انتقال انڈیمان ہی میں ہوا ۔ اس کے بعد بھی مدت تک برطانوی ہندوستان کے علاقوں میں ان کے اہل خاندان کے لیے حالات سازگار نہ تھے ۔

چناں چہ فضل حق خیرآبادی کے چھوٹے بھائی نے جو ریاست پٹیالہ میں وزیر تھے وطن واپس آنے کا خیال ہی ترک کر دیا یہی مولوی فضل امین کے دادا تھے ۔ جو ریاست میں وزیر مالیات تھے ۔ ان کے بیٹے ریاست میں جج کے منصب پر فائز تھے ۔ انہی کے ہاں مولوی فضل امین آج سے تقریباً ستر اسی برس قبل پیدا ہوئے ۔

مولوی فضل امین نے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد علی گڑھ یونیورسٹی کا رخ کیا جہاں تعلیم حاصل کرنے کی خواہش اس زمانے کے ہر نوجوان مسلمان کو ہوتی تھی ۔ زمانہ طالب علمی میں علی گڑھ کے نامور طلبا میں ان کا شمار ہوتا تھا ۔ ۱۹۱۲ء میں انہوں نے سردار اورنگ زیب خان سابق وزیر اعلیٰ صوبہ سرحد کو شکست دے کر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی یونین کا انتخاب جیتا تھا ۔ اور یونین کے نائب صدر ہوئے تھے ۔

مولوی فضل امین کو انگریزی اور اردو دونوں زبانوں پر عبور حاصل تھا ۔ اور وہ دونوں زبانوں کے بڑے اچھے مقرر تھے ۔ یونیورسٹی کے اردو و انگریزی مباحثوں میں انہوں نے مشہور میرلڈ کوس اسپیکنگ پرائز وغیرہ جیتے تھے ۔ یونیورسٹی رائڈنگ کلب کے ممبر تھے ۔ اور گھڑسواری کے بھی کئی مقابلے جیتے تھے ۔

جنگ بلقان کے زمانے میں مولوی فضل امین مسلم اسکول علی گڑھ کے طالب علم تھے ۔ اس وقت ان کی عمر تقریباً بارہ تیرہ برس تھی لیکن جذبۂ حریت سے سرشار تھے ۔ انہوں نے ایک

Marfat.com

باغیانہ مضمون لکھ کر مولانا حسرت موہانی کے پرچے اردوئے معلی کو بھیجا جس کی اشاعت کی پاداش میں مولانا حسرت موہانی کو قید و بند کی صعوبتوں سے گزرنا پڑا اور ان کا نادر کتب خانہ ساٹھ روپے میں نیلام ہوا لیکن حسرت موہانی نے مضمون نگار کا نام حکومت کو بتانے سے انکار کر دیا اور تمام تر ذمے داری اپنے اوپر لے لی تھی۔

عبدالرحمٰن پشاوری، مولوی فضل امین کے کلاس فیلو تھے۔ اور انہی کی ترغیب پر عبدالرحمٰن پشاوری ترکی گئے تھے۔ جہاں انہوں نے اعلیٰ خدمات انجام دیں اور ترکی میں ہی سکونت اختیار کر لی تھی۔ بعد میں عرصہ تک افغانستان میں ترکی کے سفیر کے فرائض بھی سرانجام دیے تھے۔ وہیں ان کو گولی مار کر شہید کر دیا گیا تھا۔

مولوی فضل امین نے علی گڑھ یونیورسٹی سے ایم کا امتحان امتیاز کے ساتھ پاس کیا جب تعلیم سے فراغت پانے کے بعد گھر واپس لوٹے تو خاندان کے معاشی حالات دگرگوں ہو چکے تھے۔ اس کی وجہ ان کے والد خان بہادر سردار فضل متین جج ہائی کورٹ ریاست پٹیالہ کی قبل از وقت ریٹائرمنٹ تھی: مہاراجہ بھوپندر سنگھ اپنے چند سسرالی عزیزوں پر جھوٹے مقدمات چلا کر انہیں ذلیل و خوار کرنا چاہتا تھا۔ خان بہادر فضل متین نے انصاف کا دامن نہ چھوڑا اور مہاراجہ کے متعلقین کو باعزت بری کر دیا۔

ایک مطلق العنان حاکم کو یہ بات کیسے پسند آسکتی تھی۔ اس نے نہ صرف انہیں قبل از وقت ریٹائر کر دیا بلکہ ان کی وسیع و عریض اراضی کے کاشتکاروں کو شہ دے کر انہیں نادہند کرا دیا۔ ان حالات نے خاندان کو مالی اعتبار سے تباہ کر دیا۔

لہٰذا مولوی فضل امین کو فوری طور پہ ملازمت اختیار کرنا پڑی۔ اور سب سے پہلے ریاست حیدر آباد دکن میں سر علی امام کے پولیٹیکل سیکرٹری ہوئے۔ سر علی امام کے ریاست چھوڑ

Marfat.com

دینے کے بعد خود بھی وہاں سے چلے آئے۔ اور پھر ریاست جاورہ میں سکریٹری دربار کے عہدے پر مامور ہوئے یہیں ۱۹۳۲ء میں چالیس برس کی عمر میں ان کا انتقال ہوا۔

مولوی فضل امین راسخ العقیدہ مسلمان تھے۔ اور صوم و صلوٰۃ کے سختی سے پابند تھے بارہ برس کی عمر سے تہجد پڑھتے تھے۔ ان کی دنیاوی زندگی نا مساعد حالات میں گزری۔ کیوں کہ خوشامد، دنیاداری اور جوڑ توڑ ان کے مزاج کے خلاف تھا۔ مولوی فضل امین کے ہاں چار اولادیں ہوئیں۔ جن میں سے الطاف فاطمہ اور فضل قدیر ادبی حلقوں میں معروف ہیں۔

مولوی آفتاب عمر آفتاب عمر، مشہور جاسوسی ناول نگار ظفر عمر بی۔ اے کے چھوٹے بھائی تھے۔ علی گڑھ سے ایم اے ایل ایل بی کیا تھا۔ میرٹھ کے نامور وکلا میں ان کا شمار ہوتا تھا خان بہادر سید جعفر حسین کی منجھلی صاحب زادی اشفاق جہاں بیگم ان سے منسوب تھیں۔

مولوی آفتاب عمر جینیئس تھے۔ انہیں دنیاداری سے کوئی تعلق نہ تھا۔ گو پیشے کے لحاظ سے وکیل تھے۔ لیکن ان کی تمام تر دلچسپی فنی کاموں کی طرف تھی۔ چناں چہ اپنے گھر میں ایک لیبارٹری بنا رکھی تھی جس میں نت نئے تجربات کرتے رہتے تھے۔ ریڈیو کے کام کو اپنی ذاتی دلچسپی سے اس زمانے میں سیکھا تھا جب ابھی ہندوستان میں اس فن کے ماہرین کا وجود تک نہ تھا۔ سنہ ۱۹۳۲ء کے لگ بھگ ریڈیو کے بارے میں آسان زبان میں ایک کتاب "صدائے برق"، لکھی تھی۔ جو شائع بھی ہوئی تھی۔ اس کتاب پر یوپی کی حکومت نے انہیں پانچ صد روپے کا انعام دیا تھا۔

آفتاب عمر پر دو بار از خود رفتگی کے شدید دورے پڑے۔ اور انہیں آگرہ کے دماغی اسپتال میں داخل کرایا گیا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد ترک وطن کرکے راولپنڈی

Marfat.com

میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ وہیں ان کا انتقال ہوا۔

تصنیف و تالیف کا بھی شوق تھا چناں چہ ایک ناولٹ "رنج و راحت" بھی لکھا تھا۔ بڑے ذہین طباع اور مخلص شخص تھے۔ سائنسی تجربات کے مشغلے نے زندگی بھر ساتھ نہ چھوڑا۔ مختلف چیزیں بناتے رہتے تھے۔

الطاف فاطمہ مولوی فضل امین کی بیٹی ہیں۔ الطاف فاطمہ کے نام سے اردو ادب کا ہر قاری واقف ہے۔ یہ گزشتہ بیس برس سے افسانے اور ناول لکھ رہی ہیں۔ اب تک ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ "وہ جیسے چاہا گیا" کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ علاوہ ازیں دو ناول "دستک نہ دو"۔ اور "نشان محفل" بھی شائع ہو چکے ہیں۔

ان کی ایک تنقیدی کتاب "اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقا" کے عنوان سے بھی شائع ہو چکی ہے۔ اس کتاب کو اردو میں لکھی جانے والی "فن سوانح نگاری" پر پہلی کتاب کہا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد ہی ڈاکٹر شاہ علی کی کتاب "اردو میں سوانح نگاری" منظر عام پر آئی ہے۔

الطاف فاطمہ نے افسانہ نگاری میں دھیمے لہجے کو اپنایا ہے ان کے افسانوں کا موضوع بھی گھر کی چار دیواری میں مقید عورتیں ہیں۔ اور انہوں نے پاکستانی عورت کی بڑی کامیابی سے اپنے افسانوں میں تصویر کشی کی ہے۔

الطاف فاطمہ ایک اچھی مترجم بھی ہیں۔ انہوں نے ہارپلی کے ناول کا اردو ترجمہ "نغمے کا قتل" کے عنوان سے کیا ہے۔ ان کی ایک اور کتاب "روزمرہ آداب" ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے بچوں کے لیے ایک ناول "ایک تھا رڈکا" بھی لکھا ہے۔

الطاف فاطمہ لاہور کے ایک کالج میں اردو کی استاد ہیں۔

Marfat.com

فضل قدیر فضل قدیر، پاکستان کے علمی و ادبی حلقوں میں جانی پہچانی شخصیت ہیں گزشتہ دس پندرہ برس سے حکومت پاکستان کے ماہنامے "ماہِ نو" کے مدیر رہ چکے ہیں۔ یہ رسالہ حکومت پاکستان کے جملہ شعبوں کی کارگزاریوں کی تفصیلات وغیرہ بھی دیتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس میں علمی و ادبی موضوعات پر گراں قدر مضامین، افسانے، انشائیے، نظمیں غزلیں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ ملک کے ممتاز ادیب و شاعر اس پرچے میں لکھتے رہتے ہیں۔ علاوہ ازیں اس پرچے میں علاقائی ادب و ثقافت اور فنون لطیفہ کی جملہ شاخوں پر نہایت اچھے مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب تک اس کا مدیر خود ایک صاحب ذوق اور ادب و فن اور ثقافت سے دلچسپی رکھنے والا نہ ہو تو یہ پرچہ صرف ایک عام سرکاری رسالہ بن کر رہ جاتا۔

ملک کے معیاری ادبی جرائد میں اس رسالے کا شمار ہوتا ہے۔ اور اس کے لیے اس کے مدیر کی کوششیں قابل قدر ہیں۔ دیگر اشاعتوں کے علاوہ فضل قدیر کی زیر ادارت اس مجلے کے غالب نمبر، اقبال نمبر، انیس نمبر، اور دیگر نمبر شائع ہو کر مقبول خاص و عام ہو چکے ہیں۔ اور اپنے موضوع پر ریفرنس کی حیثیت رکھتے ہیں۔

فضل قدیر خود بھی اردو کے اچھے افسانہ نگار ہیں۔ اگرچہ اپنی سرکاری مصروفیات کے سبب کم لکھتے ہیں۔ علاوہ ازیں انہوں نے انشائیے، فکاہیے، فیچر اور بچوں کے لیے بھی کتابیں اور کہانیاں لکھی ہیں۔ وبسٹی کی مختصر تاریخ امریکہ کا ترجمہ بھی کیا ہے جو شائع ہو چکا ہے۔ ابھی ان کے افسانوں کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا ہے۔

Marfat.com

Marfat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شجرۂ طیّبہ

۱۔ حضرت محمدؐ۔ خاتم النبیین، مالک قضا و قدر، سرور کائنات، خلاصۂ موجودات
حامیٔ دین و دنیا، سیّد المرسلین احمد مجتبیٰ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم۔

۲۔ حضرت خاتون جنت فاطمہؓ۔ امام المسلمین شمس المشارق و المغارب اسد اللہ الغالب
امیر المومنین حضرت علیؓ امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ،

۳۔ حضرت امام حسینؓ۔ شہید دشت کربلائے معلّٰی، امام مظلوم، پیشوائے دین و
دنیا و عقبیٰ، مقتدائے شہیداں، پیشوائے صابراں، جگر گوشۂ
سیّدۃ النساء امام الساجدین، قافلہ سالار سادات رضی اللہ عنہ،۔

۴۔ حضرت امام زین العابدینؓ۔ امام الساجدین، قافلہ سالار سادات۔ عباد و
زہاد را مقدم، امام زین العابدین رضی اللہ عنہ۔

۵۔ حضرت امام محمد باقرؓ۔ دودمان رسالت، زبدۂ خاندان امامت، ستودۂ کون و مکاں، دین محمدی
را ناصر و معین، حضرت محمد باقر رضی اللہ عنہ۔

Marfat.com

۶- حضرت امام جعفر صادقؓ ۔ صادق الوقت، مخزنِ اسرارِ الٰہی، سلطانِ ملّت مصطفوی، برہانِ حجّتِ نبوی، حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہٗ ۔

۷- حضرت امام موسیٰ کاظمؓ ۔ ہمدمِ محفلِ اُنس صمدیت، اخترِ برجِ ولایت، نیّرِ فلکِ امامت دینِ نبوی وموجدِ خاندانِ موسوی حضرت موسیٰ کاظم رضی اللہ عنہٗ ۔

۸- حضرت سیّد ابراہیم رضاؓ ۔ رضا بہ ربّ العالمین، فیاضِ عوارف معارف ربانی، وظائف کمالِ انسانی حضرت سیّد ابراہیم رضا رضی اللہ عنہٗ ۔

۹- حضرت سیّد محمد اکبر موسویؓ ۔ امام الواصلین وسید العارفین حضرت سیّد محمد اکبر موسوی رضی اللہ عنہٗ ۔

۱۰- حضرت سیّد جعفر موسویؓ ۔ درۃ التاج رسالت، اخترِ برجِ امامت وعالمِ کمالات حضرت سیّد جعفر موسوی رضی اللہ عنہٗ ۔

۱۱- حضرت سیّد محمد عزیز موسویؓ ۔ وارثِ علوم نبوی، زبدۃ اہلِ شریعت وطریقت اسرارِ مرتضوی حضرت سید محمد عزیز رضی اللہ عنہ ۔

۱۲- حضرت سیّد احمد موسویؓ ۔ رہنمائے مومنین، قدوۃ السالکین ومنبع الفیاض حضرت سیّد احمد موسوی رحمۃ اللہ علیہ

۱۳- حضرت سیّد محمد شہید موسویؓ ۔ درۃ مملکتِ ولایت، عالم علوم احمدی، قسام فیوض سرمدی حضرت سیّد محمد شہید موسوی

۱۴- حضرت سیّد عبداللہؒ الملقب رحمۃ اللہ ۔ قطب الزماں، حامی کون ومکان، دُرِّ دریائے شریعت وطریقت حضرت سیّد عبداللہ ؒ

۱۵- حضرت سید امیر موسیٰؒ الملقب رحمۃ اللہ ۔ فدا علی العالمین، وحید العصر، قطب الدہر،

Marfat.com

اعجاز مظہر عیسیٰ حضرت سید امیر موسیٰ

۱۶ حضرت سید امیر حسینؒ الملقب رحمۃ اللہ۔ نور ظہور اسلام امیر الوقت یعنی آں زماں
حضرت سید امیر حسین

۱۷۔ حضرت سید ابو القاسمؒ الملقب رحمۃ اللہ۔ دلنواز، سلالہ خاندانِ نبوت، دُرِ درج فتوت،
حاکم امورات دینی و دنیادی سید ابو القاسم

۱۸ حضرت سید امیر عزیزؒ الملقب رحمۃ اللہ۔ جاں باز، قاطع کفر و بدعت، ہادم شرک و
ضلالت حضرت سید امیر عزیز

۱۹ حضرت سید امیر حمزہؒ الملقب رحمۃ اللہ۔ کن فیکون، محی سُننِ نبوی قسام فیوض مرتضوی
حضرت سید امیر حمزہ

۲۰۔ حضرت سید امیر کلالؒ الملقب رحمۃ اللہ۔ امیر کلال، سلطانِ شریعت و طریقت و
برہان الحقیقت حضرت سید امیر کلالؒ خواجہ محمد بابا سماسی کے مرید و
خلیفہ تھے مقام ولادت سوخار ۸ جمادی الاول ۷۷۲ھ کو بروز
جمعرات انتقال ہوا۔ (تاریخ الاولیا۔ دارا شکوہ)

۲۱۔ حضرت سید امیر برہانؒ الملقب رحمۃ اللہ۔ مظہر کمالات، مخزنِ فیوضاتِ خفی و جلی حضرت
سید امیر برہان

۲۲۔ حضرت سید امیر شاہؒ الملقب رحمۃ اللہ۔ حضرت شاہ حاوی الکمالات نبوی و جامع رموز
مرتضوی، فخر الملت حضرت سید امیر شاہ

۲۳۔ حضرت سید امیر علی شاہ الملقب رحمۃ اللہ پیشوائے گدا و شاہ، رہنمائے ابرار، مقتدائے
روزگار حضرت سید امیر علی شاہ

Marfat.com

۲۴۔ حضرت سیّد امیر جعفر شاہؒ الملقب رحمۃ اللہ۔ باباشاہ قطب الدہر، یگانۂ زماں حضرت امیر جعفر رحمۃ اللہ علیہ ۔

۲۵۔ حضرت سیّد کلال شاہؒ الملقب رحمۃ اللہ۔ قطب الاقطاب الدہر، غوث الزماں حضرت سیّد امیر کلال شاہ رحمۃ اللہ علیہ ۔

۲۶۔ حضرت سیّد میر احمد شاہؒ۔ الملقب رحمۃ اللہ۔ حاجی الحرمین مکّی و مدنی، خلاصۂ دودمان سادات حضرت سید میر احمد شاہ رحمۃ اللہ علیہ ۔

۲۷۔ حضرت سیّد امیر شاہ الملقب رحمۃ اللہ ۔ وحید الزماں خلاصۂ دودمان الدہر حضرت سیّد امیر شاہ رحمۃ اللہ علیہ ۔

۲۸۔ حضرت سیّد میرک شاہؒ الملقب رحمۃ اللہ۔ حاجی الحرمین مقرب سلطان آں زماں، خاندان عظام حضرت میرک شاہ رحمۃ اللہ علیہ ۔

۲۹۔ حضرت سیّد عرب شاہؒ الملقب رحمۃ اللہ۔ مقرب سلطان، عارف معارف رموز محمدی شاہی مقرب سلطان حضرت عرب شاہ رحمۃ اللہ علیہ ۔

۳۰۔ حضرت سیّد حسین شاہؒ الملقب رحمۃ اللہ۔ گوہر حقیقت، بحر شریعت و طریقت، حضرت سیّد حسین شاہ رحمۃ اللہ علیہ ۔

Marfat.com

Marfat.com

Marfat.com

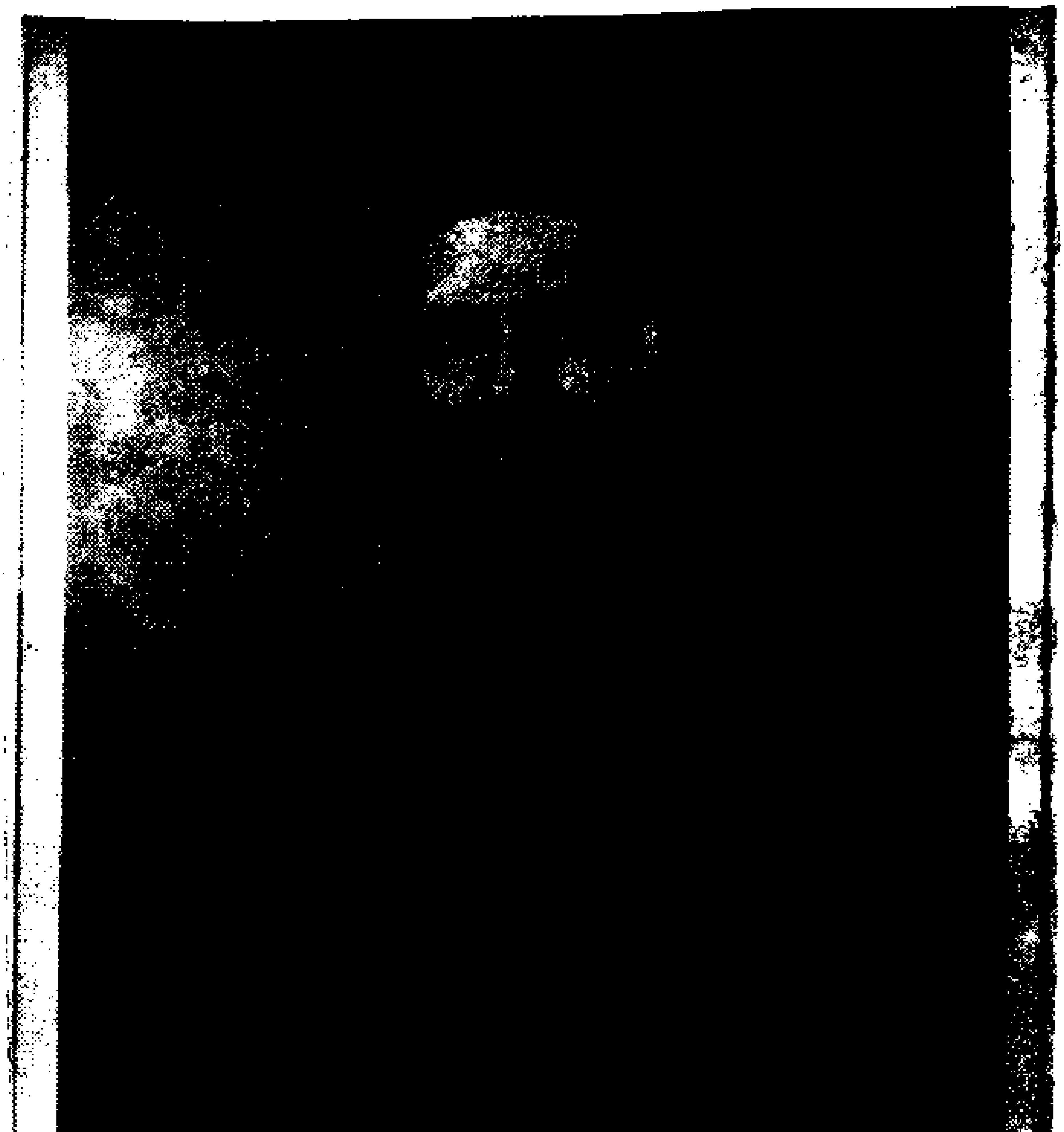

خان بہادر سیّد جعفر حسین

Marfat.com

خان بہادر سیّد حامد حسین

Marfat.com

(بائیں جانب سے) سید اکبر حسین، سید خواجہ احمد، سید جعفر حسین اور (کھڑے ہوئے) ظفر عمر بی اے

Marfat.com

دو دوست

میجر جنرل (ریٹائرڈ) سید شاہد حامد اور ممتاز مسلم لیگی لیڈر قاضی محمد عیسےٰ لندن میں اپنے زمانۂ تعلیم کے دوران ۔

Marfat.com

خان بہادر سید جعفر حسین پہلی قطار میں (دائیں جانب سے ساتویں نمبر پر) بیٹھے ہیں

Marfat.com

ایک یادگار تصویر بائیں جانب سے قائد اعظم. فیلڈ مارشل لارڈ اکین لیک محترمہ فاطمہ جناح اور سید شاہد حامد

Marfat.com

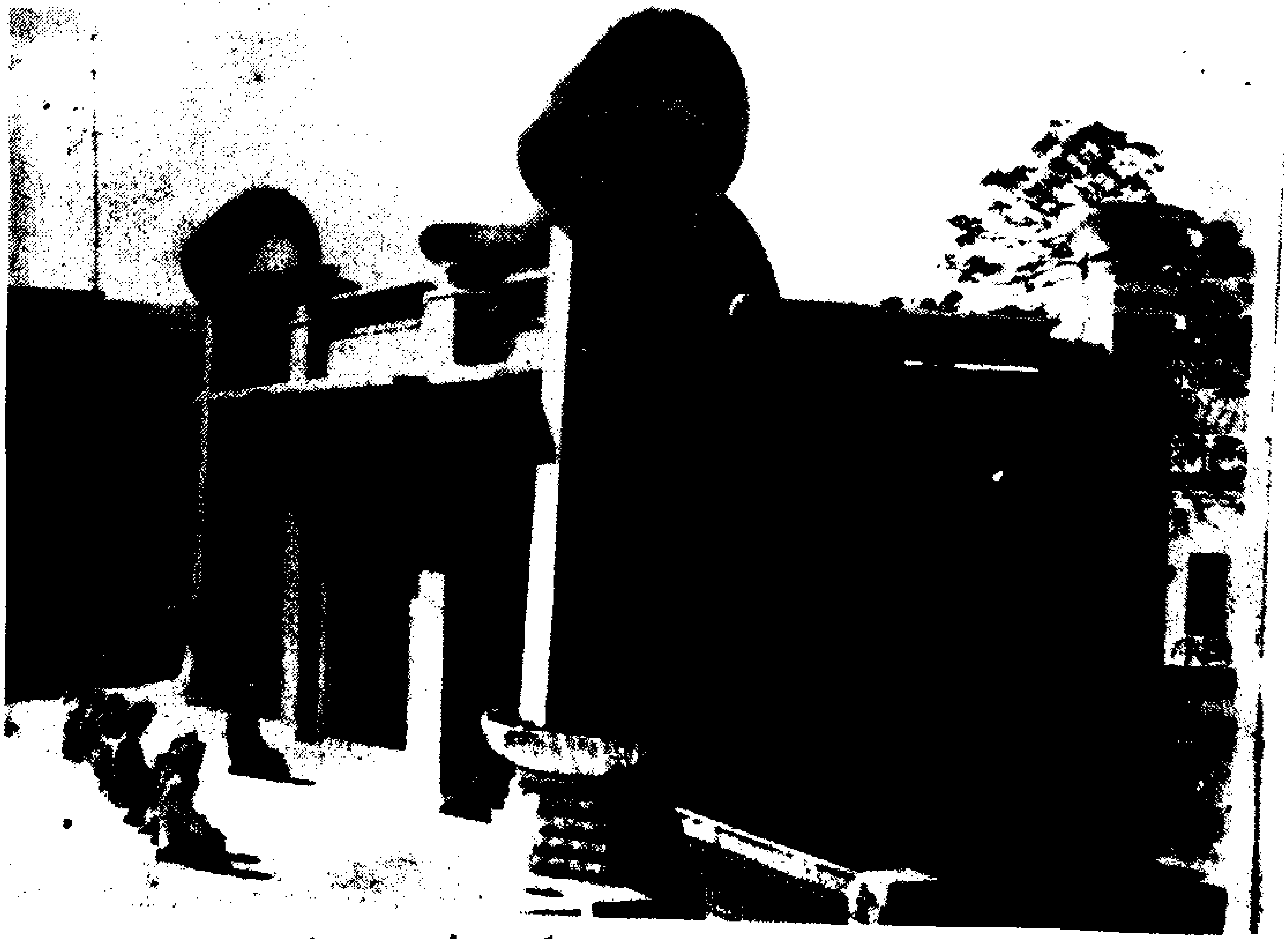

بھوپال میں خان بہادر سید حامد حسین کی تعمیر کردہ ایک اور خوب صورت مسجد

Marfat.com

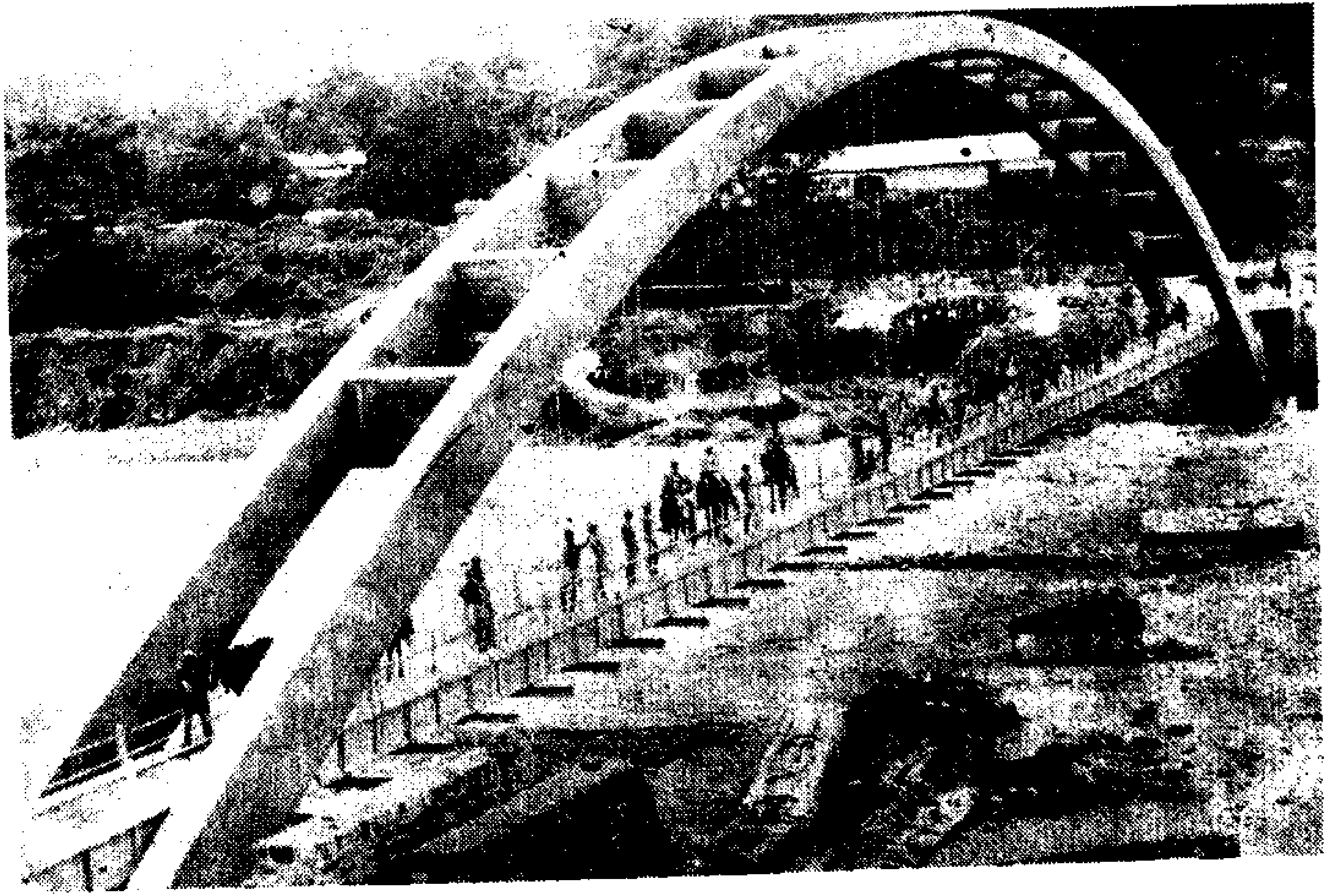

یوپی کی ترائی میں کاٹھ گوڈاؤن کے مقام پر خان بہادر سید حامد حسین کا پہلا تعمیراتی کارنامہ ۱۹۱۲ء

Marfat.com

قائداعظم کی ایک یادگار دستخطی تصویر جو انھوں نے
میجر جنرل (ریٹائرڈ) سید شاہد حامد کو عطا کی تھی۔

Marfat.com

خان بہادر سیّد حامد حسین اپنے عملے کے ہمراہ (بائیں جانب سے دوسرے نمبر پہ بیٹھے ہیں)

Marfat.com

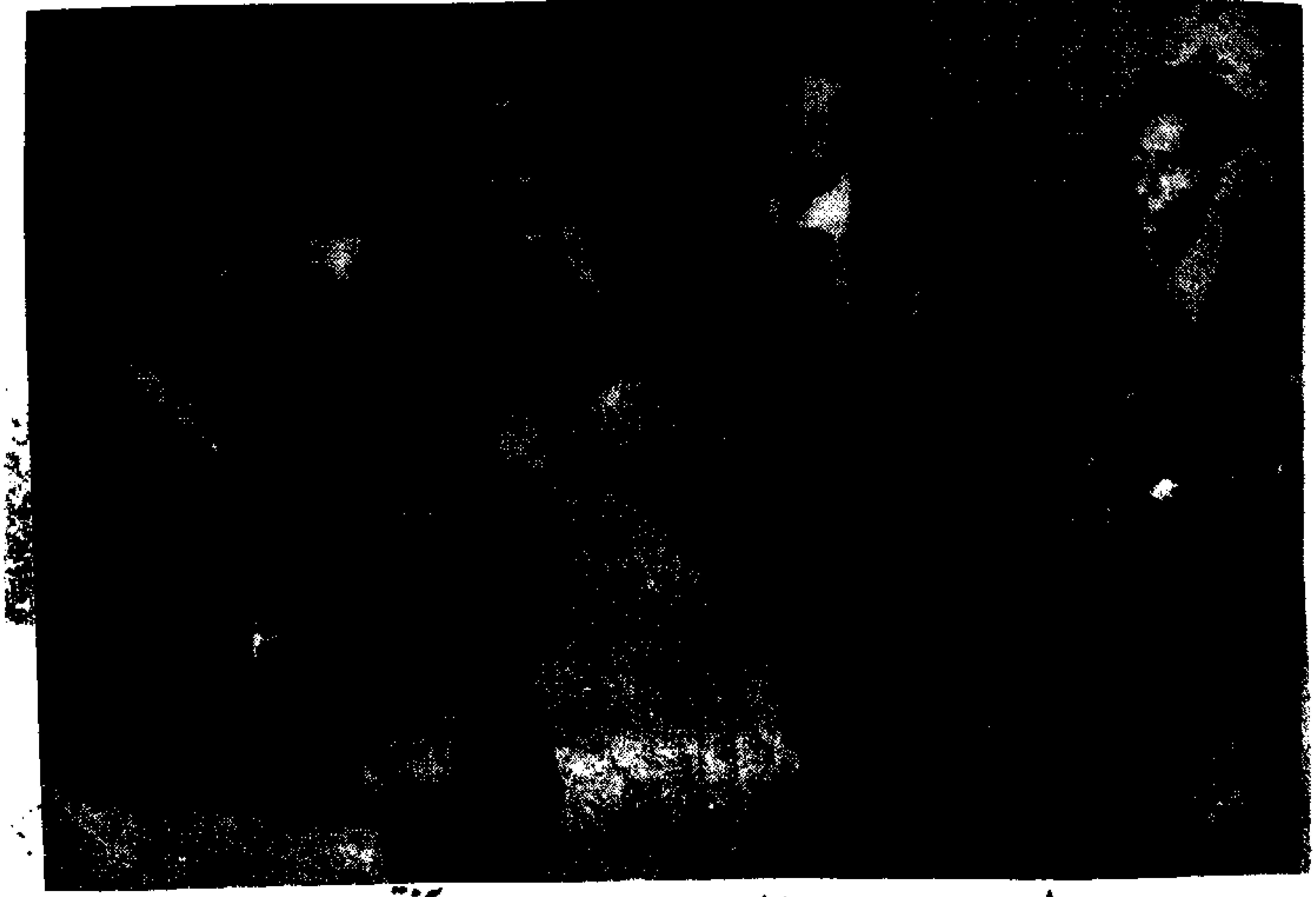

(بائیں جانب سے) میجر جنرل (ریٹائرڈ) سید شاہد حامد اور مولوی آفتاب عمر

Marfat.com

۱۹۳۲ء میں لندن میں ایک یادگار گروپ۔ وسط میں قائداعظم، محترمہ فاطمہ جناح،
علامہ اقبال اور سینڈہرسٹ ملٹری کالج میں زیرِ تعلیم سید شاہد حامد نظر آ رہے ہیں۔

Marfat.com

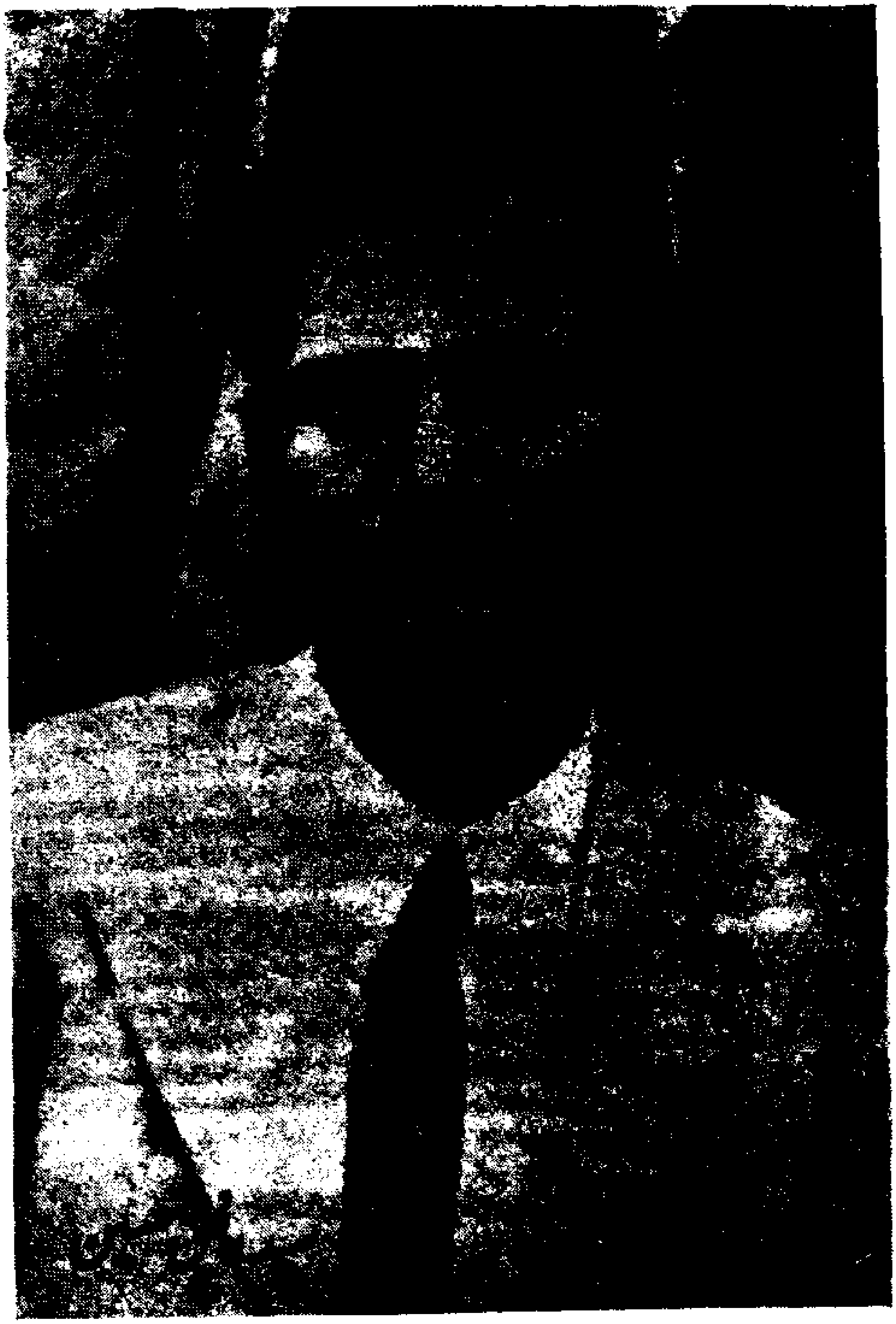

Marfat.com

قائد اعظم، لیفٹیننٹ کرنل سید شاہد حامد سے مصروف گفتگو ہیں

Marfat.com

البشیر

ہفت روزہ

ایڈیٹر:- محمد بشیر الدین

نمبر (۳۰)	اٹاوہ - یوم شنبہ ۱۱ - جولائی ۱۹۳۶ء مطابق یکم جمادی الاول ۱۳۵۵ھ	جلد

چندہ سالانہ

23.IX.36.19
5b

رسالہ البشیر میں خان بہادر سید جعفر حسین کے بارے میں لکھے جانے والے تعزیتی نوٹ کا عکس

Marfat.com

نہایت افسوس کے ساتھ یہ خبر درج کیجاتی ہے۔ کہ خان بہادر سید جعفر حسین صاحب پنشنر ایگزیکٹیو انجینیر نے ۸۰ برس کی عمر میں اس دنیائے فانی سے رحلت فرمائی۔ مرحوم بہت اچھے اوصاف کے آدمی تھے۔

انکی ابتدائی تعلیم اگرچہ بہت معمولی ہوئی تھی تاہم وہ اپنے شوق سے پرانے زمانے کی سب اوورسیری کے امتحان کی تیاری کے لئے رڑکی کالج میں داخل ہوئے۔ اس اونے درجے کے امتحان پاس کرنے کے بعد وہ ورافٹ مین ہوئے بعد ازاں سب اوورسیر مقرر ہوئے۔ پھر ترقی پاکر ضلع دار اور اس کے بعد ڈپٹی مجسٹریٹ مقرر ہوئے۔ ڈپٹی مجسٹریٹی کے بعد وہ ذمہ دار ایگزیکٹیو انجینیر مقرر ہوئے اگرچہ انکی تعلیم بہت معمولی درجے کی تھی۔

لیکن انجینیری سے انکو چونکہ خاص شوق تھا۔ لہذا اپنی ذوق اور انہماک کی وجہ سے ان کا شمار اعلیٰ درجے کے انجینیر میں کیا جاتا تھا۔ میکینیکل انجینیری میں اگرچہ انہوں نے کوئی خاص تعلیم نہ پائی تھی۔ لیکن بوجہ شوق کے اس میں بھی انہوں نے اعلیٰ دستگاہ حاصل کر لی تھی۔ جب سے سرسید رحمۃ اللہ نے علی گڈھ کی تحریک شروع کی یہ شروع سے اس تحریک کے حامی رہے۔

سرسید کے معتقدین میں ان کا نمبر سب سے زیادہ بڑھا ہوا تھا۔ انکے دل میں علی گڈھ کالج کی محبت اور اس کی ترقی کے متعلق غیر معمولی شغف موجود تھا۔ وہ جہاں رہتے اور جہاں جاتے۔ وہ اپنے حلقہ اثر میں لوگوں کو سرسید کا مقلد بنانے اور علی گڈھ کی اعانت پر آمادہ کرتے تھے۔

غرضکہ مرحوم کی ذات سے علی گڈھ کالج اور آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کو اخلاقی اور مادی ہمیشہ فائدہ پہنچتا تھا۔ وہ علیگڈھ کالج کے پرانے ٹرسٹی تھے۔ اور جب کالج یونیورسٹی کے درجے پر پہنچا۔ تو اس کے کورٹ کے ممبر ہوئے۔

انہوں نے یہ ارادہ کیا تھا۔ کہ علیگڈھ میں مستقل سکونت اختیار کریں اور اس غرض سے انہوں نے علی گڈھ میں ایک کوٹھی جعفر منزل کے نام سے بنوائی تھی۔ لیکن بعض خانگی مجبوریوں کی وجہ سے وہ علی گڈھ میں قیام نہ کر سکے۔ اور کوٹھی فروخت کرنے کو مجبور ہوئے۔

اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ جب کہ ایک مکتب کی شکل میں تھا جب سے وہ اسکول کے ہمدرد اور معاون رہے۔ اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ کی ترقی کے لئے انہوں نے کئی مرتبہ اٹاوہ میں سکونت اختیار کرنے کا ارادہ بھی کیا۔ یہاں آکر کئی کئی ماہ تک ٹھہرے لیکن بعض خانگی مجبوریوں کی وجہ سے انکو باہر جانے کی ضرورت پیش آئی۔ اگست ۱۹۳۵ء میں وہ آخری مرتبہ پھر اٹاوہ تشریف لائے۔ اور اس ارادے سے آئے تھے۔ کہ وہ ڈن روپی فنڈ کے ذریعہ سے اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ کو انٹر کالج بنانے کے لئے ایک لاکھ روپیہ جمع کریں گے۔

چنانچہ انہوں نے اس تجویز کو کامیاب کے بنانے کے لئے مختلف قسم کے رجسٹر تجویز کئے۔ لیکن اسکول کی بدقسمتی سے وہ ایک ماہ بھی کام نہ کرنے پائے تھے کہ وہ علیل ہو گئے۔ اس سخت علالت کی حالت میں بھی وہ لیٹے لیٹے کام کرتے تھے۔ یہاں انکے مرض میں اضافہ ہو گیا تھا۔ تو ان کے بھتیجے خان بہادر حامد حسین ایگزیکٹیو انجینیر انکی اور میری مرضی کے خلاف انکو زبردستی لکھنؤ لے گئے۔ اور بلرام پور ہسپتال کے یورپین وارڈ میں انکو داخل کر دیا۔

کئی ماہ تک ہسپتال میں علاج ہوا۔ جب تک انکے ہاتھ میں لکھنے کی سکت رہی وہ ڈن روپی فنڈ کے متعلق اپنے خیالات اور تجاویز لکھکر بھیجتے رہے۔ جب ہسپتال میں فائدہ نہ ہوا۔ تو وہ حامد حسین کے مکان میں اٹھ آئے۔ اور ہومیوپیتھک علاج شروع کیا۔

پہلے خبر آئی کہ انکو روز بروز آرام ہو رہا ہے۔ لیکن یکایک حامد حسین کا تار آیا۔ کہ مرحوم نے ۱۷ تاریخ کو اس دار فانی سے انتقال کیا۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون)

مرحوم نہایت جفاکش محنتی آدمی تھے۔ میں نے اپنے تمام عمر میں سید جعفر حسین کی برابر کسی دوسرے شخص کو محنتی اور جفاکش نہ پایا۔ ملازمت کے زمانے میں اکثر برابر مسلسل ۱۸ گھنٹے اٹھارہ گھنٹے کام کرتے تھے۔

باوجود دیکھنے کے وہ حقہ پینے اور پان کھانے کے عادی تھے۔ یہ کام میں مشغول ہوتے تھے۔ تو نہ انکو حقہ پینے کا خیال ہوتا تھا

Marfat.com

بچوں کے کھانے کا خیال کرتے تھے۔ حتیٰ کہ سخت بیماری کی حالت میں بھی وہ تندرستی کی طرح محنت کرنے کے عادی تھے۔

مسلمانوں کے افلاس کی ان کے اوپر ایک چوٹ لگی ہوئی تھی۔ وہ اپنے عزیزوں اور دوسرے لوگوں کی مالی امداد اس خاموشی کے ساتھ کرتے تھے۔ کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی تھی۔

یہی وجہ تھی۔ کہ باوجود معقول تنخواہ اور سادہ زندگی کے وہ ہمیشہ تنگ دست رہتے تھے۔ وہ ہمیشہ اس ادھیڑبن میں رہتے تھے کہ کیونکر مسلمانوں کی حالت کو بہتر سے بہتر بنایا جائے۔ چنانچہ سیکڑوں ایسے نوجوانوں کو جنہوں نے بہت کم تعلیم حاصل کی تھی۔ انکو وہ حساب اور ٹائپ کی تعلیم دیتے تھے۔ اور اپنی کوشش سے بہت سے ایسے نوجوانوں کو نوکری کرا دیتے تھے۔

چنانچہ آج بھی بہت سے اچھے عہدوں پر ہیں۔ انکی یہ خدمت ایسی تھی۔ کہ جس کی کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوتی تھی۔ انگریزی تعلیم یا علیگڑھ کالج کے جو لوگ مخالف تھے۔ وہ ہمیشہ کوشش کرتے کہ ان کے بچوں کو مقامی اسکولوں میں داخل کرا دیتے تھے۔ یا علیگڑھ کالج یا اسلامیہ ہائی اسکول میں تعلیم دلانے کے لئے انکے والدین کو آمادہ کرتے تھے۔

میری اور ان کی دوستی کو پچاس برس گزر چکے۔ میرے ساتھ انکو جو محبت تھی۔ وہ اعتدال سے بڑھی ہوئی تھی۔ انکو میرے ساتھ اسوقت سے محبت [illegible] ہوئی ہے۔ جب کہ میری پوزیشن زمانہ کے اعتبار سے بہت [illegible] اور [illegible] حالت میں تھا [illegible] میرے [illegible] کے ساتھ [illegible] بلکہ میری ذات سے ان کو ضرورت سے زیادہ حسن ظن اور عقیدت تھی۔ اور یہ حالت آخر وقت تک قائم رہی۔ ایسے [illegible] میرے ساتھ محبت کرنے والے اور میرے [illegible] کرنے والے ایک ایک دوست [illegible] جاتے ہیں۔ [illegible] کہ مجھکو سخت صدمہ ہوا ہے [illegible] وقت [illegible] والا برداشت رہا [illegible] آنکھوں کے سامنے [illegible] عزیز اور دوست اٹھتے جاتے ہیں۔ اور جو عزیز یا دوست [illegible] ہے اس کی جگہ لینے والا [illegible] نہیں ہوتا۔

میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ [illegible] صدمہ مجھکو برداشت [illegible] ہے۔ اور خدا سے مرحوم سید جعفر حسین کی مغفرت کی دعا کرتا ہوں جب سید جعفر حسین صاحب کی وفات کی خبر اٹاوہ پہنچی تو اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ کے طلبا اور استادوں کا [illegible] سے تعزیتی جلسہ ہوا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے مرحوم کے اوصاف بیان کئے۔ جمعہ کی نماز کے بعد بورڈنگ ہاؤس کی مسجد میں قرآن خوانی کر کے مرحوم کی روح کو ایصال ثواب پہنچایا گیا

Marfat.com

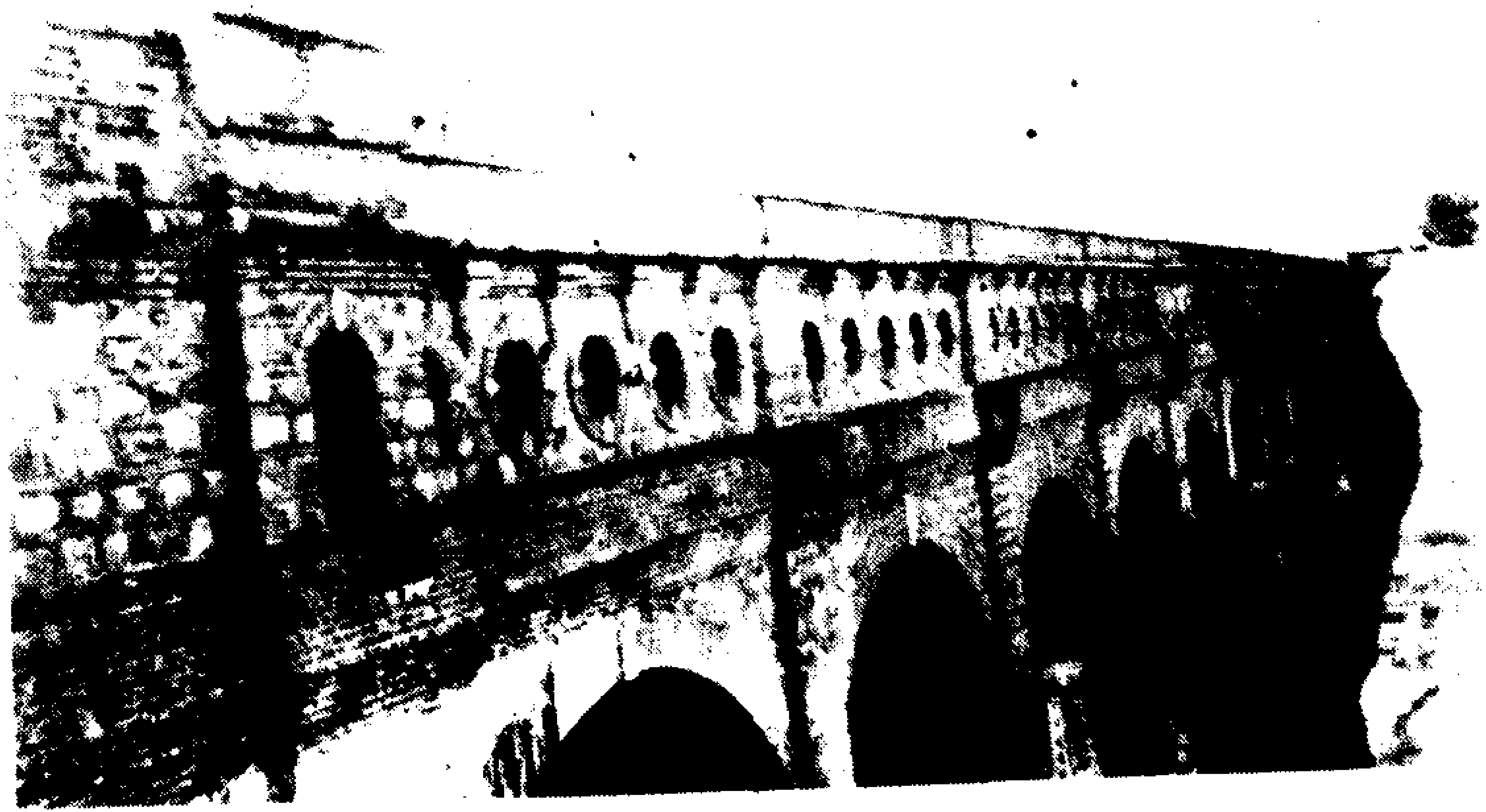

خان بہادر سید جعفر حسین کے تعمیر کردہ ایک پل کا منظر

Marfat.com

Vice-Chancellor

Muslim University
Aligarh

Dated 5.6.[illegible]

My dear Colonel Shahid Hamid,

I received with great sorrow the sad news of the demise of your revered father. It is a great loss to the family. May God give you the strength to bear this loss and may He grant his soul peace in Heaven.

Yours sincerely,

Lt.Colonel
S.Shahid Hamid
Feroze Kothi,
Lucknow.

خان بہادر سید حامد حسین کے انتقال پر ڈاکٹر سر ضیاء الدین کے تعزیتی خط کا عکس

Marfat.com

ایم۔اے۔کالج علی گڑھ کے سکریٹری نواب محسن الملک کے خط کا عکس، جس میں انھوں نے
یو۔پی کی حکومت سے خان بہادر سید جعفر حسین کی خدمات حاصل کرنے کی درخواست کی تھی

Copy of letter No 206 dated 28 September 1903. From the Honorary Secretary M.A.O College Aligarh, to the Private Secretary to His Honor the Lieutenant Governor United Provinces Naini Tal.

Sir,

I shall be obliged if you will kindly lay the following before His Honor the Lieutenant Governor. When His Honor visited Aligarh in August last I had occasion to bring to His Honor's notice the fact that we were in need of a Mahomedan Gentleman who may be competent to efficiently superintend the work of collecting subscriptions in connection with the Sir Syed Memorial Fund and also to supervise the Building Department which badly wants proper control and looking after. But the sort of man that we want besides being competent and hard-working, should also be inspired with an Enthusi

Marfat.com

asm for the work and the interests of the College a[illegible]
should be one who may command the confid[ence]
and respect of the Community.

I had the honour to suggest to His Honor the na[me]
of Syed Jaffer Husain, Deputy Magistrate, Cana[l]
Irrigation Department of these Provinces, now o[n]
deputation to Gwalior State. In the light of the
interest that he has always been taking in the wel[fare]
of the College and the credit with which he is repu[ted]
to have always discharged his official duties, I a[s]
well as all my colleagues have every reason to be[lieve]
that he is the proper man for our present requireme[nts].
Besides being an experienced and able Governm[ent]
Officer he possesses the complete confidence of the co[m]
munity. I may mention his recent services to [the]
College which he has rendered by starting, organiz[ing]
and working the scheme of the One Rupee Fund[.]
It is solely due to his untiring energy and zeal [that]
over Rs 15,000/- have already been collected i[n]
connection with the above mentioned fund. I [may]
also take the liberty of mentioning that he is perf[ectly]
willing and ready to undertake the College wo[rk]
provided the Government be pleased to allow [him]
to do so. Therefore I beg to ask His Honor to sanc[tion]

(ریکارڈ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی)

Marfat.com

the transfer of Syed Jaffar Husain's services to the College on terms that may be settled between him and the College Authorities which may be in Conformity with the Government rules on the subject.

Syed Jaffar Husain was deputed to Gwalior State for five years out of which he has already completed about 4 years. He is prepared to apply for his reversion provided the Government be pleased to sanction the transfer of his services to the College.

I have the &c.

Mohsin ul Mulk.
Honorary Secretary.

No 243

Honorary Secretary's Office
M A O College
Dated Alegarh the 14th October 1903.

Copy forwarded to Syed Mir Jaffar Husain Divisional Engineer, Gwalior State, Morar, for information.

[signature]

Honorary Secretary
M A O College, Alegarh.

Marfat.com

Readymoney House
Matheran
27th May 45

Dear Piaria

I was extremely sorry to hear the news of your father's death. It was only yesterday that I read the news in the Dawn.

Mr Jinnah joins me in sending you our deepest sympathy in your sad bereavement.

Yours sincerely
Fatima Jinnah

Page (5)

خان بہادر سید حامد حسین کے انتقال پر محترمہ فاطمہ جناح کے تعزیتی خط کا عکس

Marfat.com

Gul-i-Raana
Hardinge Avenue
New Delhi
5. 6. 45

My dear Shahid,

I was terribly shocked to learn the tragic news of the sudden death of your father on my return from a tour of Assam and Bengal.

My wife and I send you all our deepest sympathy and condolences. May the departed soul rest in peace and may God give you all enough courage to bear this terrible loss.

Yours sincerely

Liaquat Ali Khan

خان بہادر سید حامد حسین کے انتقال پر نواب زادہ لیاقت علی خان کے تعزیتی خط کا عکس

Marfat.com

8, Theatre Road,
CALCUTTA.
21st. June 1945.

My Dear Hamid,

I wired to Quetta conveying my sincerest sympathy and condolence at the great loss that you have suffered. I hope God will give you courage and patience to bear this loss.

Please give my compliments to Mrs. Hamid.

Yours sincerely,

خان بہادر سید حامد حسین کے انتقال پر خواجہ ناظم الدین کے تعزیتی خط کا عکس

Marfat.com

٧٨٦

قصرِ اسمٰعیل۔ میرٹھ
۲۴/ مئی ۵۸ء

ذخیرۂ محمد اقبال مجددی لاہور

مکرمی! تسلیم

کل کے "Dawn" میں یہ خبر انتہائی رنج و قلق سے پڑھی کہ خان بہادر نے اس دارِ فانی سے کوچ کیا۔ اس حادثہ سے جو آپ پر اثر پڑا ہو وہ بالکل بجا ہے ان کے عزیز دوست اور علیگڑھ کے لئے بھی یہ خبر باعثِ اذیت ہے۔ مرحوم بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ میری دلی دعا ہے کہ خدا ان کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور آپ کو اور مرحوم کے سب عزیزوں کے دلوں کو صبر و سکون۔

مشیتِ ایزدی کے آگے انسان مجبور و لاچار ہے۔ میں اور میرے خاندان کے سب لوگ دل سے آپ کے غم میں شریک ہیں۔

آخر میں پھر خدا سے دعا ہے کہ وہ آپ سب کے دلوں کو صبر عطا فرمائے۔ آمین۔

فقط

والسلام

محمد اسمٰعیل خان

خان بہادر سید حامد حسین کے انتقال پر نواب سر محمد اسماعیل کے تعزیتی خط کا عکس

Marfat.com

سارداکینال ہیڈورکس بن باسا

Marfat.com

Marfat.com

بھوپال کی ایک خوبصورت مسجد جس کا ڈیزائن اور تعمیر خان بہادر سید حامد حسین کے ہاتھوں ہوئی

Marfat.com

ڈاکٹر محمد اقبال کی ۱۸ / دسمبر ۱۹۳۲ء کی ایک تحریر جو انھوں نے لندن میں سید شاہد حامد
کو عطا کی تھی۔ بعد ازاں اقبال نے اس نظم کے ایک مصرعے میں ترمیم کر دی تھی۔

Marfat.com

Marfat.com

Marfat.com